مکتبہ جامعہ دہلی

۵۵ ف

پیام تعلیم (سالنامہ)

سال گرہ نمبر کی تیاریاں شروع ہو گئیں اکی یہ خاص نمبر ہر اعتبار سے بچوں کے لٹریچر میں ایک نئی چیز ہو گی۔

اس میں صرف وہی چیزیں نہ ہوں گی جنھیں بچے چند دن میں پڑھ کر رسالہ الماری میں رکھ دیں بلکہ وہ سال بھر تک ان کے ہاتھوں میں رہے گا۔ وہ انھیں بتائے گا کہ پڑھنے کے علاوہ کون کون سے مشغلے ان کے لئے مفید ہیں اور وہ اپنے ہاتھ اور دماغ کی کوشش سے کیسی کیسی اچھی مفید اور دلچسپ چیزیں بنا سکتے ہیں۔

کتاب نما

ادب اردو کے شائقین کے لئے مکتبہ جامعہ کا یہ رسالہ بہت ضروری ہے۔ تمام جدید کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے ہمیشہ مل سکتی ہے کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں۔ کتاب نما پڑھ کر اردو ادب کی رفتار ترقی سے واقف رہیں گے۔ (چندہ سالانہ صرف ۸؍)

مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۳۰	جولائی سنہ ۱۹۴۸ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

اعتذار

گذشتہ پرچے میں فہرست مضامین کے سلسلہ میں دو بڑی غلطیاں ہوگئیں جن کا ادارہ کو بہت افسوس ہے،

۱۔ حکیم ٹالسٹائے کے اعترافات ، غلام ابرار صدیقی صاحب اثر بی۔ اے (علیگ) کا ترجمہ ہے۔

۲۔ دنیا۔ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کا مضمون ہے۔

ہم ان حضرات سے معذرت چاہتے ہیں کہ ان کے اسمائے گرامی رسالہ میں درج نہیں ہوسکے۔

مدیر

بچہ اور اس کی اخلاقی تربیت

سعید انصاری صاحب پرنسپل استادوں کا مدرسہ جامعہ دہلی، نے امریکہ
سے واپس آکر بچوں کی تربیت و تعلیم پر ایک کتاب لکھنا شروع
کی ہے جس کے چند صفحے رسالہ جامعہ کو عنایت ہوئے ہیں
امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ "مدیر"

اگر بچے کی اخلاقی تربیت صرف چند کام کرنے یا نہ کرنے کا نام ہوتا تو یہ بڑا آسان کام تھا کہ ایسے کاموں کی فہرست بنا کر دے دی جاتی اور سارا معاملہ حل ہو جاتا۔ لیکن اخلاقی تربیت اور بچے کی ساری زندگی میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ جب تک بچے کے اور میلانات اور اس کی زندگی کے دوسرے اثرات کو پیش نظر نہ رکھا جائے، اس کی تربیت صحیح طور پر نہیں کی جا سکتی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب صحبت کے اثر کو اخلاق کے بننے یا بگڑنے میں بڑا دخل سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے لیکن آج ایسا ضروری نہیں کہ بچہ بروں کی صحبت میں برا ہی ہو اور اچھوں کی سنگت میں اچھا ہی ہو جائے بلکہ اور بہت سے عوامل خود اس کی زندگی کے اندر اور ہم سے خارج ایسے ہیں جو اس کو برا یا بھلا بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صحت کے معاملے کو لیجئے۔ ایک بچہ جس کی صحت اچھی نہ ہو، اس کی قوت ارادہ بھی کمزور ہو گی اور وہ برے میلانات کا شکار صحت در بچے کے مقابلہ میں آسانی سے ہو جائے گا۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس قسم کے اثرات قابو میں لائے جا سکتے ہیں اور انھیں صحیح راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے اثرات میں سے ایک بہت موثر اثر علم اور واقفیت ہے۔ بعض وقت بچے غلط راہ پر لگ جاتے ہیں اس لئے کہ وہ صحیح راستہ نہیں جانتے۔ لیکن جدید نفسیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ صرف صحیح علم کافی نہیں ہے بلکہ صحیح میلان بھی ہونا چاہیئے۔ جب تک بچہ خود بہتر نہ بننا چاہے اس کے سامنے

ہزار انبیاء اور مصلحین کی سیرت کا خاکہ پیش کیجئے۔ بے سود ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ بچہ ایسا ہونا کیوں نہیں چاہتا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے دل میں اس سے کوئی قوی تر جذبہ کام کر رہا ہے ایسی صورت میں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسی جذبے کی کارفرمائی ہوگی جس کے اظہار کا سب سے زیادہ موقع ہوگا۔ لہٰذا عادت کو بھی سیرت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کو تنہا اس کی سیرت کے بنانے یا بگاڑنے کا اختیار نہیں ہے۔

اسی طرح صحت جسمانی کو بھی بچے کے اخلاق میں دخل ہے۔ بچے اگر تھکے ماندہ ہوں تو اُن سے ہمدردی کے اظہار کی کم توقع رکھنی چاہیئے۔ آج کل تمام اچھے اچھے مدرسوں میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بچوں پر زیادہ زور نہ پڑے۔ بعض وقت ہم کسی بچے کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کاہل ہے حالانکہ بہت ممکن ہے اس غریب کو پیٹ بھر کھانا نہ ملا ہو۔ آج کل دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں بچوں کی عدالتیں ان پر فوراً قرار داد جرم لگا دینے کی بجائے طبیب اور ڈاکٹر رکھتی ہیں، جو ان کی جسمانی صحت کا حال معلوم کرنے کے بعد انھیں مجرم یا غیر مجرم قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح لڑکوں کے جنسی اخلاق کے متعلق فوری فیصلہ کرنے کی بجائے اگر ہم یہ دیکھیں کہ کہاں تک اس کی عام صحت، اس کی غذا، اس کے سونے جاگنے کے اوقات اور اس کے کھیل کود کو اس میں دخل ہے تو شاید ہم اپنے فیصلے میں زیادہ صحیح ہوں۔ تربیت اخلاق جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بچے کی عام زندگی کو صحیح طور پر نشو و نما دینے سے علیحدہ کوئی شے نہیں ہے۔

اس بنا پر تربیت اخلاق کے تین طریقے ہو سکتے ہیں (۱) ایسی باتیں جن سے بچے میں بُری چیزوں سے نفرت اور اچھی چیزوں سے الفت پیدا ہو، ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ (۲) ایسی تمام واقفیتیں جن سے انسانی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملے، بچے کے لئے مفید ہو سکتی ہیں (۳) ایسی تربیت جس سے بچے اپنی معقول اغراض پوری کر سکیں زندگی کے بنانے میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم بچوں کی سیرت میں اخلاق حسنہ پیدا کرنے کی کوشش کریں، پہلے یہ دیکھیں کہ اُن کے غلط میلانات کو کس طرح راہ راست پر لایا جا سکتا ہے بعض بچوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ ننھے ننھے پرندوں کا شکار کرتے ہیں اور انھیں ان معصوم جانوں کے لینے پر ذرا افسوس نہیں ہوتا۔ ان بچوں کے لئے اس سی

کوئی فائدہ نہیں کہ انھیں معصوم حالوں کے پینے پر گناہ سے ڈرایا جائے، یا انھیں زجر و توبیخ کی جائے بلکہ بہترین صورت یہ ہے کہ ان کے اس شوق کو پرندوں کی تصویریں بنانے اُن کے رہنے سہنے کے متعلق حالات معلوم کرنے اور پھر انھیں دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی طرف مائل کیا جائے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ایک جذبے کو دوسرے سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس کے جماعتی احساس کو ابھار کر اُسے قریب قریب بالکل روک دیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض صحیح جذبات سے کام لے کر ہم اخلاق کی تربیت بھی کر سکتے ہیں مثلاً ایک بچے کو سگریٹ یا بیڑی پینے کی عادت پڑ گئی ہے اور وہ کسی طرح نہیں چھوٹتی ہے۔ آپ ہزار سگریٹ کی برائیاں بتائیں لیکن وہ ہے کہ اس لت سے باز نہیں آتا۔ وہی بچہ اگر کھیل کود کا عاشق ہے اور آپ اُسے ذرا یہ سمجھائیں کہ اس سے ٹیم میں تمھارا درجہ بہت کم ہو جائے گا، اس لئے کہ اس سے سینہ کمزور ہو جاتا ہے۔ پھر دیکھئے کہ وہ کبھی اس کے قریب بھی نہ جائے گا۔

بچے کی زندگی میں ایک بڑی موثر چیز شخصی مثال ہوتی ہے۔ ہزار وعظ و پند کے مقابلہ میں شخصی مثال . . . کہیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے بچے شروع شروع میں تو ایسے شخصوں کی مثال سے اثر لیتے ہیں، جنھوں نے دلیری، بہادری اور جاں بازی کے کارنامے کئے ہیں۔ آگے چل کر بڑے بڑے مصلحین اور پیمبروں کے حالات سے اثر لیتے ہیں۔ والدین اور استادوں کو چاہئے کہ بچوں کو شروع ہی سے نہ صرف ایسے لوگوں کے حالات زندگی پڑھانے پر اکتفا کریں بلکہ ممکن ہو تو انھیں زندہ مختلف قسم کی بڑی بڑی شخصیتوں سے براہِ راست ملنے جلنے کے مواقع بہم پہنچائیں تاکہ وہ ان سے اپنے نمونے کا انتخاب کر سکیں۔

بچوں میں ایک بڑا جذبہ امتیاز حاصل کرنے اور نمایاں ہونے کا ہوتا ہے کھیل کے میدان میں اگلی صف کے کھلاڑیوں میں ہر ایک یہ کوشش کرتا ہے کہ گیند کو گول میں پہنچا سکے، ہر ایک کو برابر کا موقع نہیں رہتا ایسی صورت میں کھلاڑی کو یہ چاہیے کہ وہ ٹیم کی خاطر شخصی امتیاز کو قربان کر دے اور گیند دوسرے ساتھی کو دے دے، جس کو اس سے بہتر موقع حاصل ہو۔

بچوں میں اسی طرح ایک جماعتی جذبہ بھی بہت قوی ہوتا ہے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُن کی ٹولیاں ہوتی ہیں اور یہی ٹولیاں بعض وقت ناپسندیدہ مشاغل میں شہرت حاصل کرلیتی ہیں۔ لڑکوں کے اس جذبے کی بنا پر اُن کی اچھی اچھی مجلسیں اور انجمنیں بنائی جاسکتی ہیں جو نہایت مفید کام انجام دے سکتی ہیں۔ اسی طرح ان میں ٹیم اور اسکول کی محبت کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے جو آگے چل کر قوم اور وطن کے جذبے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یہی تربیت ہوتی ہے جو وقت آنے پر انسان سے بڑی بڑی قربانیاں کرالیتی ہے۔

ہمدردی اور رحم کا بھی ایک جذبہ بچے میں شروع ہی سے ہوتا ہے، اب سوال محض عادت کا رہ جاتا ہے کہ بچے میں اس جذبے کے ماتحت اس سے کام لیا جائے۔ بچوں کی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع پیش آتے ہیں مثلاً ایک کے پاس کئی کھلونے ہیں اور دوسرے کے پاس ایک بھی نہیں۔ وہ اپنے ان کھلونوں میں سے دوسرے کو دے سکتا ہے یا ایک مٹھائیوں سے بھرا ڈبہ ہاتھ میں لئے ہوئے ہے، اور دوسرا منہ تک رہا ہے۔ نہایت آسانی سے اُسے اس پر آمادہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی شریک کرے۔

اب ان کے علاوہ کچھ اور مواقع آتے ہیں جہاں اخلاق پر ناگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے ہمیں چاہئے کہ بچوں کی زندگی میں اُن سے پرہیز کریں تاکہ اخلاقی قوت اور مضبوط ہو۔ مثلاً اکثر بچے کسی نیک کام کے اس بنا پر عادی ہوتے ہیں کہ اُنھیں والدین یا استاد کی طرف سے شاباشی ملے گی۔ نیک کام خود اپنا اجر ہے اور بچے بھی شروع سے اسے محسوس کرتے ہیں ہمیں چاہئے کہ ان کے اس احساس کو اور قوی کریں۔ بجائے اس کے کہ انھیں تحسین و آفریں کا عادی بنائیں۔

اسی طرح اکثر وہ کسی کام سے اس لئے باز رکھے جاتے ہیں کہ انھیں مار پڑے گی یا اُن کا ناشتہ بند ہوجائے گا۔ بچوں کے اندر اسی عمر سے اعتماد اور عزت نفس کے شریف جذبات بھی موجود ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ان جذبات سے اپیل کی جائے؟ بہت کم امکان ہے کہ وہ نہ سُنیں، اور اگر ایک بار نہ سنیں تو دوسری بار کوشش کی جائے۔ کوئی بچہ اپنے لئے ذلیل اور رسوا ہونا پسند نہ کرے گا۔

سیرت دراصل عادت سے پختہ ہوتی ہے۔ ایک بات کا کرنا اور بار بار کرنا سیرت کو پختہ کرتا ہے۔ پابندیٔ وقت، ایفائے وعدہ، ذمہ داری کا احساس، ہمت اور استقلال کون نہیں جانتا کہ یہ سب اچھی خصلتیں ہیں لیکن سیرت کے اندر ان کا جم جانا صرف عادت سے ہو سکتا ہے۔ عادت ہر صفت کی اور ہر حالت میں ہونی چاہیے۔ ممکن ہے ایک بچہ مدرسے تو وقت پر آئے لیکن جب اپنے کسی ساتھی کے ہاں آنے کا وعدہ کرے تو آدھ گھنٹہ دیر کرکے آئے یا اگر کسی دوست کی کتاب واپس کرنی ہے وہ تو کر دیتا ہے لیکن جلسے کے سلسلے میں ایک کام اپنے ذمے لیا ہے اور اُسے پورا کرنے سے بھاگتا ہے لہٰذا بچوں کے اندر ان تمام اخلاق حسنہ کی ہر حالت میں عادت ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صرف ان کا علم ہونا کافی نہیں ہے۔

ایک اور خرابی تربیت اخلاق کے سلسلے میں یہ ہے کہ وہ تعلیم سے علیحدہ کوئی جداگانہ شئے سمجھی گئی ہے۔ اب تک تعلیم ایک اور چیز تھی اور تربیت ایک دوسری شئے سمجھی جاتی تھی تعلیم کا کام ذہن اور علم سے تھا اور تربیت کا تعلق دل اور عمل سے لیکن اب جدید تعلیم میں یہ تصور بالکل بدل گیا ہے۔ بچوں کو بیشتر کام مدرسے کے اندر ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً باغبانی کے سلسلے میں پھولوں کو پانی دینا، کیاریاں بنانا، ڈرامے کے لئے اسٹیج تیار کرنا، قطب کی سیر کا پورا اہتمام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ان میں محنت کرنے کی عادت، محنت کرنے والوں کی قدر، اشتراک عمل، ذمہ داری اور بہت سی اخلاقی خوبیوں کی تعلیم ہو جاتی ہے۔

بعض اچھے مدرسے اور ایک قدم اس سے آگے چلتے ہیں، وہ مدرسے کا پورا انتظام اُن کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بُرے بھلے کی ذمہ داری سب اُن کے سر ڈال دیتے ہیں ایسی صورت میں بچے نہ صرف اس مدرسے کو اپنا مدرسہ سمجھنے لگتے ہیں بلکہ وہ ایک پورے ادارے کا بار بھی اپنے کندھوں پر اُٹھا لیتے ہیں اور وہ نہ صرف اشتراک عمل کا سبق اس سے سیکھتے ہیں بلکہ ایک ذمہ داری کا احساس بھی اُن کے اندر ترقی پاتا ہے۔

لیکن اس قسم کے اجتماعی کاموں میں ایک کمزوری ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اُن کی پشت پر کوئی نہ کوئی قوت ہوتی ہے جو ناکامی کے وقت اُن کا سہارا بن جاتی ہے بچوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں پر ایسے تجربات کا عادی بنایا جائے جب اُن کے خطرے کا کوئی سہارا نہ ہو بلکہ اس خطرے سے ایک یا دو بار

گذر بھی جائیں کہتے ہیں کہ اچھا تیراک وہ ہوتا ہے جو ایک دو دفعہ غوطے کھا چکا ہو۔ مثال کے طور پر بچوں کے پیسے کوڑی کا معاملہ لیجئے والدین بچے کے ہاتھ میں روپیہ پیسہ دیتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ وہ نہ صرف اڑا ڈالے گا بلکہ کہیں بد عادت بھی نہ ہو جائے لیکن ایسے ہی بچے ہوتے ہیں جب بڑے ہونے پر یا والدین کے مرجانے پر جہاں دولت اُن کے ہاتھ میں پڑی آناً فاناً غائب ہو گئی اور وہ خود بھی اس کے ساتھ تباہ ہوئے والدین کو چاہیئے کہ وہ شروع ہی سے بچوں پر اعتماد کریں اور پیسہ کوڑی سب کچھ اُن کے ہاتھ میں دیں تاکہ وہ ضائع کر ہی کر اُن کی قدر کرنا سیکھیں۔

اسی طرح ہمارے اجتماعی کاموں کا حال بھی ہوتا ہے مدرسے کی پوری ذمہ داری گو وہ اپنے سر لیتے ہیں، لیکن وہ اسے بگاڑ نہیں سکتے۔ ہمیں چاہیئے کہ اُنھیں ایسے کام دیں جنھیں وہ چاہیں تو بگاڑ بھی سکیں اور اس کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ مثلاً کوئی رسالہ نکالنا، جلسہ منعقد کرنا، ڈراما کرنا اس میں انھیں پورا اختیار ہو کہ وہ خواہ بنائیں یا بگاڑیں۔ اور اگر بگاڑ بھی دیں تو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ اور سچ پوچھئے تو جو کام وہ بگاڑ کر بنانا سیکھتے ہیں اس کے اعتماد اور قوت کا کیا کہنا؟

اخلاق کی تربیت میں ہم کو چند باتوں کا اور خیال رکھنا چاہیئے ایک تو یہ کہ جن اوصاف حسنہ کی ہم بچے کو تلقین کرنا چاہتے ہیں، وہ اُن کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتا بھی ہو۔ صرف اطاعت مطلق کی عادت ڈالنا کافی نہیں۔ اس سے اس کے اعمال میں جو زندگی اور اس کی روح میں جو تازگی پیدا ہوگی وہ اطاعتِ مطلق سے ہرگز نہیں ہو سکتی جو بچہ جانتا ہے کہ کس طرح اس کے دیر میں آنے سے ساری جماعت کا نقصان ہوگا، اس پابندیٔ وقت اور اس کی جو صرف تعمیلِ حکم کے خیال سے وقت پر آتا ہے، بہت فرق ہوگا۔

اسی طرح تلقینِ حسنہ کے سلسلے میں اگر عمومی نصائح کی بجائے مخصوص ہدایت کی جائے تو اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً سچ بولنا نہایت اچھی بات ہے۔ اس کی بجائے اگر ہم یہ تلقین کریں کہ جب تم اپنا کام گھر سے کر کے نہ لاؤ تو جو وجہ ہو، سچ سچ استاد کے سامنے بیان کر دو، تو غالباً اس کا زیادہ اثر پڑے گا۔

اسی طرح اخلاق کی تعلیم میں ہمیشہ نہی مفید نہیں پڑتی ہے۔ آپ نے کبھی سردی سے دانت بجتے دیکھے ہیں۔ اگر آپ اس سے ہزار کہیں کہ دانت مت بجاؤ۔ برا لگتا ہے لیکن وہ نہیں باز رہ سکتا ہے پر اگر یہ کہیں کہ دانت دبا لو، تو دانتوں کا بجنا فوراً بند ہو جائے گا۔ یہی حال بعض وقت بچوں کا ہوتا ہے۔ انھیں کسی کام سے منع کیجئے وہ نہیں رکیں گے۔ لیکن اگر کوئی اور بات کرنے کو کہئے تو وہ فوراً اس سے باز آجائیں گے۔

علاوہ اس کے بچوں کے سامنے ایک اچھی زندگی کا تصور آجاتا ہے کہ فلاں بات نہ کرو، فلاں سے پرہیز کرو۔ ایسی زندگی کا تصور انسان کی سیرت کو بہت کم زور بنا دیتا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ابتدا ہی سے ایک اچھی زندگی کا تخیل پیش کریں جس میں فلاں فلاں باتیں کرنی ہیں۔ مثلاً جھوٹ سے نفرت دلانے کی بجائے سچ کی خوبیوں پر زور دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

تربیتِ اخلاق کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا اور ضروری ہے ایک تو یہ کہ کہنے والا کون ہے اور دوسرے یہ کہ باتیں کس وقت کہی جاتی ہیں بعض وقت اچھی سے اچھی باتیں اگر کہنے والے کی عزت بچے کے دل میں نہیں ہے تو بالکل بے اثر رہتی ہیں۔ پھر اس طرح کہنے کا وقت بھی ہوتا ہے۔ دن کے ہنگامے میں جبکہ دماغ مختلف خیالات کے اندر مصروف رہتا ہے، بہت ممکن ہے کہنے کا کچھ اثر نہ ہو۔ لیکن رات کو سوتے وقت یا اور ایسے وقت جب طبیعت میں یک سوئی ہو، نصیحت کا بہترین موقع ہوتا ہے۔

اسی طرح کہنے کے طریقے میں بھی ایک بات پیش نظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ کہ باتیں اشارۃً کہی جائیں براہِ راست کہنے کا نہ صرف بُرا اثر بلکہ بعض وقت الٹا اثر ہوتا ہے مثلاً سگریٹ پینے پر یوں کتنا ہی سخت سست کہو لیکن کھیل کے وقت اس کی خرابی کا ذرا اشارہ ممکن ہے بہت اچھا اثر کر جائے۔ بڑوں کی طرح چھوٹوں میں بھی اپنی خوبی اور خرابی کا احساس ہوتا ہے، اگر ہم اس احساس سے ذرا کام لیں تو بعض وقت وہ کام نکل سکتا ہے جو براہِ راست پند و نصائح سے شاید ممکن نہ ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اخلاق کی تعلیم مدرسوں کے اندر دینی چاہیئے یا نہیں؟ اس کا جواب ہاں اور

نہیں دونوں میں ہوسکتا ہے۔ اخلاقی تعلیم سچ پوچھئے تو سب مضمونوں میں آسکتی ہے۔ زبان و ادب کو لیجئے اس میں ایسے قصے اور افسانے لے سکتے ہیں جن کا اثر بچوں کی سیرت پر بہت اچھا پڑسکتا ہے اس طرح تاریخ میں علاوہ اس کے کہ وہ انسانی کارنامہ ہے۔ اس سے بچوں کے دلوں میں ہمت اور بہادری، عزم اور استقلال، ایثار اور قربانی وغیرہ کے جذبات کی پرورش کی جاسکتی ہے۔ بڑے اشخاص کی سوانح عمریوں سے تو بہت کچھ سبق براہِ راست حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جغرافیہ اور سائنس سے بھی انسانوں کی خدمت اور راحت رسانی اور اس طرح کے دوسرے سبق مل سکتے ہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اخلاق کی تعلیم علیحدہ ہو یا یوں ہی محض ضمنی طور پر رکھی جائے اس میں خرابی اور اچھائی دونوں ہیں۔ علیحدہ مضمون کے طور پر رکھنے میں یہ اگر کسی ایسے استاد کے ہاتھ میں پڑگئی جو اس کے لوچ لچک سے واقف نہیں تو پھر یہ ایک بے روح مضمون ہوکر رہ جائے گی اور اس سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا۔

اخلاق کی تعلیم میں ایک بڑا کام تیوہاروں اور قومی اجتماعوں سے لیا جاسکتا ہے جبکہ بچوں کے جذبات قبولِ اثر کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر عید کی خوشی میں دوسروں کا غم بھی یاد دلایا جاسکتا ہے۔ محرم میں امام حسینؓ کی شہادت جہاں حق کی فتح کا وہاں دسہرے میں رام چندر کی لنکا پر چڑھائی ناحق کی مغلوبیت کا سبق دیتی ہے۔ قومی اجتماعوں سے شہدائے وطن کی یاد تازہ کی جاسکتی ہے اور یہ سب اخلاق کی تربیت و تعلیم کا بہترین ذریعہ ہیں۔

جناح نہرو خط کتابت

اور

مسلمانوں کے لئے آئندہ پروگرام

جناح نہرو خط کتابت پر ذیل میں ایک مسلم سوشلسٹ نے تنقید کی ہے، اس موضوع پر
کوئی اور بزرگ بھی بحث کرنا چاہیں تو ہم اس کو بڑی خوشی سے جامعہ میں جگہ دیں گے۔

(مدیر)

جناح نہرو کی خط کتابت کے شائع ہونے کا چرچا بہت دنوں سے تھا آخر شائع ہو ہی گئی مسٹر جناح نے تو اپنی طرف سے اس کے شائع کرنے پر کبھی اصرار نہیں کیا البتہ جواہر لال جی اور ان کے رفقا اسے شائع کرنے کے لئے بہت بے چین معلوم ہوتے تھے لیکن اس کی اشاعت جن حالات اور جس موقعہ پر ہوئی ہے اس کے لئے جواہر لال جی اور ان کے رفقا بھی راضی نہیں تھے پریس کے کسی ستم ظریف نمائندہ نے کسی طرح اس خط و کتابت کی نقل کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر سے اڑا لیا اور اخباروں کو اشاعت کے لئے دے دیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا ابو الکلام آزاد نے اس کی اشاعت کو روکنا بھی چاہا۔ لیکن پریس والے اس مزیدار خبر کو کیسے دبا کر رکھ سکتے تھے۔ بہر حال جن لوگوں کو اس کی اشاعت سے نئے انکشافات کی امید تھی انھیں یقیناً مایوسی ہوئی گی۔

جواہر لال جی اور مسٹر جناح کے نقطہ نگاہ میں جیسا جواہر لال جی کو خود اعتراف ہے بڑا فرق ہے۔ وہ مسائل پر بحث آزاد ہندوستان کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ برطانوی حکومت کی موجودہ ماتحتی کو وہ تسلیم نہیں کرتے اور کسی ایسے سمجھوتے کو جس کی بنیاد اس عارضی زمانہ کے حالات پر ہو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ دوسری بات جو ان کے دماغ پر اس وقت پوری طرح پر قبضہ کئے ہوئے ہے وہ موجودہ بین الاقوامی صورت حالات اور جنگ کا خطرہ ہے جن کا ان کے خیال میں ہندوستان اور اس کی

جنگ آزادی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اسے سب سے زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہیں اور باقی امور ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری بات عوام کے اقتصادی مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی غریبی اور بے کاری کا سوال۔ ان کا خیال ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ سوال سب سے زیادہ ضروری ہے جب تک اس کا حل دریافت نہیں کیا جائے گا ہماری جدوجہد فضول ہے۔

مسٹر جناح اس مکمل آزادی کو جس کا پنڈت جواہر لال خواب دیکھتے ہیں ایک ڈھونگ اور ڈھکوسلہ سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ جہاں تک لفظی جمع خرچ کا تعلق ہے انھوں نے بھی مسلم لیگ کا نصب العین مکمل آزادی قرار دیدیا ہے اور وہ کانگریس سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن موجودہ دستور کے صوبجاتی حصہ کو قبول کرکے اسے چلانا اور وفاق میں اگر چند ترمیمیں ہو جائیں تو اسے منظور کرنے کے لئے آمادگی کا اظہار کرنا ایسے طریقے نہیں ہیں جن سے مکمل آزادی کو حاصل کیا جاسکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کانگریسی سرمایہ دار مکمل آزادی چاہتے ہیں اور نہ مسلم لیگ کے رہنما اس کا حوصلہ کر سکتے ہیں۔ مکمل آزادی کا دعویٰ کرنے کے لئے کچھ اہلیت ہونی چاہیئے۔ اس دعویٰ کو منوانے کے لئے قوت چاہیئے۔ اور وہ اس کلجگ میں ہنسا (تشدد) کی ہی قوت ہو سکتی ہے اور اگر واقعی سرمایہ دار ہندو جو برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں پھلے پھولے اور پروان چڑھے ہیں مکمل آزادی کے لئے تیار ہیں تو مسلمان جنھوں نے اپنا سب کچھ برطانوی حکومت میں کھو دیا ہے اور اگر وہ سوچیں تو اپنی زنجیروں کے علاوہ اب کوئی اور دوسری چیز ان کے پاس کھونے کے لئے باقی نہیں رہی ہے تو انھیں مکمل آزادی میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔

یہی حال موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال اور جنگ کے خطرے کا ہے۔ جنگ سے وہ ڈرے جس کے پاس دولت ہو، عزت ہو، قیمتی جان ہو، یہاں تو صورت یہ ہے ؎

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

اس کی فکر بھی ہندو سیٹھوں کو ہی ہونا چاہیئے۔ ہمارا جنگ کیا بگاڑ سکتی ہے۔ لے دے کے ایک جان ہے سو وہ گھل گھل کر آہستہ آہستہ ختم نہ ہوئی یکبارگی ختم ہو گئی۔ پھر ہم اس جنگ کے خطرے

سے بچنے کے لئے یا اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز ہمارے پاس نہیں سائنس نے جو ہزاروں نت نئے آلات حرب بنائے ہیں ان سے ہم ناواقف، ہاں انگریزوں کے دشمنوں سے ساز باز کر کے انگریزوں کو اس ملک سے نکالنے کی تدبیر کی جا سکتی ہے۔ سو اگر یہ ارادہ ہے تو بہت خوب ہے چشم ما روشن دل ما شاد۔ اگر انگریزوں کے دشمن فتح کے بعد اپنے معاہدے پر قائم رہے تب تو اچھا ہی اچھا ہے ورنہ ایک کی غلامی نہ سہی دوسرے کی سہی۔

اب تیسری چیز رہ گئی غریبی اور بے کاری کا سوال۔ اس کا حل سوشلزم بتلایا جاتا ہے جواہر لال جی چاہے جتنی دھواں دھار تقریریں اس کی حمایت میں کرلیں لیکن کانگریس کی پوری مشینری پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ انگریزوں کو اس ہوّے سے ڈرانے کے لئے چاہے جتنا سوشلزم کو چمکاریں اور پیار کریں لیکن وہ جانتے ہیں کہ آستین کے اس سانپ کو کبھی زیادہ نہ اُبھرنے دینا چاہئے۔ جب یہ ذرا سرکشی کرے فوراً اس کا سر کچل دینا چاہیئے۔

اس لئے اگر جواہر لال جی کی خیال پرستیوں سے قطع نظر کر لی جائے اور بے بسی اور محکومی کی جو واقعی صورت حال ہے اس کو نظر کے سامنے رکھا جائے تو گفتگو کو دوسری سطح سے شروع کرنا پڑے گا مسٹر جناح نے ہمیشہ جواہر لال کو ایک خیال پرست سمجھ کر ان کو کسی معقول سمجھوتہ کی گفتگو کے لئے نا اہل سمجھا ہے۔ لیکن چونکہ وہ جواہر لال کے خلوص کے قائل ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہندوؤں میں واقعی ایسا ہے جس کا دل تعصب سے پاک ہے اور جس کا اثر بھی ملک کے نوجوانوں پر بہت زیادہ ہے اور جو اگر چاہے تو اپنے اثر سے ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے ایک مناسب فضا بھی پیدا کر سکتا ہے تو وہ جواہر لال اور صرف جواہر لال ہے۔ ایسا شخص اگر خط کتابت شروع کرنے کی خواہش کرے تو اس کی درخواست کو آسانی کے ساتھ ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس سے کسی اچھے نتیجہ کی توقع کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جواہر لال اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔ ان کی رواداری بے تعلقی کی رواداری ہے ؎

لاگ ہو تو ہم اسے سمجھیں لگاؤ

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکہ کھائیں کیا

ان کی اس بے لوثی اور بے تعصبی کو دیکھ کر تو بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

دراصل ان کا اس قدر "بے لاگ" ہونا خود ہمارے لئے ایک مصیبت بن گیا ہے۔ کیونکہ یہ بے چارے نام نہاد کمیونل سوال کو دوربین سے، ادھر سے ادھر سے الٹ کر پلٹ کر دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں کہیں کچھ نظر نہیں آتا اور عاجز آکر کہتے ہیں کہ جب کچھ ہو ہی نہیں تو کوئی کیا دیکھ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار جناح سے پوچھتے ہیں کہ مجھے بتائیے تو سہی امور متنازعہ کیا ہیں میں ابھی تک انھیں نہیں سمجھ سکا ہوں اور جب تک میرے سامنے مسئلہ صاف طور پر نہ رکھا جائے میرا دماغ مؤثر طریقہ پر کام نہیں کر سکتا۔

بلا شبہ کمیونل سوال نہرو جی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ ایسے باپ کی اولاد ہیں جنھوں نے مذہب کی پابندیوں کو خیرباد کر دیا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت خالص غیر مذہبی ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کو اپنے آبائی تمدن سے کوئی واسطہ نہیں رہا اس لئے وہ تمدنی اور مذہبی وابستگیوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کا بال بال اور رواں رواں مذہب اور اس کے مخصوص تمدن سے جکڑا ہوا ہے وہ کیسے اس طرح کی بیگانگی اپنے تمدنی ورثہ کے ساتھ جائز رکھ سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کو بھی مسلم تمدن سے وہ وابستگی نہیں ہے جو عام مسلمانوں کو ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک کامیاب وکیل ہیں اس لئے اپنے موکل کے مقدمہ کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں مسٹر جناح پکے قوم پرست ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مسلم مطالبات کا کوئی ایسا حل نکل سکے جس میں مسلمان ہندوستانی قومیت میں شریک ہونے کے بعد یہ محسوس نہ کریں کہ وہ محکوم یا زیر دست ہیں بلکہ خود مختار ہندوستانی قومیت کے ایک آزاد رکن کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکیں۔

اس تمہیدی بیان کے بعد اب آئیے دیکھیں کہ امور متنازعہ کیا ہیں۔ مسٹر جناح نے انھیں بیان نہیں کیا۔ مسٹر جناح انھیں بیان کر ہی نہیں سکتے تھے وہ بذات خود غالباً ان کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتے وہ تو وکیل ہیں۔ اور وکیل کا کام دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو اپنے موکل کا مقدمہ پیش کرنا اور دوسرے جج کو فیصلہ میں مدد دینا۔ وہ فریق مقدمہ خود نہیں ہوتا۔ بلکہ فریق مقدمہ کا معاملہ بہترین روشنی میں پیش کرتا ہے اور پھر جج کے ساتھ اشتراک عمل کر کے مقدمہ کے فیصلہ میں مدد دیتا ہے۔ یہی پوزیشن مسٹر جناح

کی بھی ہے۔ وہ اس مسئلہ میں فریق مقدمہ نہیں ہے اور جب جواہر لال انھیں فریق بنا کر ان سے ان کے مطالبات طلب کرتے ہیں۔ تو وہ اس پر بگڑتے اور ناراض ہوتے ہیں وہ ان سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سے کہہ سکیں کہ بھائی میں تو تم جیسا ہی ہوں البتہ میں نے اپنے موکل کا مقدمہ سمجھ لیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے۔ جب جواہر لال کسی طرح نہیں مانتے اور امور متنازعہ کے بیان کرنے پر برابر اصرار ہی کئے جاتے ہیں تو وہ انھیں چند حوالے دیتے ہیں جن سے مسلمانوں کا مطالبہ سمجھا جا سکتا ہے۔

بہر حال امور متنازعہ جو جناح نہرو خط کتابت سے لوگوں کے سامنے آئے ہیں اور جن کو جناح آخری یا قطعی نہیں سمجھتے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) چودہ نکات جو مسلم لیگ نے ۱۹۲۹ء میں مرتب کئے تھے۔

(۲) کانگریس کمیونل ایوارڈ کی مخالفت ترک کردے۔ اور اسے نیشلزم کے منافی قرار نہ دے۔

(۳) سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب آئینی طور پر معین کر دیا جائے۔

(۴) دستور اساسی میں مسلمانوں کے پرسنل لاء اور کلچر کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔

(۵) کانگریس شہید گنج کے مسئلہ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے اخلاقی اثر و رسوخ سے مسلمانوں کو شہید گنج واپس دلا دے۔

(۶) اذان اور دیگر مذہبی رسوم کے متعلق مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہو۔

(۷) مسلمانوں کو ذبح گاؤ کی کھلی اجازت ہے۔

(۸) ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ایسی علاقے بندیاں نہ کی جائیں جن سے اکثریت پر اثر پڑے۔

(۹) بندے ماترم ترک کر دیا جائے۔

(۱۰) اردو کو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کر لیا جائے اور اس امر کی گارنٹی دی جائے کہ اردو کے استعمال میں مزاحمت نہیں کی جائے گی۔

(۱۱) بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمانوں کو کمیونل ایوارڈ کے اصول پر نمائندگی دی جائے

یعنی جداگانہ انتخاب ہو اور آبادی کے لحاظ سے۔

(۱۲) کانگریس جھنڈا ترک کر دیا جائے یا مسلم لیگ کے جھنڈے کو وہی اہمیت دی جائے۔

(۱۳) مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا جائے۔

(۱۴) اتحادی وزارتیں قائم کی جائیں۔

ان مطالبات میں سے بہت سے مطالبے بادی النظر میں لغو اور مہمل نظر آتے ہیں اور جواہر لال جی اور ہندو پریس نے ان کو اسی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اور جناح نہرو خط کتابت کی اشاعت پر جو اس قدر اصرار تھا اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی۔ یہ مسلمانوں کی واقعی بدنصیبی ہے کہ ان کے پاس ایسے رہنما اور ایسا پریس نہیں ہے جو ان کے جائز مطالبات کو معقولیت کے ساتھ پیش کر سکیں وہ اپنا اچھا مقدمہ وکیلوں کے خراب ہونے کی وجہ سے ہار جاتے ہیں وہ ابھی تک اپنے ذہن کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ وہ حالت موجودہ سے غیر مطمئن ہیں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے نصب العین ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کے خلاف ہو رہا ہے۔ وہ اس سے مختلف قسم کی ایک چیز چاہتے ہیں اور ان کو پورا حق ہے کہ وہ اس چیز کو چاہیں اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ خود ان کے ذہن میں ان کا نصب العین، ان کی تمنا اور آرزو واضح طور پر موجود ہو اور دوسروں تک بھی وہ اپنے خیال کو منتقل کر سکیں تاکہ ان میں جو منصف مزاج اور ہمدرد لوگ ہیں وہ ان کے مطالبہ کی صحت کا فیصلہ اور ان کی حمایت کر سکیں۔ انھیں ہر قسم کے مہمل مطالبات کو جا اور بے جا پیش نہ کرنا چاہئیے۔ ان میں تناسب کا احساس ہونا چاہئیے اہم اور غیر اہم، اساسی اور غیر اساسی عارضی اور مستقل، ممکن اور ناممکن، ہندوؤں کے کرنے، خود اپنے کرنے، اور دوسرے لوگوں کے کرنے کے جو کام ہیں ان میں فرق کرنا چاہئیے خیالات میں یک رنگی اور منطقی استدلال ہونا چاہئیے۔ اپنے مطالبات کو چوں چوں کا مربہ بنا کر پیش کرنے سے دنیا کے لئے تمسخر اور استہزار کا سامان تو فراہم ہو جاتا ہے لیکن اپنا کوئی مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

ہمیں اس روشنی میں دیکھنا چاہئیے کہ مسلمانوں کی کیا شکایات ہیں۔ کیا بے چینیاں اور بے اطمینانیاں ہیں کیوں وہ ہندوستان کی عام قومی تحریک میں شریک نہیں ہوتے۔ کیوں وہ ملک کی سیاسی اور معاشری

تحریکوں میں حصہ لینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ آیا یہ ان کی کم ہمتی، بزدلی، خود غرضی ہے جو انھیں باز رکھتی ہے یا کوئی حقیقی مانع موجود ہے۔ کیا ان کے نصب العین مختلف ہیں۔ کیا ان کی تمناؤں کی تشکیل کانگریسی تنظیم میں نہیں ہوتی۔ اگر نہیں ہوتی تو کیوں نہیں ہوتی کانگریس سے ان کو کیا حقیقی شکایتیں ہیں اس سے کیوں وہ گریزاں دل برداشتہ یا متنفر ہیں۔ کیا شرائط ہیں جن کے ساتھ وہ کانگریس میں شریک ہونے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں یا سرے سے کانگریس میں شریک ہونا ہی نہیں چاہتے۔ اور کانگریس کے علاوہ کسی اور دوسری پارٹی کو با اقتدار دیکھنا چاہتے ہیں یا مسلمانوں کی حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ بہرحال ان باتوں کے بارے میں ذہن میں صفائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

پھر تعمیری پہلو کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے مثلاً اگر موجودہ چیزوں سے مطمئن نہیں ہیں تو کس قسم کی نئی تنظیم پیدا کرنا چاہتے ہیں یہ تنظیم محض ہوائی نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کا ربط و تعلق زمین سے زمین پر بسنے والے دوسرے گروہوں سے کام کے کرنے کے جو عام طریقے اور رواج ہیں ان سے ہونا چاہیئے۔

یہ بھی واضح طور پر بتا دینا چاہیئے کہ ہمارا نصب العین کس سے زیادہ قریب ہے ہم کس کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔ اور کس کے ساتھ غیر مصالحت پذیر مخالفت۔ مثلاً ملک کے مختلف اداروں مختلف طبقوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کس نوعیت کے ہوں گے اور ان کی طرف محض کوئی مبہم اشارہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ واضح تصریح ہونا چاہیئے مثلاً محض یہ کہ دنیا کے ہمارا معاشی اور معاشری نظام قرآن پر مبنی ہوگا کافی نہیں ہے۔ ہمیں اس کا ایک مکمل نقشہ موجودہ حالات کی روشنی میں بنا کر پیش کرنا چاہیئے تاکہ سب لوگ سمجھ سکیں کہ ہماری تمنا ہندوستان کو کیا بنانے کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ انگریزی پریس ہمارے ساتھ نہیں ہے اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہمارا مطالبہ نہایت واضح اور ابہام سے مبرا ہو۔

آیئے سب سے پہلے مسلمانوں کی بے چینیوں اور بے اطمینانیوں کا مطالعہ کریں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں مذہب کا بہت غلبہ ہے اور مذہبی رواداری نہ ہندوؤں میں موجود ہے نہ مسلمانوں میں۔ ہندوؤں کی غیر رواداری ان کے مذہب کا ایک جز بن گئی ہے چھوت چھات مسلمان

سے دور دور رہنا گائے کی قربانی کو مہا پاپ سمجھنا، کبھی ساتھ بیٹھ کر ایک دستر خوان پر کھانا نہ کھانا بات بات پر پوچھنا کہ آپ مسلمان تو نہیں ہیں اپنے بیوی بچوں کے سامنے مسلمان کو ایک ہوّا بنا کر پیش کرنا یہ چیزیں موجود ہیں اور ان کا اثر محض معاشرتی تعلقات تک محدود نہیں ہے بلکہ معاشی معاملات پر بھی پڑتا ہے۔ دفتروں میں تعصب سے کام لیا جاتا ہے اور ہر جگہ اپنے مذہب والے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پھر طریقہ عبادت تہوار و رسوم۔ طریقہ معاشرت، لباس، غذا، زبان، رسم خط تاریخ روایات، خیالات ان سب کا فرق، اختلاف کو اور بھی بڑھا دیتا ہے خصوصاً زبان اور رسم خط کا فرق جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے اعلیٰ خیالات سے واقف ہونے کا موقع ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چیز موجود ہے۔ اس میں کمی نہیں ہو رہی ہے بلکہ ترقی پر ہے فرقہ وارانہ رقابت بھی موجود ہے، مسلمان کی ترقی محض اس لئے ناگوار ہوتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اب تک اقتدار انگریزوں کا تھا دونوں فریق بن کر انھیں کے پاس داد اور فریاد کے لئے جاتے تھے۔ لیکن اب اگر ایک فریق برسر اقتدار آجائے تو ظاہر ہے دوسرا فریق اس پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتا اس کو ہزاروں قسم کے اندیشے ہوں گے۔ وہ اس کو اپنی شکست سمجھے گا۔ فریق مخالف چاہے جتنا بھی یقین دلائے فریق اول یہی چاہے گا کہ کسی طرح برابری کی پہلی سی صورت دوبارہ پیدا ہو جائے۔ اب برابری کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو ترقی کی رفتار کو روک کر پرانی حالت کو قائم رکھا جائے یا اگر ترقی کو پسند کیا جائے تو حقوق کی تقسیم نئی بنیاد پر کی جائے تاکہ محکومی کی مساوات حکمرانی کی مساوات میں تبدیل ہو سکے۔

اتفاق سے صورت حال یہ ہے کہ کانگریس کی مقامی شاخوں پر ہر جگہ پہلے سے ہندو قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کانگریس کی رکنیت پر بھی ہندوؤں کا غلبہ ہے اور کانگریس کے اعلیٰ کارکنوں میں بھی ہندو ہی ہندو نظر آتے ہیں اور یہ ہندو مذہب سے بے تعلق نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر پکے مذہبی ہیں۔ اور ہندو تمدن کے احیاء اور اقتدار کے خواہش مند ہیں۔ سنسکرت کے عالم ہیں اس لئے ان کی تحریر میں سنسکرت کے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ ان کے آداب و اطوار اور وضع قطع میں بھی ہندو تمدن نمایاں ہوتا ہے ان میں سے جو ترقی پسند اور سوشلسٹ بن گئے ہیں۔ وہ بھی کل تک ہندو تمدن کے احیاء اور ترقی کے حامی تھے اور آج بھی جس ماحول میں پیدا ہوئے ہیں اس کے اثرات سے مجبور اور بے بس ہیں اور چونکہ انھیں ہندوؤں میں کام کرنا ہے

اور ہندوؤں کی حمایت سے ہی ترقی کرنا ہے اس لئے وضع قطع زبان اور معاشرت میں کوئی ایسی تبدیلی کرنا نہیں چاہتے جس سے ان کے مخالفوں کو انھیں بدنام کرنے کا موقع ملے۔ پھر اس کے علاوہ جو لوگ زندگی میں واقعتہً انقلاب پیدا کرنے پر تلے ہوئے ہیں وہ سرے سے ہر پرانی چیز سے بیزار ہیں اور ان کے لئے مذہب اور تمدن سب لغو اور بے کار چیزیں ہیں۔ اور ان کی حمایت میں ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں ہیں اب اشتراک عمل کس سے کیا جائے ہندوؤں کے کسی فرقے اور طبقہ کو بھی ان چیزوں سے ہمدردی نہیں جن کو ہم جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہتے ہو تمھارا مطالبہ کیا ہے تم کیا چاہتے ہو۔ یہ تمدن وغیرہ کیا بلا ہے۔ پاجامہ ہے۔ لوٹا ہے گائے کے گوشت کا لوتھڑا ہے۔ شہید گنج کے کھنڈر کی اینٹیں ہیں۔ بندے ماترم کے گیت کی مخالفت ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ ان چیزوں کو سیاست سے کیا واسطہ ہے۔ اصل مسئلہ غربت اور بیکاری کو رفع کرنا ہے، برطانوی شہنشاہیت کو ختم کرنا ہے، جنگ جو ہونے والی ہے اس کے لئے اپنے کو تیار کرنا ہے۔ اور مکمل آزادی حاصل کرنا ہے۔ کانگریس کمیٹیوں کا سیاسی کام یہ ہے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے مطالبوں کو منواتی ہیں۔ انگریزی سرکار سے جنگ کرتی ہیں۔ ملک کی سیاسی تنظیم کرتی ہیں انھیں کسی کے تمدن سے کیا واسطہ وہ ہندو تمدن کے زندہ رکھنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتیں اور نہ وہ مسلم تمدن کے زندہ رکھنے کے لئے کوئی کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ ہندوؤں میں غیر سیاسی ادارے ہیں جو اس کام کو کر رہے ہیں مسلمان بھی اپنے غیر سیاسی ادارے ایسے ہی بنا سکتے ہیں۔ سیاست کو تمدن و مذہب سے واسطہ۔ تم گھر پر جا کر گائے کا گوشت کھاؤ۔ نماز پڑھو، مجھے اس سے واسطہ۔ میں تو سیاست کے مشترک کاموں میں تمھیں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ تم آزادی حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ تم غریبی اور بے روزگاری کو دور کرنا نہیں چاہتے؟ اگر چاہتے ہو تو آؤ میرے ساتھ کام کرو۔ تم اُردو بولو میں منع نہیں کرتا۔ نماز پڑھو میں منع نہیں کرتا ڈاڑھی رکھو پاجامہ پہنو، کباب کھاؤ میرے لئے یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ اگر صورت ایسی ہی سادہ ہوتی تو یقیناً کسی کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ لیکن معاملہ در اصل اتنا سہل نہیں ہے۔ کانگریس کی تحریک کے ساتھ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہندو تمدن کے احیار کی تحریک

بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ مہاتما گاندھی سیاسی رہنما بھی ہیں۔ اور مذہبی رہنما بھی۔ ان کی طرف سے جو کارکن دیہاتوں میں پہنچتے ہیں ان کے فرائض میں ہندی کی اشاعت بھی شامل ہوتی ہے۔ وہ بھجن گاتے ہیں اور ایک پوری مذہبی فضا اپنے گرد رکھتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ جب سے سات صوبوں میں کانگریس برسر اقتدار آئی ہے یہ بات اور بھی واضح ہوتی چلی جارہی ہے کہ کانگریسی حکومتوں کی پالیسی مذہبی اور تمدنی معاملات میں اپنے بنیادی حقوق اور دوسری اسی قسم کی قراردادوں کے باوجود غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ تعمیری کام کا آغاز تعلیم سے کرنا ضروری ہے۔ اور تعلیم کے مسئلہ میں پورا ہندو مسلم مسئلہ اپنی انتہائی شدت کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ ذریعۂ تعلیم کون سی زبان اور رسم خط کو بنایا جائے گا۔ یہ کہہ دینا کہ ہندوستانی زبان کو جو اُردو اور ناگری دونوں رسوم خط میں لکھی جائے گی اطمینان کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ "ہندوستانی" کیا چیز ہے۔ یہ کوئی زبان پچھلے زمانے میں رہ چکی ہے یا اس وقت موجود ہے یا آئندہ بننے والی ہے۔

اُردو ہندی کے ادب سے تو لوگ واقف ہیں لیکن ہندوستانی زبان کے ادب کا کہیں پتہ نہیں چلتا تو کیا اس کا نیا ادب تیار کرایا جائے گا اور وہی آئندہ مدرسوں میں پڑھایا جائے گا۔ لیکن اُردو میں اس وقت ادب کا جو ذخیرہ موجود ہے اور جسے ہم اپنے تمدّنی ورثہ کا ایک بیش بہا جزو سمجھتے ہیں اس کا کیا حشر ہوگا۔ سرسید آزاد۔ نذیر احمدؔ حالیؔ شبلیؔ غالبؔ اکبرؔ اقبالؔ اور ہمارے اور دوسرے ہزاروں شاعروں ادیبوں مصنفوں نے اُردو میں کتابیں لکھی ہیں ان کا کیا حشر ہوگا کیا انھیں کوڑے کی کھتی میں ڈال دیا جائے گا یا انھیں از سر نو ہندوستانی میں لکھایا جائے گا۔ یہ تو زبان کا مسئلہ ہوا اس کے بعد مضمون کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدرسوں کی درسی کتابوں میں کسی قسم کا مواد جمع کیا جائے گا۔ یو۔ پی۔ کے وزیر تعلیم سوامی سمپورنا نند جی نے ۱۴ اپریل ۳۸ء کو یو۔ پی۔ اسمبلی میں جو تقریر فرمائی ہے اور جو اخبار مدینہ مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور جس کا حوالہ مدیر ترجمان القرآن نے اپنی جلد ۱۲۔ عدد ۱ میں دیا ہے۔ اس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کو قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے ۔۔۔

ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کے لئے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنھوں نے اسے اپنا گھر بنا لیا ہے بالکل ایک ہے ....
اس لئے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اُمید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں اس بات پر زور نہ دیں گے۔"

یہاں بھی اُردو ہندی اور ہندوستانی کی طرح یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندو تہذیب، مسلم تہذیب تو جانی پہچانی چیز ہے لیکن یہ ہندوستانی تہذیب کیا ہے۔ مسلم تہذیب کی بنیاد تو مذہب اسلام ہے ہندوستانی تہذیب کی بنیاد کیا ہوگی۔ جواب دیا جا سکتا ہے "مشترکہ قومیت" لیکن مشترکہ قومیت کا مفہوم بذات خود تشریح کا محتاج ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ یہ ہم آہنگ ہیں یا متضاد اور متصادم کیا ہندوؤں کا چھوت چھات ماننے والا تمدن کسی غیر چیز کے ساتھ اشتراک کر سکتا ہے۔ کیا مسلمانوں کا کفر و اسلام میں واضح فرق کرنے والا تمدن شرک کو گوارا کر سکتا ہے۔ کیا قومیت کی طرف یہ رجحان لوگوں میں موجود ہے یا حکومت کی طرف سے ان پر عاید کیا جائے گا۔ اور اس کے لئے کلیت پسند ریاستوں کے تمام وسائل نشر و تبلیغ اختیار کئے جائیں گے اور مخالفوں کی قرار واقعی سرکوبی کی جائے گی یہ سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں۔ اب تک تو حکومت کی پالیسی دیسی تمدن کی طرف سے غفلت، لاپرواہی اور عدم مداخلت کی رہی تھی یا کبھی کبھی برائے نام کچھ امداد اور سرپرستی بھی کر دی جاتی تھی لیکن آزاد ہندوستان کی پالیسی کیا ہوگی۔ اگر اس کی پالیسی قومیت اور قوم پرستی کی، ہوگی اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ اس کا رویہ سخت گیری کا ہوگا تو یہ معاملہ یقیناً سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا ہے بندے ماترم کا گیت یا ترنگے جھنڈے کا معاملہ بے حقیقت چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان سے بنیادی مسائل متعلق ہیں مسلمان اپنا علیحدہ تمدنی وجود کسی شرط پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ ایک مقصد کے علمبردار ہیں۔ وہ ایک پیغام کے مبلغ ہیں وہ کائنات اور نظام اجتماعی کے بارے میں اپنا ایک جداگانہ تصور رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخی روایات ہیں۔ ان کی غیر ملکوں کے مسلمانوں سے تمدنی وابستگیاں ہیں۔ وہ ان چیزوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان کو قائم اور برقرار رکھنا چاہتے ہیں جب سوشلسٹ کہتے ہیں کہ دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن جب

مسلمان کہتے ہیں کہ کائنات اور جماعت انسان کی تنظیم کے بارے میں ایک خاص تصور رکھنے والے لوگو ایک ہو جاؤ تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ مسلمان اس چیز کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ارکان اسلام میں فریضہ حج بھی شامل ہے جو ہر سال مسلمانان عالم کے لئے ان کے باہمی اتحاد و یگانگت کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ مسلمانان ہند کی حالت اس وقت چاہے کتنی ہی خراب اور ابتر کیوں نہ ہو، لیکن جب کبھی ان میں بیداری اور زندگی پیدا ہوگی وہ اسلام کے مرکز پر ہی مجتمع ہوں گے اور ہندوستان اور دنیا کے دوسرے رہنے والوں کو بھی اس بے نظیر تعلیم میں شریک کرنے کا حوصلہ کریں گے۔

غرضکہ مسلمانوں کی یہ شکایتیں، اندیشے، حوصلے اور تمنائیں ہیں لیکن یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا اس کی نوعیت تخریبی زیادہ اور تعمیری کم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر مسلمان کانگریس سے غیر مطمئن ہیں جو جدید تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے متحدہ قومیت کے تصور سے بیزار ہیں تو وہ چاہتے کیا ہیں۔ ان کے پروگرام کا تعمیری اور اثباتی پہلو کیا ہے کس چیز سے وہ مطمئن ہو سکیں گے۔ اس ملک میں وہ رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہندو اور دوسرے غیر مذاہب والے جو ہندوستان میں آباد ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہوگی۔ اگر اس ملک میں رہنا چاہتے ہیں تو ان لوگوں سے معاملات اور تعلقات کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنا ہی ہوگی۔ جہاں ان کی تعداد بہت زیادہ کم ہے وہاں وہ کس طرح رہنا چاہیں گے جہاں ان کی تعداد برابر ہے وہاں وہ کس طرح رہیں گے جہاں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے وہاں ان کے تعلقات کا کیا اندازہ ہوگا۔ مجموعی طور پر ان کی پالیسی دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کیسی ہوگی۔ پھر ملک میں جو غیر مذہبی جماعتیں ہیں مثلاً سوشلسٹ پارٹی یا مزدوروں اور کسانوں کی انجمنیں یا اسی طرح کی اور انجمنیں جن کے مقاصد معاشی یا سیاسی ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہوں گے۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں میں جو اس وقت تصادم رونما ہے اور جو مذہبی بندشوں سے آزاد ہوتا جا رہا ہے اس کی طرف ان کا کیا رویہ ہوگا۔ یعنی جواہر لال جی نے جو بنیادی سوالات اُٹھائے تھے یعنی برطانوی شہنشاہیت سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور غریبی اور بے روزگاری کے مسئلہ کی طرف ان کا رویہ اس کو متعین کرنا ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے یہ مسائل روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں

اور بہت ممکن ہے کہ اگر ان بنیادی چیزوں پر دوسری سیاسی جماعتوں سے آپ کا اشتراک خیال ہو جائے تو وہ آپ کے تمدنی اور مذہبی مطالبات میں آپ کی پوری حمایت کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ انھیں آپ کا مذہب قبول کرنے اور آپ کے تمدن کو اپنا تمدن آپ کی زبان کو اپنی زبان بنانے میں کوئی تامل نہ ہو۔ آپ کی اقلیت اقلیت نہ رہے بلکہ اکثریت میں منتقل ہو جائے۔ آپ دوسروں سے تحفظات کا مطالبہ نہ کریں بلکہ دوسرے آپ سے تحفظات کے خواہش مند نظر آنے لگیں۔ آپ کے تمدن اور مذہب کا پیغام اگر دنیا کی موجودہ مشکلات کا حل ثابت ہو سکتا ہے تو آپ اسے کیوں اس شکل میں پیش نہیں کرتے جو وہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے اور ان کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر سکے۔ زندہ اور ترقی پسند قومیں اپنے ترکہ اور ورثہ کو بچانے کی فکر نہیں کرتیں بلکہ اس کو وسیع کرتی ہیں اور تمام دنیا کو تسخیر کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارا پہلا قدم تحفظات نہ ہونا چاہیئے۔ نہیں ہو اور ضرور ہو۔ لیکن اسی جگہ پر ہم کو ٹھہرنا نہیں چاہیئے۔ اپنی قوت کو ایک نئی ریاست قائم کر کے مستحکم بنانا چاہیئے۔ اور پھر ریاست کے وسائل اور قوتوں سے کام لے کر اپنے مشن کی تبلیغ کرنا چاہیئے۔ یہ نصب العین اگر ہمارے سامنے واضح شکل میں موجود ہو تو سب سے پہلے ہم اپنے لئے ایک ایسا پروگرام بنائیں گے جو دنیا کی موجودہ نسل کی مشکلات کا ایک معقول حل پیش کر سکے گا۔ پھر ہم اس نصب العین کے حصول کے لئے عملی کوشش شروع کریں گے۔ اور جب ہماری راہ میں دشواریاں اور دقتیں پیدا ہونگی تو ہم قانون سے آزادی عمل کے لئے تحفظات کا مطالبہ کریں گے۔ اگر یہ تحفظات مل گئے تو بہت خوب ورنہ ہم کو ہجرت کرنا ہوگی اپنی جداگانہ ریاست بنانا ہوگی اور اپنی تنظیم اور توسیع کی نئی راہیں اختیار کرنا ہوں گی۔ اسلام کی ابتدا اور توسیع اسی طرح ہوئی۔ ہر زندہ تحریک اسی طرح چلتی ہے اور اسلام کا احیاء اور از سر نو اقتدار اسی طرح پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے عمل ریاضت اور مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ خالی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔

اس لئے سب سے پہلا سوال پروگرام بنانے کا ہے جو دنیا کی موجودہ بین الاقوامی فضا اور

ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور معاشرتی زندگی میں کھپ سکے۔ مسلم لیگ کو چاہیئے کہ سب سے پہلے اس پروگرام کا تعین کرلے۔ اس پروگرام میں جاذبیت، قوت، اور زندگی ہونا چاہیئے اور اسے زمانے کے نئے حالات اور مطالبات کا ساتھ دینا چاہیئے۔ کیا مسلم لیگ اس کام کو کرے گی کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہاں کر سکتی ہے۔ وہ حرکت خیز اور ولولہ انگیز پروگرام جسے مسلم لیگ کو لے کر اُٹھنا چاہیئے وہ اسلام کا پیغام عمل اور درس حرّیت، اخوت اور مساوات ہے۔ لیکن چونکہ دنیا کے بدلے ہوئے حالات نئے ماحول اور اظہار خیال کے نئے طریقوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس لئے اگر اس پرانے پیغام کے لئے نئی اصطلاح استعمال کی جائے اور کہا جائے کہ مسلم لیگ کا پروگرام "مسلم سوشلزم" ہے تو میرے خیال میں ہم لوگوں کی توجہ کو زیادہ جذب کر سکیں گے اور اپنے مذہب کی تعلیمات کو ان کے لئے زیادہ قابل فہم بنا سکیں گے اسلام انقلابی مذہب ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسلام بین الاقوامی تحریک ہے یہ بھی مسلم ہے اسلام عدل، مساوات، اخوت اور آزادی کا حامی ہے اس پر بھی کسی کو اختلاف رائے نہیں ہے۔ قرون اولی کے مسلمانوں کی زندگی سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بیت المال کے اصول کے حامی اور مال غنیمت کی غیر مساوی تقسیم کو ناجائز خیال کرتے تھے۔ پھر زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے احکام، سود کی ممانعت ان تمام باتوں سے اشتراکی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام کی پوری تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ کے اجتماع اور روپیہ کے لین دین کے کام میں مسلمان ہمیشہ بہت پیچھے رہے ہیں۔ یہودیوں، عیسائیوں یا ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد حکومت میں ان کاموں کو جاری رکھا ہے لیکن مسلمان اس قسم کے کاموں سے علیحدہ رہے ہیں انفرادی سرمایہ داری جس پر موجودہ صنعتی نظام کی بنیاد قائم ہے۔ نفع طلبی کی ذہنیت اور اجتماع اصل کا جذبہ مسلمانوں میں ہمیشہ مفقود رہا ہے۔ ان کی ذہنیت یا تو جاگیردارانہ اور زمیندارانہ ہے یا پرولیتاری یعنی اجرت پر کام کرنے والی۔ آج بھی سرکاری ملازمت یا اسی قسم کی اور دوسری ملازمتوں کو مسلمان پسند کرتے ہیں ان میں انفرادی کام کی خواہش نہیں ہے بلکہ اجتماعی کاموں کو تقسیم عمل کی مشین کے ایک پرزہ کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو تمدن

کا علمبردار بنیوں کا طبقہ ہے روپیہ جمع کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ یہ یا تو بورژوا بن گیا ہے۔ یا
کولک کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پٹی بورژوا (ٹٹ پونجیوں) کی منزل سے گذر کر لونچی پتی لکھ پتی
اور کروڑ پتی بننے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ہندوؤں میں اور ذاتیں طبقے اور فرقے بھی ہیں لیکن آج کل ان
سب پر بنیوں کا تسلط ہے اور برسر اقتدار طبقہ بنیوں کا ہی ہے اور موجودہ ہندو تمدن پر سرمایہ دارانہ
رنگ بالکل چھا گیا ہے ہندوؤں کے وہ طبقے جو بنیوں کے پاؤں کے نیچے دبے ہوئے ہیں ان کو ابھرنے
کی یہی صورت ہے کہ ان کے روبرو اسلامی سوشلزم کا پیغام رکھا جائے اور انھیں اسلام کی عدل پرور
اور انصاف دوست تعلیمات سے واقف کیا جائے۔ کانگریس پر آج بنیوں کا اثر غالب ہے۔ سوشلزم
کی جو تحریک کانگریس کے لوگوں میں پھیلنا شروع ہوئی ہے اور جس کی وجہ سے کانگریس سوشلسٹ
پارٹی بنائی گئی ہے اس کا اور کانگریس کا ساتھ زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتا۔ اسے کانگریس سے قطع
تعلق کرنا ہوگا۔ بلکہ یہ لوگ فاشسٹ قوتوں کے زیر اثر کانگریس سے زبردستی نکالے جائیں گے۔
جب یہ لوگ کانگریس سے اس طرح نکالے جائیں اس وقت مسلم لیگ کی آغوش ان کا خیر مقدم کرنے
کے لئے کھلی ہوئی ہونا چاہیئے۔ فی الحال ناواقفیت کی بنا پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی اس اشتراک
مقاصد کا احساس نہیں کرتی جو مسلمانوں کے ساتھ اسے حاصل ہے ایم۔ این رائے اس کو سمجھتے ہیں اور
شاید جواہر لال بھی۔ لیکن جب مسلم لیگ کی طرف سے مسلم سوشلزم کے پروگرام کو صاف اور واضح شکل میں پیش
کیا جائے گا تو وہ سمجھیں گے کہ سوشلسٹ مسلمانوں سے کس قدر قریب ہیں اور پھر دونوں میں ایک نہایت
پائدار اتحاد قائم ہو سکے گا۔ مسلمانوں میں جو جاگیرداروں اور زمینداروں کا طبقہ ہے اس کی زندگی روز بروز
خطرہ میں پڑتی جا رہی ہے۔ ایک طرف بنئے ان کی جائدادوں کو قرض کے معاوضے میں قرق اور نیلام
کرانے کی فکر میں ہیں اور دوسری طرف سرکار کی طرف سے جو کسانوں کے لئے قوانین بنائے جا رہے
ہیں وہ ان کے تمام پرانے اقتدار اور منافع کو ختم کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی قسمت میں فنا ہونا
لکھا ہے اور مایوسی کی حالت میں انھیں مجبوراً سوشلزم کو ہی اپنا مسلک قرار دینا ہوگا۔ مسلمانوں میں جو بڑے
بڑے تاجر ہیں ان کی ذہنیت بھی صحیح معنی میں سرمایہ دارانہ نہیں ہے۔ مسلمان تاجروں کے یہاں جن

لوگوں کو دعوتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے یا جو تمیں وہ اپنی عورتوں کی پوشاکوں پہ صرف کرتے ہیں اور جس اللّے تللّے سے عام طور پر روپیہ خرچ کرتے ہیں ان کے دیکھنے سے بھی جاگیر دارانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور صحیح سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مقابلہ میں اس ذہنیت کو شکست اٹھانا پڑے گی اور آخر میں ناکام اور مایوس ہو کر ان لوگوں کو بھی سوشلزم ہی میں پناہ لینا ہوگی۔ یہی حال ہمارے ادیبوں، مولویوں اور عالموں کا ہے یہ ابھی تک جاگیرداروں کے دامن دولت سے وابستہ رہ کر اوران سے چندے اور نذرانے لے کر زندگی گذارتے رہے ہیں۔ لیکن جب ہندو سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ان کے وظائف اور تنخواہیں اور انعامات بند ہوں گے تو انھیں بھی مجبوراً پرولتاری طبقہ سے اپنی قسمت کو وابستہ کرنا ہوگا۔ اور اسی طبقہ کی امداد و اعانت پہ ان کا نان نفقہ چل سکے گا۔ لہذا ایک طرف تو حالات کا تقاضا اور دوسری طرف خود اسلامی تعلیمات اور روایات اس بات کے لئے مجبور کرتی ہیں کہ مسلم لیگ مسلم سوشلزم کو اپنے پروگرام میں داخل کرے اور اگر اس کی وجہ سے عارضی طور پر کچھ خود غرض اور نا عاقبت اندیش لوگ اس سے کنارہ کشی کریں تو اس کی بالکل پروا نہ کرے بلکہ عوام سے اپنے رابطہ کو روز بہ روز بڑھاتی جائے اور اپنی تبلیغ و اشاعت کا پروگرام ایسا بنائے جو غیر مذہب والوں کو بھی اپنی طرف مائل کر سکے۔ خصوصاً اچھوت اور دوسرے مظلوم طبقے خاص طور پر اس کی اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ قرون اولیٰ کے اسلام کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ اس کی اپیل دنیا کے مصیبت زدہ اور مظلوم طبقوں سے تھی۔ وہ ان کے لئے اُمید اور روشنی کا پیغام بن کر نازل ہوا تھا اور ان ہی کی امداد و اعانت سے اس کو وسعت اور سرفرازی نصیب ہوئی تھی۔ وَمَا عَلَینا اِلّا البلاغ۔

ہندوستان کی تجارت خارجہ

ہندوستان کی قدیم اور موجودہ تجارت خارجہ پر اگر روشنی ڈالی جائے اور واقعات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو اغلب یہ ہے کہ تجارت خارجہ کی سرگزشت ایک طویل داستان کی صورت اختیار کریگی۔ مگر اس وقت نہ تو اس کا موقع ہے اور نہ ضرورت، یہاں اس بیان کے چند اہم پہلو نمایاں کر دینے کافی ہونگے۔

جس طرح ہندوستان کی سیاسی تاریخ ہندو مسلم اور انگریزی تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے اسی طرح ہم ہندوستان کی تجارت خارجہ کو بھی تاریخی لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور قدیم عہد یا ہندوؤں کا زمانہ جو تقریباً دو ہزار قبل مسیح سے شروع ہو کر دسویں صدی عیسوی یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس عہد کے حالات ہمیں کسی باقاعدہ تاریخ سے نہیں ملتے تاہم ہندوؤں کی مذہبی کتابوں، سیاحوں کے سفرناموں اور آثار قدیمہ کے کتبوں سے اس زمانہ کے کچھ نہ کچھ حالات ضرور معلوم ہو جاتے ہیں جن سے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں بھی ہندوستان کی تجارت دور دراز ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی مغرب میں فارس، عراق عرب، مصر، شام، روم اور یونان تک، اور مشرق میں چین و جاپان تک ہندوستان کا تجارتی سامان جاتا تھا۔ یہ تجارت عرصہ تک فنیشین قوم کے ہاتھ میں رہی۔ یہ لوگ قدیم زمانہ میں ہندوستان کے ساحلوں پر آتے تھے اور یہاں کی مصنوعات اور پیداوار لے کر بحری راستے سے یمن پہنچتے تھے اور وہاں سے یہ سامان اونٹوں پر لد کر مصر و شام ہوتا ہوا بحر روم سے یورپ تک چلا جاتا تھا۔ اسی طرح وہاں کا تجارتی سامان یہ لوگ ادھر ہندوستان، جزائر ہند، چین اور جاپان لے جاتے تھے۔

جب یونانیوں نے مصر پر قبضہ کر لیا تو تجارت بھی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ انہوں نے اسکندریہ سے ہندوستان تک براہِ راست نیا بری راستہ بنالیا اور ہندوستان کا تجارتی سامان اونٹوں اور

خچروں پر لاد کر افغانستان، فارس اور ایشیائے کوچک کے راستے سے یورپ لیجانے لگے چھٹی صدی عیسوی تک یہ لوگ ہندوستان کی تجارت میں عربوں کے حریف بنے رہے لیکن ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا عروج ہوا۔ اور مسلمانوں نے مصر، شام اور بحر روم پر قبضہ کر لیا تو یہ تجارت ساری کی ساری پھر عربوں کے قبضہ میں آگئی۔ اور صدیوں تک یہ لوگ ہندوستان کی تجارت کے مالک بنے رہے، ہندوستان کے متعلق عرب ایک خاص عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ سے ایک عرب سیاح نے اس طرح بیان کیا کہ "ہندوستان کے دریا موتی، پہاڑ یاقوت اور درخت عطر ہیں" اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں یہ لوگ ہندوستان سے موتی جواہرات اور خوشبو کی چیزوں کی تجارت کرتے تھے اس کے علاوہ یہاں سے ریشمی اور سوتی کپڑا، ریشمی تاگا، مختلف قسم کی چھینٹ، رنگ اور مسالے (لونگ، الائچی، سیاہ مرچ، دارچینی وغیرہ) بھی باہر بھیجے جاتے تھے۔ ان چیزوں کے عوض میں اونی کپڑا، تانبا، سیسا، ٹین، شیشے اور آئینے مختلف قسم کے عطر، شراب اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی برآمد ہوتی تھی اور باقی قیمت سونے اور چاندی کے سکوں میں نقد ادا کی جاتی تھی۔

گیارھویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں مسلمانوں کا دور شروع ہوتا ہے اور تقریباً اٹھارھویں صدی عیسوی کے شروع تک قائم رہتا ہے۔ اس دور میں صنعت اور تجارت کی بڑی ترقی ہوئی۔ جس طرح آج ہندوستان کی آبادی کا عام پیشہ زراعت ہے اُس زمانہ میں تجارت کی گرم بازاری کی وجہ سے لوگوں کا عام پیشہ صنعت وحرفت تھا، خاص کر پارچہ بافی کی صنعت کا بہت رواج تھا۔ اور اس فن میں لوگوں کو اس قدر کمال حاصل تھا کہ اُس زمانے کے سوتی اونی، ریشمی اور زربفت کے کپڑے اور قالین آج تک لوگوں سے خراج عقیدت وصول کرتے ہیں۔ ملک میں چاروں طرف خوش حالی نظر آتی تھی، بحری تجارت کے ساتھ ساتھ بری تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ چودھویں صدی عیسوی تک توبرابر ہندوستان کا تجارتی مال بحری اور بری دونوں راستوں سے یورپ جاتا رہا۔ مگر جب اہل یورپ اور مسلمانوں میں جنگ چھڑی اور یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا تو مسلمانوں نے یہ راستے

اُن کے لیے بند کر دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں ہندوستان کے مال کی درآمد بند ہو گئی اور تمام تجارت کا رُخ اسلامی ممالک کی طرف پھر گیا۔ اب یورپین تاجر بہت پریشان ہوئے اُنھوں نے سوچا کہ ہندوستان پہنچنے کا کوئی دوسرا بحری راستہ معلوم کرنا چاہیے۔ اس زمانہ میں پرتگیز جہازرانی میں بڑے ماہر مانے جاتے تھے، چنانچہ اُنھوں نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور ہندوستان آنے کا ایک نیا بحری راستہ ڈھونڈھ نکالا۔ "واسکوڈا گاما" نامی مشہور پرتگیز کپتان ۱۴۹۸ء میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ افریقہ کے ساحل کے کنارے کنارے جنوب میں راس اُمید کا چکر لگاتا ہوا ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ کے بندرگاہ پر آ پہنچا۔ واسکوڈا گاما یہاں کے راجہ سے ملا اور پرتگال اور ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات قائم کرنے کی گفتگو کی۔ اُس وقت سے سو سال یعنی ۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک ہندوستان کی بحری تجارت زیادہ تر پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی۔ اُنھوں نے اپنی حفاظت کے لیے شہر گوا میں ایک قلعہ تعمیر کرایا جو آج بھی پرتگیزوں کے قبضے میں ہے۔

جب دوسری یورپین اقوام نے پرتگیزوں کو ہندوستان کی تجارت سے مالامال ہوتے دیکھا تو اُن کے مُنہ میں بھی پانی بھر آیا اور شوق ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیے، چنانچہ ہالینڈ انگلستان، فرانس، ڈنمارک جرمنی اور سویڈن کے تاجروں نے بھی اپنے اپنے جہاز ہندوستان کی طرف روانہ کیے، مگر کامیابی صرف ہالینڈ، انگلستان اور فرانس والوں کو نصیب ہوئی۔

پرتگیزوں کے بعد ہندوستان میں ڈچ قوم یعنی ہالینڈ والوں نے اپنے قدم جمانے شروع کیے اگرچہ ہالینڈ چھوٹا سا ملک تھا مگر اُس کی بحری طاقت دوسری قوموں کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے پرتگیزوں کو زیر کر لیا اور گوا کے سوا تمام دوسری بندرگاہوں پر قابض ہو گئے ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک ہندوستان کی تجارت خارجہ انھی کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ سیلون، جاوا، سماٹرا میں بھی مرکز قائم کیے۔

ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے یورپین اقوام میں برابر جنگ جاری تھی، تاجروں کے چھوٹے چھوٹے بیڑوں میں بھی بحری جنگ ہوتی تھی اور ایک دوسرے کے جہاز لوٹ لیتے تھے۔ اکثر ہندوستان کے ساحل پر بھی کشت و خون کی نوبت آ جاتی تھی۔ اس وجہ سے ان لوگوں نے اپنی حفاظت کے لیے قلعے تعمیر

کروائے۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں تقریباً سو انگریزی تاجروں کی ایک جماعت جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا، ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئی۔ کمپنی نے سورت میں جو اُس زمانہ میں مغلیہ سلطنت کا سب سے بڑا بندرگاہ تھا اپنی کوٹھی تعمیر کروائی۔ یہ لوگ ہندوستان سے سیاہ مرچ، لونگ، الائچی، نیل، چاول، ناریل، پوست اور شکر وغیرہ کے علاوہ سوت اور ریشم کا کپڑا کثرت سے انگلستان اور دوسرے ملکوں میں لیجاتے تھے، اور وہاں سے تانبے، پارے، لوہے اور فولاد کا سامان لاتے تھے اور باقی رقم سونے اور چاندی کی شکل میں ادا کیا کرتے تھے

اس تجارت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قدر منافع حاصل ہوا کہ انگریزی تاجروں نے کئی اور کمپنیاں قائم کرکے ہندوستان کے ساتھ کاروبار شروع کردیا۔ سنہ ۱۷۰۸ء میں ان سب کمپنیوں نے متحد ہوکر ایک بڑی کمپنی کی بنیاد رکھی اور اُس کا نام متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی قرار پایا۔ سترہویں صدی کے آخر تک انگریزوں نے چندر گیری، بمبئی، کلکتہ وغیرہ مقامات پر قبضہ کرلیا اور وہاں اپنی کوٹھیاں اور قلعے بنا ڈالے، ان مقامات کے علاوہ اور جگہوں پر بھی ان کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔

انگریزوں کے بعد فرانسیسی تاجر ہندوستان میں آئے اور اُنھوں نے بھی اپنے تجارتی مرکز قائم کیے۔ ابتدا میں تو اُن کو خاصی کامیابی ہوئی مگر بعد میں انگریزوں نے اُن کو تجارتی اور ملکی معاملات میں زک دی اور ہندوستان سے ان کا تعلق ختم کردیا۔ اسی طرح دوسری کمپنیوں کے مقابلہ میں بھی انگریزی کمپنی کامیاب رہی۔ اور اُس نے ہندوستانی تجارت خارجہ پر پوری طرح اپنا تسلط جمالیا۔

سترہویں صدی کے آخر تک ہندوستان سے جو چیزیں خاص طور پر باہر بھیجی جاتی تھیں ان میں سوتی کپڑا، ریشم اور ریشمی کپڑا، اُون، قالین، موتی، جواہرات، زیورات، لوہے کی مصنوعات شورہ اور نیل وغیرہ شامل تھے جس طرح آج غریب سے غریب ہندوستانی کے جسم پر مانچسٹر اور لنکا شائر کا کپڑا نظر آتا ہے اسی طرح کسی زمانہ میں انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کا گھر گھر رواج تھا۔ امیر سے غریب تک سب لوگ یہی کپڑا پہنتے تھے، اس کے علاوہ زیب و زینت اور اعلیٰ فیشن کی ضرورت بھی ہندوستانی

کپڑے سے پوری کی جاتی تھی، ہندوستانی کپڑا خوش وضع، خوش رنگ اور مضبوط ہونے کے علاوہ بہت سستا ہوتا تھا جس کی وجہ سے یورپ کے پارچہ باف اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ چنانچہ اس سے تمام یوروپین ممالک کی خصوصاً انگلستان کی صنعت پارچہ بانی کو سخت نقصان پہنچا اور لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی حتیٰ کہ انگلستان کے جلاہوں نے ہندوستانی کپڑے کی مخالفت شروع کردی۔

ہندوستانی مصنوعات کے معاوضہ میں کمپنی انگلستان سے جن چیزوں کی درآمد کرتی تھی اُس میں سونے اور چاندی کی مقدار زیادہ ہوتی تھی اور روز بروز اُس کی درآمد بڑھتی جارہی تھی، کیونکہ سونے اور چاندی پر ہی ہر ملک کی دولت کا انحصار ہوتا ہے اس لیے انگلستان والوں کو کمپنی سے سخت شکایت تھی کہ وہ ملک کی ساری دولت ہندوستان منتقل کررہی ہے، جس کی وجہ سے ملک میں مفلسی اور بے روزگاری کا اضافہ ہو رہا ہے مگر کمپنی کے لیے بھی اس کے سوا چارا ہی کیا تھا کیونکہ انگلستان کی مصنوعات تو اس قابل نہ تھیں کہ وہ ہندوستان میں رواج پاتیں اور نہ کوئی پیداوار تھی جس کو ہندوستانی معاوضہ میں قبول کرتے، مجبوراً کمپنی کو سونے اور چاندی کی شکل میں قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔

اِدھر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالت ابتر ہوگئی، چاروں طرف طوائف الملوکی پھیل گئی اور آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے صناعوں اور دستکاروں کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ اُدھر کمپنی نے اپنی حفاظت کی غرض سے ملک کی سیاست میں دخل دینا شروع کردیا۔ فرانسیسی جو بہت دنوں سے ہندوستان میں اپنی سلطنت کے منصوبے گانٹھ رہے تھے انگریزی کمپنی کے سخت دشمن ہوگئے، دونوں فریقوں میں لڑائی ہوئی اور آخر کار فرانسیسوں کے قدم اُکھڑ گئے۔ اس کامیابی سے انگریزی کمپنی کے حوصلے اور بڑھے اور اُس نے چند مقامات پر قبضہ کرکے اچھی خاصی حکومت قائم کرلی اور آہستہ آہستہ ملک کے ایک بڑے حصے میں اپنا اقتدار بڑھانے کی فکر کرنے لگی اس زمانہ میں انگلستان میں ہندوستانی مصنوعات کے خلاف سخت احتجاج شروع ہوگیا اور لوگ اُس کی روک تھام کی تدبیریں کرنے لگے۔ ملک میں سودیشی کی تحریک شروع ہوئی اور لوگ پورے انہماک کے

ساتھ اپنی صنعتوں کو فروغ دینے میں مشغول ہو گئے۔ مجلس تجارت اور نوآبادیات کے کمشنروں نے بھی پارلیمنٹ سے یہی سفارش کی کہ ہندوستانی مصنوعات اور پارچہ جات کی درآمد اور اُن کا استعمال اپنی سلطنت اور نوآبادیات میں ممنوع قرار دے دیا جائے۔ غرضکہ اٹھارہویں صدی سے ہندوستانی تجارت خارجہ نے پلٹا کھایا، اور یہی زمانہ ہے جس میں اُس کے جدید یا موجودہ دور کا آغاز ہوا۔

سترہویں صدی تک تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مسلک یہی رہا کہ جہاں تک ہو سکے ہندوستانی مصنوعات کو ترقی دی جائے اور اُس کی تجارت کو بڑھایا جائے۔ اس غرض کے لئے اس نے انگلستان سے کاریگر بُلا کر اُن سے ہندوستان میں کام لیا کیونکہ وہ ابھی تک اپنے منافع کے پھیر میں رہتی تھی لیکن جب ہموطنوں کی مخالفت بڑھتی گئی تو اس کو مجبوراً اپنا رویہ بدلنا پڑا اور اٹھارہویں صدی سے اُس نے باقاعدہ کوشش شروع کر دی کہ ہندوستانی مصنوعات کو تباہ کر کے انگلستان کی بنی ہوئی چیزوں کو رواج دیا جائے اور اس کے بدلے میں ہندوستان سے خام پیداوار کی برآمد کی جائے۔ انگلستان سے جو خطوط کمپنی کے ڈائرکٹروں کے نام آتے تھے اُن میں عام طور سے یہی ہدایت ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے خام اشیاء کی پیداوار بڑھائی جائے اور مصنوعات روکی جائیں اور اس کام میں قانون سے مدد لینے میں کوئی دریغ نہ کیا جائے چنانچہ بنگال میں ریشم بننے والوں کو کمپنی کے سوا اور کہیں کام کرنے کی قانوناً ممانعت کر دی گئی اور اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرتے تو ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ نوجوانوں کے انگوٹھے تک کٹوائے گئے جو ریشم بنانے کے لیے مخصوص تھے۔ ادھر تو یہ سختیاں کی گئیں، اُدھر انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد پر بڑے بڑے محصول لگا دیے گئے اور ہندوستانی ریشمی کپڑا پہننا جرم قرار دے دیا گیا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں جو مال انگلستان سے آتا تھا اُس پر کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ ہندوستانی صنعت کو ختم کرنے کے لیے کمپنی اور حکومت برطانیہ نے جو رویہ رکھا اور ہندوستانی صناعوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ انہی کی زبان سے سُنیئے۔ مشہور مؤرخ مسٹر ڈسن لکھتے ہیں:۔

"۱۸۱۳ء میں جو شہادت پیش ہوئی اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اُس زمانہ تک ہندوستان کا سوتی اور ریشمی کپڑا اس قدر ارزاں تھا کہ برطانیہ کے بازاروں میں برطانوی کپڑے

کے مقابلے میں ۵۰ اور ۶۰ فیصدی کم قیمت پر بھی کافی منافع سے فروخت ہوتا تھا۔ اِس لیے کہ برطانیہ نے اپنی صنعت پارچہ بافی کی حفاظت کی خاطر ہندوستانی کپڑے کی درآمد پر ۷۰ اور ۸۰ فیصدی محصول لگائے۔ اگر یہ تدبیر نہ کی جاتی تو لنکا شائر اور مانچسٹر کے کارخانے شروع سے ہی بیکار پڑے رہتے، کسی طرح نہ چل سکتے، خواہ دُخانی انجن کتنا ہی زور لگاتے لیکن ہندوستانی صنعت کو تباہ کر کے یہ کارخانے چلائے گئے۔ اگر ہندوستان بھی آزاد اور خود مختار ہوتا تو اس کا بدلہ لیتا، اور وہ بھی برطانوی مصنوعات کی درآمد پر اپنے ہاں محصول لگاتا اس طرح اپنی صنعت کو کبھی تباہ و برباد نہ ہونے دیتا، لیکن اس میں اپنی حفاظت اور مدافعت کی طاقت ہی کہاں تھی وہ تو نو وارد اور اجنبی حکومت کے ہاتھوں میں بندھا ہوا تھا اور اُس کے رحم و کرم کا محتاج تھا۔ برطانوی مصنوعات اس کے سر زبردستی تھوپی گئیں، جن پر کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ اس طرح برطانوی صناعوں نے جو برابری کے ساتھ ہندوستانی صناعوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے سیاسی ناانصافی کے زور سے مقابلہ روک کر اپنا کام بنا لیا۔"

مسٹر ولسن کا یہ بیان سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی اور برطانوی تجارت کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔

کمپنی کو ہندوستان میں بلا شرکت غیرے ابھی تک جو اجارہ حاصل تھا اس کے خلاف اُنیسویں صدی کے شروع میں انگلستان کے تاجروں نے احتجاج شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کمپنی ہندوستان میں معاشی تحقیقات کی غرض سے بھیجی گئی اور ۱۸۱۳ء میں کمپنی کا اجارہ ختم کر دیا گیا اور انگریزی تاجروں کو ہندوستان میں اپنے طور سے تجارت کرنے کی عام اجازت دیدی گئی۔ اپنی رپورٹ میں کمپنی نے جس چیز پر زیادہ زور دیا تھا وہ یہ تھی کہ ہندوستانی مصنوعات کو ختم کر کے انگریزی مصنوعات کو کس طرح رواج دیا جائے، انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کے کیا کیا موقعے حاصل ہیں۔ نیز رپورٹ سے یہ بھی

پتہ چلتا ہے کہ کمپنی نے صنعتوں کو تباہ کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی تھیں وہ کس قدر کارگر ثابت ہوئیں۔

اس زمانے میں کلکتہ کی بندرگاہ پر جو ریشمی مصنوعات درآمد ہوتی تھیں اُن پر صرف ۲½ فیصدی محصول لیا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں لندن میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

ہندوستانی مصنوعات	محصول فیصدی		
	سنہ ۱۸۱۲ء	سنہ ۱۸۲۴ء	سنہ ۱۸۳۲ء
ریشمی کپڑا	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲۰ فیصدی
زربفت	"	۳۰ فیصدی	۳۰ فیصدی
شال	۷۰ فیصدی	۶۷½ فیصدی	۳۰ فیصدی
چھینٹ	۷۱⅔ فیصدی	۶۷½ فیصدی	۱۰ فیصدی
قالین	۶۸⅓ فیصدی	۵۰ فیصدی	۲۰ فیصدی
بانات کا آرائشی سامان	۷۰ فیصدی	۵۰ فیصدی	۳۰ فیصدی
سوتی کپڑا	۶۷½ فیصدی	۵۰ فیصدی	۲۰ فیصدی

ریشم کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی، سنہ ۱۸۱۲ء میں اس کی درآمد پر ۳۰ فیصدی محصول وصول کیا جاتا تھا، سنہ ۱۸۲۴ء میں تین روپیے فی پاؤنڈ سنہ ۱۸۳۲ء میں صرف ایک آنہ فی پاؤنڈ رہ گیا۔

انگلستان کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی ہندوستانی کپڑے کا رواج بہت تھا، اُنھوں نے بھی اپنی صنعت کو ترقی دینے کی خاطر ہندوستانی مصنوعات پر بڑے بڑے تامینی محصول عائد کرکے اس کی درآمد روک دی۔ مختلف ملکوں میں ہندوستانی کپڑے کی درآمد میں جو کمی ہوئی وہ ذیل کے اعداد سے واضح ہوجائیگی۔

انگلستان سنہ ۱۸۰۳ء میں ۱۴۸۱۷ گانٹھ کپڑا ،

انگلستان	سنہ ۱۸۲۹ء	میں	۴۲۳ گانٹھ کپڑا
امریکہ	سنہ ۱۸۰۱ء	میں	۱۳۶۳۳ 〃 〃
	سنہ ۱۸۲۹ء	میں	۲۵۸ 〃 〃
ڈنمارک	سنہ ۱۸۰۰ء	میں	۱۴۵۷ 〃 〃
	سنہ ۱۸۲۰ء	میں	۱۵۰ 〃 〃
پرتگال	سنہ ۱۷۹۹ء	میں	۹۱۱۴ 〃 〃
	سنہ ۱۸۲۵ء	میں	۱۰۰۰ 〃 〃
عرب و روس	سنہ ۱۸۱۰ء	میں	۶۰۰۰ 〃 〃
	سنہ ۱۸۲۵	میں	۱۰۰۰ 〃 〃

غرضکہ ہر ملک نے اپنی اپنی تجارت کو فروغ دینے کی خاطر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزوں کو اپنے ملک میں آنے سے روک دیا، سنہ ۱۸۱۳ء میں تین کروڑ روپے کا کپڑا ہندوستان سے لندن گیا اور سنہ ۱۸۳۰ء میں اُلٹا تین کروڑ روپیہ کا ولایتی کپڑا ہندوستان پہنچا۔ سنہ ۱۸۲۴ء میں انگلستان سے کل کپڑا آٹھ لاکھ اٹھارہ ہزار گز آیا لیکن سنہ ۱۸۳۵ء میں اس کی مقدار بڑھ کر پانچ کروڑ، پچھتر لاکھ گز ہوگئی۔ اس طرح اور مصنوعات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ دوسرے خود مختار ممالک کے ساتھ بھی ہندوستان کو ایسا ہی سابقہ پڑا اور کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی سوئی اور تاگے کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہوگئے۔

جوں جوں کمپنی کے مقبوضات بڑھتے گئے اس کی توجہ ملکی انتظامات کی طرف رہنے لگی چنانچہ سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک کمپنی بحیثیت حکمراں کے ہندوستان میں رہی اور انگلستان کے عام تاجر ہندوستان سے کاروبار کرنے لگے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کمپنی حکومت سے دست بردار ہوگئی اور تاج برطانیہ نے سلطنت ہند کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ اور اس کے معاوضہ میں کمپنی کا جو روپیہ ہندوستان میں صرف ہوا تھا وہ قرض لے کر ادا کر دیا اور یہ قرض ہندوستان کے نام لکھ دیا گیا، جس کا سود اب تک ہندوستانی محاصل سے ادا کیا جاتا ہے، تاریخ عالم میں ایسی خرید و فروخت کی یہ پہلی اور آخری مثال کر-

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک یعنی جنگِ عظیم سے پہلے ہندوستان کی درآمد و برآمد پر وقتاً فوقتاً جو محاصل عائد کیے گئے اور اُن میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُس کی مختصر کیفیت سُنیے :-

۱۸۵۸ء میں برطانوی مصنوعات کی درآمد پر پانچ فیصدی اور دیگر ممالک کی مصنوعات پر دس فیصدی محصول مقرر کیا گیا، اس طرح ولایتی سوت پر ۵ - فیصدی اور سوتی کپڑے پر ۱۰ فیصدی محصول لیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں برطانوی اور غیر برطانوی مصنوعات کی تفریق اُٹھا دی گئی اور اب تعیشات پر ۲۰ فیصدی اور باقی سامان پر ۱۰ فیصدی محصول درآمد لیا جانے لگا۔ تاکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں جو خرچ کا بار پڑا تھا وہ پورا کیا جائے۔ ۱۸۶۰ء میں بلا کسی تفریق کے سُود اور کپڑے پر ۱۰ فیصدی کی بجائے ۳½ اور ۵ فیصدی محصول مقرر ہوا۔ تاکہ ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا برطانوی کپڑے کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۸۶۵ء عام محصول کی شرح ۱۰ - فیصدی سے گھٹ کر ۵ فیصدی رہ گئی، لیکن روئی کی مصنوعات پر محصول حسب سابق قائم رہا۔

۱۸۷۲ء میں بمبئی میں پارچہ بافی کے چار پانچ کارخانے کھُل چکے تھے، اور ہندوستان میں سوتی کپڑا تیار ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر مانچسٹر اور لنکا شائر کے کارخانے دار گھبرائے۔ اُس وقت ولایتی کپڑے کی درآمد پر برائے نام محصول لیا جاتا تھا اُس کے خلاف شور مچایا اور ۱۸۷۷ء میں پارلیمنٹ سے حکومتِ ہند کے نام یہ حکم جاری کردیا کہ ہندوستان میں ولایتی کپڑوں پر جو محصول لیا جاتا ہے وہ ایک طرح سے ہندوستانی کپڑوں کو تامین دیتا ہے اور یہ آزاد تجارت کے اصول کے خلاف ہے، اس لیے جہاں تک ہوسکے ولایتی کپڑے کی درآمد پر محصول ختم کردیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۷۸ء میں ولایتی کپڑے پر سرے سے محصول اُڑا دیا گیا۔ ان آزاد تجارت کے حامیوں کی عقل نہ معلوم اُس وقت کہاں ماری گئی تھی جب کہ ہندوستانی مصنوعات پر تامینی محصول لگا کر اُن کو تباہ کیا گیا۔ لیکن اس پر بھی ان آزاد تجارت کے حامیوں کی تشفی نہ ہوئی اور وہ برابر دوسری اشیا، کی درآمد پر بھی محصول ختم کردینے کا مطالبہ کرتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۲ء میں تمام ولایتی اشیا، کا محصول معاف ہوگیا۔ صرف شراب اور نمک پر تھوڑا سا محصول قائم رہا۔

۱۸۹۲ء میں روپے کی شرح مبادلہ بہت بڑھ گئی اور حکومت کے فوجی اخراجات بھی بڑھ گئے۔

جس کی وجہ سے حکومت کے میزانیہ میں چار لاکھ کا خسارہ ہوا تب حکومت نے مجبور ہو کر بیشتر اشیاء پر پھر ۵ فیصدی محصول عائد کر دیا۔ لوہے اور فولاد کی مصنوعات پر محصول کی مقدار صرف ایک فیصدی رہی، ریل کا سامان صنعتی اور زراعتی مشینیں اور کلیں، سونا، کوئلہ اور مطبوعہ کتابیں محصول سے مستثنیٰ رہیں۔ روئی کی مصنوعات کی درآمد پر بھی اور اشیاء کی طرح ۵ فیصدی محصول مقرر ہوا۔ ہندوستانی کارخانوں کے باریک سوت پر بھی ۵ فیصدی محصول اس غرض سے لگایا گیا کہ ولایتی کپڑے کو ہندوستان میں تامین حاصل ہو۔ مگر باوجود اس کے انگریزی تاجروں نے حکومت ہند پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہندوستانی کارخانوں کے ساتھ خاص رعایت کرتی ہے اور برابر اس کی مخالفت کرتے رہے۔ آخر حکومت نے ۱۸۹۶ء میں سوتی کپڑے کے محصول کے متعلق ایک نیا قانون پاس کیا جس کی رو سے ہر قسم کا ولایتی اور دیسی سوت محصول سے بری کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ہر قسم کے دیسی اور ولایتی کپڑے پر ۳½ فیصدی محصول مقرر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے جو موٹا کپڑا جاپان جاتا تھا گراں ہو گیا اور دن بدن اس کی برآمد کم ہوتی گئی اور کچھ عرصہ کے بعد جاپان کے موٹے کپڑے نے اُس کی جگہ لے لی۔ مصر اور امریکہ سے جو لمبے ریشے کی روئی ہندوستان میں آتی تھی۔ اس پر ۵ فیصدی محصول مقرر کیا گیا تاکہ ہندوستانی کارخانے ولایتی باریک سوت کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ غرضکہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی میں روڑے اٹکائے گئے۔ ۱۹۱۴ء تک ولایتی کپڑے کی درآمد پر یہی محصول قائم رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مارشیس اور جمیکا برطانوی مقبوضات سے شکر کی درآمد ہوتی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں جرمنی اور آسٹریا سے بھی چقندر کی شکر آنے لگی۔ مارشیس اور جمیکا کی شکر اُس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی تو حکومت نے جرمنی اور آسٹریا کی شکر کی درآمد پر ۵ فیصدی محصول مزید عاید کر دیا تاکہ برطانوی شکر کو اس سے امن حاصل ہو مگر جرمنی کی شکر کو وہاں کی حکومت سے اتنی مدد ملتی تھی کہ باوجود زائد محاصل کے برطانوی شکر کے مقابلہ میں ارزاں ہی فروخت ہوتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں برطانیہ کی کوشش سے برسلیز میں ایک شکر کی کانفرنس ہوئی اور آپس میں چند معاہدے ہوئے جس کی رو سے جرمنی اور آسٹریا کی شکر پر جو مزید محصول لیا جاتا تھا وہ معاف کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء تک تمام ممالک سے

ہندوستان میں شکر کی درآمد ہوتی تھی اور سب یکساں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں لیکن باوجود اس کے ہندوستانی شکر کی صنعت میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ دورانِ جنگ میں جب جرمنی سے شکر آنی بند ہوگئی تو اس کی جگہ جاوا کی شکر نے لے لی۔

سنہ ۱۹۱۴ء تک جتنے بھی محاصل حکومت نے درآمد پر لگائے اس سے اس کا مقصد ہندوستانی صنعتوں کو تامین دینا نہ تھا بلکہ یہ محاصل محض ملکی اخراجات کی رعایت سے عائد کیے جاتے تھے۔

ہندوستان سے جو اشیاء برآمد ہوتی تھیں اُن میں زیادہ تر خام پیداوار ہوتی تھی جس پر برائے نام محصول لیا جاتا تھا۔

ذیل میں بیسویں صدی کے شروع سے جنگ عظیم تک کی سالانہ درآمد برآمد کے اعداد و شمار درج ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ جنگ سے پہلے ہندوستان کی تجارت خارجہ کی کیا کیفیت رہی۔

سال	درآمد بحساب کروڑ روپیہ	برآمد بحساب کروڑ روپیہ	زائد برآمد بحساب کروڑ روپیہ
سنہ ۱۹۰۳-۴ء	۱۱۰٫۶۹	۱۳۵٫۵۹	۲۴٫۹۰
سنہ ۱۹۰۴-۵ء	۱۴۳٫۹۲	۱۷۴٫۲۶	۳۰٫۳۴
سنہ ۱۹۰۵-۶ء	۱۴۳٫۷۶	۱۷۷٫۳۰	۳۳٫۵۴
سنہ ۱۹۰۶-۷ء	۱۶۱٫۸۷	۱۸۲٫۷۴	۲۰٫۸۷
سنہ ۱۹۰۷-۸ء	۱۷۸٫۷۸	۱۸۲٫۹۳	۴٫۰۰
سنہ ۱۹۰۸-۹ء	۱۵۱٫۵۳	۱۵۸٫۴۶	۶٫۹۳
سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء	۱۶۰٫۱۷	۱۹۴٫۳۶	۲۴٫۱۹
سنہ ۱۹۱۰-۱۱ء	۱۷۳٫۴۷	۲۱۷٫۰۸	۴۳٫۶۱
سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء	۱۹۷٫۵۲	۲۳۸٫۳۶	۴۰٫۸۴
سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء	۲۲۸٫۴۶	۲۵۶٫۸۵	۲۸٫۳۹
سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۲۳۴٫۷۵	۲۵۵٫۲۵	۲۰٫۵۰

ان اعداد و شمار میں سونے اور چاندی کی درآمد بھی شامل ہے گویا ہندوستان کی برآمد درآمد کے مقابلہ میں کم و بیش ہمیشہ زیادہ رہی۔

ان سالوں میں خالص سونے کی برآمد کے اعداد حسب ذیل ہیں :-

سنہ	برآمد	سنہ	برآمد	سنہ	برآمد
سنہ ۱۹۰۰-۰۱ء	۸۴۲۱ ہزار روپے	سنہ ۱۹۰۱-۰۲ء	۱۹۳۷۶ ہزار روپے	سنہ ۱۹۰۲-۰۳ء	۸۷۵۴۶ ہزار روپے
سنہ ۱۹۰۳-۰۴ء	۹۹۱۳۷ "	سنہ ۱۹۰۴-۰۵ء	۹۷۰۵۹ "	سنہ ۱۹۰۵-۰۶ء	۴۶۸۰ "
سنہ ۱۹۰۶-۰۷ء	۱۳۸۵۶۱ "	سنہ ۱۹۰۷-۰۸ء	۱۷۳۶۷۷ "	سنہ ۱۹۰۸-۰۹ء	۴۳۴۵۴ "
سنہ ۱۹۰۹-۱۰ء	۲۱۶۷۹۳ "	سنہ ۱۹۱۰-۱۱ء	۲۳۹۷۸۶ "	سنہ ۱۹۱۱-۱۲ء	۳۷۷۵۹۸ "
سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء	۳۴۰۰۱۲ "	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۲۳۳۲۳۸ "	سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء	۷۶۴۷۸ "

دوران جنگ سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء میں ۱۰۹۱۰۰۰ روپے کا سونا برآمد ہوا اور جنگ کے بعد سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں اور سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ۵۵۶۳۷۰۰۰ اور ۲۶۶۴۵۰۰۰ روپے کا سونا برآمد ہوا۔

دوران جنگ میں اور اس کے کئی سال بعد تک تجارت خارجہ کی حالت بہت ناقابل اطمینان رہی۔ یہ زمانہ یورپ کے صنعتی ملکوں کی پریشانیوں کا زمانہ تھا۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی صنعتوں کو بہت فروغ ہوا اور باہر سے مال آنا کم ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء میں جا کر پھر کہیں تجارت خارجہ کی گرم بازاری شروع ہوگئی اس کے بعد سے درآمد و برآمد کے توازن کی جو حالت رہی وہ حسب ذیل ہے :-

سال	درآمد بحساب کروڑ روپیہ	برآمد بحساب کروڑ روپیہ	زائد برآمد و درآمد بحساب کروڑ روپیہ	
سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	۲۵۳٫۳۶۳۷	۴۰۰٫۲۴۲۷	۱۴۶٫۸۷۹۰	زائد برآمد
سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	۲۳۶٫۰۰۱۳	۳۸۶٫۸۱۲۲	۱۵۰٫۸۱۰۹	"
سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	۲۴۰٫۸۱۸۴	۳۱۱٫۰۵۰۴	۷۰٫۲۳۲۰	"
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	۲۶۱٫۵۳۴۰	۳۳۰٫۲۶۳۷	۶۸٫۷۲۹۷	"
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	۲۵۳٫۳۰۶۰	۳۳۰٫۱۲۷۹	۷۶٫۸۲۱۹	"
سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	۲۴۰٫۷۹۶۹	۳۱۰٫۸۰۵۵	۷۰٫۰۰۸۶	"
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	۱۶۴٫۷۹۳۷	۲۲۰٫۴۹۲۶	۵۵٫۶۹۸۹	"
سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	۱۲۶٫۳۷۰۷	۱۵۵٫۸۸۸۶	۲۹٫۵۱۴۹	"

سال	درآمد بحساب کروڑ روپیہ	برآمد بحساب کروڑ روپیہ	زائد برآمد و درآمد بحساب کروڑ روپیہ
سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	۱۳۲٫۵۸۴۳	۱۳۲٫۴۰۳۷	۰۰٫۱۸۰۶ زائد درآمد
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	۱۱۵٫۳۸۶۱	۱۴۶٫۳۱۶۶	۳۰٫۹۳۹۵ زائد برآمد
سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	۱۳۴٫۴۲۷۲	۱۶۰٫۵۲۱۹	۲۶٫۰۹۴۷ ”
سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء	۱۲۵٫۲۴۲۸	۱۹۶٫۱۲۴۶	۷۰٫۸۸۱۸ ”

پچھلے چند سالوں میں سونے کی خالص درآمد و برآمد حسب ذیل ہیں۔

سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	درآمد ۷۳۰۹۲۶۶	سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء	درآمد ۳۴۸۵۴۵	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء	درآمد ۱۹۴۰۰۵
سنہ ۱۹۲۷-۲۸ء	” ۱۸۰۹۹۰	سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء	” ۲۱۱۹۸۷	سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء	” ۱۴۲۲۰۸
سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء	” ۱۲۷۵۳۲	سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء	برآمد ۵۷۹۷۲۸	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	برآمد ۶۵۵۲۲۸
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	برآمد ۵۷۰۵۳۶	سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء	” ۵۲۵۳۷۵		

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے ہندوستان سے سونا برابر جا رہا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی خام پیداوار کی مانگ بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے اب تجارت کا توازن ہمیشہ ہندوستان کے ناموافق رہتا ہے۔

جنگ سے پہلے اور بعد ہندوستانی تجارت خارجہ میں مختلف ممالک کا جو حصہ رہا وہ حسب ذیل ہے۔

ملک	درآمد			برآمد		
	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
برطانیہ	۶۲٫۸	۵۷٫۶	۴۱٫۳	۲۵٫۱	۲۴٫۲	۳۲٫۲
جرمنی	۶٫۴	۲٫۸	۷٫۷	۹٫۸	۴٫۹	۶٫۶
جاوا	۶٫۴	۶٫۸	۲٫۱	۱٫۲	۱٫۰	٫۳
جاپان	۲٫۵	۶٫۹	۱۴٫۲	۷٫۵	۱۳٫۳	۸٫۷
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳٫۱	۸٫۵	۶٫۲	۷٫۵	۱۲٫۰	۹٫۶
بلجیم	۱٫۹	۱٫۸	۲٫۳	۵٫۳	۳٫۷	۳٫۰
آسٹریا	۲٫۲	٫۲	٫۴	۳٫۵	٫۲	۰
اسٹریٹ سٹلمنٹ	۲٫۱	۱٫۹	۲٫۳	۳٫۴	۲٫۷	۲٫۳
فرانس	۱٫۵	٫۹	۱٫۳	۶٫۶	۴٫۸	۵٫۰
فارس	٫۴	٫۷	۱٫۲	٫۵	۱٫۳	٫۶

ملک	درآمد سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	درآمد سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	درآمد سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء	برآمد سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	برآمد سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء	برآمد سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
ماریشس	۱٫۸	۲٫۲	۰	٫۶	۳٫۱	٫۵
اٹلی	۱٫۰	۱٫۰	۲٫۵	۳٫۲	۳٫۲	۳٫۹
چین	۱٫۱	۱٫۲	۱٫۹	۳٫۹	۳٫۶	۴٫۰
نیدرلینڈ	٫۹	٫۹	۱٫۶	۱٫۵	۱٫۵	۲٫۸
آسٹریلیا	٫۷	۱٫۳	٫۹	۱٫۴	۱٫۷	۲٫۹
ہانگ کانگ	٫۷	٫۷	٫۴	۲٫۱	۲٫۳	٫۸
روس	٫۱	٫۰۵	۱٫۴	٫۹	۰	٫۱
سیلون	٫۵	٫۷	۱٫۱	۳٫۷	۴٫۸	۴٫۲
دیگر	۳٫۹	۳٫۸۵	۱۱٫۲	۱۰٫۴	۱۱٫۷	۱۲٫۵

پچھلے دو سالوں میں جن اشیاء کی درآمد و برآمد ہوئی ان کی فہرست قیمتوں وار حسب ذیل ہے:-

درآمد

نام اشیا جن کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	سنہ ۱۹۳۵-۳۶ء	سنہ ۱۹۳۶-۳۷ء
روئی اور اُس کی مصنوعات	۲۷۸۹۶۲ ہزار روپیہ	۲۳۳۳۰۲ ہزار روپیہ
مختلف قسم کی مشنری	۱۲۶۹۶۶ " "	۱۴۱۳۹۴ "
خام دھاتیں	۱۲۰۳۳۲ " "	۹۶۸۷۰ "
تیل	۷۲۴۵۴ " "	۷۲۵۲۷ "
موٹر اور دوسری گاڑیاں	۶۹۲۱۴ " "	۶۵۷۷۸ "
اوزار، آلات اور پرزے	۵۱۷۶۲ " "	۵۱۹۱۴ "
مصنوعی ریشم	۳۱۵۷۸ " "	۳۸۵۶۰ "

کھانے پینے کا سامان	۳۱۱۸۷ ہزار روپیہ	۳۲۰۲۲ ہزار روپیہ
رنگ	۳۳۳۶۷ 〃	۳۰۱۳۴ 〃
دھات کے برتن اور سامان	۳۲۶۷۶ 〃	۲۸۹۳۵ 〃
اون اور اونی مصنوعات	۲۷۸۵۴ 〃	۲۸۶۹۴ 〃
کاغذ	۲۹۹۰ 〃	۲۸۱۶۸ 〃
کیمیائی چیزیں	۳۱۱۸۸ 〃	۲۷۲۱۹ 〃
ریشم اور ریشمی مصنوعات	۲۷۷۶۵ 〃	۲۴۱۸۷ 〃
شراب	۲۴۷۵۷ 〃	۲۳۹۶۱ 〃
ربڑ کی مصنوعات	۲۰۶۸۵ 〃	۲۱۱۳۱ 〃
دوائیں	۲۱۱۱۷ 〃	۲۰۷۰۲ 〃
مسالے	۱۶۱۷۷ 〃	۱۸۷۷۵ 〃
پھل اور ترکاریاں	۱۳۳۴۱ 〃	۱۴۱۶۹ 〃
شیشہ اور شیشے کا سامان	۱۳۹۴۰ 〃	۱۲۷۹۲ 〃
میزان قیمت اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	۱۰۸۵۰۲۱ ہزار روپیہ	۱۰۱۱۲۳۴ ہزار روپیہ
میزان قیمت اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے کم ہے۔	۲۵۹۲۵۱ 〃	۲۴۱۱۹۴ 〃
کل میزان درآمد	۱۳۴۴۲۷۲ 〃	۱۲۵۲۴۲۸ 〃

برآمد

نام اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	۱۹۳۵ - ۳۶ء	۱۹۳۶-۳۷ء
روئی خام اور گودڑ	۳۴۴۷۰۴ ہزار روپیہ	۳۵۱۷۳۵ ہزار روپیہ
روئی کی مصنوعات	۲۹۲۷۲ 〃	۳۷۸۴۳ 〃
سن خام	۱۳۷۰۷۶ 〃	۱۴۷۷۱۰ 〃

سن کی مصنوعات	۲۳۴۸۹۵	ہزار روپیہ	۲۷۹۴۷۵	ہزار روپیہ
چاء	۱۹۸۲۴۱	〃	۲۰۰۳۸۱	〃
مختلف قسم کے بیج	۱۰۲۳۰۵	〃	۱۸۴۶۹۳	〃
غلہ، دالیں اور آٹا وغیرہ	۱۲۴۰۸۷	〃	۱۵۳۷۹۲	〃
دھاتیں	۷۷۳۳۵	〃	۸۰۱۹۲	〃
دباغت کیا ہوا چمڑا	۵۶۲۸۹	〃	۷۳۶۳۷	〃
کھالیں	۴۱۳۱۰	〃	۴۴۳۴۰	〃
اون اور اونی مصنوعات	۲۹۲۵۶	〃	۲۷۳۸۹	〃
لاکھ	۱۵۸۳۶	〃	۲۳۴۲۱	〃
کھلی	۱۸۱۷۰	〃	۲۲۶۹۳	〃
متفرق	۲۲۷۸۷	〃	۱۹۵۹۹	〃
ٹمبر اور مختلف قسم کی دوسری عمارتی لکڑی	۱۳۴۵۷	〃	۱۷۷۴۷	〃
پھل اور ترکاریاں	۱۶۴۶۶	〃	۱۶۹۸۹	〃
میزان قیمت اشیاء جنکی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ ہے	۱۴۶۲۴۸۶	ہزار روپیہ	۱۷۹۱۶۳۹	ہزار روپیہ
میزان قیمت اشیاء جن کی قیمت ایک کروڑ سے کم ہے	۱۴۲۷۳۳	〃	۱۶۹۶۰۷	〃
میزان کل قیمت اشیاء برآمد	۱۶۰۵۲۱۹	〃	۱۹۶۱۲۴۶	〃

ان اعداد و شمار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درآمد و برآمد میں روئی اور روئی کی مصنوعات کو پرانے زمانہ کی طرح آج بھی سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں کے بنے ہوئے کپڑے کی برآمد زیادہ ہوتی تھی لیکن اب خام روئی کی برآمد زیادہ ہوتی ہے اور مصنوعہ روئی کی درآمد کثرت سے ہوتی ہے۔ جنگ سے پہلے ہندوستان میں روئی کی مصنوعات کے محصول پر جو تبدیلیاں ہوئیں اس کا ذکر مختصراً ہو چکا ہے۔ جنگ کے بعد اس کی جو حالت رہی وہ یہ ہے :-

جنگ سے پہلے انگریزی تاجروں نے حکومت ہند کو مجبور کیا تھا کہ وہ مانچسٹر اور لنکا شائر کے کپڑے پر محصول درآمد کم کردے چنانچہ ان کے حسب منشا، دیسی اور ولایتی پارچہ جات پر محصول ۳½ فیصدی ہو گیا تھا لیکن دورانِ جنگ میں حکومت کے اخراجات بڑھے تو محصول بڑھانے کی بھی ضرورت ہوئی حکومت نے بدیسی پارچہ جات کی درآمد پر بلا کسی امتیاز یا شاہی ترجیح کے ۳½ فیصدی کی بجائے ۷½ فیصدی محصول عائد کردیا، اور دیسی کپڑے پر ۳½ فیصدی ہی قائم رکھا۔ کیونکہ ہندوستانی اس محصول کے پہلے ہی سے مخالف تھے۔ اس نازک موقع پر دیسی مال پر محصول بڑھانا گویا جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالنا تھا لیکن ۲۳-۱۹۲۲ء میں حکومت نے چاہا کہ دیسی کپڑے پر بھی ۷½ فیصدی محصول عائد کردیا جائے لیکن مجلس قانون ساز نے اسے نامنظور کردیا اور یہ تجویز پاس کی کہ بدیسی کپڑے کی درآمد پر بجائے ۷½ فیصدی محصول کے ۱۱ فیصدی کردیا جائے تاکہ ملک کے سوتی کپڑے کو تامین ملے۔ بدیسی سوت پر بھی ۵ فیصدی محصول لگا دیا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان میں روئی کی مصنوعات کو بہت ترقی حاصل ہوئی اور اس سال بہت سے نئے کارخانوں کا بھی اضافہ ہوا۔

۱۹۲۵ء میں کپڑے کے کارخانے کے مالکوں اور مزدوروں میں کشمکش شروع ہوئی۔ مزدور عام گرانی کی وجہ سے اُجرتیں بڑھوانا چاہتے تھے اور سرمایہ دار یہ عذر کرتے تھے کہ ابھی اُجرتوں میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کردیں۔ آخر کار کارخانہ کے مالکوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ سوتی کپڑے پر جو ۳½ فیصدی محصول چنگی لیا جاتا ہے وہ معاف کردیا جائے تاکہ وہ مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافہ کرسکیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں حکومت نے یہ محصول معاف کردیا اور اعلیٰ قسم کے بدیسی اونی اور ریشمی کپڑے پر ۱۵ سے ۳۰ فیصدی محصول مقرر کردیا۔ اس عرصہ میں جاپان نے صنعت پارچہ بافی میں بہت ترقی کرلی اور اپنا سامان ہندوستان میں بھیجنا شروع کردیا جس کا مقابلہ نہ تو برطانوی کپڑا کرسکا اور نہ دیسی۔ ۱۹۳۰ء میں ایک نیا قانون تحفظ پارچہ بافی منظور ہوا جس کی رو سے بدیسی کپڑے کی درآمد پر تین سال کے لیے ۵۰ فیصدی محصول عائد کرکے ہندوستانی پارچہ صنعت بافی کو تامین دی گئی لیکن برطانیہ کو ۵ فیصدی شاہی ترجیح حاصل رہی۔ ۱۹۳۳ء

میں غیر برطانوی کپڑے پر ۵۰ فیصدی کی بجائے ۷۵ فیصدی محصول لگا دیا گیا۔ حکومت کی اس حرکت سے جاپانی کارخانہ دار بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے بھی ہندوستانی روئی کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس وقت ہندوستانی روئی کا سب سے بڑا خریدار جاپان ہی تھا۔ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں جاپان میں ہندوستانی روئی کی گیارہ کروڑ روپے کی درآمد ہوئی۔ یعنی ہندوستانی روئی کی کل برآمد میں تقریباً آدھا حصہ جاپان کا رہا۔ اب اس نے امریکہ اور حبش سے روئی خریدنی شروع کر دی جس کی وجہ سے ہندوستانی روئی کی برآمد گھٹنی شروع ہوئی تو حکومت نے جاپان کو ایک نئے تجارتی معاہدہ کرنے کی اجازت دی اور کئی مہینوں کی گفت و شنید کے بعد ہندوستانی اور جاپانی نمائندوں میں ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جاپان ہر سال ۳۲۵ ملین گز کپڑا ہندوستان بھیجیگا اور اس کے بدلے میں ایک ملین روئی کی گانٹھیں ہندوستان سے خریدیگا۔

جنگ سے پہلے اور پچھلے چند سالوں میں جاپان سے سوتی اور ریشمی مصنوعات کی درآمد کا جو اوسط رہا وہ حسب ذیل ہے :-

	سوتی مصنوعات	ریشمی مصنوعات
سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں	۱٫۸ فیصدی	۴۶٫۸ فیصدی
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں	۳۸٫۰ 〃	۶۳٫۸ 〃
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں	۳۵٫۰ 〃	۷۳٫۲ 〃

اس کے مقابلہ میں برطانوی سوتی اور ریشمی کپڑے کا اوسط ملاحظہ فرمائیے :-

	سوتی مصنوعات	ریشمی مصنوعات
سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں	۹۱٫۱ فیصدی	۹٫۰ فیصدی
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں	۵۳٫۰ 〃	۳٫۷ 〃
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں	۵۸٫۷ 〃	۲٫۸ 〃

اس عرصہ میں سلطنت برطانیہ اور ہندوستانی کارخانہ والوں میں ایک معاہدہ لوٹا وہ پیکٹ کے

نام سے ہوا جس میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان میں بدیسی کپڑے کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا ہے اُس میں برطانیہ کو ۱۰ فیصدی شاہی ترجیح حاصل ہوگی اور اس کے مقابلہ میں انگلستان میں ہندوستانی اشیاء کی درآمد پر ۱۰ فیصدی محصول معاف ہوگا۔ دوسری نوآبادیات میں برطانیہ کو جو رعایتیں حاصل ہونگی اُس میں ہندوستان بھی شریک ہوگا۔ بظاہر تو اس معاہدہ میں کوئی بات قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی برآمد میں انگلستان کا ۳۰ فیصدی حصہ ہے اور اس میں بیشتر اشیاء ایسی ہیں جن کا ہندوستان کو پورا اجارہ حاصل ہے۔ مثلاً سن، روئی اور غلہ وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں کوئی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی مانگ دوسرے ملکوں میں بھی ہے۔ رعایت کی ضرورت تو اُس میں ہوتی ہے جس میں دوسروں سے مقابلہ ہو۔ برعکس اس کے ہندوستان میں برطانوی مال کی ۵۰ فیصدی سے بھی زیادہ درآمد ہوتی ہے اور مقابلہ میں دیسی مال کے علاوہ جاپان بھی ہے۔ ظاہر ہے اس کا اثر دیسی کپڑے پر پڑیگا جس کو ابھی تامین کی سخت ضرورت ہے چنانچہ اوٹاوہ کے معاہدہ کے بعد سے برطانی مال کی درآمد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستانی روئی اور روئی کی مصنوعات کی درآمد و برآمد میں مختلف ممالک کا جو حصہ جنگ سے پہلے اور پچھلے چند سالوں میں رہا وہ حسب ذیل ہے۔

ملک	درآمد			ملک	برآمد		
	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء		سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
برطانیہ متحدہ	۹۰٫۱ فیصدی	۵۳٫۰ فیصدی	۵۸٫۸ فیصدی	برطانیہ متحدہ	۳٫۵ فیصدی	۸٫۷ فیصدی	۱۲٫۶ فیصدی
امریکہ	۰٫۴ ″	۳٫۱ ″	۱٫۰ ″	امریکہ	—	۰٫۳ ″	۰٫۹ ″
جرمنی	۱٫۲ ″	۰٫۳ ″	۰٫۲ ″	جرمنی	۱۴٫۶ ″	۶٫۵ ″	۷٫۹ ″
جاپان	۱٫۸ ″	۳۸٫۰ ″	۳۵٫۰ ″	جاپان	۴۲٫۲ ″	۵۴٫۵ ″	۳۹٫۶ ″
فرانس		۲٫۰ ″	۰٫۲ ″	فرانس	—	۵٫۷ ″	۵٫۷ ″
اٹلی	۱٫۵ ″	۰٫۸ ″	۰٫۱ ″	اٹلی	۷٫۷ ″	۷٫۶ ″	۹٫۰ ″

ملک	درآمد			ملک	برآمد		
	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴		سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء	سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء
چین	۱ء۰ فیصدی	۳ء۳ فیصدی	۸ء۳ فیصدی	چین	۱ء۷ فیصدی	۶ء۵ فیصدی	۱۲ء۱ فیصدی
سوئٹزرلینڈ	—	۰ء۵ 〃	۰ء۲ 〃	بلجیم	۱۰ء۳ 〃	۶ء۳ 〃	۵ء۴ 〃
دیگر	۴ء۰ 〃	۰ء۸ 〃	۰ء۷ 〃	اسپین	—	۲ء۳ 〃	۲ء۴ 〃
				نیدرلینڈ	—	۱ء۶ 〃	۲ء۰ 〃
				دیگر	۸ء۰	۰ء۹ 〃	۳ء۴ 〃

ہندوستانی سوتی کپڑے کی ملوں کی رفتار ترقی حسب ذیل ہے:-

سال	تعداد مل	تعداد مزدور
سنہ ۱۸۷۹-۸۰ء میں	۵۸	۳۹۵۳۷
سنہ ۱۸۸۸-۸۹ء میں	۱۰۹	۹۲۱۲۶
سنہ ۱۸۹۸-۹۹ء میں	۱۷۴	۱۵۶۱۳۲
سنہ ۱۹۰۸-۹ء میں	۲۳۳	۲۳۶۸۲۷
سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں	۲۶۴	۲۶۰۸۴۷
سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں	۲۴۹	۲۹۰۲۵۵
سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء میں	۳۰۵	۳۷۶۰۱۲
سنہ ۱۹۲۸-۲۹ء میں	۳۰۴	۳۹۲۵۳۲
سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں	۳۴۴	۴۲۳۶۵۸

پچھلے چند سالوں میں روئی کی صنعت کو تاہین دینے کی وجہ سے ترقی ہورہی ہے اور اب ملک میں کافی کپڑا تیار ہونے لگا ہے۔ اگر اور چند سالوں کے لیے تاہین بحال رکھی گئی تو ہندوستان اپنی ضرورت کا کپڑا خود پیدا کرلیگا اور دوسروں کا محتاج نہیں رہیگا۔ ابھی تک حکومت نے روئی کی پیداوار کی ترقی کی طرف توجہ نہیں کی۔ ضرورت ہے کہ اس طرف بھی توجہ کی جائے۔ اچھے اور گھٹیا قسم کے بیج کی تمیز

کی جائے اور اُن کی کاشت علیحدہ علیحدہ کرائی جائے۔ جس طرح امریکہ نے روئی کی کاشت میں نئی سائنٹفک ذرائع سے ترقی کی ہے اور اعلیٰ قسم کی روئی پیدا کرنی شروع کی ہے۔ ہندوستان میں بھی ابھی روئی کی کاشت کو ترقی دینے کے مواقع بہت ہیں۔

ہندوستان سے جو چیزیں برآمد ہوتی ہیں اس کا غالب حصہ خام پیداوار کا ہے اور یہی پیداوار دوسرے ملکوں میں مصنوعہ شکل اختیار کر کے ہندوستان میں واپس آتی ہیں جس کا تمام تر خرچ آخر میں ہندوستانیوں ہی پر پڑتا ہے۔ حالانکہ خود ہندوستان میں ایسے وسائل موجود ہیں کہ ہم یہاں کی پیداوار کو صنعتی کاموں میں لا کر اپنی ضروریات مہیا کر سکتے ہیں۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ابتدائی صنعتوں کو تامین دے پچھلے چند سالوں سے حکومت نے شکر کی صنعت کو تامین دینی شروع کی ہے جس کی وجہ سے اس صنعت کو روز بروز ترقی ہو رہی ہے اور باہر کی شکر کی درآمد میں کمی ہو رہی ہے۔ جن علاقوں میں شکر سازی کے کارخانے کھولے گئے ہیں وہاں گنّے کی کاشت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ شمالی ہند میں جہاں یہ کارخانے قائم ہوئے ہیں کُل کاشت کے ۳۷ فیصدی رقبہ میں گنّے کی کاشت ہوتی ہے اور اسی طرح دوسری صنعتوں میں بھی حکومت عوام کا ساتھ دے تو نہ صرف صنعت ہی کو فروغ ہوگا بلکہ زراعت میں بھی ترقی ہوگی۔

آج کل ہندوستان میں گھریلو صنعتوں کو رواج دینے کی بڑی کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح پُرانے زمانے میں دیہاتوں اور قصبوں میں چھوٹے چھوٹے صنعتی مرکز ہوتے تھے اسی طرح آج کل بھی ان دیہاتوں اور قصبوں میں صنعتی مرکز قائم کر کے اُن کو فروغ دیا جائے۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں صنعتوں کا اس طریقہ سے ترقی کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس طریقہ کار سے اوّل تو ہم بیرونی صنعتوں کے مقابلہ سے قاصر رہینگے دوسرے یہ کہ جب تک ہم نئی ایجادات اور سائنس کی تحقیقات سے فائدہ نہیں اُٹھائینگے ہم اپنی صنعتوں کو فروغ نہیں دے سکتے۔ بجائے اس کے کہ دیہاتوں میں چھوٹے چھوٹے صنعتی مرکز قائم کیے جائیں، انہی دیہاتوں اور قصبوں میں صنعتی لوازم کا خیال کرتے ہوئے بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم کئے جائیں۔ ہمارے سامنے شکر کی صنعت کی مثال موجود ہے جن خطوں میں

شکر کے کارخانے قائم ہوئے وہاں گنے کی کاشت بلحاظ قسم اور مقدار کے خوب بڑھی اس کی پیداوار کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم کی گئیں اور جہاں تک ہو سکا اس کی اصلاح بھی کی گئی۔ جو لوگ بیکار تھے اُن کی تھوڑی بہت کھپت ان کارخانوں میں ہوئی۔ اگر اسی طرح اور صنعتوں کے بھی بڑے پیمانہ پر کارخانے کھولے جائیں تو صنعت کے ساتھ ساتھ زراعتی پیداوار میں بھی ترقی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ کی تو ہماری خام اشیاء کی جو مانگ باہر کے بازاروں میں ہے وہ بھی ختم ہو جائیگی کیونکہ بیرونی ممالک میں بھی صنعتوں کے ساتھ ساتھ زراعت کو بھی ترقی دینے کی کوشش جاری ہے۔ چنانچہ امریکہ کی روئی اور گیہوں ہندوستان کی روئی اور گیہوں کی جگہ لے رہا ہے پچھلے چند سالوں سے ہماری دوسری خام اشیاء کی برآمد میں بھی کمی ہو رہی ہے۔ اس لیے عوام اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔

جگر پارے

میری جانب نگراں ہے کوئی — اب زماں ہے نہ مکاں ہے کوئی

وہیں میں بھی ہوں جہاں ہے کوئی — دل ہے یا تختِ رواں ہے کوئی

اب تو یوں محرمِ جاں ہے کوئی — جیسے رگ رگ میں نہاں ہے کوئی

گرم اشکوں میں رواں ہے کوئی (قطعہ) سرد آہوں میں نہاں ہے کوئی

میں نے گھبرا کے جو اک روز جگر — دی یہ آواز کہاں ہے کوئی

درد چیخا کہ مجھی میں ہے وہ شوخ — غم پکارا کہ یہاں ہے کوئی

ہمہ نغمہ، ہمہ خوشبو، ہمہ رنگ (قطعہ) دوسرا تجھ سا کہاں ہے کوئی

تو ہی للہ بتا دے ناصح — ایسی سج دھج کا جواں ہے کوئی

اے غمِ عشق ترا کیا کہنا — پہلے تو، بعد ازاں ہے کوئی

کیجیے شرح محبت کیونکر — کیا محبت کی زباں ہے کوئی

غیرتِ عشق یہ کیا سنتا ہوں! — "غیر از دوست کہاں ہے کوئی"

نہیں ہٹتی، نہیں ہٹتی تری یاد — یہ بھی کیا رشتۂ جاں ہے کوئی

کس کے دل پر نہیں اُس کا سایہ (قطعہ) غم ہے یا سحرِ رواں ہے کوئی

ہمہ ساز و ہمہ سوز و ہمہ درد — زندگی ہے کہ فغاں ہے کوئی

ہر نفس اب تو یہ دیتا ہے صدا — کہ پسِ پردۂ جاں ہے کوئی

دل کی اب فکر کرے میری بلا
مجھ سے بڑھ کر نگراں ہے کوئی

روزِ جزا

(گذشتہ سے پیوستہ)

جج ولورا:- اس سے حلف اُٹھواؤ۔

کلرک:- (باسربا سے) اِدھر آؤ۔

باسربا:- بہت بہتر (گھٹنوں کے بل گر کر صلیب کا نشان بناتا ہے۔ اور پھر کھڑا ہو کر گواہوں کے کٹھرہ میں گرتا پڑتا پہنچتا ہے) معاف کیجیے یور لارڈشپس۔ یہ خیال نہ فرمائیگا کہ میں نشہ میں ہوں۔ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ میرے گھٹنے ہیں۔ ذرا کمزور۔ میرے لیے یہ ایک نئی چیز ہے۔ میں نے ہمیشہ عدالتوں سے باہر رہنے کی کوشش کی ہے۔

سرکاری وکیل:- بکواس بند کرو۔

باسربا:- جی ہاں، میں نہیں چاہتا تھا کہ یور لارڈشپس میرے متعلق یہ رائے ——

سرکاری وکیل:- جو سوالات میں پوچھنے والا ہوں اُن کی طرف توجہ کرو۔

باسربا:- بہت اچھا جناب، میں تیار ہوں (گلا صاف کرتا ہے)

سرکاری وکیل:- تم کہاں ملازم ہو۔

باسربا:- جناب میں ایک قہوہ خانہ میں بیرا ہوں۔ جی ہاں ذرا حساب لگانے دیجیے۔ سترہ نہیں اٹھارہ برس سے میں رنڈوا ہوں اور میرے تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا فوج میں ہے۔ دوسرا ایڈریا نوپل اسٹریٹ میں کام سیکھتا ہے۔ وہ اپنے کام میں بڑا ہوشیار ہے۔ مگر یور لارڈشپس میری لڑکی بڑی خراب نکلی۔ سترہ برس کی عمر میں اسے ایک پولیس کا آدمی اغوا کر کے لے گیا تھا اور ابھی تک اُس نے اپنی قدرتی اور صحیح زندگی اختیار نہیں کی ہے۔

سرکاری وکیل:- ان تمام باتوں کو رہنے دو۔ کہاں ——

باسربا۔ معاف کیجیے گا جناب۔ مگر ایک بات

سرکاری وکیل۔ تم کہاں ملازم ہو۔

باسربا۔ کہاں؛ جناب قہوہ خانہ ڈینیوب میں جو ایٹھتہ آف اکتوبر اسٹریٹ میں ہے۔ گھوڑا منڈی سے ذرا پرے۔ یہ ایک متوسط جگہ ہے یور لارڈ شپس۔ قہوہ، سیاہ و سفید دس میں، بیر کا گلاس پانچ میں اور فرانسیسی شراب پچیس میں۔

جج ستر زاوا۔ ناممکن۔ کس قسم کی فرانسیسی شراب؟

باسربا۔ یور لارڈ شپ، بتانے کی بات تو نہیں مگر بوتل میں تھوڑا سا پانی بھی داخل کر دیا جاتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ تم ان ملزموں میں سے جو یہاں ہیں کسی کو پہچانتے ہو۔

باسربا۔ جی ہاں یقیناً جناب۔ سب کو

سرکاری وکیل۔ تم نے اس سے پہلے انہیں کہاں دیکھا ہے۔

باسربا۔ قہوہ خانہ میں جناب۔ فیتو نکلسے اسٹریٹ کے کونے میں رہتا ہے۔ وہ ہمارا باقاعدہ گاہک ہے۔ یعنی گرفتار ہونے سے پہلے وہ تھا۔

سرکاری وکیل۔ اور میڈم کمان، کیا وہ بھی گاہک تھی؟

باسربا۔ جی ہاں جناب، یقیناً جناب۔ اور یہ جرمن صاحب مسٹر شنڈر ہیں نہ؟

سرکاری وکیل۔ ہاں، یہ بھی آیا کرتا تھا؟

باسربا۔ جی ہاں، کبھی کبھی میں اس سے چند جرمن الفاظ بول لیتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی جرمن اپنی بیوی سے سیکھی تھی۔ بیچاری اب مر گئی ہے۔ نمونیا سے اس کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ایک جرمن خاندان میں کام کرتی تھی۔ جی ہاں کھانے پکانے کا۔ اسی لیے وہ تھوڑی سی جرمن سیکھ گئی۔ میں غیر ملکی زبانوں میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیں اپنی قومی زبان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مگر جب کوئی کسی قہوہ خانہ میں بیرا ہو تو گاہک تھوڑی سی توجہ سے خوش ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب شنڈر آتا تھا۔۔۔

سرکاری وکیل۔ بہت اچھا۔ کیا میڈم کمان اکثر آتی تھی۔

باسربا۔ جی ہاں آپ اکثر ہی کہہ لیجیے۔ ہمارے باقاعدہ گاہکوں کی طرح ہر رات نہیں بلکہ کبھی کبھی بعض اوقات اپنی چھوٹی لڑکی کے ساتھ اور بعض اوقات اپنے شوہر الگزنڈر کمان کے ساتھ۔ وہی جسے آئندہ ہفتے پھانسی ملنے والی ہے۔

جج سانکو۔ یہ قہوہ خانہ ہے یا سازشیوں کا اڈا؟

باسربا۔ جی نہیں یور لارڈشپ۔ وہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ شرفا زیادہ تر اور سیاہی مختلف جماعتوں کے رکن۔ گھوڑا منڈی کے رہنے والے اور گاہے گاہے کوئی وکیل یا افسر جنہیں کسی خاتون سے باتیں کرنے کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لڑکیاں بھی لوگوں کو متوجہ کرتی ہیں۔ ان میں سے بعض بہت حسین ہوتی ہیں نوجوان دیہاتی لڑکیاں جو مختلف صوبوں سے تازہ دم آتی ہیں۔ اور قہوہ خانے میں اچھے لوگوں کے ساتھ بُرے آ ہی جاتے ہیں۔

سرکاری وکیل۔ قہوہ خانہ کا مالک جماعت کا وفادار رکن ہے۔ یور لارڈشپ۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ایسی جگہوں میں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

جارج۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے بیرے قومی جماعت کے تنخواہ دار جاسوس ہیں۔

باسربا۔ مجھے جاسوس مت کہو خیتو۔ میں نے ہمیشہ حلال کی روزی کمائی ہے۔ میں سات جائز بچوں کا باپ ہوں جن میں سے تین ابھی تک زندہ ہیں۔ اگر میں اپنے کان کھلے رکھتا ہوں تو میں قابل الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

سرکاری وکیل۔ ہر ایک محبِ وطن کا فرض ہے کہ حکومت کو ہر اس بات کی اطلاع کر دے جو سازشی اس کے خلاف کر رہے ہوں۔

باسربا۔ جی ہاں یہی میں کہتا ہوں۔

سرکاری وکیل۔ باسربا تم نے ملزموں کو آخری بار قہوہ خانہ ڈینیوب میں کب دیکھا تھا؟

باسربا۔ آخری بار؟ ذرا سوچنے دیجیے۔ آپ کا مطلب ہے تینوں کو۔ میں نے انہیں کب وہاں دیکھا تھا۔

سرکاری وکیل۔ ہاں دس مارچ اتوار کی شام کو۔ ہے نا؟ مسٹر پریذیڈنٹ پر قاتلانہ حملہ سے ایک روز پیشتر

باسربا۔ جی ہاں بالکل ٹھیک۔ اتوار کی شام کو۔ دس مارچ۔ اور دوسرے ہی دن ہم نے پڑھا کہ ہمارے معزز قائد پر خونی حملہ کیا گیا ہے (بازو بڑھا کر قومی سلام کرتا ہے) خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمارے لیے ان کو بچا لیا۔

جج ولورا۔ کیا تمہارا مطلب یہ ہے تم نے ان تینوں کو ایک جگہ دیکھا تھا۔ تینوں کو؟

باسربا۔ جی ہاں یور لارڈ شپس تینوں کو۔ خیتو، میڈم کمان اور جرمن صاحب کو۔

لاڈیا۔ یہ جھوٹ ہے۔

جارج۔ اس چھوٹے چوہے کو اپنی تنخواہ حاصل کر لینے دو۔

باسربا۔ خیتو اگر تم چوہے نہیں تو میں بھی نہیں۔ نہ معلوم اسے کیا حق ہے کہ مجھے چوہا کہے۔

سرکاری وکیل۔ کیا ملزموں کو اجازت ہے یور لارڈ شپس، کہ حکومت کے گواہوں کی ان کے مُنہ پر توہین کریں۔

جج ولورا۔ ملزم اس قسم کے توہین آمیز جملے نہیں کہیں گے۔ کاروائی جاری رکھیے۔

سرکاری وکیل۔ تم نے ملزموں کو وہاں کس وقت دیکھا تھا۔ تم نے سات بجے کہا تھا۔ ہے نہ؟

کنارڈ۔ معاف کیجیے گا

سرکاری وکیل۔ میرے پاس اس کا ابتدائی بیان موجود ہے جس میں اُس نے صاف طور سے سات بجے کا وقت بیان کیا ہے

باسربا۔ جی ہاں بالکل ٹھیک۔ سات بجے کا وقت تھا

سرکاری وکیل۔ اس کی تصدیق دوسرے گواہوں کے بیانات سے بھی ہو جائیگی یور لارڈ شپس۔ باسربا ملزم کیا کر رہے تھے۔

باسربا۔ کیا کر رہے تھے جناب۔ وہ بیٹھے تھے وہاں۔

سرکاری وکیل۔ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

باسربا۔ جی ہاں، پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

جارج۔ غالباً آنریبل سرکاری وکیل بھی ایک راہگیر کا بھیس بدلے وہاں موجود تھے۔ (ہلکا سا قہقہہ)

سرکاری وکیل۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس قسم کی باتوں کو ہمیشہ کے لیے روک دیا جائے۔

جج ولورا۔ خیتو اگر تم نے آئندہ ایسی بات کی تو تمہیں یہاں سے نکال دیا جائیگا۔

جارج۔ میں یور لارڈشپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔

جج سانکو۔ رپورٹر! ہم چاہتے ہیں کہ اس قسم کے تمام توہین آمیز جملے روئداد میں لکھے جائیں۔

رپورٹر۔ بہت خوب یور لارڈشپ۔

سرکاری وکیل۔ باسریا کیا تم نے ملزموں کی باتیں بھی سُنی تھیں۔

باسریا۔ جناب آدمی اپنے کان تو بند نہیں کر سکتا۔ (خیتو سے) لیکن میں اس کو جاسوس نہیں کہتا۔

جج ولورا۔ (گھنٹی بجا کر) قیدیوں کو مخاطب کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔

باسریا۔ مہربانی فرما کر مجھے معاف کیجیے یور لارڈشپ۔ یہ محض اس لیے کہ میں عادی ——

سرکاری وکیل۔ تم نے انہیں کس قسم کی باتیں کرتے سُنا تھا۔

باسریا۔ میں نے اس لڑکی کو کہتے سُنا یعنی میڈم کمان کو، اُس نے کہا "بھائیو ہر بات کا انتظام ہو گیا ہے۔ ہماری تجویز پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ کل صبح میں اپنے محترم قائد گرگیری وینسگ سے ملنے جا رہی ہوں۔ (قومی سلامی دیتا ہے)

سرکاری وکیل۔ کیا اُس نے کہا تھا "اپنے محترم قائد"

باسریا۔ نہیں جناب۔ اس نے ایسے الفاظ کہے تھے جنہیں میں دوہرا نہیں سکتا۔

لاڈیا۔ اچھا!

(کنارڈ اسے خاموش رہنے کی درخواست کرتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ کیا تم نے اور بھی کچھ سنا تھا

باسریا۔ نہیں جناب میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کچھ سُنا تھا۔ اتوار مصروفیت کا دن ہے۔ پھر گاہک اس کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی پاس کھڑا ہو کر ان کی گفتگو سُنے۔ یور لارڈشپس متعجب ہونگے اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ لوگ قہوہ خانوں میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں

سرکاری وکیل۔ مگر وہ بڑی احتیاط سے گفتگو کر رہے تھے، ہے نہ؟

باسریا۔ جی ہاں جناب۔ وہ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

۳۹۴۵

سرکاری وکیل۔ بعد میں تم نے کچھ اور بھی ہوتے دیکھا تھا؟ (ججوں کی طرف دیکھتا ہے جن کے سامنے پستول پڑا ہے)

باسربا۔ (اُسی طرف دیکھ کر) بعد میں؟ مجھے سوچنے دیجیے۔ جی ہاں جناب، بعد میں ضیتو نے ایک پستول نکال کر شنڈر کو دیا تھا۔ (جارج زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

جج مورسی۔ تم کہتے ہو کہ جارج نے شنڈر کو پستول دیا تھا۔ تم نے خود دیکھا تھا؟

باسربا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔

سرکاری وکیل۔ (پستول کی طرف اشارہ کر کے) اور پستول یہی تھا؟

باسربا۔ جی ہاں، بالکل یہی۔

جج سانکو۔ دوسرے الفاظ میں حملہ سے ایک روز پیشتر تم نے دیکھا کہ ضیتو نے شنڈر کو وہی پستول دیا جس سے شنڈر نے منسٹر پریزیڈنٹ کو زخمی کیا تھا۔

باسربا۔ جی ہاں یور لارڈ۔۔۔ اس کا یہی مطلب ہے۔

جج سلوترسکی۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی پستول ہے؟

سرکاری وکیل۔ یور لارڈشپس، ضیتو نے تسلیم کیا ہے کہ یہ اُس کا پستول ہے۔ اور اس سے بآسانی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شنڈر کے پاس یہ کس طرح پہنچا۔

جج سلوترسکی۔ ضیتو کا دعویٰ ہے کہ یہ پستول اُس کے کمرہ سے چُرایا گیا ہے

سرکاری وکیل۔ اسے اس بات کو ثابت کرنے دیجیے۔

جارج۔ کوئی اسے کیسے ثابت ــــــ (رک جاتا ہے)

ستاملبو۔ باسربا یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ ملزموں کی زندگیاں اس پر منحصر ہیں۔ کیا تمہیں بالکل یقین ہے کہ تینوں ملزم منسٹر پریزیڈنٹ سے میڈم کمان کی ہونے والی ملاقات کا ذکر کر رہے تھے اور یہ کہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ضیتو نے شنڈر کو پستول دیا تھا۔ براہ کرم ذرا سوچ کر جواب دو۔ مجھے یقین ہے تم نہیں چاہتے کہ بے گناہ لوگوں کے قتل کی ذمہ داری تم پر آئے۔

باسربا۔ میں انہیں بے گناہ نہیں کہتا۔ میں کوئی وکیل یا جج نہیں۔ محض قہوہ خانہ میں ایک بیرا ہوں جو حلال

کی روزی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب لوگ جمہوری جماعت سے جا ملتے ہیں جو خلافِ قانون ہے اور ہمارے محترم و معزز قائد کی زندگی کے خلاف سازش کرتے ہیں جنھوں نے ہم میں قومی روح از سرِ نو پھونک دی ہے اور پوری قوم کو متحد کر دیا ہے تو میں انہیں کیسے بے گناہ کہوں۔ (پر جوش نعرہ ہائے تحسین)

کنارڈ۔ باسربا کیا تمہارا یہ فرض نہیں تھا کہ جو کچھ تم نے دیکھا اور سُنا تھا اس کی اطلاع فوراً پولیس کو کر دیتے۔

سرکاری وکیل۔ کیوں؟ اُس نے کوئی ایسا جملہ نہیں سُنا تھا جس میں کہ دھمکی کا اظہار ہو۔ صرف میڈم کمان اور منسٹر پریزیڈنٹ کی ملاقات کی طرف اشارہ کیا جا رہا تھا۔

کنارڈ۔ لیکن پستول؟

سرکاری وکیل۔ یہ تو دوسرے دن کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ اصل میں بات کیا تھی۔ اور پھر گواہ کی عقل۔

جارج۔ یہ بات ہمیں تسلیم ہے۔

باسربا۔ قہوہ خانہ کے بیرے کا دماغ اُس کے پاؤں میں ہوتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ صرف اس بات سے کہ ایک آدمی نے دوسرے کو پستول دیا تھا یہ ظاہر ——

جج موریسی۔ اسلحہ یہاں ایسے ہی عام ہیں جیسے امریکہ میں۔ (معمولی ہنسی)

جج سترزوا۔ (زور سے ہنستے ہوئے) بہت خوب!

سرکاری وکیل۔ اس کے علاوہ یور لارڈشپس جیسا کہ ابتدائی بیان سے ظاہر ہوتا ہے گواہ اس خونی حادثہ کے وقوع کے بعد تین گھنٹے کے اندر پولیس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

جارج۔ کاش وہ اڑتالیس گھنٹے پہلے پہنچ جاتا۔

باسربا۔ (غصہ سے) تمہارا دماغ اس وقت کام دیگا جب تمہارا سر جسم سے الگ ہو جائیگا۔ (قہقہہ)

جج ولورا۔ (گھنٹی بجا کر) خاموش

باسربا۔ مجھے بہت افسوس ہے یور لارڈشپس۔ اگر ——

سرکاری وکیل۔ اور کوئی بات نہیں، باسربا تم جا سکتے ہو۔

باسربا۔ یعنی میرا کام ختم ہو گیا ہے۔

مالبینو۔ ہاں نیچے اترو۔

باسربا۔ یقیناً جناب، بڑی خوشی سے۔ شکریہ جناب۔ آداب عرض ہے۔ یور لارڈ شپس۔
(نیچے اُترتا ہے اور چاروں طرف دیکھتا ہے۔ مالبینو اسے چلے جانے کا اشارہ کرتا ہے)
شکریہ جناب (دائیں طرف جاتا ہے)

جارج۔ (جب باسربا دروازہ کے قریب پہنچتا ہے) بیرا، سیاہ شراب

باسربا۔ (عادتاً پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے) بہت اچھا حضور۔ (گھبرا کر) میرا مطلب ۔ میں بھول گیا۔ اُف توبہ۔ آج کا دن بھی کیسا ہے۔ (گرتا پڑتا باہر چلا جاتا ہے)

سرکاری وکیل۔ نیتو جلاد تمہاری ہنسی بند کرنا خوب جانتا ہے۔

جج ولورا (گھنٹی بجا کر) کیا اور گواہ باقی ہیں جنہوں نے لزموں کو ایک ساتھ قہوہ خانہ میں دیکھا تھا؟

سرکاری وکیل۔ جی ہاں یور لارڈ شپ۔ بیرا زمر نسکو اور پانچ دوسرے شہری جو وہاں موجود تھے

جج ولورا۔ اُن کو بلاؤ۔

سرکاری وکیل۔ یقیناً یور لارڈ شپ۔ مگر پہلے میں مجرم شنڈر کو بلاتا ہوں۔
(اُسے پکارتا ہے۔ مگر کرٹ شنڈر بالکل بے حس ہے) اسے کٹھرے میں لاؤ۔
(سنتری گلوکا اور گھیرا شنڈر کو ہلا کر اُسے اُٹھنے کو کہتے ہیں۔ شنڈر اُٹھ کر گلوکا کے ساتھ کٹھرے میں جا کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے، اس کے پیچھے ایک سنتری ہے)

جج سلوترسکی۔ کیا اس سے حلف لیا جائیگا۔

سرکاری وکیل۔ یور لارڈ شپ لزم جرمن اور پروٹسٹنٹ ہے۔ حلف ایک ایسی مقدس چیز ہے جو صرف سلاوی اور محبان وطن کے لیے مخصوص رکھنی چاہیئے۔
(جج ولورا آہستہ آہستہ جج سترزوا اور جج مورسی سے مشورہ کرتا ہے)

جج ولورا۔ اچھا حلف کی کوئی ضرورت نہیں۔

سرکاری وکیل۔ شنڈر تم جمہوری جماعت کے رکن ہو۔ ہے نہ؟ (سنتری اس کو ہلاتا ہے)

شنڈر۔ ہاں ہاں جمہوری جماعت کا رکن

جارج۔ یہ جھوٹ ہے۔ جمہوری جماعت لغو انسانوں کو رکن نہیں بنایا کرتی۔

سرکاری وکیل۔ میرے پاس شنڈر کی رکنیت کا کارڈ ہے جو گرفتاری کے وقت اس کی جیب میں تھا۔

(کارڈ عدالت کے رپورٹر کو دیتا ہے)

جارج۔ یہ کارڈ جعلی ہے۔

سرکاری وکیل۔ تم رکنیت کا رجسٹر پیش کر دو تاکہ ہم دیکھ سکیں۔

جارج۔ نہیں جناب جلاد صاحب نہیں۔ ومینسک کے تمام ظلم و ستم کے باوجود بھی میں ہرگز ایسا نہیں کرونگا۔

جج سانکو۔ ہمارے قائد کا ذکر کرتے وقت اپنی زباں کو قابو میں رکھو۔

جارج۔ وہ میرا قائد نہیں ہے۔

جج ولورا۔ رکنیت کا کارڈ ہمیں دیکھنے دو۔

(رپورٹر جج ولورا کو کارڈ دیتا ہے۔ دوسرے جج باری باری سے دیکھتے ہیں)

سرکاری وکیل۔ شنڈر کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے نسٹر پریزیڈنٹ پر گولیاں چلائی تھیں۔

شنڈر۔ کیا؟

سرکاری وکیل۔ کیا یہ ٹھیک ہے، کہ تم نے نسٹر پریزیڈنٹ پر حملہ کیا تھا؟

شنڈر۔ ہاں میں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں۔

جج ولورا۔ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟

شنڈر۔ ہاں میں نے کیا تھا؟

جج ولورا۔ کیوں وجہ کیا تھی۔

شنڈر۔ (آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے، دفعتہً) ظالم مردہ باد۔ اُس نے میری آزادی چھین لی تھی۔ میں انسان ہوں۔ کرمے شنڈر۔ ظالم مردہ باد۔

جارج۔ (کھڑے ہو کر) شاباش، شاباش، ظالم مردہ باد، قومی حکومت مردہ باد۔

جج سانکو۔ باہر نکالو اس کو

جج سانزوا (ایک ساتھ) خاموش

جج ولورا۔ لے جاؤ اس کو

کنارڈ۔ یور لارڈ شپس

(سنتری سرزبیرا اور گھبرا جارج کو کرسی سے گھسیٹ کر دروازہ کی طرف لیجاتے ہیں، وہ مقابلہ نہیں کرتا مگر برابر بولے جاتا ہے)

جارج۔ ظالم مردہ باد، عوام زندہ باد، رکووسکی مردہ باد، وسینسک مردہ باد۔

(سنتری اس کو گھسیٹ کر لیجاتے ہیں۔ عدالت میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔

جج ولورا۔ (گھنٹی بجاکر) خاموش، خاموش۔ (خاموشی ہو جاتی ہے) کارروائی جاری رکھو۔

کنارڈ۔ یور لارڈ شپ۔

جج ولورا۔ نہیں اس سے ہر قسم کی نرمی کی گئی مگر اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

کنارڈ۔ یہ بڑی اہم شہادت ہے یور لارڈ شپ، اس کو اپنے خلاف شہادت سننے کا حق ہے۔

جج ولورا۔ عدالت کا اجلاس برخاست ہونے پر اُسے یہ شہادت پڑھ کر سنا دی جائیگی۔ اچھا۔

کنارڈ۔ یور لارڈ شپ میں بڑے ادب سے درخواست ——

جج ولورا۔ خاموش! (کنارڈ بیٹھ جاتا ہے)

سرکاری وکیل۔ شنڈر کیا تم میڈم کمان اور ضیتو سے قہوہ خانہ میں حملہ سے ایک رات پہلے ملے تھے۔

شنڈر۔ قہوہ خانہ، قہوہ خانہ ڈینیوب۔ ایتھ آف اکتوبر اسٹریٹ۔

لاڈیا۔ نہیں۔

شنڈر۔ ایتھ آف اکتوبر اسٹریٹ۔ (ہاتھ ماتھے پر رکھتا ہے)

جج ولورا۔ یہ مریض معلوم ہوتا ہے۔ شنڈر کیا تم بیمار ہو۔

شنڈر۔ کیا؟ قہوہ خانہ ڈینیوب۔

سرکاری وکیل۔ یور لارڈ شپ آج صبح جیلخانہ کے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا تھا۔

منیج۔ (کھڑے ہوکر) یہ عجیب قسم کی بیماری ہے، یور لارڈ شپ

سرکاری وکیل۔ شنڈر اب غور سے سُنو

شنڈر۔ (سینہ پر ہاتھ مار کر) میں ایک جلا وطن ہوں

سرکاری وکیل۔ سنو شنڈر۔ کیا قہوہ خانہ میں دوسرے دونوں قیدیوں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم کمان کے ساتھ جا کر منسٹر پریزیڈنٹ پر گولی چلا دینا۔ ٹھیک ہے نہ؟

شنڈر۔ ہاں۔ (کنارڈ لاڈیا کو قطع کلام کرنے سے روکتا ہے۔

سرکاری وکیل۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ ہے نہ؟

شنڈر۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ تم کمان پر عاشق تھے۔ ہے نہ؟

لاڈیا۔ خوب!

شنڈر۔ (دانت پیس کر) ہاں میں اس کا عاشق تھا۔

لاڈیا۔ (کھڑے ہوکر) میں اس کو نہیں جانتی۔ میں نے کبھی اس سے بات بھی نہیں کی۔

جج ولورا۔ براہ مہربانی بیٹھ جاؤ۔ تمہیں صفائی کا حق دیا جائیگا۔

لاڈیا۔ مگر یہ ——

جج ولورا۔ مہربانی کرکے خاموش رہو۔

شنڈر۔ (ججوں کی طرف مُڑ کر) بہت سی عورتیں میرے پاس تھیں، بہت سی۔ سب مجھے چاہتی ہیں۔ میں بہت خوبصورت ہوں۔ صرف میرے نقش و نگار ہی نہیں۔ نہیں (بڑبڑاتا ہے)

سرکاری وکیل۔ اور اسی عشق کی وجہ سے تم یہ خوفناک جرم کرنے پر راضی ہوگئے۔

شنڈر۔ ہاں، خوبصورت کرٹ مجھے وہ کہتی ہیں۔

جج ولورا۔ تم نے پستول کہاں سے لیا تھا؟

شنڈر۔ کیا ؟

سرکاری وکیل۔ پستول۔ کیا خیتو نے تمہیں دیا تھا ؟

شنڈر۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ دوسرے دن کمان کے ساتھ تم منسٹر پریزیڈنٹ کے کمرہ میں گیے اور جب اس نے اشارہ کیا تو تم نے پستول داغ دیا۔ یہی واقعہ ہوا تھا نہ ؟

شنڈر۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ کیا تم اور بھی کچھ کہنا چاہتے ہو۔

شنڈر۔ نہیں، ہاں۔

جج ولورا۔ کیا ہے ؟۔

شنڈر۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے گولی سے ہلاک کیا جائے قتل نہ کیا جائے۔ یہاں ایک گولی، تاکہ میرا چہرہ بدنما نہ ہو جائے۔

(تماشائی حیرت سے اُسے دیکھتے ہیں)

جج سانکو۔ تمہیں تو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہیے، جرمن کتے۔ (شنڈر اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

شنڈر۔ (جنون کی حالت میں) گولی سے ہلاک کیا جائے قتل نہ کیا جائے۔

جج ولورا۔ ہم اس کا پورا بیان اُس وقت سُنینگے جب اس کا دماغ ٹھیک ہو جائیگا۔ کیا وکیل صفائی کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں ؟

ستاملیو۔ ابھی نہیں یور لارڈشپ۔ جب تک ہم میڈم کمان کا بیان نہ سُن لیں۔

جج ولورا۔ بس شنڈر نیچے اتر جاؤ۔

(سنتری شنڈر کو اس کی جگہ لیجاتا ہے)

جج ولورا۔ اس پر مسلسل طبی توجہ ہونی چاہیے۔ غالباً جیلخانہ کا ڈاکٹر اس قابل نہیں کہ۔

سرکاری وکیل۔ یور لارڈشپ، دوسرے ڈاکٹر کا انتظام ہو جائیگا۔

کنارڈ۔ یور لارڈشپ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کوئی نشہ آور دوا دی گئی ہے۔

جج سلوترسکی۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

جج ولورا۔ کیا کوئی ثبوت ہے۔

منیج۔ میری رائے میں یہ اسی کا اثر ہے یور لارڈشپ۔

شنڈر۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) خوبصورت کرٹ مجھے عورتیں کہتی ہیں۔

جج موریس۔ معلوم ہوتا ہے یہ اپنے حسن سے خود مسحور ہو گیا ہے۔ کاش اسے کوئی آئینہ پیش کرے۔

(قہقہہ۔ جج سترزوا کو کھانسی کا دورہ اٹھتا ہے۔ گھیرا واپس آتا ہے)

ستاملبو۔ میڈم کمان۔ اب تم تکلیف کرو۔ (لاڈیا ستری گھیرا کے ساتھ کٹھرہ میں جاتی ہے)

کلرک۔ (جج ولورا سے) یور لارڈشپ کیا اس سے حلف لیا جائیگا۔

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ، میں حلف نہیں ——

سرکاری وکیل۔ ہم باغیوں اور مجرموں کو حلف اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

کنارڈ۔ وہ ابھی مجرم ثابت نہیں ہوئی۔ اس پر صرف الزام عائد کیا گیا ہے۔

سرکاری وکیل۔ یہ امریکہ نہیں ہے۔ ہم سماج کے دشمنوں کو سزا دیتے ہیں انہیں ہیرو نہیں بناتے۔

(نعرہ ہائے تحسین)

جج ولورا۔ (گھنٹی بجا کر) کارروائی جاری رکھو۔

ستاملبو۔ میڈم کمان تم نے ڈاکٹر کانسٹائن پروان سکرٹری منسٹر پریذیڈنٹ کا بیان سن لیا ہے؟

لاڈیا۔ ہاں میں نے سن لیا ہے۔ اس میں رتی بھر بھی صداقت نہیں۔

ستاملبو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہیں ڈاکٹر پروان کی بیان کردہ باتوں میں سے کس بات سے اختلاف ہے۔

لاڈیا۔ ہر ایک بات سے۔ الف سے ے کر تے تک غلط ہے۔

جج ولورا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بیان کرو۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ منسٹر پریذیڈنٹ سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے کی غرض سے تم ڈاکٹر پروان سے نہیں ملی تھیں۔

لاڈیا۔ نہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ جب سپریم کونسل نے میرے شوہر کی سزائے موت پر مہر تصدیق ثبت کردی تو میرے لیے صرف ایک امید باقی رہ گئی۔ یعنی منسٹر پریزیڈنٹ سے التجائے رحم۔ ہر روز ایک ہفتہ تک میں اُسے خط لکھتی رہی کہ براہ کرم مجھے ملنے کی اجازت دے۔ مگر جواب ندارد۔ آخر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ میں خود وہاں جاؤں۔

جج سلوترسکی۔ کیا یہ مشورہ تمہیں جیتو نے دیا تھا۔

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ، بلکہ اس کے بالکل برعکس۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں نہ جاؤں اس نے کہا کوئی اُمید نہیں۔ لیکن میں گئی۔ میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی چاہے وہ کتنا ہی معمولی ہوتا۔

ستالملبو۔ پروان سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرو۔

جج ولورا۔ جمعرات کے دن سات مارچ کو؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ جمعرات کو میں نے ملاقات کی درخواست کی۔ اس نے میرا اور میرے شوہر کا مضحکہ اُڑایا۔ اور ہمیں خوب بُرا بھلا کہا۔ پھر اُس نے کہا دوسرے دن آنا۔ اور یہ میں بتا چکی ہوں کہ اُس نے کونسی شرائط پیش کی تھیں۔

جج مورسی۔ مگر تم نے شرائط ماننے سے انکار کردیا۔

لاڈیا۔ جی ہاں، یور لارڈشپ میں نے انکار کردیا۔ لیکن اگر ضروری ہوتا تو میں یہ شرائط مان بھی لیتی۔

سرکاری وکیل۔ ہاں ہمیں اس کا یقین ہے۔

لاڈیا۔ ہاں میں اپنے شوہر کی زندگی بچانے کے لیے سب کچھ کر گزرتی۔

سرکاری وکیل۔ چاہے منسٹر پریزیڈنٹ ہی کو قتل کرنا پڑتا۔

لاڈیا۔ میں اس جرم سے بالکل بری ہوں۔ جب میں دوسرے دن وہاں گئی تو ڈاکٹر پروان نے مجھے بتایا کہ منسٹر پریزیڈنٹ سے پیر کا دن ملاقات کے لیے مقرر ہوا ہے۔ میں بے انتہا خوش ہوئی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ انکار کردیگا۔

جج ترزاوا۔ اور کیا ڈاکٹر پروان نے اشارۃً ــــــ یعنی اُس نے پھر درخواست کی ــــــ؟

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ۔ اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ بڑی اچھی طرح سے پیش آیا۔ میرا خیال تھا شاید

ہیں نے اُس کے متعلق غلط رائے قائم کی ہے۔ میں نے جرأت کر کے یہ بھی پوچھ لیا کہ کیا میں اپنے ساتھ کسی کو لاسکتی ہوں۔

جج سلوترسکی۔ کیوں؟

لاڈیا۔ میں چاہتی تھی جارج میرے ساتھ چلتا۔ وہ فصاحت کے دریا بہا سکتا ہے اور دوسرے کو ہموار کرنے کا طریقہ اُسے خوب آتا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ منسٹر پریزیڈنٹ کے سامنے میری ہمت جواب دیدیگی اور میں کچھ نہ کہہ سکونگی۔

ستاملبو۔ آگے چلو۔

لاڈیا۔ جب میں ایوانِ وزارت سے واپس ہوئی تو سیدھی ضینو کے کمرہ پر گئی۔ مگر ——

سرکاری وکیل۔ تم اُس کے کمرہ پر گئی تھیں؟

لاڈیا۔ ہاں ہم دونوں قدیم دوست ہیں۔

سرکاری وکیل۔ بیشک میں تسلیم کرتا ہوں

لاڈیا۔ جارج اور میں دوست ہیں۔ ہمارا مضبوط ترین رشتہ یہ ہے کہ ہم دونوں الگزنڈر سے بیحد محبت کرتے ہیں۔

جج ولورا۔ تم نے اورضینو نے پھر کیا کیا؟

لاڈیا۔ وہ مکان پر نہیں تھا یور لارڈشپ۔ میں وہاں اس مضمون کا ایک رقعہ چھوڑ آئی کہ ملاقات کا انتظام ہوگیا ہے اور میں اُسے ساتھ لیجانا چاہتی ہوں۔ دوسرے دن ہفتہ کو اس کا جواب آیا کہ میں اُسے اتوار کی شام کو قہوہ خانہ ڈینیوب میں ملوں۔

جج مورسی۔ تو پھر تم اتوار کی شام کو قہوہ خانہ ڈینیوب میں موجود تھیں! اور ضینو بھی تھا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ، میں اپنی چھوٹی بچی کو لے کر اس سے ملنے کے لیے گئی ہم اکثر وہاں ملا کرتے تھے۔

جج ولورا۔ تمہاری بچی تمہارے ساتھ تھی؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔ میں نے اسے ملاقات کی اجازت ملنے کی خوشی میں سینما لے جانے کا وعدہ کیا تھا، مگر پہلے ہم جارج سے ملنے قہوہ خانہ میں گئے۔ ہم نے فوراً آنے والی ملاقات پر تبادلۂ خیالات شروع کر دیا۔ میں نے

اُس سے درخواست کی میرے ساتھ چل کر الگزنڈر کے لیے رحم کی التجا کرے۔ لیکن اُسے خوف تھا کہ اس کی موجودگی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ آخر کار اُس نے مجھے یقین دلادیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے اور میں تنہا جانے پر راضی ہوگئی۔

سرکاری وکیل۔ اُسے اپنی گرفتاری کا خوف تھا۔ ہے نہ؟

لاڈیا۔ اُسے کسی چیز کا خوف نہیں۔

سرکاری وکیل۔ خیر معلوم ہو جائیگا۔

ستالمبو۔ پھر کیا ہوا؟

لاڈیا۔ ہم قہوہ خانہ سے اُٹھے۔ سونیا اور میں ٹرنٹی بلیو رڈ پر پلیس سینما کی طرف روانہ ہوئے اور جارج دوسری طرف

ستالمبو۔ وہ تمہارے ساتھ ہی قہوہ خانے سے روانہ ہوا؟

لاڈیا۔ ہاں ہم نے دروازہ پر ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ میں جلدی سے جانا چاہتی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہہ دیا تھا ملاقات کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلیگا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے آنسو دیکھ لے۔ سونیا بھی رو رہی تھی۔

ستالمبو۔ اور شنڈر؟ جب تم ضیتو سے باتیں کر رہی تھیں تو کیا وہ تمہارے ساتھ بیٹھا تھا۔

لاڈیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بالکل غلط، سراسر جھوٹ، وہاں کوئی نہیں تھا۔ صرف سونیا، جارج اور میں۔

سرکاری وکیل۔ کیا تمھیں اس سے انکار ہے کہ اس وقت شنڈر قہوہ خانہ میں موجود نہ تھا

لاڈیا۔ میں کیسے انکار کر سکتی ہوں۔ وہ اتوار کی شب تھی، وہاں سینکڑوں لوگ تھے ـــــ بہت سے آجا رہے تھے۔ ممکن ہے وہ دوسری میز پر بیٹھا ہو۔ میں کسی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے صرف اپنے شوہر کا خیال تھا اور یہ کہ اگلی صبح کونسٹر پریزیڈنٹ سے کیا کہا جائے۔

کنارڈ۔ کیا جارج نے کسی کو پستول دیا تھا۔ شنڈر یا کسی دوسرے کو۔ یعنی اپنی جیب سے نکالا تھا۔

لاڈیا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم صرف ملاقات کی بابت گفتگو کرتے رہے۔

ستالمبو۔ اب پیر کا دن آتا ہے ـــــ ملاقات کا روز۔ تم ایوانِ وزارت میں گئی تھیں؟

لاڈیا۔ ہاں۔

جج سلوترسکی۔ تنہا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ، تنہا۔

ستاملبو۔ جو کچھ ہوا، بیان کرو۔

لاڈیا۔ منسٹر پریزیڈنٹ کے خاص کمرہ سے متصل ایک کمرہ میں میں نے ملازم کو اپنا نام بتایا۔ وہ کمرہ میں گیا اور واپس آکر مجھ سے کہا کہ میں ذرا انتظار کروں۔

ستاملبو۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے؟

لاڈیا۔ ہاں شاید پانچ یا چھ۔ کلرک اور افسر برابر آجا رہے تھے۔

ستاملبو۔ کیا ان لوگوں میں کرٹ شنڈر بھی تھا؟

لاڈیا۔ ہاں۔

جج ولورا۔ جب تم پہنچیں تو شنڈر اس کمرہ میں موجود تھا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔

جج مورسی۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ تم اُسے نہیں جانتی تھیں۔

لاڈیا۔ جی ہاں میں اُسے نہیں جانتی تھی، میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تھا۔

جج مورسی۔ اس کے باوجود تمہیں یاد ہے کہ وہ وہاں بیٹھا تھا؟

لاڈیا۔ جی ہاں ایک خاص وجہ سے۔

جج ولورا۔ کس وجہ سے؟

لاڈیا۔ وہ میری طرف گھور رہا تھا۔ جب تک میں وہاں انتظار کرتی رہی اُس نے اپنی آنکھیں میرے چہرہ سے نہیں ہٹائیں۔ مجھے بڑی بے چینی سی محسوس ہوئی۔

ستاملبو۔ کیا اُس نے تم سے کوئی بات بھی کی تھی۔

لاڈیا۔ نہیں، بس وہ بیٹھا گھورتا ہی رہا۔

ستاملبو۔ کیا تم نے اُس سے کچھ کہا تھا۔

لاڈیا۔ بالکل نہیں۔

ستاملبو۔ کتنی دیر تک تمہیں انتظار کرنا پڑا۔

لاڈیا۔ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتی، شاید بیس منٹ یا نصف گھنٹہ، یہ مدت بڑی طویل معلوم ہوئی تھی۔

ستاملبو۔ اور پھر؟

لاڈیا۔ منسٹر پریزیڈنٹ کے کمرہ کا دروازہ کھلا اور جنرل رکووسکی وزیر تمدن وترقی باہر آیا۔

جج ولورا۔ منسٹر پریزیڈنٹ کے کمرہ سے جنرل رکووسکی باہر آئے۔

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ

ستاملبو۔ اچھا، آگے۔

لاڈیا۔ ہر ایک نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

سرکاری وکیل۔ کیا تم نے بھی کھڑے ہو کر سلام کیا؟

لاڈیا۔ میں کھڑی ہو گئی تھی لیکن سلام نہیں کیا۔

جج سانکو۔ سلام کیوں نہیں کیا؟ (لاڈیا خاموش ہو جاتی ہے) جواب دو۔

لاڈیا۔ میرا خیال ہے اس کا جواب بالکل صاف ہے یور لارڈشپ

جج سانکو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جواب دو۔ چاہے صاف ہو یا کچھ اور۔

لاڈیا۔ یور لارڈشپ میں نے اس لیے سلام نہیں کیا کہ میرے دل میں جنرل رکووسکی کی کوئی عزت نہیں۔

(تماشائی حیرت سے دیکھتے ہیں)

جج ولورا۔ اچھا پھر کیا ہوا؟

لاڈیا۔ جنرل رکووسکی نے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور کمرہ سے چلا گیا۔ پھر ایک ملازم نے مجھ سے کمرہ میں داخل ہونے کے لیے کہا۔ میں داخل ہوئی شنڈر بھی میرے ساتھ داخل ہوا۔

جج ولورا۔ شنڈر بھی تمہارے ساتھ داخل ہوا؟

لاڈیا۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔

کنارڈ۔ تمہیں تعجب نہیں ہوا۔

لاڈیا۔ نہیں۔ میں سمجھی شاید یہ کوئی سیکرٹری ہے یا پولیس کا آدمی جو میری نگرانی پر مامور کیا گیا ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ وہ بغیر کسی سوال اور رد و ک ٹوک کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

ستالمبو۔ جب تم داخل ہوئیں تو کمرہ میں اور کون تھا؟

لاڈیا۔ صرف منسٹر پریزیڈیٹ اور ڈاکٹر پروان۔

ستالمبو۔ پھر تم نے منسٹر پریزیڈنٹ کے سامنے رحم کی درخواست شروع کر دی

لاڈیا۔ ہاں فوراً۔ مجھے صرف دس منٹ دیے گئے تھے۔

کنارڈ۔ کیا کہا تم نے؟

سرکاری وکیل۔ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ـــ اس لیے کہ یہ سب ـــ

جج ولورا۔ اُسے پوری سرگزشت سُنانے دو۔

لاڈیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا الفاظ استعمال کیے۔ اس کے سامنے پہنچ کر ہر چیز بدل گئی۔ میں نے دل کی گہرائی اور الگزنڈر کی محبت کے جوش میں جو مُنہ میں آیا کہا۔ میں نے اُسے ایک انسان سمجھ کر مخاطب کیا۔ مدبر سمجھ کر نہیں۔ میں نے اُس سے فیاضی، رحم اور انسانیت کے نام پر التجا کی۔ میں نے کہا الگزنڈر کا قصور جو کچھ بھی ہو، اُس نے کیسی ہی سیاسی غلطیاں کی ہوں ان کی سزا موت نہیں ہو سکتی۔ شاید جلاوطنی یا قید مگر موت نہیں۔ بیشک اُس نے حکومت کی مخالفت کی تھی اور اُسے سزا ملنی چاہیے لیکن موت! یہ سخت اور ظالمانہ سزا ہے۔ "تم ایک مضبوط آدمی ہو" میں نے اُس سے کہا، "ایک طاقتور انسان، تم نے میرے شوہر کو شکست دی ہے، تمہیں اُس کی زندگی کی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اُس کی جان بخش دو ساری دنیا تمہاری فیاضی کو سراہیگی۔ ہمیں اُس کی ضرورت ہے، مجھے اور سونیا کو، وہ ہمیں پیارا ہے، اُس کی جان بخش دو" میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں نے زبان بند کر دی۔ (رونے لگتی ہے)

ستالمبو۔ اور اس کا جواب کیا ملا؟

لاڈیا۔ (اپنے آپ پر قابو پا کر) صاف اور کورا جواب۔ اُس نے الگزنڈر پر بہت بہتان تراشے، اُسے

باغی، مجرم اور نہ معلوم کیا کیا کہا۔ میں نے سُنا بھی نہیں۔ میں سمجھ گئی کہ میری آخری اُمید بھی ختم ہوئی۔

گنارڈ۔ ڈاکٹر پروان نے کہا ہے کہ تم نے شنڈر کی طرف متوجہ ہو کر کہا "جیسا میرا خیال تھا ویسا ہی ہوا، اب کوئی اُمید نہیں۔ کرٹ اب ایک ہی چیز باقی ہے" کیا یہ صحیح ہے؟

لاڈیا۔ بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ میں نے آج تک شنڈر سے بات نہیں کی۔ ممکن ہے میں نے کہا ہو "اب کوئی اُمید نہیں" لیکن یہ اس لیے کہ اپنے خیالات کا بلند آہنگی سے اظہار کر رہی تھی، اور مایوسی کا مجھ پر غلبہ تھا۔

ستاملبو۔ اور پھر؟

لاڈیا۔ پھر؟ پھر میں جانے کے لیے مُڑی۔ میں جلدی سے باہر نہیں نکل سکی۔ دفعتہً میں نے ایک چیخ سُنی میں نے شنڈر کو پستول ہاتھ میں لیے دیکھا۔ دھماکے کی آواز آئی، آئینہ چکنا چور ہو گیا۔ مسٹر پریذیڈنٹ گر پڑا۔ پروان شنڈر سے گتھم گتھا ہو گیا۔ کمرہ میں بہت سے لوگ آ گئے اور ایک لمحہ میں یہ سب کچھ ہوا۔ بس یہ ہے سارا واقعہ۔ اس کا ہر لفظ صحیح اور درست ہے۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں۔

جج سانکو۔ کیا تمہیں اس امر سے انکار ہے کہ تم جمہوری جماعت کی رکن ہو۔

لاڈیا۔ نہیں مجھے اس سے انکار نہیں۔

جج سانکو۔ یعنی تمہیں تسلیم ہے کہ تم باغی ہو

لاڈیا۔ نہیں یور لارڈشپ۔ باغی نہیں بلکہ وطن کی سچی خیرخواہ جس کی خواہش یہ ہے کہ بدقسمت لوگ آزادی مسرت اور امن کی زندگی بسر کریں۔

جج سانکو۔ بکواس نہ کرو۔ میں تمہیں منع کرتا ہوں کہ اس کٹہرے کو اپنے باغیانہ خیالات کی اشاعت کا ذریعہ نہ بناؤ۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ تم قومی حکومت کو ختم کرنے کی سازش میں شریک ہو؟

لاڈیا۔ میں اُن میں سے ایک ہوں جن کا مطالبہ یہ ہے کہ لوگوں کو خود اپنے حکمراں منتخب کرنے کا حق ہونا چاہیے

سرکاری وکیل۔ کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ جمہوری جماعت کے سرغنہ حکومت کے اراکین اور ہمارے قائد کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے۔

لاڈیا۔ ہاں میں قطعی انکار کرتی ہوں۔

سرکاری وکیل۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تمہارے شوہر نے ایسی سازش کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے تو تم کیا کہو گی؟

لاڈیا۔ میں کہونگی کہ یہ ایک اور جھوٹ ہے۔

سرکاری وکیل۔ تم غلطی پر ہو۔ میرے پاس اُس کا تحریری اعتراف موجود ہے۔

(عدالت کے کمرہ میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔

لاڈیا۔ (ججوں سے) کیا اسے توقع ہے کہ کوئی اس بات پر یقین کر لیگا۔

جج ولورا۔ تم کہتے ہو کہ تمہارے پاس الگزنڈر کمان کا تحریری اعتراف موجود ہے۔

سرکاری وکیل۔ جی ہاں یور لارڈ شپ۔ کیا آپ اُسے سُننا چاہتے ہیں۔

جج ولورا۔ ہاں ضرور

سرکاری وکیل۔ (پڑھتا ہے) "میں الگزنڈر کمان ——"

جج سلونرسکی۔ کیا اس پر کوئی تاریخ ہے؟

سرکاری وکیل۔ جی یور لارڈ شپ۔ اس پر کل کی تاریخ ہے۔ شام کو ½ ۸ بجے۔ کیا میں پڑھوں۔

جج ولورا۔ ہاں۔

سرکاری وکیل۔ "میں الگزنڈر کمان جو اس زمین پر صرف گنتی کے چند گھنٹوں کا مہمان ہے اور اس جرم کے وزن کو ہلکا کرنا چاہتا ہے جو اس کے ضمیر پر بار ثابت ہو رہا ہے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے غداری اور سازش جیسے جرائم کیے ہیں جس کی سزا مجھے دی گئی ہے۔ میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں اور حکومت سے معافی کا خواستگار ہوں۔ ہمارے محترم قائد پر اس حملہ سے عوام میں نفرت و حقارت کے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں اُنہوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں کس قدر خوفناک جرائم کا مرتکب ہوا ہوں۔ حملہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ میں اپنی بیوی، نیتو اور دوسرے لوگوں سے متفق تھا کہ اگر دیگر ذرائع ناکام رہیں تو منسٹر پریزیڈنٹ کے قتل سے حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ خدا کا شکر ہے یہ سازش

ناکام رہی۔ اس کا کفارہ میں اپنی جان دے کر ادا کرتا ہوں" دستخط الگزنڈر کمان

(پڑھنے کے دوران میں کمرہ عدالت میں ہلچل زیادہ ہو جاتی ہے۔ صرف لاڈیا حالت سکون میں ہے

جج ولورا۔ ہمیں یہ اعتراف دیکھنے دو۔

سرکاری وکیل۔ (دیتے ہوئے) یہ کمان کی اپنی تحریر ہے۔

لاڈیا۔ یور لارڈشپس یہ جعلی ہے۔

سرکاری وکیل۔ اس پر جیلخانہ کے دو سنتریوں کی گواہی ہے۔ وہ اس کے اصل ہونے کی تصدیق کر دینگے۔

لاڈیا۔ حکومت کے گرگے! ان کی حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ جعل ہے۔

جج مورسی۔ کیا اس کے جعلی ہونے کا کوئی ثبوت بھی ہے۔

لاڈیا۔ ثبوت میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں۔ کیا آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں، یور لارڈشپس یہ تو بہت آسان بات ہے۔ کسی کو جیلخانے بھیجیے، وہ وہاں ہے۔ ایک کال کوٹھری میں، زنجیروں میں جکڑا ہوا تین ماہ سے وہ وہاں ہے۔ اُس کو بلوا لیجیے، اُس کو یہاں لائیے، اُس کو یہاں کھڑا ہونے دیجیے۔ اگر وہ اب تک کھڑے ہونے کے قابل ہے اور اُسے یہ جعلی اعتراف دکھا دیجیے۔ اُس سے پوچھیے کہ کیا یہ اُسی کا ہے اور جب وہ جواب دیگا تو آپ پر صداقت واضح ہو جائیگی۔

سرکاری وکیل۔ بدقسمتی سے یور لارڈشپس الگزنڈر کمان کو یہاں بلانا ناممکن ہے۔

جج ولورا۔ ناممکن کیوں؟

سرکاری وکیل۔ آج صبح سویرے اُس نے خودکشی کر لی ہے۔ (سنسنی پھیل جاتی ہے)

لاڈیا۔ (چیخ کر) ہائے، انھوں نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ قاتل، جانور، جنگلی

کنارڈ۔ (آگے بڑھ کر) لاڈیا

لاڈیا۔ انھوں نے اس کو مار ڈالا ہے۔ (جارج کی پستول میز سے اُٹھا لیتی ہے)

کنارڈ۔ روکو اس کو، خدا کے لیے روکو۔

(ایک عورت چیختی ہے۔ لاڈیا پستول کا رخ اپنے سینہ کی طرف کرتی ہے مگر چلانے سے پیشتر ہی

کنارڈ اور ایک سنتری اُس سے پستول چھین لیتے ہیں۔

لاڈیا۔ نہیں نہیں، مجھے مرنے دو۔ الگزنڈر، الگزنڈر!

(کنارڈ اور سنتری اُسے تسلّی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جج دلور گھنٹی بجاتا ہے۔ عدالت کے کمرہ میں شور و غل ہے)

پردہ گرتا ہے

(باقی)

اِقبال کی یاد

(از جناب آلِ احمد صاحب سرور علی گڑھ)

ابھی مسعود کے ماتم سے سنبھلی بھی نہ تھی ملت
خبر آئی کہ ہم سے ہوگیا اقبال بھی رخصت

مسلمانوں کو مسلماں کردیا جس کے ترانوں نے
قسم کھائی ہے جس کے نطق کی معجز بیانوں نے

وہ جس نے اپنے نغموں سے وطن کی آبرو رکھ لی
چمن کی خوش نوایانِ چمن کی آبرو رکھ لی

وہ جس کے ساز سے بیداریاں بکھریں فضاؤں میں
وہ جس کے دم سے طوفاں جاگ اُٹھے ٹھنڈی ہواؤں میں

وہ جس نے خاکیوں میں عرشیوں کی عظمتیں بھردیں
وہ جس نے خلوتوں میں محفلیں آراستہ کردیں

وہ جس کی چشم روشن محرمِ اسرارِ فطرت تھی
وہ جس کی فکر رنگیں طرۂ دستارِ فطرت تھی

وہ جسکی خوش نوائی سے چمن میں پھول کھلتے تھے
وہ جسکی شعلہ افشانی سے دل سینوں میں ہلتے تھے

ہر اک ساحل کو ہم آغوشِ طوفاں کردیا جس نے
بیابانوں کو رشک صد گلستاں کردیا جس نے

وہ جس نے شاعری میں زندگی کا عکس دکھلایا
ہماری زشت روئی کے لئے جو آئینہ لایا

فضائے لامکاں تک رخصتِ پرواز تھی جسکی
نوائے قدس سے ملتی ہوئی آواز تھی جسکی

وہ جس نے آشیاں کی خاک میں چنگاریاں بھردیں
رگوں میں خون کے بدلے تڑپتی بجلیاں بھردیں

وہ ساقی جسکی مینائے سخن میں تیغ کی تیزی
وہ واعظ پند میں جس کی جوانی کی دلآویزی

بہارِ رنگ و بو میں، بجلیاں کھولی ہوئے پرچم
کبھی طوفاں، کبھی ساحل، کبھی شعلہ، کبھی شبنم

فقیر بے نوا تھا عظمت شاہانہ رکھتا تھا
وہ عاشق تھا مگر انداز معشوقانہ رکھتا تھا

وہ جس کا دل نہ تھا عشقِ الٰہی کا خزانہ تھا
تکلم عالمانہ تھا، تخیل شاعرانہ تھا

وہ جسکی موت کا ہندوستاں میں آج ماتم ہے
مگر عظمت سے جسکی مسلم ہندی معظم ہے

اُٹھیگا فخر سے سر عالم اسلام کے آگے
حجاز و مصر کے آگے، عراق و شام کے آگے

وہ جس نے ڈوبتی نبضوں میں دوڑایا لہو اپنا — بیابانوں کے دل میں بھر دیا ذوقِ نمو اپنا

وہ جس نے حریت کے راز بتلائے غلاموں کو — وہ جس نے سجدے کے آداب سکھلائے اماموں کو

دلِ یخ بستہ کو ذوقِ عمل کی آنچ دی جس نے — ہجومِ یاس میں چمکائی اپنی روشنی جس نے

حریمِ حسن کے پردے اُٹھائے، رازِ حق کھولے — فرشتوں کے عمل انسان کی میزان پر تولے

وہ شاعر جس نے اسرارِ خودی کا راگ گایا تھا — وہ غازی موت کا مُنہ دیکھ کر جو مسکرایا تھا

وہ مے کش دے گواہی حور جس کی پارسائی کی — وہ مومن بندگی میں شان تھی جسکی خدائی کی

زعیمِ ملک و ملت رہبرِ دیں، رندِ بے پروا — کلیمِ طورِ معنی، علم کا بہتا ہوا دریا

وہ جس نے زندگی میں پھونک دی تابندگی ایسی — جسے خود موت کی ظلمت بھی مدھم کر نہیں سکتی

شفق ہر شام کو اسکی لحد پر پھول لاتی ہے — نسیم جانفزا ہر صبح یہ نغمہ سناتی ہے

یہاں ملتا رہیگا سوز و سازِ آرزو برسوں
کیا ہے خونِ دل سے ایک قلندر نے وضو برسوں

تنقید و تبصرہ

وفاق ہند | از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ۔ سائز ۲۲×۱۸/۱۶ صفحات ۱۶۰ ۔ قیمت عہ؍
ملنے کا پتہ :۔ اُردو لٹریچر کمپنی، دہلی ۔

وفاق ہند "سلسلہ آئین عالم" کی پہلی کڑی ہے ۔ لیکن کتاب سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سلسلہ کی آئندہ کڑیاں کون کون سی ہونگی اور دنیا کے کس کس ملک کے دستور کو اسی انداز پر پیش کیا جائے گا ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض مصالح کی بنا پر کسی کتاب کو ایک خاص سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ اسکی آئندہ کڑیاں شایع کرنا مقصود بھی نہیں ہوتا ۔ کاش اس مفید سلسلہ کا یہ حشر نہ ہو ۔

بہرحال یہ کتاب ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری کی تصنیف ہے ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس زمانے میں جبکہ وفاق ہند کے دستور نے مختلف مدارج طے کئے حکومت ہند کے پبلک انفرمیشن بیورو کے ڈپٹی ڈائرکٹر تھے ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس دستور کے رموز و نکات پر آپ کو جتنا عبور حاصل ہو سکتا ہے اُتنا کسی دوسرے کو ہونا مشکل ہے ۔ یقیناً آپ نے یہ کتاب تصنیف کر کے اہل سیاست کی مفید خدمت انجام دی ہے جس کے لئے آپ داد کے مستحق ہیں ۔ اُمید ہے کہ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اُردو داں حضرات حوالہ جات کے سلسلہ میں اسے کارآمد پائیں گے ۔

گذارش کے ذیل میں ناشرین لکھتے ہیں کہ " قانون ہند ۱۹۳۵ء یا جدید دستور پر موافق یا مخالف رائے ظاہر کرنے سے جان بوجھ کر پہلو بچایا گیا ہے ۔۔۔ اس سے غرض یہ ہے کہ ۔۔۔ اس پر کسی ایسے شبہ کی پرچھائیں بھی نہ پڑ سکے کہ یہ کتاب کسی خاص سیاسی مسلک یا عقیدے کا پروپگنڈا ہے " اور پیش لفظ کے تحت میں ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ تحریر فرماتے ہیں کہ " وفاق ہند گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس میں قیام وفاق اور اصول وفاق کو ایک مستقل موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے "

کتاب کے شروع میں قابل مصنف نے سیاسیات ہند کا تاریخی پس منظر بھی دیا ہے یعنی غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی اہم آئینی تبدیلیوں پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد وفاق کی اسکیم اس کی تمام و کمال جزئیات کے ساتھ پیش کی ہے موضوع کی "خشکی" کے باوجود کتاب کی زبان اتنی سادہ اور انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ سر سلیمان کی دونوں رائیں اپنی اپنی جگہ پر غالباً صحیح ہو سکتی ہیں یعنی ایک طرف تو " یہ کتاب ایک تاریخی کہانی معلوم ہوتی ہے " اور دوسری طرف " لائق مصنف نے جس قابلیت سے اس کا پس منظر تیار کیا ہے اس نے وفاق ہند کو ایک عالمانہ سیاسی تصنیف کی شان بخش دی ہے "۔

بہرحال ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے سلسلہ میں ڈاکٹر جعفری اپنے مقاصد میں کامیاب ہیں۔ (م۔ع۔خ)

زرتاج | یعنی سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۱۳۶ قیمت فی جلد عمہ۔ عہدہ داران اور ذی ثروت حضرات سے عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب جناب قیس حیدرآبادی کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے تین افسانے (زرتاج۔ ماں اور کنول) غالباً طبعزاد ہیں۔ تین افسانے (جبکہ دنیا بچہ تھی۔ ہنگامۂ چشمک اور حب وطن) دوسری زبان کے افسانوں سے ماخوذ ہیں اور باقی پانچ ترجمہ ہیں۔

دنیا میں کوئی زبان جب ترقی کی طرف رخ کرتی ہے تو شروع شروع میں اس زبان کے اہل قلم افسانوں کی طرف جھک پڑتے ہیں اس لئے ہم اردو زبان میں افسانہ نویسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھ کر نہ مایوس ہوتے ہیں اور نہ اسے شگون بد سمجھتے ہیں۔ بہرحال اس وقت ہندوستان میں بہت سے افسانہ نویس موجود ہیں لیکن ان میں ایسے لوگ کم ہیں جو ان کی اشاعت کے لئے سرمایہ بھی رکھتے ہوں۔ خوش قسمتی سے جناب قیس کو یہ دونوں چیزیں میسر تھیں اس لئے انکا یہ مجموعہ پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ (م۔ع۔خ)

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

رفتارِ زمانہ کا مضمون برتنا بہت مشکل ہے اس لئے کہ زمانے کی کوئی ایک رفتار نہیں ہوتی کبھی تو وہ ایسی تیزی سے بھاگنے لگتا ہے کہ اس کی تصویر بہ جاتی ہے، چاہے جتنی جلدی بھی اتاری جائے کبھی وہ ایسا سست ہو جاتا ہے کہ قلم ہاتھ میں لئے ہفتوں سوتے رہیئے اور پھر آنکھ کھولئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ وہ چھلانگ مارنے کے لئے اپنا بدن سمیٹ رہا ہے۔ لیکن جیسے ہی تصویر اتارنے کا سامان کر چکے ویسے ہی یہ بھید کھل جاتا ہے کہ یہ ایا بیچ کی انگڑائی تھی اس سے حرکت کرنا نہیں حرکت سے بچنا مقصود ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک کرتب دیکھنے میں آیا۔ مئی کے آخر میں جب چیکوسلوواکیا کی میونسپلٹیوں اور مقامی حکومت کے دوسرے اداروں کے انتخاب ہو رہے تھے تو کچھ ایسا لگتا تھا کہ ہر طرف الٹیمیٹم بھیجے جائیں گے اور انہیں کے پیچھے پیچھے بم اور توپ کے گولے پہنچیں گے۔ لیکن پھر معاملہ کچھ ایسا دب گیا کہ جیسے کچھ ہوا نہ تھا اور ہونے والا نہ تھا۔ چیکوسلوواکیا کے جرمن ابھی تک جرمنی سے وصل کے لئے اس طرح بیتاب ہیں جیسے کہ انتخاب کے زمانے میں اور ہر ہٹلر کی تدبیر بھی سازگار ہے۔ لیکن ان کی پہلی کوشش منہ میں ناکامیابی کی کڑواہٹ چھوڑ گئی ہے آپ کو یاد ہو گا کہ وسط مارچ میں انہیں دنوں میں جبکہ آسٹریا پر ہر ہٹلر کا قبضہ ہو گیا تھا پولینڈ اور لتھوئنیا کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پولینڈ نے لتھوئنیا کو یہ الٹیمیٹم دیا تھا کہ آمد و رفت کے لئے سرحد کو کھول دے، جو کہ سترہ اٹھارہ سال سے بند تھی اور وہ تمام تعلقات، جو دو ریاستوں میں جس کے درمیان لڑائی نہیں ہے، ہونے چاہیئے۔ قائم کرے۔ ورنہ اس کا نتیجہ برا ہو گا۔ پولینڈ کے اس الٹیمیٹم کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ سرحد پر لتھوئنیا کے چند سپاہیوں نے پولینڈ کے سپاہیوں پر یا پولینڈ کے سپاہیوں نے لتھوئنیا کے سپاہیوں پر گولی چلا دی تھی اصل سبب یہ تھا کہ لتھوئنیا کا روس سے معاہدہ

ہے جس کے مطابق روس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی فوج کو جنگ کی حالت میں لتھوئنیا کی زمین پر سے گذارے اور اس کے بدلے میں روس نے لتھوئنیا کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیا ہے اب اگر آپ حساب لگائیں تو معلوم ہوگا کہ روس سرحد، برلن سے اتنی دور ہے کہ روسی ہوائی جہاز اس پر بمباری نہیں کر سکتے، لیکن اگر لتھوئنیا کے مغربی حصے میں کہیں قدم رکھنے کا موقع مل جائے تو یہ آسانی سے ممکن ہے اس لئے جب چکوسلوواکیا کے وزیر اعظم نے اس کی خبر پاکر ہر ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اعلان کیا کہ ان کی قوم اپنی آزادی اور ملک کو سلامت رکھنے کے لئے خون بہانے میں تامل نہ کرے گی اور اسی کے ساتھ روسی حکومت نے چکوسلوواکیا کی مدد کو پہنچنے کا وعدہ کیا تو ہر ہٹلر نے اپنے دوست پولینڈ کے وزیر خارجہ کرنل بک کو بلایا اور باہمی مشوروں کے بعد یہ طے پایا کہ لتھوئنیا کے گھونسا مار کر دیکھا جائے کہ روس پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ سٹالن نے چوں نہیں کی اور ہٹلر کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا پھر انگلستان اور فرانس کے تیور دیکھنا تھے کہ چکوسلوواکیا سے جنگ کا قصہ چھڑنے پر کیا ہوں گے۔ برطانوی مدبروں کی گول گول باتوں سے پہلے تو اندازہ ہوا تھا کہ انھیں چکوسلوواکیا سے کوئی خاص ہمدردی نہیں وہ اندرون یورپ کے کسی معاملے میں الجھنا نہیں چاہتے، لیکن جب چکوسلوواکیا کی سرحد کے قریب جرمن فوجوں کے پہنچنے کی خبر ملی اور فرانس نے ہمت کر کے چکوسلوواکیا کی مدد کرنے کا غیر مشروط وعدہ کر لیا تو برطانوی سفیر کو بھی ہدایت دی گئی کہ وہ جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فون ربن ٹروپ سے فوجوں کی نقل و حرکت کے معنی پوچھے، اور اس طرح پوچھے کہ وہ سمجھ جائیں کہ ٹھیک ٹھیک جواب دئے بغیر کام نہ چلے گا اس نے چکوسلوواکیا کو بچا لیا، اور کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر برطانوی حکومت سے آخری وقت تک فیصلہ نہ کرتا، اور دنیا پر اپنا ارادہ ظاہر نہ کرتا اپنا خاص مشرب نہ بنا لیا ہوتا تو اس وقت یورپی سیاست کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔

ہٹلر کا یہ پہلا وار ہے جو کہ خالی گیا ہے، اور اس کے بعد اس کی جو چالیں ہوں گی ان میں اسے خیال رکھنا ہوگا کہ برطانیہ کا شیر بالکل شیر قالین نہیں، وہ بھرے پیٹ کی نیند سو رہا ہے تو کیا کبھی کبھی چونک بھی پڑتا ہے۔ اب ہٹلر کی چالیں زیادہ گہری ہوں گی جس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ زیادہ

احتیاط کرے گا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کی چالوں کا توڑ جنگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کے لئے چین سے رہنا ممکن نہیں اس کی سیاست اور شخصیت کی بنیاد ہی بے چینی پر، اور ہر وقت کوئی نہ کوئی گرد کھلاتے رہنے پر ہے۔ اب آیئے ذرا سوچیں کہ وہ کرے گا تو کیا کرے گا۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ جنوبی ڈنمارک پر، ڈانٹزگ کے آزاد شہر اور مغربی پولینڈ کے اس علاقے پر جو جرمنی اور مشرقی پرشا کو الگ کئے ہوئے ہے اور چکوسلوواکیا کے ان حصوں پر جہاں جرمن آباد ہیں ہٹلر کے دانت لگے ہوئے ہیں، انگلستان اور فرانس نے چکوسلوواکیا کا نوالہ اس کے منہ سے نکال لیا ہے اور اس نے اس کی بھوک اور غصے کو بڑھا دیا ہوگا اس کی کسر نکالنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ جنوب مشرقی یورپ میں تجارت کو سیاست کا اور سیاسیات کو تجارت کا سہارا دے کہ اپنا اثر بڑھائے آسٹریا پر قبضہ ہو جانے سے دریائے ڈینیوب کی تجارتی شاہ راہ، جو بہت اہمیت رکھتی ہے بڑی حد تک اس کے اختیار میں آگئی ہے اور یہ تو اب سے بارہ چودہ برس پہلے کی بات ہے کہ جرمنی نے اس طرف کے تمام ملکوں کے کاروبار کو اپنے کاروبار سے اس طرح الجھا دیا ہے کہ وہ کسی اور سے تجارت کر ہی نہیں سکتے۔ ہنگری اس کی طرف مائل ہے پولینڈ کی سیاست اس کی گرویدہ، رومانیہ کو اس سے بڑا گاہک نہیں مل سکتا، اور باقی سارے ملک، جو چاہتے ہیں کہ زبردست کا ساتھ ہو کہ کمزور کا نہ ہو اس کی طاقت سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ اب ہٹلر کو جنوب مشرقی یورپ پر حاوی ہو جانے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ ادھر وہ چپکے چپکے وینس سے سیدھ لگا کر بحر اڈریاٹک تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس میں وہ کامیاب ہوا تو بحر روم کا ایک رستہ نکل آئے گا جو جنوب مشرقی یورپ پر اس کی گرفت کو اور مضبوط کر دے گا۔

لیکن یہ کام خاموشی سے کرنے کا ہے۔ اس میں نہ ہنگامہ ہے نہ تماشا اسی سبب سے خیال ہوتا ہے کہ اس کام میں حرج کئے بغیر ہٹلر کی سیاست اور میدان بھی تلاش کرتی ہے گی جہاں کام کے ساتھ نام پیدا کرنے کا بھی موقع ہوگا۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ شلزوگ یعنی ڈنمارک کے جنوبی حصے پر قبضہ کرے جہاں اس وقت بھی بے ضابطہ طور پر نازیوں نے ہر طرح کا اختیار حاصل

کر لیا ہے۔ مگر ڈنمارک کا رُخ مغرب کی طرف ہے، اور شلسوگ پر قبضہ ہو جانے سے جرمنی کو ادھر بحری قوت کے مرکز بنانے کا ایسا موقع مل جائے گا۔ جو برطانیہ کے لئے بہت خطرناک ہے۔ ہٹلر ابھی ایک مرتبہ برطانوی سیاست کو چھیڑ چکا ہے اس لئے وہ اتنا انتظار تو ضرور کرے گا کہ دل کا غبار بیٹھ جائے۔
اب تیسری یہ کہ ڈانٹزگ پر وار کیا جائے۔ اس کے لئے وقت بہت مناسب ہے۔ ڈانٹزگ کی حکومت لیگ کے سپرد ہے اور لیگ کی آپ جانتے ہیں کہ اب آبرو کیا ہے۔ ڈانٹزگ کو جرمنی سے الگ رکھنے پر پولینڈ کے سوا کسی کو اصرار نہ ہوگا، اور پولینڈ کی سیاست خواہ آپ حکومت کے رنگ کو دیکھئے یا خارجی تعلقات کو، جرمنی کا منہ تکتی رہتی ہے۔ غالباً پولینڈ کے وزیر خارجہ کرنل بک سے ہٹلر نے ذاتی طور پر یہ معاملہ کر لیا ہے کہ وہ علاقہ جو جرمنی اور مشرقی پرشا کے درمیان ہے اور پولش کوریڈور کہلاتا ہے جرمنی کو دے دیا جائے۔ اور پولینڈ اس کے بدلے شمال مشرق کی طرف ہٹ کر سمندر تک پہنچنے کا رستہ نکالے۔ یہ رستہ لتھو مینیا سے ہو کر گذرے گا اور اسی لئے پولینڈ نے اپنے پڑوسی سے جھگڑا بھی شروع کر دیا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے تو پھر انتظار کاہے کا ہے کرنل بک کو ایک نازی انقلاب کا انتظار ہے جو کسی روز بھی ہو جائے تو تعجب نہیں یہ انقلاب پولینڈ کی عام آبادی اور ملک کی پارلیمنٹ کی مرضی کے خلاف ہوگا اسی وجہ سے وہ ایک معمولی اور باضابطہ قانونی کارروائی کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ کرنل بک اور اُن کے فاشسٹ ساتھی حکومت پر بے شک حاوی ہیں لیکن اس قدر نہیں کہ جو چاہیں کر سکیں۔ پھر دوسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہٹلر میں کون سی کشش ہے کہ پولینڈ کے فاشسٹ اس پر فدا ہو رہے ہیں جب وہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہٹلر کو زمین کی اور شہرت کی ہوس ہے اور اُن کا ایک اور پڑوسی موجود ہے جس کی دوستی شاید بالکل بے غرض ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ روسی پولینڈ پر اتنے دنوں تک ظلم کر چکے ہیں کہ روس اور پولینڈ کا اتحاد ہو نہیں سکتا، اور اس کے علاوہ معاشرتی تنظیم کے جو اصول روس میں رائج ہیں انھیں پولینڈ کا حاکم طبقہ اپنے لئے زہر سمجھتا ہے ان دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ جرمنی کی طاقت دیکھنے میں روس سے

کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے اور اس طاقت کو استعمال کرنے پر وہ ہر وقت آمادگی بھی ظاہر کیا کرتا ہے پولینڈ کو لتھوئنیا سے کد ہے، چکوسلوواکیا سے عداوت ہے اور اگر کبھی وہ اِن دونوں پر اپنا غصہ اتارنا چاہے تو اُسے جرمنی سے مدد ملے گی اور روس سے ہرگز نہ ملے گی۔ پھر وہ جرمنی کا کیوں دامن نہ پکڑے، خصوصاً جب انگلستان اور فرانس، جس کا اس پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے اسے ملک کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کیا۔ اس احسان کا کوئی بدلہ نہیں۔ اس کی غرض کو اپنی غرض نہیں سمجھتے اور اس کی بھولے سے بھی ہمت افزائی نہیں کرتے۔

اب تک ہٹلر کی خاص بول چال یہ تھی کہ درسائی کے صلح نامے کی بے شمار زیادتیاں جتا کر اور مغربی قوموں کو بولشوزم کے بھوت سے ڈرا کر جرمنی کے لئے وہ تمام حقوق مانگے جو ایک آزاد اور غیرت دار قوم کو حاصل ہونا چاہئیں۔ اب اس راگ میں کوئی تاثیر نہیں رہی اور قومی عظمت کے جو پرانے جرمن سیاست گا رہی ہے انھوں نے اس پرانے راگ کو دبا بھی دیا ہے۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اس کا اندازہ کرنے کی ترکیبیں سوچے گا کہ تین طرف سے فاشسٹ حکومتوں سے گھر جانے کا فرانس پر کیا اثر ہوگا۔ اور ۵ رجون کو فرانس کے اندر جو گمنام ہوائی جہاز ہسپانیہ کی طرف سے گھس آئے تھے اس کا مقصد سمجھیے سوئی چبھو کر یہ معلوم کرنا تھا کہ فرانس کی جلد کتنی موٹی ہے اور زندہ گوشت میں سوئی چبھ جائے تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ اگر اس تجربے نے یہ ثابت کیا کہ وہ سست یا اندرونی اختلافات میں مبتلا ہیں جس کا کہ فرانس میں خاص طور پر اندیشہ ہے تو ہٹلر چکوسلوواکیا یا ڈانٹزگ پر ضرور وار کرے گا اور شاید اس مرتبہ اس کا وار خالی نہ جائے گا۔

لیکن اگر ہٹلر نے انگریزی اور فرانسیسی اتحاد کو چست اور ان کی سیاست کو چوکنا ہی نہ پایا بلکہ ہر طرف اپنے رستے میں حائل دیکھا تو؟

اس سوال کا ایک ہی جواب ہے جو سیاست کے ماہر پہلے سے دے چکے ہیں پہلے یقین نہ آتا تھا کہ اِن کا جواب صحیح ہو سکتا ہے لیکن اب جو یہ بھید کھل گیا ہے کہ فاشزم کا دیو بولشزم کے بھوت سے کچھ کم ڈراؤنا نہیں اور جمہوری ریاستوں میں عام رائے مدبروں پر زور ڈال رہی ہے کہ دونوں

کی یکساں مخالفت کی جائے تو کیا عجب ہے کہ بھوت اور دیو مل کر ایک شکل بن جائیں ان کے جسم بھی ہوا تاریکی اور تخیل کے بنائے ہوئے اور دیکھنے والے کی اندرونی کیفیت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں

ابھی دو چار روز پہلے کی خبر ہے کہ روس اور چین کا ایک معاہدہ ہوا ہے جس میں چین کی حکومت نے جاپان کی مخالفت پر قائم رہنے اور حکومت کے کاروبار میں روسی ماہروں سے مدد لینے کا وعدہ کیا ہے اور روس نے سامانِ جنگ مہیا کرنے کا ذمہ لیا ہے یہ خبر ٹوکیو سے شائع ہوئی ہے اور بہت ممکن ہے اس کا مقصد چین کو بدنام کرنا ہو۔ یہ بھی بہت ممکن ہے کہ خبر صحیح ہو۔ کیونکہ چینیوں کے ہاتھ سے لنگھائی ریلوے نکل گئی ہے۔ کانٹون اور ہانکاؤ پر بمباری ہو رہی ہے اور جاپانی حکومت نے معلوم ہوتا ہے طے کر لیا ہے کہ چینیوں کو کہیں بھی آپ اپنے اوپر حکومت کرنے کا موقع نہ دے گی ٹوکیو سے ماسکو بہرحال زیادہ دور ہے، اور کھنڈر سے جھونپڑا بہتر، اس لئے اگر چینیوں نے اپنے آپ کو روس کے حوالے کر دیا تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ دوسری طرف جاپان کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر مسلسل جنگ کرنے کی ذمہ داری بٹھائے دیتی ہے۔ وہاں کی وزارت میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی تھیں اُن سے لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اب جاپان غیر قوموں اور خصوصاً انگلستان اور امریکہ سے بہت بہتر برتاؤ کرے گا اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ چین نے روس کا دامن پکڑا ہے تو جاپان کو چاہئے بھی کہ یورپ اور امریکہ والوں کا سہارا ڈھونڈھے۔

روس کو جاپان کی طرف سے بڑے اندیشے تھے، اور جرمنی اور جاپان کے اتحاد نے خطرے کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اب جاپان ایک طرف الجھا ہوا ہے، اگر دوسری طرف جرمنی سے صلح ہو جائے اور ہٹلر کو وسطی یورپ میں منہ مانگے دام دے کر اوکرائین (Ukraine) کو محفوظ کر لیا جائے تو اس میں روس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ لیکن انگلستان اور فرانس کا اس میں بڑا نقصان ہے کیونکہ انھیں ہٹلر کا مطالبہ کہ اسے وہ تمام نوآبادیاں جو جنگ سے پہلے جرمنی کے پاس تھیں واپس کر دی جائیں پورا کرنا ہوگا اور ممکن ہے کہ یہ مطالبہ پورا کر کے بھی وہ ایسے الجھاؤ میں پڑ جائیں کہ جس سے جنگ کے سوا چھٹکارا پانے کی اور کوئی صورت نہ ہوگی اس میں دنیا کا بھی بڑا نقصان ہوگا۔ کیونکہ ترقی یافتہ قوموں

کی جنگ، علم و ہنر اور صنعت کو بڑا سخت صدمہ پہنچائے گی اور اس سے ان مشکلوں میں سے ایک
مشکل بھی حل نہ ہو گی جو اس وقت دنیا کو بے چین کئے ہیں۔

(باجازت اے آئی آر)

تعلیمی دنیا

مسٹر اڈولف مائر نے بیسک انگلش (BASIC ENGLISH) کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی پنڈت جواہر لال نہرو اس جلسے کے صدر تھے۔ پنڈت جی نے اس کی اہمیت کو ہندوستان کے مخصوص حالات میں اس طرح واضح کیا۔

"مجھے (BASIC ENGLISH) کی ترویج میں سب سے بڑا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ اس ترکیب سے ہندوستانی نوجوانوں کا بہت سا قیمتی وقت بچ سکے گا جو بے معنی اور لغو ادبی موشگافیوں میں ضائع ہو جاتا ہے (BASIC HINDUSTANI) بیسک ہندوستانی کو کل ہندوستان کی عام زبان بنانے کے سلسلے میں بھی بیسک انگریزی سے مدد مل سکتی ہے۔ تمام عملی ضروریات کے لئے بیسک انگریزی ادبی اور رواجی انگریزی کی جگہ بہت آسانی سے لے سکتی ہے"۔

بنیادی انگریزی لغت سے مراد وہ چند سو انگریزی الفاظ ہیں جو بالعموم تحریر و تقریر کے سلسلے میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور جن سے معمولی ضروریات کے لئے بخوبی کام چلایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر میگھ ناتھ سہا جو ایک مدت سے الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر طبعیات تھے کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میں معلم پالٹ پروفیسر آف فزکس مقرر ہوئے ہیں۔ پروفیسر موصوف تیسرے ہندوستانی ہیں جنھیں قابل قدر علمی تحقیقات کی بدولت رائل سوسائٹی نے اعزازی فیلوشپ سے نوازا۔ آپ نے زیادہ تحقیقات ASTRO PHYSICS یعنی فلکی طبعیات پر کی ہے۔

ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیم کی طرف سے مسٹر وت صدر تحریک برتا چاری بنگال کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اہل حیدرآباد کو اس نئی تحریک کے اصول اور فوائد سے روشناس کرائیں۔ ریاست

میں حکومت کی طرف سے براتاچاری تحریک کی شاخ قائم کردی گئی ہے اور نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیم اس کے صدر ہیں مسٹر دت نے جو انڈین سول سروس کے ممبر ہیں چند سال سے براتاچاری کی مفید تحریک بنگال میں جاری کی ہے اس کے لغوی معنی عہد و پیمان کرنے والے کے ہیں۔ تحریک کا مقصد مدارس اور کالجوں کے طلبا میں ضبط کی مشق اور ریاضت جسمانی کا شوق پیدا کرنا ہے۔

حکومت کشمیر نے پچیس ہزار کی رقم نئے میزانیہ میں ان طلبا کو قرض دینے کے لئے مخصوص کی ہے جو ہندوستان یا غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم یا کسی فن یا پیشے میں اعلیٰ درجہ کی تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قرضے کی شرطیں بہت آسان رکھی گئی ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مقروض اپنی آمدنی میں سے تمام رقم قسطوں کی صورت میں ادا کرسکتا ہے اصل رقم پر تین فیصدی سود لیا جائے گا۔ اگر قرضہ سات سال کے اندر ادا کردیا جائے تو سود کا پچیس فیصدی حصہ معاف کردیا جائیگا اور اگر قرضہ کی ادائیگی دس سال کی مدت میں ہوئی تو پندرہ فیصدی سود معاف کیا جائے گا۔

سینور مسولینی نے اطالوی انسٹیٹیوٹ برائے مشرق بعید و وسطیٰ قائم کیا ہے جس کا مقصد اٹلی اور ایشیا کے مابین تمدنی اور ادبی رشتوں کو استوار کرنا ہے۔ اس ادارے کی طرف سے سر۔ ٹی۔ وجیا راگھو چاریہ سابق زراعتی تحقیقاتی کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ روم میں "تمدن زراعت اور زندگی کے موضوع" پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کریں سر وجیا پہلے ہندوستانی ہیں جن کو یہ اعزاز دیا گیا ہے۔

حکومت مدراس نے اعلان کیا ہے کہ فی الحال ایک سو چار ثانوی مدارس میں ہندستانی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ انتظام بورڈ کے ثانوی اسکولوں میں ہی رائج ہے۔ اور اب تک حکومت نے اس سلسلے میں کبھی کوئی خاص زر امدادی منظور نہیں کیا۔ اب حکومت نے فیصلہ کیا ہے

کہ ثانوی مدارس کی پہلی تین جماعتوں میں ہندوستانی کی تدریس کا باقاعدہ انتظام کیا جائے آئندہ سال کم ازکم ایک سو پچیس اداروں کی پہلی تین جماعتوں میں ہندوستانی کی لازمی تعلیم جاری ہو جائیگی سال رواں کے میزانیہ میں اساتذہ کی تنخواہوں کی مدمیں ۲۰ ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

پچھلے دنوں حکومت بمبئی نے تعلیمی اصلاحات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی اس کا مقصد ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ پر مقامی حالات کی روشنی میں تبصرہ کرنا اور بمبئی کے مخصوص تعلیمی مسائل کے لئے مشورہ دینا تھا کمیٹی نے خارجی امتحانات کے متعلق بہت دلچسپ اور مفید مشورہ دیا ہے اُن کے خیال میں ثانوی درجے کے تمام خارجی امتحانات حتیٰ کہ میٹرکولیشن امتحان بھی بند کر دینے چاہئیں۔ ہر ایک کالج داخلے کے لئے الگ امتحان کا بندوبست کرے۔ دستکاری وصنعت کی تعلیم کے لئے منتخب اساتذہ کو خاص تربیت دی جائے اور طلبا اور اساتذہ کے لئے مفید مطلب کتابیں اور تعلیمی اشیاء کی تیاری کے لئے ایک مرکزی اشاعتی دفتر قائم کیا جائے۔

مئی کے شروع میں کارل خاں اوسی اٹزکی Carl von Ossietzky کا انتقال ہوگیا انھیں اسی سال امن کا نوبل انعام ملا تھا۔ اُن کی زندگی امن اور صلح جوئی کے حق میں ایک طویل مجاہدہ ہے۔ حال ہی میں نوبل انعام ملنے کے سلسلے میں ان سے حکومت کی ناراضگی کا معاملہ عوام میں آچکا ہے اوسی اٹزکی ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے آپ پول نژاد تھے اگرچہ جنگ عظیم کے دنوں میں آپ نے چار سال تک جرمنی افواج میں کام کیا تاہم جنگ ختم ہوتے ہی آپ پورے امن پسند بن گئے اور اخبارات اور جرائد کے ذریعے اپنے خیالات کی اشاعت شروع کر دی۔ اس سرفروشانہ مجاہدے میں آپ کو اکثر قتل کی دھمکی دی گئی۔ قید بھی ہوئے نظر بند کئے گئے مگر آپ اپنے عقائد پر ہمیشہ سختی سے قائم رہے آپ کو ۱۹۳۲ء میں ایک مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں جس کا موضوع "سپاہی قاتل سے کم نہیں ہے" تھا سزائے قید دی گئی۔ جب ہٹلر صدر منتخب ہوا تو اس خوشی میں

انھیں رہا کر دیا گیا تاہم جلد ہی جرمن پارلیمنٹ میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد انھیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک مدت تک نازی حکومت کے گرگے انھیں ایک مرکزی کیمپ سے دوسرے میں تبدیل کرتے رہے گرفتاری کے وقت ان سے انتہائی بربریت کا سلوک کیا گیا حتیٰ کہ ان کو قتل کی دھمکی دی گئی اوسی اٹزکی نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی تھی ۱۹۳۳ء میں ان کی بیٹی نے انھیں انگلستان سے خط لکھا جس میں بچی نے اس امر پر خوشی ظاہر کی تھی کہ وہ جرمنی سے باہر عافیت میں ہے۔ نازیوں کے محکمۂ جاسوسی نے اس چھٹی کی بو پالی اور اس جرم کی پاداش میں کہ اوسی اٹزکی نے اپنی لڑکی کی تربیت کس بُرے طریق پر کی ہے ان کو بہت وحشیانہ طریق پر پیٹا گیا۔

ان مظالم اور مصائب کے ہوتے ہوئے بھی، انھوں نے بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار کیا تاہم ان پیہم سختیوں اور جفا کوشی سے ان کی صحت بہت خراب ہو گئی اور آخر کار اس شکستہ دل مجاہد نے موت کے آغوش میں پناہ لے لی۔

گاندھی جی نے نیشنل ایجوکیشن بورڈ کی پہلی نشست میں یہ تقریر کی" اس وار دھا ٹریننگ اسکول کے قیام سے ہمارا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے اور قومی بیماریوں کا مداوا تلاش کرنا آج ہمارے قومی امراض میں سب سے شدید و مہلک چیز مذہبی تعصب ہے اس کے خلاف ہمیں عدم تشدد کا حربہ چلانا ہوگا۔ ہمیں اپنے سب مسائل کا حل اہنسا کے اصول پر کرنا ہوگا۔ ہمارے اسکولوں میں ریاضی۔ سائنس اور تاریخ کی تدریس عدم تشدد کے نقطۂ نگاہ سے کی جائے گی۔

جب خالدہ ادیب خانم نے جامعہ ملیہ دہلی میں ترکیہ جدیدہ خطبات دئے تو میں نے کہا تھا کہ پرانا فن تاریخ بادشاہوں کے نام اور ان کی جنگجو یانہ کارناموں کے سوا کچھ نہیں ہے آئندہ تاریخ سے مراد انسان کی تاریخ ہوگی نہ کہ چند حکمرانوں اور خونخوار فاتحوں کی۔ انسانی تمدن کی تاریخ عدم تشدد کے اصول کا مجلیٰ آئینہ ہے۔ اگر تاریخ کو نئے سرے سے لکھا گیا تو ہمیں شہری دستکاریوں کی بجائے دیہی صنعتوں کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ اگر ہمارا منشا دیہات کو آباد اور خوشحال رکھنا ہے تو ہمیں

لازماً وہی دستکاریوں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے اور اس بات کا یقین کر لیجئے کہ اگر ہم ان صنعتوں کے ذریعہ کتابی تعلیم دے سکے تو ہم ملک میں انقلاب عظیم پیدا کر سکیں گے۔ ہماری نصاب کی کتابیں بھی اسی اصول کو مد نظر رکھ کر تیار کی جائیں گی۔

اگر میرے مسلمان بھائیوں کو میری باتیں معقول نظر نہیں آتیں تو وہ شوق سے انھیں مسترد کر سکتے ہیں عدم تشدد سے میری مراد وہ ہتھیار نہیں جو محض انگریز کے خلاف چلایا جا سکتا ہی بلکہ وہ اصول ہی جو ہمارے تمام داخلی مسائل کا حل پیش کر سکے گا۔ وہ حقیقی لحاظ سے زندہ اور محرک قوت ہے جو ہندو مسلم اتحاد کو زندہ حقیقت بنا کر دکھا دے گی۔ ایسا اتحاد جو مسولینی ہٹلر کے عہدنامہ کی طرح ڈر اور خوف پر مبنی نہیں۔ بلکہ محبت و اخوت اور باہمی رواداری کی بنیادوں پر استوار ہوگا۔

پچھلے دنوں بہار کے بورڈ اسکولوں میں دعا کے وقت بندے ماترم گانے پر سخت جھگڑا ہوا تھا مسلمان طلبا نے اس گیت کے خلاف سخت احتجاج کیا اب متفقہ طور پر یہ سمجھوتا ہوا ہی کہ بندے ماترم کی بجائے اقبال کا مشہور و معروف ترانہ۔ 'ہندوستان ہمارا' گایا جائے۔

امسال اگست میں بین الاقوامی یوتھ کانفرنس کا اجلاس نیویارک میں ہو رہا ہی۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن بھی اس مرتبہ طلبا کا ایک وفد شرکت کی غرض سے بھیج رہی ہی۔ مختلف صوبوں کی شاخوں سے مندوبین کے نام بھیجے جا چکے ہیں اور فیڈریشن کی مجلس عاملہ آخری انتخاب کے لئے غور و خوض کر رہی ہی علیگڑھ سے انصار ہروانی سکریٹری فیڈریشن کا نام تجویز کیا گیا ہی۔

۱۳۔ مئی کو ساتوں کانگرس صوبوں کے وزیراعظم۔ ہندستانی تعلیمی سنگھ کے نمائندے اور واردھا تعلیمی کمیٹی کے افراد بمبئی میں ایک کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس کی صدارت

مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی نے فرمائی اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا ہی کہ ہر صوبہ کی طرف سے واردھا ٹرنینگ اسکول میں تربیت پانے کے لئے اساتذہ بھیجے جائیں اور یہ اصحاب واپسی پر اپنے اپنے صوبوں میں اساتذہ کی تربیت کا کام سنبھالیں۔ یہ تعلیمی اسکیم سب سے پہلے دیہی حلقوں میں رائج کی جائے گی بالخصوص ان علاقوں میں جہاں پہلے سے کوئی اسکول نہیں ہی۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے وفد نے مختلف صوبوں کے وزیر اعظموں سے ملاقات کی اور اس امر کے دریافت کرنے کی کوشش کی کہ ان صوبوں میں ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ کے نصاب کو اسکولوں میں رواج دینے کی کہاں تک کوشش کی گئی ہی معلوم ہوا کہ سی پی میں ذاکر حسین رپورٹ کا تجویز کردہ نصاب خفیف تبدیلی کے بعد من وعن جاری کر دیا گیا ہی دوسرے صوبے بھی اس غرض کے لئے ٹرنینگ اسکول کھولنے کا انتظام کر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں پونا میں پروفیسر دھوندوکیشپ کاروے کی اسیّویں سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی گئی پروفیسر موصوف نے اپنی زندگی ہندوستان کے طبقۂ نسواں کی سماجی بہبودی اور تعلیمی ترقی کے لئے وقف کر دی ہی تعلیمی دنیا میں ان کا نام انڈین وومن یونیورسٹی کے قیام کی وجہ سے مشہور ہی یہ یونیورسٹی ہندوستان میں خواتین کے لئے پہلا ادارہ ہی جو حکومت کی امداد کے بغیر چلایا گیا اس میں ذریعۂ تعلیم شروع سے مادری زبان رہا ہی اور نصابِ تعلیم میں مردانہ اسکول کی غلامانہ نقالی نہیں کی گئی بلکہ طبقۂ نسواں کی مخصوص ضروریات اور امور خانہ داری کی تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر مضامین کا انتخاب کیا گیا ہی اس کے علاوہ پونا کا ہندو بیواؤں کا آشرم ہی جس کی بنیاد پروفیسر کاروے کے ہاتھوں پڑی ان ہی کی مخلصانہ کوششوں سے یہ یہ نازک پودا اب بڑھ کر ایک عظیم الشان درخت ہوگیا۔ اس ادارے میں ہندو بیواؤں کو معلمی۔ دایہ گری وغیرہ جیسے مفید پیشوں کے لئے تیار کیا جاتا ہی۔

پروفیسر کاروے ان چند صمیم العزم ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے باوجود ناقابل بیان مشکلات اور مصائب کے تعلیم حاصل کی اور اپنی زندگی کو ان مشکلات اور رکاوٹوں کے دور کرنے کے لئے وقف کر دیا ان مشکلات کا صحیح اندازہ ان کی اوائل عمر کے ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہو سکتا ہے آپ نے سترہ سال کی عمر میں اپنے وطن سے ایک سو دس میل کا سفر پیدل طے کیا اور چار دن کی طویل مسافت کے بعد ستارا میں ایک سرکاری امتحان میں شامل ہوئے سفر کی تیسری رات انھوں نے ستاروں کی چھاؤں میں ایک پتھریلی وادی میں گزاری جہاں درندے اور وحوش کی بھیانک آوازیں بھی ان کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکیں طرفہ یہ کہ ممتحن نے ان کو کم سنی کے عذر پر امتحان میں فیل کر دیا تاہم آپ نے ہمت نہ ہاری اور سرفروشانہ مجاہدے سے علم کے اعلیٰ درجات طے کر کے فائز المرام ہوئے۔

آپ ۱۸۹۲ء میں فرگوسن کالج پونا میں معلم ریاضی مقرر ہوئے اور ایک سال کے اندر دکن تعلیمی سوسائٹی کے لائف ممبر بن گئے۔ پروفیسر گوکھلے پہلے ہی سے اس انجمن کے ممبر تھے۔ اس انجمن کے ہر فرد کو بیس سال کی طویل مدت کے لئے تہتر (۷۳) روپے کے قلیل مشاہرے پر کام کرنا ہوتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے پورے بیس سال اس خدمت کو انجام دیا اور بالآخر ۱۹۱۴ء میں اس سے سبکدوش ہو گئے۔ مگر آپکے ایثار اور قربانی کی درخشاں مثال پونا کا بیوہ آشرم ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک انجمن کا قیام ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا۔ شروع میں روپیہ بالکل نہیں تھا تو پروفیسر کاروے نے اپنی زندگی بھر کی کمائی جو محض ایک ہزار روپیہ تھی آشرم کے لئے وقف کر دی اور گرمیوں کی تعطیلات کو اس مقصد کے پرچار اور چندے کی فراہمی کے لئے استعمال کرنے لگے۔

ایک زمانہ وہ تھا جب ہنگن بدروک کو جہاں آشرم واقع ہے کوئی پختہ سڑک نہ جاتی تھی۔ پختہ سڑک کیا پگڈنڈی تک نہ تھی اور نہ آشرم کی اپنی گاڑی یا اور کوئی وسائل آمد و رفت تھے۔ پروفیسر موصوف دن بھر پونا شہر میں کالج کے کام میں مصروف رہتے تھے اور

شام کو چار میل پیدل چل کر رات کو آشرم میں سوتے اور صبح کو پھر کالج واپس پہنچ جاتے اس زمانہ میں کھانے پینے کا سامان اور ضروری اشیاء بازار سے سر پر اٹھا کر آشرم میں لے جانا ہوتی تھیں اور پروفیسر موصوف اکثر ان چیزوں کا گٹھر سر پر اُٹھا کر سر شام آشرم میں پہنچ جاتے تھے آج یہ ادارہ ۱۵۰ ایکڑ کی کھلی جگہ میں واقع ہے اس میں ۳۰۰ طالبات ہیں ایک ہائی اسکول اور ایک ٹریننگ کالج ہے۔

پروفیسر موصوف مذہبی عقائد میں فراخدل واقع ہوئے ہیں وہ اوتاروں کے قائل نہیں ہیں اور نہ انھیں مسئلہ تناسخ پر کوئی گہرا یقین ہے۔ ان کے لئے زندگی کا اعلیٰ مقصد خدمت خلق ہے مسئلہ تناسخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں" اگر مسئلہ تناسخ کی کوئی حقیقت ہے تو میں یہی دعا مانگوں گا کہ خدا مجھے باربار ہندوستان ہی میں پیدا کرتا رہے تاکہ میں اپنا کام جاری رکھ سکوں" آپ نے 'Looking Back' کے عنوان سے اپنی سرگزشت حیات لکھی ہے جس میں انھوں نے مختلف تحریکوں اپنی تعلیمی سرگرمیوں۔ کل دنیا کے سفر اور مذہب و اخلاق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

ہندوستان میں مسئلہ تعلیم بالغان ابھی تک سماجی کارکنوں کی توجہ کا محتاج ہے۔ ملک بھر میں انگلستان کی طرح کوئی مرکزی انجمن نہیں جو چھوٹے چھوٹے منتشر اور غیر منظم اداروں کو ایک سلسلہ میں منسلک کردے نہ تعلیمی محکموں کی طرف سے ابھی تک اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے کوئی خاص قدم اٹھایا گیا ہے۔ ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی حکومت ہے وزرائے تعلیم کے دلوں میں تعلیم بالغان کی اہمیت کا ہلکا سا احساس موجود ہے۔ وزارت بمبئی نے برسر اقتدار آنے کے چند روز بعد ہی میزانیہ میں دس ہزار روپیہ کی رقم اس مقصد کے لئے منظور کر دی۔ تجویز یہ ہے کہ تعلیمی رضاکاروں کو دعوت دی جائے کہ وہ صوبے کے مختلف حصوں میں حکومت کی امداد کے بغیر تعلیم بالغان کے مرکز قائم کر دیں یہ مرکز ڈویژنل انسپکٹروں کی نگرانی میں ہوں گے اور انھیں منظور شدہ رقم سے زر امدادی ملا کرے گا۔ اب تک صوبہ بھر میں بہت سے ایسے مراکز قائم ہو چکے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ تعلیم بالغان کا یہ چھوٹا سا تجربہ

کامیاب رہے گا۔

سی۔پی میں (Local Bodies) لوکل باڈیز کی طرف سے ۵۵ ادارے تعلیم بالغان کے لئے کھولے گئے ہیں جن میں پچاس دیہاتی حلقوں میں اور ۵ ناگپور میں ہیں۔ حکومت دیہاتی علاقوں کے مدارس کا پورا بار اور شہری مدارس کا نصف خرچ اٹھا رہی ہے۔

ہندوستانی ریاستوں میں میسور اور ٹراونکور تعلیم بالغان کے معاملے میں برطانوی ہند سے بھی پیش پیش ہیں ٹراونکور کے میزانیہ میں ۲۱,۳۰۰ روپے ابتدائی مدارس میں کتب خانے اور دار المطالعہ قائم کرنے کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے فی الحال ساٹھ ابتدائی مدارس منتخب کئے گئے ہیں جن میں ہر ادارے کے لئے ایک سو روپے کا سامان کتب خانہ کے لئے وقف کیا گیا ہے اور ہر کتب خانہ میں دو سو کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔ ان کتب خانوں سے عام دیہاتی آبادی فائدہ اٹھا سکے گی۔

تعلیم بالغان کے سلسلے میں یونیورسٹی مراکز میں توسیعی خطبات دئے جاتے ہیں مگر ہندوستان میں بالعموم ان تقریروں سے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہی مستفید ہو سکتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ علم کے مرکز عام شہریوں کے لئے بھی کسی حد تک مشعل ہدایت ہو سکیں۔ اسی سال دہلی میں انجمن تعلیم بالغان ہندوستان کی بنیاد ڈالی گئی۔ اسی سلسلے میں مسز ولیم رکن نیشنل ایڈلٹ اسکولز یونین انگلستان نے پچھلے موسم سرما میں ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ ڈاکٹر فرانک لابیک جنھوں نے جزائر فلپائنز میں بالغ ان پڑھوں کے لئے پڑھنا سکھانے کا نیا طریقہ ایجاد کیا۔ ہندوستانی زبانوں کی تدریس پر تحقیقات کر رہے ہیں گجرات میں ان کے طریق کے مطابق کتاب تیار کر لی گئی ہے۔

انگلستان میں ہندوستانی طلبا کی دوسری سالانہ کانفرنس۔ ہندوستانی طلبا کی انجمنوں کے فیڈریشن کا دوسرا سالانہ اجلاس مسٹر کاس بیکر کی صدارت میں پچھلے اپریل میں منعقد ہوا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مبارکبادی پیام میں ہندوستانی طلبا کو نصیحت کی ہے کہ وہ اپنے اندر فولادی قوت ارادی پیدا کریں تاکہ آیندہ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں - آج دنیا ہنگامہ خیز زمانے سے گذر رہی ہے اور اس ابتلا میں وہی نوجوان مرد اور عورتیں تاریخ کو پلٹ سکتے ہیں جن کا تخیل بھلے ۔جن کی نگاہ بلند اور جن کے دل و دماغ تربیت یافتہ ہیں ۔آج ہندوستانیوں کو بہت اہم اور پیچیدہ مسئل کا سامنا ہے اور ان مشکلات کو سلجھانے کی ذمہ داری نئی نسل پر عاید ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ وزرائے تعلیم مدراس ، سی پی ، بمبئی وغیرہ سے بھی پیغامات موصول ہوئے پروفیسر ہالڈین نے دنیائے جدید میں 'طالب علم کا فرض' کے موضوع پر خطبۂ افتتاحیہ پڑھا اور ان کے بعد لارڈ لوتھین اور مسٹر گرنفل ممبر پارلیمنٹ نے ہندوستان میں نئی اصلاحات کے عنوان پر تقریریں کیں - طعام شب پر سفیر حبش اور چینی اور ہسپانوی سفارت خانوں کے نمائندے موجود تھے ۔کانفرنس کے سلسلے میں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ اس کا مالی بار طلبا نے خود اٹھایا ۔باہر سے محض دس پونڈ چندہ لیا گیا۔

صوبہ بہار اور فوجی تربیت ۔ پچھلے دنوں بہار لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک تجویز منظور کی ہے جس میں حکومت سے سفارش کی ہے کہ بہار میں عساکر ملی کی تنظیم کا فوری بندوبست کیا جائے ۔ اور اس سلسلے میں ایک رضاکار فوج مرتب کی جائے جو فوری ضروریات کے لئے ریزرو کا کام دے سکے ۔ نیز مدراس اور کالجوں میں بھی فوجی تربیت کا انتظام کیا جائے اور صوبے میں فوجی تعلیم کی ترقی کے لئے ایک ملٹری اسکول قائم کیا جائے ۔اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے فوجی تربیت پر ایک مختصر سا رسالہ تیار کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گا ۔

پچھلے مہینے شانتی نکیتن میں ڈاکٹر ٹیگور کی سال گرہ منائی گئی - اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر ٹیگور نے خود کی ۔انھوں نے کہا کہ انسان کو ایسے تہواروں کی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ روزمرہ کے

مشاغل اور ایام کی بھول بھلیاں میں رازِ حیات کو نہ بھلادے۔ اپنی علالت کا ذکر فرماتے ہوئے آپ نے کہا کہ اس بیماری کے دوران میں ان پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ موت زندگی کی نفی یا اختتام نہیں پھول پتیاں گرا کر پھل اور پھل خشک ہو کر بیج، اور بیج اک لہلہاتی ہوئی نئی زندگی کا پیام لاتا ہے۔ اس طرح روح مادی جسم کو چھوڑ کر اس عالمگیر زندگی میں مل جاتی ہے جو کل کائنات میں جاری و ساری ہے۔

عبادت کے بعد ادارے کے سب طلبار اُن آموں کے جھنڈ میں اکٹھے ہوگئے جو مدرسے کی چار دیواری میں واقع ہیں۔ متبرک منتروں کے پڑھنے کے بعد شانتی نکیتن اور سری نکیتن کے طلبار نے شاعر کی خدمت میں تحائف پیش کیے جن میں اکثر مصوری کے اچھے نمونے اور دستکاری اور صناعی کی چیزیں تھیں۔ آخر میں چینی پروفیسر، طلبا اور چینا بھون کے تبتی سادھو، سب نے مل کر شاعر کے حق میں دعائے خیر مانگی۔

مسٹر جیمز کلگ مین جنرل سکریٹری اولڈ اسٹوڈنٹ فیڈریشن اس موسم گرما میں ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں۔ آپ نے لکھنؤ میں مقامی طلبار اور مسٹر سمپورنا نند وزیر تعلیم صوبجات متحدہ سے ملاقات کی۔

ڈاکٹر سر اقبال کی وفات پر سر رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ تعزیتی پیغام بھیجا ہے "ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے جس کا گھاؤ مدت مدید میں کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دنیا کی نگاہ میں اتنا کم مایہ ہے کہ ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے جن کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی تھی"۔

پچھلے اپریل میں آل انڈیا ایجوکیشن بورڈ کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی جی نے بھی شرکت کی۔ جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب

اور علی گڑھ سے خواجہ غلام السیدین تھے اس نشست میں وار دھا اسکیم کے مدارس کے اساتذہ کے لئے ایک ہینڈ بک اور اساتذہ کی تربیت کے لئے مختصر کتابیں اور رسالے تیار کرنے کی تجاویز منظور ہوئیں۔ اساتذہ کی ہینڈ بک کا کام سیدین صاحب کو تفویض کیا گیا ہے۔

انگلستان اور نو آبادیات میں ہر جگہ محکمہ تعلیم کے قواعد کی رو سے ہر امدادی اسکول کو حکومت کے منظور شدہ گریڈ اور تنخواہیں دینا ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں اگرچہ دفتری لحاظ سے بعض صوبوں میں ایسے قوانین ہیں مگر عملاً ہر امدادی اسکول کا استاد انتظامیہ کمیٹی یا منیجر کی سیماب صفت طبیعت کے رحم پر ہوتا ہے مسٹر کھیر نے ایک حد تک ارباب اختیار کی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ نتیجہ غیر معلوم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرادارت:- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۳۰	ستمبر ۱۹۳۸ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قومیّت اور ملیّت

(۲)

(ایک جامعی)

اگست کے "جامعہ" میں آپ نے دیکھا کہ مشرقِ قریب کے اسلامی ملکوں میں قومیت اور ملیت کے تصادم نے کون سی شکل اختیار کی، مصر، شام، عراق اور دوسرے عربی بولنے والے ملک اس بھنور سے آسانی سے نکل گئے، شاید ترکوں اور ایرانیوں کو ابھی اس گرداب میں کچھ دن اور تھپیڑے کھانے پڑیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ترکی اور ایرانی فطرت، قومیت کے مغربی تصور سے ضرور ابا کرے گی اور چنگیز و ہلاکو اور کیخسرو و دارا کو محمدؐ (فداہ' ابی و امی) اور ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کے مقابلہ میں نیچا دکھنا ہوگا

حجاز، شام، عراق، ٹیونس اور مراکش کی تمام تر آبادی مسلمان ہے، جو تھوڑے بہت غیر مسلم ہیں وہ بھی تہذیب و تمدن میں مسلمان ہیں، ان کی قومیت عربیت ہے جو سر تا سر اسلام ہے، قومیت کا وہ عنصر جو اسلام سے لگا نہ کھاتا تھا وہ آج سے تیرہ سو برس قبل رسُول اللہ صلعم اور ان کے جانشینوں کے ہاتھوں فنا ہو چکا، ان عربوں کی قومی زندگی کے تمام سرچشمے اسلامی ہیں، ادب، شعر، فلسفہ اور تمدن الغرض ماضی کا ہر ورق زریں اسلام کے عہد اقبال کی داستان ہے، راقم سطور کو بغداد میں دار العلوم نعمانیہ کے شیخ اعلیٰ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دار العلوم امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر واقع ہے، اور شیخ موصوف کا شمار "قدامت پسند" علما میں ہوتا ہے، گفتگو کا موضوع شیعہ اور سنیوں کے اختلافات تھے، شیخ موصوف نے فرمایا کہ "میرا بس چلے تو عراق میں نہ کوئی شیعہ رہنے دوں، اور نہ کوئی سنی، عراق میں بسنے والے سب عراقی ہوں اور بس"، "قومیت اسلام" کے علمبردار اس بات پر ناک بھوں چڑھائیں گے لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ عراقیت میں اسلامیت "سنّیت" اور "شیعیت" سے کہیں زیادہ ہے۔

شام و فلسطین میں عیسائی عربوں کی بہت بڑی آبادی ہے، یہ مذہباً عیسائی ہیں لیکن ان کا مزاج عربی ہے، انجیل پڑھتے ہیں لیکن قرآن ازبر یاد کرتے ہیں، حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کے ذکر مبارک سے اپنی روحانی تشنگی بجھاتے ہیں، اور امرأ القیس، فرزدق، جریر، متنبی، ابو العلا معری، شوقی اور حافظ ان کا ذہنی سرمایۂ تسکین ہیں رسول اللہ صلعم ان کی نظر میں زعیم عرب قرآن عربی زبان کا شاہکار، اور خالدؓ، عمرؓ، عمرو بن عاص اور معاویہ "رجالات عرب" ہیں، ظاہر ہے ان حالات میں مسلم اور غیر مسلم کا تمدنی اختلاف کیسے ہو سکتا ہے۔

مصر میں شروع شروع میں قومیت اور ملیت کا قدرے تصادم ہوا، "مصریت" پر زور دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکمراں طبقے بیشتر غیر مصری یعنی ترک تھے اور یہ مصریوں کو گنواروں (فلاحین) کی قوم کہتے، لیکن جوں ہی متوسط طبقوں کے ہاتھ میں قیادت آئی، "مصریت" کے ساز خاموش ہو گئے، قبطی یعنی مصر کی قدیم عیسائی آبادی کو تمدنی طور پر مسلمان بننے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ اُن کی زبان عربی ہے، اُن کا ذہنی و ادبی سرمایہ تمام تر عربی ہے، انجیل عربی میں پڑھتے ہیں، اور گرجوں کی مذہبی زبان بھی عربی ہے، حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر سے ان کو کوئی کد نہیں ہو سکتی، عربوں نے مصر کو اپنا غلام نہیں بنایا بلکہ اسے رومیوں کے استبداد سے نجات دی، عرب رومیوں کی طرح مصر کے اجنبی حکمراں نہ تھے۔ وہ وادی نیل میں بس گئے، اور مصریوں کے ساتھ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ایک مغربی مورخ کی رائے میں فتح کے ایک سو برس بعد مصری اور عربی میں تمیز کرنا مشکل تھا، قبطیوں اور مسلمانوں کے میل کی ایک اور وجہ نکالی گئی، رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی ایک زوجہ محترمہ ماریہ مصری تھیں، اور اُن سے آپ کے فرزند حضرت ابراہیم پیدا ہوئے، قبطی عنصر کا تمدنی طور پر مسلمان اکثریت میں مدغم ہو جانا بالکل فطری چیز ہے۔

ایران اور ترکی میں قومیت کے عناصر ایک حد تک قوی ہیں۔ اسلام سے قبل ایران تہذیب و تمدن میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا اور عربی فتح ایرانی قومیت کی شکست ثابت ہوئی تھی، عباسی عہد میں ایران میں اس کے خلاف ردِّ عمل ہوا، لیکن یہ ردِّ عمل عربیت کے سراسر انکار تک نہیں پہنچا، ایرانیوں

نے عربی زبان چھوڑ دی لیکن اپنی قومی زبان میں عربی کو بہت نمایاں حیثیت دی، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بنی امیہ سے بگڑے تو آل علی سے عقیدت و شیفتگی بدستور رہی، ان بنیادوں پر ایرانی قومیت کی تشکیل ہوئی۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ ایران "کفرِ عرب" کو کبھی اپنا ایمان بنالے گا دور از قیاس نظر آتا ہے۔

ترکوں کا "قومی" جوش بہت تازہ ہے، اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے ترکوں کی نسلی تاریخ میں کوئی خاص مواد بھی موجود نہیں، مغربیت کا سیل ترکی سے صرف ان خس و خاشاک کو بہالے جانے میں کامیاب ہوگا جو غلط طور پر اسلامی شعائر سمجھے جاتے تھے، کمالی رہنما لاکھ سر ماریں ان کو نئی قومیت کی تعمیر کے لئے کوئی نیا اساس ملنے کا نہیں، ان کے مورخ ترکی قوم کی شاندار قدامت کے نت نئے نظریئے گھڑا کریں لیکن اس نظریہ سازی سے نئی ترکی بننے سے رہی، دلوں کی زندگی چند پڑھے لکھوں کی سیاہ اوراقی سے بدلا نہیں کرتی، کمالی رَو ایک موسمی چیز ہے، اور اس کو بقا نہیں۔

عالمِ اسلام میں مغربی طریقہ کی قومیتوں کے زوال کے یہ ادبی اسباب ہیں، ان کے علاوہ بہت سے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی موثرات ہیں جو ان کو باہم ملانے میں بڑا کام کر رہے ہیں۔

اب اس تاریخی پسِ منظر کی روشنی میں ہندوستان کو دیکھئے، مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ محمد بن قاسم سندھ سے آگے نہ بڑھ سکا، محمد ابن قاسم گو حجاج بن یوسف ثقفی والی عراق جس کو بنوامیہ کا اژدر کہیں تو بے جا نہ ہوگا فرستادہ تھا لیکن اس کے باوجود محمد ابن قاسم نے مفتوح ہندوؤں کے ساتھ غیر معمولی روا داری برتی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ آیا تو انھوں نے تلوار کی بجائے قرآن کو فتح و تسخیر کا ذریعہ بنایا۔ سندھی جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے، اور سندھ صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن گیا۔

عربوں کی جگہ وسط ایشیا کے نومہذب اور نومسلم ترکوں نے لی تو اسلام ایک نیا جنم لے چکا تھا، ان سورماؤں نے اسلام کو محض جلالی رنگ میں دیکھا تھا اور اس میں یہ بیچارے اپنی جنگجویانہ فطرت سے مجبور بھی تھے محمد بن قاسم نے نہ سندھ کے باشندوں کے صنم خانے توڑے، اور نہ ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگائی بلکہ سیاسی فتح کے بعد اشاعتِ اسلام سے ان کو اپنایا، چنانچہ سندھ کی سرزمین ایک نئے نور سے چمک اٹھی، اور اس کی تابانیوں سے افق اسلام نے بھی جلا پائی،

محمود غزنوی جو محمد بن قاسم سے تین سو برس بعد ہندوستان پہنچا، اس نے بت فروشی پر بت شکنی کو ترجیح دی لیکن اس بت شکنی کا سبب جذبہ اعلائے کلمۂ حق نہ تھا بلکہ بتوں کا سونا چاندی، اور زر و جواہر تھے۔ غزنویوں، غلاموں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں اور مغلوں نے جہاں کشائی اور جہاں داری سے اپنا کام رکھا۔ ان کو فرمانبردار رعایا کی ضرورت تھی جو جزیہ و خراج سے ان کے خزانے بھر دیتی، اسلام کی اشاعت اور اس کے فیض سے دوسروں کو نہال و شاداب کرنے کا بار انھوں نے کبھی اپنے سر نہ لیا۔

فوجی طبقوں کی عملداری میں کسی ایسے نظامِ سلطنت کا قیام جس کو عامۃ المسلمین کی تائید حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔ ہندوستان کا یہ اسلامی دور امیروں کا دور کہلاتا ہے، ہر نیا سلطان اپنے اردگرد امیروں کے گروہ جمع کرتا، سلطان زبردست ہوتا تو امیر اطاعت و فرمانبرداری کا دم بھرتے اور کمزور سلطان ان امیروں کے ہاتھ کٹھ پتلی بن جاتا، پھر ان میں آپس میں جوتیوں میں دال بٹتی، سازشیں ہوتیں، اور آخر خون خرابے تک نوبت پہنچتی، یہ انقلاب کسی نئے سلطان کو اورنگ سلطنت پر جلوہ افروز کرتا، جو اپنے لئے نئے امیر چنتا۔

قطب الدین ایبک تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کی یہ تدبیر کی کہ اپنے غلاموں میں سے بہت سے امیر بنائے ان امیروں کی ایک زندہ مثال التمش ہے، قطب الدین کے لاولد مرنے پر ان امیروں میں آپس میں سر پھٹول ہوئی، اور بہت سے اس ہنگامے کی نذر ہوئے، امیروں کی تباہی نے التمش کا راستہ صاف کر دیا، اس نے اپنے من مانے امیر بنائے، غیاث الدین بلبن کا زمانہ آیا تو اس نے امراء کے متعلق ایک نیا دستور بنایا اور حسب و نسب کی صحت امارت کی شرط اولین قرار پائی، بلبن خاندان کو زوال ہوا تو خلجیوں کا سکہ چلا، علاء الدین خلجی نے امیروں کے ایک بالکل نئے طبقے کی ترتیب دی اور اس کے عہد سلطنت میں ہندی امیروں کا زور ہوا، ان میں سے ملک کافور اور خسرو خاں نے علاء الدین اور اس کے بیٹے قطب الدین کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی وجہ سے نومسلم امراء کے خلاف سخت ردِ عمل ہوا اور غیاث الدین اور محمد تغلق نے ان امراء کی بجائے پردیسیوں کو اپنایا، امراء سازی کا یہ سلسلہ مغلوں تک برابر چلتا رہا، آخر میں اکبر اعظم نے اپنی سلطنت کی بنیاد نئے آئین پر رکھی۔

اُمراگردی کے اس دور میں عوام الناس کو کون پوچھتا تھا ان کا کام تو صرف حکمرانوں کی اطاعت و فرمانبرداری تھا، سیاسی امور میں ان کو کوئی دخل نہ تھا، اور سیاسی انقلابات ان کی نظر میں "خرآمد و گاؤ رفت" کا مضمون تھے، یہ تو کہیئے کہ صوفیوں کے فیوض کی برکتیں ہیں کہ آج ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے ورنہ ہمارے مسلمان سلاطین کا بس چلتا تو وہ جزیہ کی کمی کے خیال سے بنی امیہ کے حکام کی طرح اسلام لانا جرم قرار دیتے اور آج بنگال و پنجاب میں صوبہ متوسط کی طرح مسلمان چار پانچ فیصدی سے زیادہ نہ ہوتے، صوفیوں کے حلقوں نے عامۃ الناس کو اسلام سے روشناس کیا۔ اور ان کی مساعی سے ہندوستان میں "قومیت اسلام" کی بُری بھلی جو کچھ بھی ہو بنیاد پڑی۔

اکبر اعظم افغانوں پر اعتبار نہ کرسکتا تھا، اس کے ہم قوم ترکمانی تخت یا تختہ سے کم پر راضی نہ ہوتے تھے، آخر سلطنت کو استحکام کیسے نصیب ہوتا؟ مجبوراً اس نے اپنے پیشرؤوں کی طرح سلطنت کے نئے حلیف ڈھونڈے، بیشک عباسیوں نے بنی امیہ کا زور توڑنے کے لئے ایرانیوں کو ملایا لیکن ایرانی مسلمان تھے، برامکہ خاندان کی ہمدردیاں لاکھ ایرانیوں سے ہوں لیکن ان کی شوکت و اقبال سے اسلام کا آفتاب اقبال چمکا، مامون کی ماں ایرانی الاصل تھی، اور ایرانی خون کا مامون کی رگوں میں جوش مارنا فطری تھا لیکن ایرانی اثرات سے سلطنت اسلام کو نقصان کی بجائے نفع پہنچا، اکبر اعظم کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، راجپوتوں کے تقرب نے اسلامی ہند کی عمارت کو وہ صدمہ پہنچایا کہ جس کی تلافی جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب سے بھی نہ ہوسکی، اس بیان سے مقصود اکبر اعظم کی سیاست کو متہم کرنا نہیں، سیاسی ضروریات کے تقاضے خیال پرستی کو خاطر میں نہیں لاتے، اکبر راجپوتوں کو ساتھ نہ ملاتا تو مغل اتنی بڑی حکومت بھی قائم نہ کرتے لیکن اس عظمت کی بنیادیں کھوکھلی تھیں، اورنگ زیب کے مرتے ہی یہ سربفلک عمارت دھم سے نیچے آرہی، حکمراں طبقہ کا شیرازہ بکھرا تو سلطنت بے سری فوج کی سی ہوگئی، عامۃ المسلمین سیاسی جھگڑوں سے پہلے ہی کنارہ کش تھے، اس لئے ان میں کسی سیاسی شعور کا نہ ہونا محل تعجب نہیں ہوسکتا، مسلمانوں کے فوجی طبقوں میں کوئی ملی یا قومی احساس نہ تھا، ان کو مرہٹوں کی فوج میں جگہ ملی تو نمک خواری کا حق ادا کرنا اپنا فرض سمجھا، سکھوں کی

حکومت آئی تو رنجیت سنگھ کے دست و بازو بن کر اپنے مسلمان بھائیوں کا سر کچلنے لگے، جاٹوں کی غارتگری میں اُن کا ساتھ دیا۔ الغرض ابر و باد کے طوفان میں جو حالت ریت کے ذرّوں کی ہوجاتی ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہوگئی۔

۱۸۵۷ء سے پہلے عامۃ المسلمین میں بیداری کے آثار پیدا ہورہے تھے، وہابی تحریک اس بیداری کا ایک مظہر تھا، اس تحریک کے مخاطب عامۃ المسلمین تھے، اور اس کا ظہور مسلمانوں کے حکمراں اور اعلیٰ طبقوں کی عین اخلاقی اور سیاسی موت کے زمانہ میں ہونا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ قدرت ہندوستان سے اسلام کے نئے آفتاب کے طلوع کے سامان فراہم کررہی تھی اور صد ہزار انجم کا خاں ایک نئی سحر کو پیدا کرنے میں لگا ہوا تھا، یہ کہنا کہ اسلام کو مرہٹوں، راجپوتوں اور سکھوں سے انگریزوں نے بچایا ایک اتنا بڑا اتہام ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہوسکتی، سچ تو یہ ہے کہ انگریزوں نے اسلام کی اٹھتی ہوئی لہر کو دبایا۔ اور پانچ چھ سو برس کے بعد عوام مسلمین میں زندگی کی جو شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، اُسے ایک مدت کے لئے ماند کردیا۔

مسلمانوں کے حکمراں اور اعلیٰ طبقے غدر کی نذر ہوئے، اور جو بچ نکلے وہ فرنگی قہر و غضب سے اتنے سہم گئے کہ" حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں" کے نغموں میں قومی خسارے کے صدمہ کا غم غلط کرنے لگے، وہابی تحریک کو بڑی سختی سے کچل دیا گیا۔ اعلیٰ متوسط طبقے علی گڈھ تحریک کے گن گانے لگے، اور حکومت نے ان کو دلکش اور فیض رساں مناصب کی چاٹ لگادی، اور عوام ملّاؤں، پیروں، سرکار دولت مدار اور مہاجنوں کا شکار بننے کے لئے چھوڑ دئے گئے، ۱۸۵۷ء سے پہلے عوام مسلمانوں کی بیداری کا یہ حشر ہوا کہ خود وہابی تحریک کے علمبردار نئے حالات سے متاثر ہوگئے، اور مصلحتِ وقت کو مقصود اصلی پر ترجیح دینے لگے۔

۱۸۵۷ء سے اب تک ہماری ملّی زندگی ایک خلفشار کے عالم سے گذر رہی ہے، حالی کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے ایک مبصر لکھتے ہیں:-

" اس یاس و بے دلی سے حالی کو نجات دینے والا دہی شخص تھا، جس نے اس

نازک وقت میں مسلمانوں کی دست گیری کی، سرسید احمد خاں کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی، انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے، اور ان کا انتشار انھیں ہلاکت کی طرف لئے جارہا ہے، مصلحت شناسی کی نظر سے زمانہ کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن و معاشرت کے بکھرے ہوئے اجزا کو "قوم" یا "ملت" کے شیرازہ میں باندھنے کی کوشش کی، اور دوسری طرف حکومتِ وقت سے جہاں تک اس ذلت و افتادگی کی حالت میں ممکن تھا عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا جسے آج ان کے موافقین اور مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔"

سرسید کے خلوص اور حسنِ نیت پر کون شک کر سکتا ہے لیکن ان کا سیاسی تدبر مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید نہ ہوا۔ "ملت" یا "قوم" کے ارکانِ ترکیبی کے انتخاب میں انھوں نے وہی غلطی کی جو ان سے پہلے ہمارے سلاطین کرتے آئے تھے ممکن ہے سرسید مرحوم معذور ہوں، اعلیٰ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کا عوام کو سمجھنا، اور ان کی قیادت کرنا مشکل ہوگا، اُن کے آرزوں سے بھرے ہوئے دل اور بے تاب طبیعت نے انھیں وہابی تحریک کا ہمدرد بنایا لیکن خاندانی وراثت نے انھیں عوام سے ملنے نہ دیا، ان کی سیاست نے اعلیٰ متوسط طبقوں کو ذلت و افتادگی میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر نازش بے جا کرنا سکھایا، اور ان کی مذہبیت نے عوام اور عوام کے ترجمان علمار کو ان سے بدظن کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۶ء تک علی گڈھ تحریک علی گڈھ کالج کے انگریز پرنسپلوں کے ہاتھ میں آلہ کار بنی رہی، اور ہمارے کارواں کے حدی خواں کو بھی علی گڈھ کالج کے طلبہ کو یہ پیام دینا پڑا ؎

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

سرسید کا زمانہ بیت گیا، محمد علی اور آزاد ہماری کشتی کے ناخدا بنے، ۱۹۰۸ سے ۱۹۲۰ کے دور کو ہم محمد علی کا دور کہہ سکتے ہیں، یہ دور ایک مسلسل ہنگامہ ہے، مسلمانوں کی کشتی منجدھار میں سے جا رہی تھی، پرانے ناخداؤں سے نوجوان مایوس ہو چکے تھے، نئے ناخدا بڑی ہمت کے مالک تھے، لیکن طوفان اس بلا کا تھا کہ یہ کشتی ساحلِ امن سے دُور ہی رہی اور ناخدا تھک تھک کر ہمتیں ہار گئے، محمد علی کی ہمت آخر وقت تک نہ ٹوٹی لیکن جان نے رفاقت نہ کی اور موجوں کے ریلے نے کشتی کو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک بھنور میں ڈال دیا۔ اب بھانت بھانت کے ملّاح ہیں، کوئی کسی کی نہیں سنتا، جو کسی کے جی میں آتا ہے کرتا ہے، حالت نازک سے نازک تر ہو رہی ہے اور کشتی گرداب بلا میں بدستور ہچکولے لگا رہی ہے، "مردے از غیب" کی طرف ہر شخص کی آنکھیں لگی ہیں، یہ "مردے از غیب" کب ظاہر ہو گا اور کس نہج پر اپنی سیاست کا ڈول ڈالے گا۔ اس کے متعلق آئندہ پرچہ میں کچھ لکھنے کی جرأت کی جائیگی ؎

نظم اقبال پر ایک سرسری تنقید

(جناب خانصاحب محمد مشتاق علی خاں رہتک)

اقبال کی نظم نہ شاعری ہے۔ نہ بصیغۂ مبالغہ ساحری جن کا زیر و بم ایک ہنگامی تلاطم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اقوام عالم کے لئے ایک پیام زندگی ہے۔ جسے بانگ سروش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ "شمع اور شاعر" کے مکالمہ میں اقبال خود کہتا ہے:-

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری ہاں سنادے محفل ملت کو پیغام سروش

اقبال کی شاعری کو تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور مشق سخن کا زمانہ ہے۔ جس میں رنگا رنگ دلاویزیاں موجود ہیں۔ مگر یہاں بھی زندگی اور زندہ دلی کا عنصر غالب اور خودی و خودداری کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن جس چیز نے اقبال کو بین الاقوامی شہرت بخشی۔ وہ اسکی فارسی مثنوی ہے جس میں وہ ایک ہادی برحق اور رہبر کامل کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

ابتدا میں ایک ہی مثنوی مدنظر تھی۔ جس کے متعلق سنہ ۱۹۲۰ء میں علامہ مرحوم نے خود فرمایا تھا۔ کہ اسکی تکمیل کے بعد میں یہ سمجھونگا۔ کہ میرا مقصد زندگی ختم ہو چکا۔ مگر کار فرمائے قضا و قدر کو اقبال سے بہت کام لینا منظور تھا۔ اس لئے بجائے ایک کے دو مثنویاں عالم وجود میں آئیں۔ اور "اسرار خودی" و "رموز بیخودی" کے بعد ہی "پیام مشرق" بھی طلاع ہوا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ جو ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

"اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کا اقبال ایک پختہ کار شاعر، نبض شناس حکیم اور رہبر کامل کے لباس میں جلوہ نما ہوا ہے۔ اسے اسکی شاعری کا دوسرا دور تصور کرنا چاہیئے۔ لیکن "پیام مشرق" سے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جسمیں وہ تمام ممالک مشرقی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اور ازاں بعد منازلِ ارتقا طے کرتا کراتا اس مقام محمود پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے تمام اجزائے کائنات ایک کل کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

"پیامِ مشرق" کی اشاعت پر پروفیسر آرنلڈ کا ایک ناقدانہ مضمون کسی انگریزی اخبار میں میری نظر سے گذرا تھا۔ جس میں "پیامِ مشرق" پر ایک عالمانہ تنقید کی گئی تھی۔ اور بعض اشعار کو انگریزی کا جامہ پہنایا گیا تھا اُس وقت یہ شعر مجھے بہت پسند آیا تھا ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

یعنی خواب کیا ہے۔ ایک ہلکی سی موت! اور مرگ کیا ہے۔ ایک گہرا خواب!!

اس کے علاوہ پروفیسر صاحب نے ان دو شعروں کو بھی اپنی زبان میں نظم کیا تھا ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ان اشعار کی شانِ نزول یہ ہے۔ کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریک خلافت اور کانگریس اپنے شباب پر تھی۔ کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار "جان بل" میں ایک کارٹون شائع ہوا جس میں ایک حسین عورت کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے "مادرِ ہند" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس کے آگے دوسری تصویر تھی جس پر "مسٹر گاندھی" لکھا تھا۔ یہ عورت آنکھیں بند کئے گاندھی جی کے پیچھے تھی۔ اور گاندھی سے آگے سمندر اور چٹان تھی تصور پیش کیا گیا تھا۔ کہ بھارت ماتا اندھا دُھند بہاتما گاندھی جی کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ کہ یا تو وہ سمندر میں غرق ہو جائے۔ یا چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

اخبار "زمیندار" کے ایک رکن ادارہ نے یہ تصویر علامہ مرحوم کو دکھائی۔ اسے دیکھ کر آپ نے مذکورہ بالا دو شعر موزوں کئے۔ اور فرمایا کہ اسی تصویر کے ساتھ انھیں "زمیندار" میں شائع کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اربابِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مگر اُس وقت ہم سمجھے تھے۔ کہ ان شعروں میں صرف ایک ہنگامی کیفیت ہے۔ لیکن جب پروفیسر آرنلڈ کی نظرِ انتخاب نے انھیں اپنی تنقید کے لئے منتخب کیا۔ تو مجھے اس "ہر دم تازہ" کلام کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اور آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ویسا ہی محرک و موثر ہے۔

اقبال کی تازہ ترین مطبوعات "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" ہیں۔ جو تیسرے دور کی پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ جس کی ابتدا "پیام مشرق" سے ہوئی۔ اب اقبال شاعری یا پیغمبری نہیں۔ بلکہ تیراندازی کرتا ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہہ جاتا ہے۔ جس طرح کہ وہ خود محسوس کرتا ہے۔ گویا ایک واردات قلب ہے۔ اور قال نہیں۔ بلکہ حال ہے۔ یا یوں کہیئے کہ زبان وقلب کا وصل ہو چکا ہے اس لئے جو بات نکلتی ہے۔ وہ جذبات کو بھڑکانے اور روح کو گرمانے والی ہے۔ جسمیں نہ کوئی تمہید ہے، نہ تکلف و تصنع۔ سیدھی بات سیدھے تیر کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے۔ اور اب اس کا روئے سخن تمام دنیا اور کل بنی نوع انسان کی طرف ہے۔

"بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے زندگی اور لوازم زندگی، راز حیات اور فلسفہ مرگ کے مسائل حل کئے ہیں، اقوام عالم سے خطاب کیا ہے، نوجوانوں کو درس زندگی دیا ہے۔ طالب علم اور معلم دونوں کیلئے مشعل ہدایت تیار کی ہے، درویشی و تونگری، فقر و سلطنت اور سرمایہ داری و مزدوری کی کیفیت کو بے نقاب کیا ہے۔ جمہوریت کی عقدہ کشائی کی ہے۔ اور معرکہ عشق و عقل سے زمین شعر کو گلرنگ کیا ہے۔ غرض کوئی شے نہیں جو یہاں حاضر نہ ہو۔

طالب علموں اور نوجوانوں کے لئے اقبال کی دعا ہے ؎

جوانوں کو مری آہ سحر دے　　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　　مرا نور بصیرت عام کر دے

ایک جگہ نوجوانوں کی رگ ہمت و تدبیر کو یہ کہکر بھڑکایا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　　نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

یعنی اگر نوجوان آزادیٔ فکر و ضمیر سے ہکنار ہو جائیں۔ تو نظر ہمت اتنی بلند ہو جاتی ہے۔ کہ آسمان کو اپنی زمین تصور کریں۔

موجودہ مدارس و مکاتب کے خود فراموش اثرات کا رونا ان الفاظ میں رویا ہے ؎

یہ بتانِ عصر حاضر، کہ بنے ہیں مدرسوں میں　　　نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

یعنی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہاں خدا پرستی کی بجائے بُت پرستی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر رونا اس بات کا ہے کہ بتوں کی تراش نہ آذری ہے۔ نہ برہمنی۔ بلکہ صرف حکام پرستی اور خود فراموشی کے بُت گھڑے جاتے ہیں۔ جو نوجوانوں کو گھر اور گھاٹ دونوں سے کھو دیتے ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے ؎

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے ۔۔۔ سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"خداوندانِ مکتب" میں مدرس، معلم، انسپکٹر، ڈائرکٹر اور منسٹر سبھی شامل ہیں۔ اقبال کو ان سب سے یہی شکایت ہے کہ اولادِ آدم کو مفلوج و محکوم بنا دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے بچے تمام عالم کو مسخر کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ بھلا یہ کیا انصاف و دیانت ہے۔ کہ شاہین و عقاب کے بچوں کو زمین پر رینگنا سکھایا جائے۔ اور انسان کے بچوں کو ہر باطل قوت کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دی جائے۔

پھر کہتا ہے۔ بلکہ تنبیہ کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں ۔۔۔ اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

یعنی وہ بچہ شاہیں جو گدھوں میں پرورش پا کر بڑا ہوا ہو۔ اُسے شاہبازی کے طریقوں سے کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ پس یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جن نوجوانوں نے مدرسہ میں غلامی اور محکومی پر قناعت کرنے کی تعلیم پائی ہے اُن سے جہاں بانی اور کار فرمائی کی توقع کی جائے!

مسلم ہندی یا بالفاظ صحیح تر قوم مغل کے لئے اقبال کا فتویٰ یہ ہے ؎

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے ۔۔۔ وہ قوم جس نے گنوایا ہو تاجِ تیموری

یہ فطرتِ انسانی ہے کہ اگر کسی کی حقیر سے حقیر شے بھی کوئی بزور و قوت لینا چاہے۔ تو وہ اسکی حفاظت میں اپنی جان لڑا دیتا ہے۔ بلکہ پہلے سے تدابیر تحفظ کر لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی حفاظت و نگہداشت ہی نہ کر سکے تو اس پر قابض و متصرف رہنے کا اہل نہیں۔ اور نااہل شخص یا افرادِ قوم ہرگز درخورِ اعتبار نہیں۔ اس لئے جو قوم تاج و تخت تیموری جیسی بیش بہا دولت کی حفاظت نہیں کر سکی۔ اس کا کوئی

دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ پس اگر یہ قوم یا کوئی فردِ قوم امارت کا دعویٰ کرے تو اسے بھی تسلیم نہ کرو۔ اور فقر کی دعویٰ دار ہو تو اُسے بھی جھٹلا دو۔ کیونکہ درویشی کی اہل بھی وہی قوم ہو سکتی ہے، جو سلطنت کی اہل ہو۔

"خواجگی" کے عنوان سے اقبال نے چند نہایت بلیغ شعر قلمبند کئے ہیں ؎

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم	اہلِ سجّادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور	سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی	پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

یعنی دورِ حاضر اور عہدِ قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ اب بھی چند مذہبی اجارہ دار اور چند سیاسی ٹھیکیدار تمام دنیا پر مسلّط ہیں۔ اور انسانی ہمت و تدبیر کو نشو و نما سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں سیاست کے دعوے داروں یا خرقہ پوشوں کی قابلیت کو مطلق دخل نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بندگانِ خدا کا اثرِ غلامی قبول کرنا فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لئے پیروں کو مرید اور صاحب اقتدار لوگوں کو فرماں بردار بندے خود بخود مل جاتے ہیں۔ اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ اندر سے ٹھوس ہیں۔ یا کھوکھلے۔ پس جس طرح زمانہ قدیم میں خود ساختہ معبودوں اور مفروضہ خالقوں کی پرستش ہوتی تھی۔ اسی طرح اب اکابر و عناصر کی پرستش کی طرف رجحان ہے۔ گویا عوام الناس بلکہ خواص تک کی خوئے غلامی اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ اب اس میں نہ پیری کی کرامت کو دخل ہے۔ نہ میری کی سیاست دانی کو۔ بلکہ لوگ از خود انکی طرف جھکے چلے آتے ہیں۔ بس زمانہ جاہلیت اور زمانہ حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

"ہنروران ہند" کے عنوان سے چار شعر اس طرح لکھے ہیں:۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا	ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں	زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند	کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس	آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ایک فاضل علوم مشرقی و مغربی اب سے پندرہ بیس سال پیشتر مجھ سے فرمانے لگے۔ کہ جب شیکسپیر سے لوگوں نے کہا کہ تم یاس انگیز افسانوں پر اپنا زورِ طبیعت کیوں نہیں دکھاتے تو اس نے جواب دیا کہ میں اس طرزِ تحریر سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ اسے ایکٹر سٹیج پر نبھا نہیں سکتے۔ شیکسپیر کا یہ قول دہرانے کے بعد وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر یاس انگیز افسانوں کا سٹیج پر ادا کرنا دشوار ہے تو ان کا لکھنا دشوار تر ہے پھر یہ کیا بدمذاقی ہے کہ ہندوستانی افسانہ نویس بدانجام افسانے ہی لکھتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ کہ شیکسپیر اور انگلستان کے متعلق تو یہ قول درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی فسانہ نگار نیک انجام افسانے لکھیں تو وہ اس حد تک بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جس حد تک کہ بدانجام افسانوں میں کامیاب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ہندوستانی کی زندگی بجائے خود ایک داستانِ درد ہے۔ اور وہ اپنے حسب حال ہی بہتر لکھ سکتا ہے۔ دوسرے غلامی اور محکومی نے بقول اقبال اُسے زن مزاج بنا رکھا ہے۔

اقبال کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے کہ ہندوستانی مفکروں، شاعروں، مصوروں اور سیاست دانوں تک کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ اور سب کے سب "تابوت بردوش" ہی نظر آتے ہیں۔

"نوبل پرائز" حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹیگور جاپان بھی گئے تھے۔ وہاں آپ ایک مجمع میں اپنی ویدانت بیان کر رہے تھے۔ تو اس وقت ایک جاپانی نے کہا کہ ٹیگور تمہارا فلسفہ ایک مفتوح قوم کا فلسفہ ہے جسے سننے کے لئے ہم ہرگز تیار نہیں"۔

اقبال اس مجہولیت سے نہ صرف ہر ہندوستانی کو بلکہ ہر انسان کو بچانا چاہتا ہے۔ اور فکرِ انسانی کو عقابی پرواز میں دیکھنا چاہتا ہے۔

غلامی اور محکومی سے بچنے کے لئے اقبال یہ نسخہ تجویز کرتا ہے ؎

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں ۔۔۔ زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

انسان کی بیشتر مصیبتیں اور تمام تر کمزوریاں غرض پرستی کے تحت میں آتی ہیں۔ انسان کیوں مادی اور فانی طاقتوں کے آگے جھکتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی غرض مندیاں اُسے مجبور کرتی ہیں۔ ایک انسان کیوں

دوسرے انسان سے ڈرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی طمع نفسانی قوت مردانگی کو سلب کر دیتی ہے ؎

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج

احتیاج است، احتیاج است، احتیاج

اگر انسان حقیر خواہشات نفسانی کو ترک کر دے، تو کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اُسے نہ ڈرنے کی نوبت آئے۔ نہ ڈرانے کی ضرورت باقی رہے۔ اور جب اس کی نیک نیتی میں بے خوفی کا بھی اضافہ ہو جائے تو اُسکا محکوم و مجبور رہنا غیر ممکن ہے۔ بس اپنے دل کو پاک رکھو، اور لذت و شہوات کے غلام نہ ہو۔ پھر کوئی دنیاوی طاقت تمھیں غلام نہیں بنا سکتی۔

خدائی اور بندگی کا موازنہ اس طرح کیا ہے:۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے — خداوندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی! استغفر اللہ — یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

کسی کام کی ذمہ داری اگر احساس فرض کے ساتھ لی جائے۔ تو وہ ایک بڑی مصیبت اور درد سری ہے۔ اور جتنی بڑی ذمہ داری ہوگی اتنی ہی وبال جان ہوگی۔ اس لئے سب سے بڑی دردسری تمام امور کائنات کی ذمہ داری ہے اور یہ ایسا دردسر ہے کہ خداوندِ عالم ہی اسے گوارا کر سکتا ہے۔ میں تو اس خدائی اور کارفرمائی کے نام سے بھی کانپتا ہوں، اور اسے دردسر سے کم نہیں سمجھتا لیکن بندگی اور اطاعت ایک نہایت خوفناک مصیبت ہے۔ جو اس دردِ سر کے مقابلہ میں دردِ جگر سے کم نہیں۔ اور بہر حال دردِ جگر پر دردِ سر کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایک اجرائے حکم اور دوسرا تعمیل حکم ہے۔

غالب کا شعر ہے:۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی ایمان رکوع و سجود میں نہیں بلکہ وفاداری کے عہد صادق کا نام ایمان ہے۔ اس لئے جس

برہمن نے تادمِ زیست بُت پرستی کی ہو اور بُت کے قدموں ہی پر جان دیدی ہو۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ مرنے کے بعد اچھے سے اچھا مقام حاصل کرے۔

مگر اقبالؔ کہتا ہے :۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ــــــ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یعنی اگر تپشِ عشق سے غیر مسلم کا دل بھی متاثر ہو تو وہ صاحبِ ایمان ہے۔ لیکن اگر مردِ مسلمان ہزار سجدے کرنے کے باوجود بھی تنگ دل اور تیرہ باطن رہے تو وہ ایمان سے محروم ہے مطلب یہ کہ ایمان صفائی قلب میں ہے ورنہ خالی آرائشِ گفتار اور زینتِ لباس تو مہا پاپ اور سب سے بڑی بے ایمانی ہے۔

پھر کہا ہے :۔

علم کی حد سے پرے بندہ مومن کے لئے ــــــ لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

یعنی بندۂ مومن کے لئے علم ظاہری کافی نہیں۔ جو بسا اوقات عقلِ انسانی کا سب سے بڑا پردہ بن جاتا ہے۔ اور قوتِ عمل کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ بلکہ اس میں عشق کی حرارت بھی ہونی چاہیئے۔ اور منزلِ عشق مقامِ علم سے بہت آگے ہے، اگر بندہ مومن وہاں پہنچ جائے تو لذتِ شوق اور نعمتِ دیدار دونوں سے شاد کام رہتا ہے۔ حالانکہ عام قاعدہ کے مطابق نعمتِ دیدار کے بعد لذتِ شوق فنا ہو جاتی ہے۔ جب علم و عقل کسی کام سے عاجز آجاتے ہیں تو وہاں عشق ہی رہنمائی اور دستگیری کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی مہمیں اسی کی بدولت سر ہوئی ہیں۔ ورنہ عقل بے چاری تو سرنگوں ہو چکی تھی۔ اقبالؔ نے کہا ہے :۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ــــــ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ــــــــ ۹ ــــــــ

مخلوقِ خدا کی مصیبتوں کو خالقِ ارض و سما کی جناب میں یوں بیان کیا ہے :۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں ــــــ کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

جب سب اراکینِ سلطنت اور عہدیدار و اہلکار عیّار ہوں ۔ اور خلقِ خدا ان سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کرلے کہ ان دنیا داروں کو چھوڑ کر معرفت کے دعویداروں ہی سے دار دئے دل طلب کی جائے ۔ تو یہاں بھی یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ شیخ و برہمن اور صوفی و مُلّا سب عیّار و مکّار ہیں ۔ اور اب پتہ چلتا ہے کہ شیطان ہر لباس میں جلوہ گر ہے ۔ غرض دیر و حرم سب میں اندھیرا ہے ۔ ایسی حالت میں دنیا کا کیا حال ہو ۔ اور خلقِ خدا کو کون سنبھالے ۔

پھر کہا ہے :۔

رہ و رسمِ حرم نا محرمانہ　　　کلیسا کی ادا سوداگرانہ

تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک　　　نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اور بھی سنئیے :۔

حق را بسجودے صنماں را بطوافے　　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

یعنی یہ دین کے ٹھیکیدار جب خدا کے سامنے جاتے ہیں تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں ۔ اور جب بتوں سے دوچار ہوتے ہیں تو ڈنڈوت کرنے لگتے ہیں ۔ غرض کارسازِ حقیقی اور معبودِ خیالی دونوں سے مکر و فریب کرتے ہیں ۔ اور جب یہ خدا سے نہیں چوکتے تو انسان بیچارہ کو تو کیا بخشتے ۔ اور چونکہ مساجد و منادر اور کلیسا و کنشت ہی ان کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کے اڈے ہیں ۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ مسجد اور مندر سب کا تعزیہ ٹھنڈا کر دیا جائے ۔

"مُلّا اور بہشت" کے عنوان سے چند لطیف اشعار قلمبند کئے ہیں ۔ اس قطعہ کا آخری شعر یہ ہے :۔

ہے بدآموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا　　　اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

یعنی مُلّا کی تو زندگی اور دل لگی ہی بدآموزیٔ اقوام و ملل اور بدگوئی خلقِ خدا میں ہے ۔ اور اس عیب جوئی و نکتہ چینی کے بہترین اڈے آج کل کی عبادت گاہیں ہیں ۔ پس اگر تو نے اسے بہشت میں داخل کر دیا تو اسکی زندگی ہی حرام ہو جائیگی ۔ کیونکہ وہاں نہ تو مسجد ہے ۔ جہاں اڈا جما کر یہ سب کو بُرا بھلا کہہ سکے اور نہ کلیسا و کنشت ہیں جنھیں مدِ مقابل اور حریف قرار دیکر یہ اپنے دل کا بخار نکال سکے ،

پس بہتر یہی ہے کہ اسے جنت سے دور رکھا جائے۔

———— ٭ ————

اقبالؔ نے آزادی، فکر و عمل اور خودی بمعنی خودداری پر کثرت سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے:-

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

وہ اپنے آپ کو کسی ملک و ملت اور کسی قوم و فرقہ سے منسوب کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اُس کے نزدیک یہ سب ایسی پابندیاں ہیں کہ جذبات خودی و آزادی کو پرورش نہیں ہونے دیتیں۔ نیز ان کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کر رہا ہے۔ اور اولادِ آدم وسعتِ فکر و نظر سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:-

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دنیا یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اُسے دینی یا دنیاوی کوئی پابندی گوارا نہیں۔ بلکہ دنیا و عقبیٰ وہ دونوں سے بے نیازی اسکا مسلکِ آزادی ہے۔

———— ٭ ————

سائنس کی جدید تحقیقات یہ ہے کہ نظر آنے والے ثوابت و سیار سے اوپر اسی قسم کے اور بھی چاند ستارے اور کُرے موجود ہیں۔ غالبؔ کہتا ہے:-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یعنی اگر عرش سے دوسری طرف ہمارا مکان ہوتا تو کیا اچھی بات تھی۔ کیونکہ اس صورت میں ہمارا منظر بلندی ایک اور آسمان اور ثوابت و سیار ہوتے اور نظر آنے والا آسمان ہماری زمین قرار پاتا۔ غالبؔ اگرچہ اور بلندیوں کا تو قائل ہے۔ مگر وہاں تک پہنچنے کے لئے صرف دستِ دُعا بلند کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن اقبالؔ کہتا ہے:-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر! — چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یعنی ستاروں سے آگے یقیناً اور جہاں بھی ہیں۔ اور تلاش و تحقیق کے دروازے کھول کر وہاں تک پہنچ جانا ایسا فرض انسانی ہے۔ جو ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ جس عالم رنگ و بو میں تم آباد ہو۔ مت سمجھو کہ دائرۂ کائنات یہیں ختم ہو گیا بلکہ اس طرح کے بہت سے عالم موجود ہیں۔ جنھیں آباد کیا جا سکتا ہے اور چونکہ تم بنی نوع انسان اور اشرف المخلوقات ہو اس لئے تلاش و تحقیق اور عمل میں مصروفیت تمھارا فرض انسانی ہے اگر تم ایک دفعہ احساسِ فرض کے ساتھ مصروف عمل ہو جاؤ تو نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کا ابدی سلسلہ قائم ہو سکتا ہے۔

پھر کہتا ہے:۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات۔ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یعنی جتنے معلوم مقامات ہیں اُن سب سے آگے غیر معلوم مقامات بھی ہیں۔ جن کا نہ صرف سراغ لگانا بلکہ وہاں تک پہنچ جانا تیرا فرض ہے۔ اور حیات صرف اسی چیز کا نام ہے کہ ہر ساعت زندگی میں آگے ہی قدم بڑھتا رہے۔

———— ۷ ————

اقبال بحرِ تصوف کا بھی ایسا غواص ہے کہ زمین کی تہ تک نکال لاتا ہے۔ ذیل کے دو معرکۃ الآرا شعر دیکھنے سے اربابِ ذوق و نظر پر روشن ہو سکتا ہے۔ کہ ترجمانِ حقیقت شاعر کس مقامِ بلند پر متمکن ہے:۔

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے — مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے۔ کیا بتائے؟ — اگر ماہی کہے۔ دریا کہاں ہے؟

یعنی سوائے ذاتِ احدیت کے کوئی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہے۔ یہ زمین و آسمان اور

مکان ولامکان محض اندازِ بیان اور مرگ و زیست صرف حسنِ ادا ہے۔ جن کا وجود اسی وقت تک محسوس ہوتا ہے۔ جب تک تو خود فراموشی میں مبتلا ہے۔ لیکن اگر تیرا قلب حساس اور دل درد آشنا ہو۔ تو رازِ حقیقت تجھ پر منکشف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ راز سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ اسکی گرہ کشا تیری تخلیقِ خودی ہی ہو سکتی ہے۔ اور خودی تیرے اندر اور تو اصل ذات کے اندر موجود ہے۔ لیکن پھر بھی تو پوچھے۔ کہ کہاں ہے۔ تو یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے ماہی خضرؑ سے سمندر کا پتہ دریافت کرے۔ حالانکہ وہ ہر وقت سمندر ہی میں رہتی ہے۔

اقبال ایک مومنِ خالص کی نظر سے تمام دنیا کو دیکھتا ہے۔ وہ غریبوں اور بیکسوں کو فائز المرام اور مسکینوں محتاجوں کو شادکام دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ بندگانِ خدا کی محکومی و غلامی سے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ بنی نوع انسان کی مظلومی و مجبوری سے اس کے سینہ میں داغ لگ جاتا ہے۔ اور خلق اللہ کی ابتری و بیکسی پر اس کے جگر میں ناسور پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی حقیقی مساوات کا علمبردار ہے جس میں نہ کوئی حاجت مند ہو۔ نہ حاجت روا۔ اور نہ کوئی ڈرنے والا باقی رہے نہ ڈرانے والا۔ اس شریف جذبۂ انسانیت سے متاثر ہو کر اُس نے "فرمانِ خدا" بنام فرشتگان میں اپنے احساسِ قلب کا یوں اظہار کیا ہے:-

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے　　　کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　　اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے　　　پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے　　　بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے　　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

اقبال کس مقام پر ہے۔ اور کس غزل کی اُسے تلاش ہے، شیخ اور صوفی و مُلّا اس کی نظر

میں کون ہیں، عشق و علم کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک غزل کے چند بصیرت افروز شعر پیش کر کے میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں:-

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ "ہے یہ بھی حرام" اے ساقی

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

لختے چند

(جناب جلیل قدوائی، ام اے)

(۱)

منائی تھیں دل نے جہاں رنگ رلیاں — محبت کی سونی پڑی ہیں وہ گلیاں

بہت گُل محبت کے کمھلا چکے ہیں — بہت کھل رہی ہیں محبت کی کلیاں

ترے حُسن کے گرچہ سب طور بدلے — مگر عادتیں وہ نہ تیری بدلیاں[۱]

مقرر ہیں راہیں، معین ہیں رستے — یہ الفت کی وادی ہے تو بچ کر چل یاں

ترا ذکر کیا ہے جلیل عاشقی میں

میاں کوہ کن نے بھی ڈھوئی ہیں ڈلیاں

(۲)

اُس بُت کی کشیدگی نہ پوچھو — آنکھوں کی رمیدگی نہ پوچھو

دیدار کو میں ترس گیا ہوں! — اب میری ندیدگی نہ پوچھو

ہے تیر نظر جو دل میں پیوست — کچھ اُس کی خلیدگی نہ پوچھو

حال دل زار سن کے اس کی — رنگت کی پریدگی نہ پوچھو!

گلنار ہوئے ہیں جیب و دامن — اشکوں کی چکیدگی نہ پوچھو

حیراں ہوں جلیل، رُخ پر اُس کے

ہے ایسی دمیدگی، نہ پوچھو!

[۱] متروک طرز ہے مگر پیاری! ج

وفاق ہند

(از جناب حسن سبحانی صاحب متعلم جامعہ)

قبل اس کے کہ ہندوستان میں وفاقی حکومت کی شان نزول بیان کر کے اسکا ایک عام جایزہ لیا جائے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وفاقی حکومت کی تعریف اور اس کی تھوڑی بہت تاریخ بیان کر دی جائے۔

اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس طرح مل کر ایک نئی ریاست بنائیں کہ ان کا انفرادی وجود بھی قائم رہے اور اس اتحاد سے جو ریاست بنی ہے اس میں ایک اچھی ریاست کے تمام اوصاف بھی موجود ہوں تو اسے وفاق یا Act of union کہتے ہیں اس تعریف کو سمجھنے کے لئے سیاسی اتحاد کی بعض اور صورتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک صورت تو دو ریاستوں کے متحد ہونے کی یہ ہے کہ ریاستیں علیحدہ علیحدہ ہوں لیکن ان کا بادشاہ ایک ہی ہو سنہ ۱۶۰۳ء میں اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ جیمس ششم انگلستان کا بادشاہ بھی ہو گیا، دونوں ریاستوں کا وجود جدا جدا قایم رہا دونوں کے داخلی قانون میں فرق تھا صرف بادشاہ کے ایک ہونے کے باعث خارجی حکمت عملی یکساں تھی۔ یہ صورت سنہ ۱۷۰۷ء تک قایم رہی اس کے بعد قانون اتحاد

کی رو سے دونوں ریاستوں نے اپنی انفرادیت کو چھوڑ دیا اور ایک ریاست متحد ہو گئی۔ وفاق کی دوسری صورت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ ریاستیں کسی خاص مقصد کے لئے متحد ہو جائیں، ان کی جداگانہ حیثیت قایم رہے لیکن ایک مشترک مقصد کے لئے وہ مشترک ادارے قایم کریں ان اداروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ریاستوں کی سعادت قایم رہتی ہے اور اگر وہ چاہیں تو ان مشترک اداروں کو توڑ سکتی ہیں اس اتحاد کو اتحاد جزوی یا Confederation کہیں گے اور یہ وفاق کی ادنیٰ صورت ہے۔ امریکہ میں سنہ ۱۷۸۱ء سے سنہ ۱۷۸۹ء سوئزرلینڈ میں سنہ ۱۸۴۸ء تک اور جرمنی کی ریاستوں میں سنہ ۱۸۶۶ء تک اسی قسم کا اتحاد تھا۔

وفاق اتحاد کی ان تمام صورتوں سے مختلف ہے وفاق میں شریک ہونے والی ریاستیں اپنی خود مختاری کا ایک بڑا حصہ قربان کر دیتی ہیں۔ داخلی امور میں کسی قدر اختیارات کو محفوظ رکھ کر باقی تمام اختیارات اس جدید ادارہ کو سپرد کر دیتی ہیں جو ان کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور جسے بلحاظ قوت و اقتدار ان سب پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور جو ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وفاق میں ریاستوں کی انفرادیت کا کچھ حصہ محفوظ رہتا ہے اور کچھ حصہ اس میں مدغم ہو کر ایک اعلیٰ ریاست کی تشکیل کرتا ہے۔

وفاقی نظام حکومت دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ آج سے دو سو برس پہلے اس کا کہیں وجود نہیں تھا۔ نہ عالم حقیقت میں اور نہ عالم خیال میں۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ فلسفی جو بڑی ریاستوں کو انفرادی آزادی کے لئے خطرناک اور صحیح سیاسی زندگی کے لئے ناموزوں سمجھتے تھے چھوٹی ریاستوں کو اتحاد کا سب سے مناسب اور معقول ذریعہ قرار دیتے تھے اور بعض نے ایسی ریاستوں کے اتحاد کا خاکہ بھی پیش کیا تھا جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ دنیا کا ایک اتحاد ہونا چاہئے کیوں کہ اس کے سوا انسانیت کو فساد اور جنگ کے عظیم الشان نقصانات سے بچانے کی اور کوئی تدبیر کامیاب ہی نہیں ہو سکتی لیکن ایک ایسے اتحاد اور وفاقی حکومت میں بہت بڑا فرق ہے۔ ریاستیں صرف ایک غرض سے متحد ہوتی ہیں یعنی حفاظت اور اس اتحاد کو مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ اتحاد کا یہ شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔ کوئی ایک ریاست باقی ریاستوں پر غالب نہ آ جائے کسی ریاست کی کمزوری سے غلط فایدہ نہ اٹھایا جائے۔ ایک مجلس یا عدالت قایم کر دی جاتی ہے کہ ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرے اور سب کو معاہدہ اتحاد کا پابند رکھے۔ لیکن یہ سارا فیصلہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہر ریاست آزاد اور خود مختار رہ سکے اور یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر کسی ریاست کو اتحاد میں شریک رہنا اپنے مفاد کے خلاف معلوم ہو تو اسے کوئی دستور کوئی قانون یا ہمدردی اور وفاداری کا کوئی جذبہ علیحدہ ہونے سے روک نہیں سکتا اس کے برخلاف وفاقی حکومت کے تمام اراکین ایک دستور کے ماتحت ہوتے ہیں اور فرماں برداری کے کوئی اختیارات انھیں حاصل نہیں ہوتے ان کے وضع کئے ہوئے قوانین دستور کے خلاف ہوں تو وہ منسوخ سمجھے جاتے ہیں ان کی عدالتوں اور فوج، ان کے مالی اور

تجارتی معاملات پر وفاق کی نظر اور اسکا اثر ہوتا ہے گویا وفاقی نظام میں اراکین وفاق کے علاوہ ایک اور ایسی ریاست وجود میں آجاتی ہے جو تمام اراکین پر حاوی ہوتی ہے اور جس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ اراکین کو دستور کی پابندی اور اسپنے احکامات کی تعمیل پر مجبور کر سکے۔

سیاسی نقطہ نظر سے وفاقی حکومت اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے وفاق کا تجربہ پہلے پہل امریکہ کی نوآبادیوں نے کیا جب کہ وہ برطانوی ریاست سے علیحدہ ہوگئی تھیں اور انھیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کے بہترین سیاسی مفکروں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک مجلس عامہ، عدالت اور مجلس قانون ساز کو برابر کا رتبہ نہ دیا جائے اور اسی طرح اختیارات کا توازن نہ قایم کیا جائے تب تک قوم آزادی کی صحیح لذت سے آشنا نہیں ہو سکتی۔ لیکن کامیاب اور کارپرداز جمہوری حکومت کا صرف ایک مثالی نمونہ ان کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ تھا انگلستان کا دستور جس کی وہ نقل نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ انگلستان میں ریاست کی حیثیت منفرد تھی اور امریکہ کی مختلف نوآبادیوں کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی ذات کو کسی ہمہ گر نظام میں بالکل محو کر دیں۔ اسی سبب سے امریکہ کا پہلا دستور ریاستوں کے اتحاد کا ایک نمونہ تھا مگر چند سال کے تلخ تجربے نے امریکی مفکروں کو یقین دلا دیا کہ صرف ریاستوں کے اتحاد سے کام نہیں چل سکتا اور وہ ایک وفاقی حکومت کی تشکیل میں لگ گئے وہ ان خامیوں سے بخوبی واقف تھے جو وفاقی حکومت میں لازمی طور پر پیدا ہوتی ہیں اور بعد کی تاریخ نے ان اندیشوں کو سچ کر دکھایا امریکہ کی طرح اور ممالک میں بھی وفاقی نظام پر کسی نہ کسی صورت میں عمل ہوتا رہا امریکہ کے علاوہ جرمنی کا وفاق بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔

جرمن اور امریکہ میں وفاق کے جو تجربات ہوئے انھیں کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی وفاق نشوونما ہوتا رہا جو ان سے بہت مختلف ہے اور جو کسی صورت میں وفاقی نظام کے لئے نظیر نہیں قرار دیا جا سکتا، مگر اس سلسلہ میں اسکا ذکر کر دینا ضروری ہے یہ برطانیہ اور اسکی نوآبادیوں کا وفاق ہے اس وفاق کے اراکین اس وقت کینیڈا، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، اسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اور آئرلینڈ ہیں یہ وفاق کسی اصول کے ماتحت نہیں، اسکا مقررہ دستور نہیں بعض اعتبار سے تو وہ ریاستوں کا اتحاد ہے کیوں کہ

اس کے بیشتر اراکین مصلحت کی وجہ سے اس سے علیحدہ نہیں ہوتے مگر اس کی برابر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ان کے اختیارات روز بروز بڑھتے رہیں دیکھنے میں یہ وفاق ایک منفرد ریاست کی شان رکھتا ہے اس لئے کہ وہ ایک ہی بادشاہ کے زیر نگیں ہے۔

یہاں تک تو وفاق کی تاریخ اور اس کی تھوڑی بہت تعریف بیان کی گئی ہے ذیل کے سطور میں ان خصوصیات کو بیان کیا جائیگا جو دنیا کی تمام وفاقی حکومتوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔

وفاقی حکومت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آئین اساسی یا Constitution کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن کا آئین اساسی تحریری شکل میں نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد بعض روایات پر قائم ہے ان میں چند روایات اتنی قدیم اور اہم ہیں کہ انھوں نے قانون کی شکل اختیار کر لی ہے ان ممالک میں انگلستان کی مثال خاص طور پر قابل ذکر ہے انگلستان میں آئین سیاسی کسی جگہ لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ فرماں روائی کے سارے کام روایات کے سہارے انجام پاتے ہیں صرف قانونی روایت یہ بن گئی ہے کہ پارلیمنٹ کو تمام اختیارات حاصل ہیں" پارلیمنٹ عورت کو مرد اور مرد کو عورت بنانے کے علاوہ تمام کام کر سکتی ہے" مشہور مقولہ سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے پارلیمنٹ کے اختیارات کتنے وسیع اور غیر محدود ہوتے ہیں یہ واضح رہے کہ وہ خود اپنے حقوق کو گھٹانے اور بڑھانے کی مجاز ہے اور وہ جو قانون بھی منظور کرلے اس میں کسی قسم کے چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پارلیمنٹ میں بادشاہ کی ذات بھی شامل ہے اور اسی لئے بادشاہ کی منظوری تمام قوانین کو رائج کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس قسم کے آئین کے مقابلہ میں تحریری آئین ہوتے ہیں وہ تمام قوانین جو آئین سیاسی کے جزو میں قلمبند ہوتے ہیں اور پھر ان کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ہے دنیا کے اکثر ممالک میں اب تحریری آئین کا رواج ہے۔

آئین اساسی کی صرف اسی نہج پر تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ایک صورت اور بھی ہے وہ یہ کہ آئین اساسی میں تبدیلی کیوں کر ہوتی ہے اگر آئین اساسی میں تبدیلی کا وہی طریقہ ہے جو کسی معمولی قانون بنانے کا ہوتا ہے تو ایسے آئین اساسی کو ترمیم پذیر کہیں گے اور اگر اس میں تبدیلی کسی ایسے خاص طریقے سے ہوتی ہے

جو معمولی قوانین بنانے کے لئے استعمال نہیں ہوتا تو اسے استوار (Rigid) کہیں گے ظاہر ہے کہ استوار سے استوار آئین بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ترمیم ممکن نہ ہو لیکن فرق صرف طریقہ کار کا ہوتا ہے اگرچہ استوار آئین کو بھی بدلنے کا طریقہ آسان بنایا جا سکتا ہے لیکن بالعموم طریقہ اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ آئین اساسی کی تبدیلی کسی فوری جذبہ کے ماتحت عجلت میں نہ ہو سکے۔

وفاق کا آئین مختلف ریاستوں میں سمجھوتہ کا نتیجہ ہوتا ہے وہ اپنی سیادت قربان کرتی ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان امور کے علاوہ جن کا مرکزی حکومت کے اختیار میں ہونا ناگزیر ہے ان کے اختیارات قایم رہیں اور ان اختیارات کو ان کی مرضی کے خلاف کسی عام جوش کے ماتحت نہ چھینا جائے لہٰذا وفاقی حکومت کا آئین بالعموم تحریری بھی ہوتا ہے اور استوار بھی۔ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر اختیارات کے متعلق جھگڑا ہو ایسے مواقع پر تحریری دستاویزوں میں شک وشبہہ کو کم دخل ہوتا ہے ان ہی وجوہ کی بناء پر وفاقی حکومتوں میں آئین اساسی کو ایک مقدس میثاق کا درجہ حاصل ہوتا ہے جس میں ترمیم عجلت کے ساتھ نہیں ہو سکتی اور جسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وفاق ایک متحد ریاست کو تقسیم کرنے کے بعد وجود میں آیا ہے تب بھی تحریری واستوار آئین کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ وفاق میں عدالت کو ایک خاص رتبہ حاصل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے لئے ایک آزاد عدالت کا وجود ناگزیر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اگر ملک میں ایک وقت میں دو حکومتیں قایم ہیں اور ہر شہری دونوں حکومت کا ماتحت ہے تو بعض اوقات مشکلات کا پیش آنا ممکن ہے اس بات کا امکان ہے کہ کسی معاملہ کے سلسلہ میں مقامی وقومی حکومتوں میں اس بات پر نزاع ہو جائے کہ وہ کس سے متعلق ہے ممکن ہے کہ مرکزی یا مقامی مجلس آئین ساز ایک ایسا قانون مرتب کرے جو دوسروں کے حقوق میں دست اندازی کرتا ہو تو ان حالات میں ایک ایسے آزاد ادارہ کی ضرورت ہوتی ہے جو متنازعہ فیہ امور کا قانونی فیصلہ کر سکے یہی سبب ہے کہ وفاقی حکومتوں میں عدالت کو سیاسی اہمیت حاصل ہوتی ہے عدالت وفاقی حکومتوں کے درمیان آئین کی پاسبان ہے اسکی دیانت اور آزادی عمل پر حقوق وفرائض کی تفویض کا دارومدار ہے لہٰذا اسے تمام سیاسی اثرات سے کلی طور پر آزاد رکھا جاتا ہے اور اس پر کسی قسم کی

کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی۔ جب تک ایک طاقتور عدالت قایم نہو وفاق کا وجود ہر دم خطرہ میں رہتا ہے۔

وفاقی نظام کی تیسری خصوصیت مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق ہے عام طور پر مجالس آئین ساز کے دو ایوان ہوتے ہیں ایک میں براہ راست نمایندگی سے قوم کے نمایندے منتخب ہوتے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے چنے جاتے ہیں دوسرے ایوان میں ریاستوں اور صوبوں کے نمایندے ہوتے ہیں۔

وفاق میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ تقسیم اختیارات کا ہے اس لئے کہ ہر وفاق میں شہریوں کو دو حکومتوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے ایک تو مقامی حکومت اور دوسری مرکزی حکومت اس لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں حکومتوں کے اختیارات کو قانوناً بالکل واضح کردیا جائے۔ عام طور پر ان کا تذکرہ آئین سیاسی میں ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ بعض اختیارات ایسی نوعیت کے ہیں کہ وہ صرف مرکزی حکومت ہی کو سپرد کئے جاسکتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں وفاق بے کار ہے ان میں سے چند کا تذکرہ غالباً بے جا نہو گا۔

(۱) امور خارجہ کے تمام بین الاقوامی معاملات میں وفاق کی حیثیت ایک ریاست کی ہوتی ہے لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ریاست اپنے خارجی امور کو خود ہی طے کرے تاریخ میں کوئی ایسی مثال آپ نہیں پائیں گے کہ جس میں ہر ریاست کو خارجی امور کے سلسلہ میں آزادی عمل حاصل رہی ہو۔ متحدہ طریقہ کار کے لئے ضروری ہے کہ ریاستوں کی خارجی حکمت عملی میں یک جہتی اور یک رنگی ہو اسی لئے امور خارجہ ہمیشہ مرکزی حکومت کو تفویض کئے جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا اہم مسئلہ دفاع کا ہے لہذا بحری و بری اور ہوائی افواج پر وفاق کو پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اس کے بغیر نہ یہ ممکن ہے کہ مرکزی حکومت بین الاقوامی امور میں اختیار و اقتدار کے ساتھ نمایندگی کرے اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر ریاست پر اپنا دبدبہ قایم رکھ سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ وفاق کا وجود ہی صرف اس طرح قایم رکھ سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کی افواج پر پوری نگرانی ہو اور صرف اسی قوت کے بھروسہ پر وہ ہر ریاست کی بغاوت کو فرو اور اگر غیر ممالک سے جنگ کا موقع آئے تو پوری قوت کے ساتھ اس میں شریک ہو سکتی ہے۔

(۳) ایسی خدمات جن کا تمام ملک سے تعلق ہے مثلاً ڈاک خانہ، تار، ٹیلیفون، ریلوے وغیرہ

ان کو اگر ہر ریاست کے سپرد کر دیا جائے تو نظم و نسق قایم رکھنے میں دشواریاں ہوں گی اور اس کے بغیر ملک کو کوئی فایدہ نہ ہوگا اس کے علاوہ ان شعبوں کے ذریعہ مرکزی حکومت کو آمدنی ہوتی ہے جو ضروری کاموں پر خرچ کی جاتی ہے۔

(۴) امور تجارت جو تمام ملک سے متعلق ہوں، تجارتی قوانین، سکہ، اوزان کی یکسانیت سے اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ تجارت کی آسانی اور مفاد کی یگانگت قوم کے تمام اجزا کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیتی ہے ایک بڑی ریاست منڈیوں کی تلاش، تجارتی مراعات کے حصول، تجارتی حقوق کے تحفظ، صنعت و حرفت کی ترقی اور جدید وسائل کے پیدا کرنے میں ہمیشہ زیادہ کامیاب ہوتی ہے یہ مقصد صوبوں یا جزوی ریاستوں کے ذریعہ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔

(۵) امور تجارت کے نام کے ساتھ بینک، وسائل آمد و رفت، سڑکیں، ریلیں، بحری بری اور ہوائی راستوں کی نگرانی کا بھی ذکر آتا ہے یہ بھی مرکزی حکومت کے سپرد ہوتے ہیں کہ ان سے تمتع حاصل کرنے کی صلاحیت صرف ایک بڑی اور منظم ریاست ہی میں پائی جا سکتی ہے۔

(۶) غیر ملکیوں کے حقوق کا تحفظ، شہری بننے کے قواعد، اقلیتوں کی حفاظت، آبادی سے متعلق دوسرے امور بھی عام طور پر مرکزی حکومت کے سپرد ہونے چاہئیں یہ وہ اختیارات ہیں جو عام طور پر مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا ہونا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ ہر وفاق میں تقسیم کی تفصیلات میں فرق ہوتا ہے یہاں پر چند ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جو کم و بیش تمام وفاقی حکومتوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ امور ایسے ہیں جن کا وفاق کے تمام رقبہ سے تعلق ہے ہر ریاست اور صوبہ کے اختیارات کی فہرست بنانا بہت ہی دقت طلب امر ہے اس لئے کہ ان میں بہت تنوع ہوتا ہے ایسے امور ہمیشہ مرکزی حکومت کے ماتحت انجام پانے چاہئیں ان میں تنوع کا سبب مقامی حالات میں اختلاف اور تاریخی اثرات ہیں۔ اگر وفاق ایسی صورت میں مرتب ہوا کہ جزوی ریاستوں کو اپنے حقوق سے دست برداری گراں گذرتی تھی تو انھوں نے زیادہ سے زیادہ حقوق جو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے جا سکتے تھے اپنے لئے محفوظ کر لئے لیکن اگر وفاق

کسی اعلیٰ قوت نے مرتب کیا تو صوبوں اور جزوی ریاستوں کے حقوق کو کم کردیا اس وفاق کی بیّن مثال ہندوستان کا مجوزہ وفاق ہے۔

حقوق کے تعین کے باوجود ایک حلقہ ایسا رہ جاتا ہے جو اس تعین کی دسترس سے باہر ہوتا ہے انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے جس وقت وفاق مرتب ہوتا ہے اس وقت زندگی کے بہت سے شعبے ظہور پذیر نہیں ہوتے بلکہ بعد میں نمایاں ہوتے ہیں۔ بہت سی صورتیں ایسی پیش آتی ہیں جو قانون وضع کرنے والوں کے ذہن میں نہیں تھیں ان کو اختیارات باقیہ کہتے ہیں اکثر وفاق ان اختیارات کو جزوی ریاستوں یا صوبوں کے سپرد کردیتے ہیں بعض وفاق ایسے بھی ہیں جو انھیں مرکزی حکومت کی نگرانی میں رکھتے ہیں لیکن ایسے وفاق کی تعداد کم ہے اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان سے مسئلہ کا خاطر خواہ تصفیہ نہیں ہوتا کیوں کہ یہ کون بتا سکتا ہے کہ آیندہ جو صورت پیش آئے گی اس کی نوعیت کیا ہوگی؟ لیکن اسکا علاج یہ ہے کہ اختیارات کی فہرست میں وقتاً فوقتاً ترمیم واضافہ ہوتا رہے بعض ممالک میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کو بعض متعین اور بعض غیر متعین امور میں یکساں اختیار دے دئے گئے ہیں وہ اس امید پر کہ جب مناسب ہوگا آیندہ ظہور میں آتے رہیں گے اگر کوئی مسئلہ محض مقامی نوعیت رکھتا ہے تو مرکز اس میں دست اندازی نہیں کرے گا اور اگر اس کی مرکزی حیثیت ہوئی جس کا کہ ملک سے تعلق ہے تو مرکز اس کے متعلق قانون وضع کردے گا اس صورت میں دستور اساسی میں مذکور ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر جزوی ریاست یا صوبہ کوئی قانون بنائے اور اس مسئلہ پر مرکز بھی قانون وضع کرے تو مرکزی قانون کو تفوق حاصل ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت درپردہ تمام اختیارات باقیہ مرکز کے سپرد کردیتی ہے۔

وفاقی نظام کی اس مختصر تعریف اور اس کے تاریخی پہلو پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب ہم ہندوستان کے وفاق کا ایک عام جائزہ لیں گے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ آیا وہ ملک کے مطالبات کو کس درجہ تک پورا کرتا ہے اور ملک کی ہر ترقی پسند سیاسی جماعت اسے قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں؟

۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت ہند نے قرطاس ابیض شایع کیا اس میں وفاق ہند کی تشکیل کی

تجویزیں درج تھیں۔ ان تجویزوں پر غور و خوض کرنے کے لئے دارالعوام اور دارالامرا کے ممبروں کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی گئی اس کمیٹی نے ہندوستان کے اعتدال پسند حضرات سے مشورہ لیا اور تجویزوں پر غور کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی۔ اسی رپورٹ پر جو ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پیش کی گئی تھی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء بنی ہے جدید دستور کے رو سے تاج انگلستان کے ماتحت ایک وفاقی حکومت قایم ہوتی ہے اس میں گورنروں اور چیف کمشنروں کے صوبے اور وہ ریاستیں شامل ہوں گی جو شمولیت پر کسی نہ کسی طرح تیار ہو جائیں۔

جدید دستور کی جن تجویزوں کو آخری طور پر اختیار کرکے قانونی جامہ پہنایا گیا ہے انھیں قبول کرنے کے ملک کا کوئی طبقہ تیار نہیں ہے۔ کانگریس کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ وہ تو نوآبادی طرز حکومت لینے پر بھی راضی نہیں ہے مگر اعتدال پسند، ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، ریاستیں غرض کوئی بھی اس دستور سے خوش نہیں ہے حکومت برطانیہ کے مدبروں نے دستور اساسی بنانے کی گذشتہ دس سال میں جتنی کوشش کی ہے ان سب میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہتے اس لئے ایک مرتبہ جس چیز کو ایک ہاتھ سے دیتے ہیں اسے دوسرے ہاتھ سے لے لیتے ہیں بعض نہایت معقول، اعتدال پسند، وقیع اور مستند لوگوں کا خیال ہے کہ نئے دستور کا مسودہ پرانے دستور سے بھی بدتر ہے اور اس دستور سے پرانے دستور ہی پر قناعت بہتر ہے ذیل کی سطور میں وفاق ہند کے خاص خاص پہلو پر نظر ڈالی جائیگی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی مجوزہ وفاق ملک کے لئے کس درجہ ناقابل قبول ہے۔

وفاقی مجلس قانون ساز وفاق ہند کا سب سے دلچسپ پہلو وفاقی مجالس قانون ساز کی ساخت ہے فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے ۲۵۰ نمائندے ہوں گے اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ۱۲۵ کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہند کے ۱۵۶ نمائندے اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ۱۰۴۔

کونسل آف اسٹیٹ کے انتخاب کا حق جائداد کی بنیاد پر قیود کے ساتھ ہوگا اس لئے صرف دولتمند

زمیندار، سرمایہ دار، اور تاجروں کے طبقہ کی اس میں نمایندگی ہوگی اور فیڈرل اسمبلی دوسرے عام باشندگان کی نمایندگی کرے گی دونوں ایوانوں میں برطانوی ہند کی نشستوں کی تقسیم فرقہ وارانہ اصول پر ہوگی ہندو، مسلم، سکھ، ہریجن، عیسائی، انگلو انڈین اور یورپین سب کو جداگانہ انتخاب کا حق ہوگا صنعت وحرفت تجارت پیشہ، مزدور پیشہ اور مستورات کی نمائندگی کے لئے چند نشستیں مخصوص کردی گئی ہیں۔

فیڈرل اسمبلی کی جملہ نشستوں کی خانہ پُری بالواسطہ طریق انتخاب سے ہوگی یعنی وہ لوگ اس میں آئیں گے جن کا انتخاب صوبہ جاتی مجالس قانون ساز کے اراکین کریں گے اور اس میں ہر فرقہ یا ہر جماعت کے لوگ علیحدہ علیحدہ رائے دیں گے البتہ کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہند کے نمایندوں کا انتخاب براہ راست ان حلقہ ہائے انتخاب سے ہوگا جن میں رائے دہندگی کا حق بہت ہی محدود اور صرف ملکیت و جائداد کی بنیاد پر حاصل ہوگا۔ دیسی ریاستیں خود اپنے نمایندے مقرر کریں گی جن کی نامزدگی والیٔ ریاست کرے گا چھ تسو ریاستوں پر نشستوں کی تقسیم ہر ریاست کی اہمیت اور اس کے مرتبہ کے لحاظ سے کی جائے گی۔

یہاں پر قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان وفاقی ایوانوں کی ساخت کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ یہ ہندوستان کی تمام رجعت پسند قوتوں کا ایک مرکز بن جائے۔ فرقہ وارانہ اصول پر نشستوں کی تقسیم، فیڈرل اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب، کونسل آف اسٹیٹ میں صرف صاحب جائداد طبقوں کی نمایندگی اور پھر دونوں ایوانات میں دیسی ریاستوں کی اتنی کثیر تعداد میں نمایندگی کے صاف معنی یہ ہیں کہ وفاقی مجالس پر ان عناصر کا قبضہ ضروری ہے جو شہنشاہیت کے حامی اور آزادی کے دشمن ہیں۔

نشستوں کی عام فرقہ وارانہ تقسیم "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے زرین اصول کے مطابق کی گئی ہے ہمارے بدقسمت ملک میں حکومت برطانیہ کا یہ کوئی اچھوتا اصول نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس بدنصیب ملک میں برطانوی حکومت کا قیام ہی اس اصول پر منحصر ہے۔ حکومت عمداً فرقہ وارانہ سوالات اٹھاتی ہے اور ضرورت کے وقت ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے لڑاتی رہتی ہے چنانچہ یہی نہیں کہ اس دستور میں فرقہ وارانہ تفرقہ اندازیاں کثرت سے موجود ہیں بلکہ انھیں اس طریقے سے داخل

کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کے چند طبقوں میں جو فرقہ وارانہ عداوت موجود ہے وہ اور زیادہ گہرا رنگ اختیار کرلے اس کی وجہ سے یہ بیماری ہندوستان میں اور زیادہ پھیلے گی اور اس طریقے سے مجالس قانون ساز کو فرقہ وارانہ جھگڑوں کے لئے اکھاڑا بنایا جارہا ہے کہ صرف جداگانہ طریق انتخاب کی ساز گار فضا میں تمام فرقوں کے رجعت پسند عناصر پھلتے پھولتے ہیں۔

ایوان ادنیٰ یعنی فیڈرل اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب اور ایوان اعلیٰ کونسل آف اسٹیٹ کے لئے براہ راست انتخاب کا جو نرالا اور دلچسپ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں ایک بڑا مقصد پوشیدہ ہے دنیا کی ساری جمہوریتوں کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ ایوان ادنیٰ کا انتخاب براہ راست عام باشندگان کو کرنا چاہئے جن کی کہ وہ نمایندگی کرتا ہے اور ایوان اعلیٰ کا انتخاب چونکہ وہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی نمایندگی کرتا ہے براہ راست کیا جائے یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس میں کسی انتخاب کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ "صاحب بہادر" ہندوستان کے جمہور کی رائے سے خوف زدہ ہیں ملک کے دباؤ اور اثر سے کچھ مجبور ہو کر صوبجاتی مجالس قانون ساز میں براہ راست طریقہ انتخاب کا حق دے دیا ہے لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ ملک میں سامراج کی مخالف تحریکوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے وفاقی مجالس کو ہر طرح سے بچایا جائے چنانچہ بالواسطہ طریق انتخاب کا صریح مقصد یہ ہے کہ کانگریس کو فیڈرل اسمبلی پر قبضہ کرنے سے روکا جائے اگر قوم کو براہ راست حق رائے دہندگی دیا جاتا تو فیڈرل اسمبلی میں کانگریس اکثریت میں ہو جاتی لیکن بالواسطہ انتخاب میں کانگریس امیدوار صرف انھیں صوبہ جات سے فیڈرل اسمبلی کے لئے منتخب ہوں گے جہاں صوبہ جاتی مجالس میں کانگریس کی اکثریت ہے یا کم از کم وہ خاصی تعداد میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بالواسطہ طریق انتخاب کا پورا خاکہ اس طور پر بنایا گیا ہے کہ اس ملک کی ہر حریت پسند جماعت کو اعلیٰ مجالس قانون ساز پر غلبہ حاصل کرنے سے روکا جائے۔ ہمارے ملک کے مستقل حقوق قایم رکھنے والے لوگ کونسل آف اسٹیٹ میں داخل ہونے کے بعد فیڈرل اسمبلی کے ترقی خواہ اراکین کی راہ میں مزاحم ہوں گے اسی لئے کونسل آف اسٹیٹ کو بالکل وہی اختیارات قانون سازی اور مالیات حاصل

ہوں گے جو فیڈرل اسمبلی کو دئے گئے ہیں کونسل آف اسٹیٹ جیسے ایوان اعلیٰ کو، جس میں سرمایہ داروں،
دولت مندوں، زمینداروں اور بڑے تاجروں کی نمایندگی ہو، ایوان ادنیٰ کے مساوی اختیارات دیا جانا
جمہوریت کے اصول کے بالکل خلاف ہے لیکن حکومت ہند ہندوستان کو اپنا دشمن بنانے کے بعد اب
یہ چاہتی ہے کہ اس ملک کے مستقل حقوق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اتحاد قایم کرے اور وہ اس کے
لئے تیار ہیں اس لئے کہ خود ان کا وجود بھی برطانوی شہنشاہیت، کا رہین منت ہے۔ یہی مقصد تھا جس کو
پیش نظر رکھ کر برطانوی پارلیمنٹ کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ دیسی ریاستوں کو وفاق میں غیر معمولی اہمیت
دے۔ چنانچہ فیڈرل اسمبلی میں کل نشستوں کی ۳۳ فیصدی دیسی ریاستوں کے قبضہ میں ہوگی اور کونسل
آف اسٹیٹ میں ان کی نمایندگی ۴۰ فیصدی ہو جائے گی مجموعی حیثیت سے گویا وفاقی مجلس میں ۴۰۶
اراکین برطانوی ہند کی نمایندگی کریں گے اور ۲۲۹ دیسی ریاستوں کی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہے کہ وفاقی مجلس سے یہ بعید ہے کہ وہ ترقی
پسند ہو یا قوم کے بلند حوصلوں کا ساتھ دے سکے۔ اس میں رجعت پسند جاگیردار اور فرقہ پرست عناصر کا
غلبہ ہوگا جو حکومت کی جماعت سے مل کر ایک جماعت بنالیں گے اور گورنر جنرل اسی جماعت کی مدد کے
بھروسہ پر اپنے غیر محدود اور مطلق العنان اختیارات کو قوم کے خلاف استعمال کرے گا۔

وفاقی مجلس کے اختیارات باوجود اس کے وفاقی مجلس میں اکثریت رجعت پسندوں اور محبان حکومت
کی ہوگی برطانوی حکومت کو پھر بھی اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر اس جماعت کو مالیات یا قانون سازی کے
حقیقی اختیارات دے دئے گئے تو ممکن ہے یہ کبھی مار آستیں ثابت ہو۔ چنانچہ محکمہ فوج اور محکمہ معاملات
خارجہ کہ سیاسی حیثیت سے دونوں سب سے زیادہ اہم محکمے ہیں وفاقی مجلس کے حدود اور اثر و اقتدار
سے باہر ہوں گے ان محکموں کے متعلق نہ وہ قانون بنا سکتی ہے اور نہ ان کے مصارف مقرر کرنے میں وہ
کوئی رائے و مشورہ دے سکتی ہے گویا اس کا وجود اور عدم وجود کم از کم ان دو محکموں کے لئے یکساں ہے
گورنر جنرل خود محکمہ جات فوج، معاملات خارجہ کا ذمہ دار ہوگا اور ان کی پوری پوری نگرانی کرے گا دوسرے
یہ کہ گورنر جنرل کی منظوری بغیر کوئی مسودہ قانون نہیں بن سکتا ظاہر ہے کہ گورنر جنرل صاحب کسی ایسے

مسودہ کو قانون بنا کیوں بننے دیں گے جو ان کی قوم اور حکومت کے مفاد کے خلاف ہو۔ تیسرے یہ کہ گورنر جنرل کی اجازت حاصل کئے بغیر کوئی ایسا بل یا کوئی ترمیم وفاقی مجلس میں قانون نہیں بن سکتی جو

(۱) پارلیمنٹ کے کسی قانون کی کسی دفعہ کو درآنحالیکہ وہ برطانوی ہند پر حاوی ہو مسترد کر دے یا اس میں ترمیم کرے یا اس کے منافی ہو۔

(۲) گورنر جنرل کے کسی قانون یا اس کے نافذ کردہ کسی Ordinance کو مسترد کردے یا اس میں ترمیم کرے یا اس کے خلاف ہو۔

(۳) یا ان معاملات پر اثر انداز ہو جن کے متعلق گورنر جنرل کو اپنی رائے سے عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہو۔

(۴) محکمہ پولیس کے سپاہی یورپین رعایا کے متعلق ضابطہ فوجداری کو مسترد کردے یا اس میں ترمیم کرے

(۵) ایسے اشخاص پر جو ہندوستان میں نہیں رہتے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں رہتے ہیں زیادہ شرح سے محصول عاید کرے یا ان کمپنیوں پر نسبتاً زیادہ محصول عاید کرے جن کا انتظام اور اہتمام کلیتاً بیرون ہند میں نہیں ہوتا ہے۔

(۶) یا اثر انداز ہو وفاقی محصول آمدنی کی کسی ایسی رعایت پر جو اس وجہ سے عطا کی گئی ہو کہ اس آمدنی پر مملکت انگلستان میں بھی محصول لگایا جاتا ہے۔

ہندوستان کی فوج اور خارجی تعلقات کے سلسلہ میں وفاقی مجلس قانون ساز کو کسی قسم کی رائے اور مشورہ دینے کا حق نہ ہوگا اور نہ بغیر گورنر جنرل کے اجازت کے کسی اہم معاملہ کے متعلق کوئی قانون بنا سکتی ہے اور جن امور میں وہ کوئی قانون بنا بھی سکتی ہے اسے گورنر جنرل خود اپنی رائے پر عمل کرکے مسترد کر سکتا ہے۔ اور پھر وفاقی مجلس قانون ساز کی بے بسی یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی اپنی آزادی پر دو اور زبردست دستوری پابندیاں عاید کردی گئی ہیں اول تو یہ وفاقی جماعت قانون ساز میں وفاقی عدالت یا کسی ہائی کورٹ کے جج کے طرز عمل پر (جو اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں اختیار کیا ہو) بحث نہیں ہو سکے گی دوسرے اگر گورنر جنرل (با اختیار خصوصی) یہ فیصلہ کرے کہ کسی مسودہ قانون پر بحث کرنے یا اس میں ترمیم کئے

جانے سے اسکی مخصوص ذمہ داریوں کی انجام دہی میں (جو قیام امن کے سلسلہ میں اس کے سپرد ہیں) فرق پڑتا ہے تو وہ وفاقی مجلس قانون ساز کو ہدایت کرسکتا ہے کہ اس مسودہ قانون یا اسکی ترمیم کے سلسلہ میں مزید کارروائی نہ کی جائے یا کارروائی شروع ہو چکی ہو تو اسے جاری نہ رکھا جائے۔

اس کے علاوہ گورنر جنرل صدر یا اسپیکر سے مشورہ لئے بغیر اختیار خصوصی سے کام لیتے ہوئے ایسے قاعدے بنا سکتا ہے جن کی پابندی کرنے سے وفاقی جماعت قانون ساز ممبر مندرجہ ذیل باتوں سے محروم رہیں گے :-

(۱) کسی ریاست کے متعلق ایسے سوالات پوچھنا یا ایسے معاملات زیر بحث لانا جن پر وفاقی جماعت قانون ساز کو (اس ریاست کے سلسلہ میں) کوئی قانون بنانے کا اختیار نہیں ہے۔

(۲) گورنر جنرل کی مرضی کے بغیر:-

(۱) ملک معظم یا گورنر جنرل یا کسی بیرونی سلطنت کے تعلقات یا ملک معظم یا گورنر جنرل یا کسی ہندوستانی ریاست کے متعلق سوالات پوچھنا یا ان پر بحث کرنا۔

(۲) قبایلی علاقوں یا خارج از دستور علاقوں کے انتظام کے متعلق سوالات پوچھنا۔

واضح رہے کہ کس خوبی کے ساتھ ہندوستانیوں کو سرحدی شمالی صوبہ کی سیاسیات سے الگ کردیا گیا ہے گورنمنٹ اہل سرحد پر خواہ کتنی ہی زیادتیاں کیوں نہ کرے یا انہیں غلام بنانے پر کروڑہا روپئے خرچ کیوں نہ کئے جائیں لیکن بقیہ ہندوستان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے مظلوم بھائیوں کی زبانی ہمدردی بھی کرسکیں۔

(۳) کسی صوبے کے متعلق گورنر جنرل بہ اختیار خصوصی نے جو قدم اُٹھایا ہو اسے زیر بحث لانا یا اس پر سوالات کرنا۔

(۴) کسی والئی ریاست یا اس خاندان کے کسی فرد کے ذاتی طرز عمل کو معرض بحث میں لانا یا اس کے متعلق سوالات دریافت کرنا۔

غرض ان قوانین اور پابندیوں سے صاف صاف ظاہر ہے کہ مجلس قانون ساز کو مطلق اختیارات

حاصل نہیں ہیں۔

وفاقی مالیات | امور متعلقہ مالیات پر وفاقی مجلس کے اختیارات اور بھی زیادہ کم ہوں گے سالانہ مصارف دو حصوں میں تقسیم کردئے جائیں گے یعنی (۱) وہ مصارف جو وفاق کی آمدنی سے ادا کئے جائیں گے۔ (۲) وہ مصارف جن کی ادائگی وفاق کی آمدنی میں سے کرنے کی تجویز پیش کی جائے گی اول الذکر کے لئے وفاقی مجلس کی منظوری ضروری نہیں ہے اس میں حسب ذیل مصارف شامل ہیں:۔

(۱) گورنر جنرل کی تنخواہ بھتہ اور اس کے دفتر سے متعلق دیگر مصارف۔

(۲) مطالبات قرض جن کی ذمہ داری وفاق پر ہے۔

(۳) وزرا، اراکین کونسل، مشیر ال، سرکاری وکیل، اور چیف کمشنران وغیرہ کی تنخواہیں اور بھتہ۔

(۴) وفاقی عدالت کے ججوں کی تنخواہ، بھتے، اور پنشن نیز ہائی کورٹ کے ججوں کی پنشن جو واجب لادا ہو۔

(۵) محکمہ فوج، معاملات خارجہ، اور کلیسا کے مصارف۔

(۶) دیسی ریاستوں کے ساتھ ملک معظم کی طرف سے تعلقات قایم رکھنے کے سلسلہ میں جو مصارف ہوں۔

(۷) اس کے علاوہ اور کوئی مصارف جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ وفاق کی آمدنی سے منظور کرے۔

دوسرے قسم کے مصارف کے لئے جو وفاق کی آمدنی سے تجویز کئے جائیں گے، وفاقی مجلس کی منظوری حاصل کی جائے گی لیکن گورنر جنرل کو چونکہ آخری منظوری کا اختیار ہوگا اس لئے وہ سالانہ میزانیہ میں ایسی رقوم داخل کرسکتا ہے جو وفاقی مجلس نے نامنظور کردی تھیں یا ان میں کمی کردی تھی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میزانیہ کا وہ حصہ جس کے لئے وفاق کی رائے کی ضرورت نہیں ہے وفاق کے کل مصارف کے کم از کم ۸۰ فیصدی پر مشتمل ہے اور پھر بھی باقی ماندہ ۲۰ فیصدی بلکہ اس سے بھی کم پر وفاقی مجلس کو اختیارات کلی نہ حاصل ہوں گے اس لئے کہ گورنر جنرل خود اپنی رائے سے ہر دو ایوانوں کے کسی فیصلہ کو جو مالیات سے متعلق ہو مسترد کرسکتا ہے۔ وفاقی مجلس قانون ساز کی ان مجبوریوں پر نظر ڈالئے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسے ہندوستان کی مالیات میں کچھ دخل نہیں ہے اور وہ دستور کے اس شعبہ میں بھی بے کار اور بے بس ہے۔

تجارت | تجارت کے لحاظ سے تو جدید دستور نے ۱۹۱۹ء کے انتظامات کو ضرور قایم رکھا ہے لیکن دوسرے مالیاتی امور میں اس نے جدید قیود اور پابندیاں وفاقی مجلس پر عاید کردی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم وہ ہیں جو مجلس قانون ساز کو اس قسم کے قوانین منظور کرنے سے باز رکھتی ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ اس ملک میں برطانیہ کی تجارت اور مالیات کے مفاد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں۔ گورنر جنرل کی دیگر خصوصی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہر اس کاروائی کو روکے جس کے ماتحت ہندوستان میں برطانیہ کے مال کی درآمد کے ساتھ امتیازی یا تعزیری برتاؤ کیا جائے خصوصی ذمہ داریوں کے معاملہ میں گورنر جنرل خود اپنی رائے اور اختیار تمیزی پر عمل کر سکے گا۔ اور جہاں تک اس ذمہ داری کا تعلق محصولات درآمد برآمد سے ہے اس میں امتیازات خواہ براہ راست کئے جائیں یا بالواسطہ دونوں صورتوں میں اسکا اطلاق ہوسکے گا اس کی وجہ سے گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ اگر مجلس قانون ساز کے کسی قانون کا منشا برطانوی مال کے مقابلہ میں ہندوستانی مصنوعات کی مدد کرنا ہو تو وہ اسکو مسترد کرسکتا ہے اس دفعہ کے تحت مجلس قانون ساز ہند کی تجارتی پالسی گورنر جنرل کے ارشاد و ہدایت کے مطابق ہوا کرے گی۔

مجلس قانون ساز ہند اس قسم کا کوئی قانون منظور نہیں کر سکتی ہے جس سے کہ برطانوی نژاد اور برطانوی رعایا کے ہندوستان میں داخلہ پر یا ان کے لئے جائداد کی فروخت اور اس پر قبضہ یا سرکاری ملازمت یا کوئی دوسرا مشغلہ تجارت، کاروبار اور دیگر پیشہ اختیار کرنے پر قیود اور پابندیاں عاید ہوں۔ اسکا صریح مطلب یہ ہے کہ اس ملک کی معاشی زندگی میں برطانیہ کو جو حقوق اور مراعات حاصل ہیں اسے مجلس قانون ساز ہند معرض بحث میں نہیں لاسکتی۔

وہ برطانوی کمپنیاں جو ہندوستان میں تجارت کر رہی ہیں مجلس قانون ساز کے اثر اور دباؤ سے کلیتاً آزاد ہوں گی اور اس ایکٹ کی دفعہ ۱۱۲ کے مطابق کسی کمپنی کو جو برطانوی قوانین کے تحت قایم ہوئی ہو ہندوستان کے کمپنی ایکٹ پر مجبور نہیں کیا جا سکتا مجلس قانون ساز کو ہرگز اختیار نہ ہوگا کہ اس قسم کی کمپنیوں کو قوانین ہند کے مطابق قایم کرنے کا مطالبہ کرے یا اس کے دفتر کی رجسٹری، اس کے سرمایہ، قومیت مستقل سکونت

یا بودو باش وغیرہ پر یا مجلس نگراں کے اراکین یا حصہ داروں عہدہ داروں ' ایجنٹ اور ملازمین پر بھی کوئی پابندی عاید کرے۔

دفعہ ۱۱۲ سے نے یہ قرار دیا ہے کہ محصولات کے مقابلہ میں برطانوی اور ہندوستانی کمپنیوں کے ساتھ ایک ہی قسم کا برتاؤ کیا جائیگا اور دفعہ ۱۱۶ میں ایک یہ بھی اہم شرط داخل کی گئی ہے کہ ہندوستان میں جو بڑی کمپنیاں قایم ہیں وہ بھی اسی حد تک حکومت کے عطیات امداد' اور اعانت کی مستحق ہوں گی جس طرح کہ ہندوستانی کمپنیاں۔

اخیر میں یہ ایک شرط رکھی گئی ہے (دفعہ ۱۱۵) کہ ممالک برطانیہ کے اندر رجسٹر شدہ کسی جہاز کے ساتھ وفاقی یا صوبہ جاتی قانون کے ذریعہ یا اس کے تحت کوئی ایسا طرز عمل نہیں اختیار کیا جائیگا جس کا اثر خود جہاز یا اس کے مالک افسروں' ملاحوں یا اس کے تجارتی مال واسباب پر پڑے درآنحالیکہ برطانوی ہند کے اندر رجسٹر شدہ جہازوں کے حق میں اس کی وجہ سے کوئی رعایت ہوتی ہو۔

تجارت سے متعلق ان تمام مراعات اور آسانیوں سے جو حکومت برطانیہ نے اہل انگلستان کے لئے روا رکھی ہیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کی صنعت کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھنا چاہتی اور ہندوستانیوں کو لباس اور سامان آرائش کے معاملہ میں بھی مانچسٹر اور لنکا شایر کے تجار اور سرمایہ داروں کا محتاج رکھنا چاہتی ہے۔

ریزرو بنک اور ریلوے | اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی لایق ذکر ہے اور وہ یہ کہ وفاقی مجلس کو ریزرو بنک اور ہندوستانی ریلوں پر بہت کم اثر اور اقتدار حاصل ہوگا اس لئے کہ اس میں برطانوی سرمایہ بہت زیادہ لگا ہوا ہے گورنر جنرل خود اپنی رائے اور تمیز سے ریزرو بنک کے گورنر اور ڈپٹی گورنر کا تقرر کرائیگا اور وہی ان کو برخاست بھی کر سکتا ہے اس کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ مرکزی بورڈ کو برطرف کرنے یا بنک کا حساب چکانے کے لئے جو کاروائی چاہے کرے ریلوں کا انتظام اور نگرانی ایک مخصوص جماعت کے سپرد ہوگی جس کا تقرر آئین پارلیمنٹ کے ذریعہ ہوگا اور اسکا نام Federal Railway Authority ہوگا اس جماعت کے لئے اراکین میں سے کم از کم تین اراکین کا تقرر گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا اور خصوصی ذمہ داری

کے سلسلہ میں جو اختیارات گورنر جنرل کو حاصل ہیں ان کا اطلاق ریلوے اتھارٹی پر بھی ہوگا۔

ہندوستان میں برطانیہ کو جو زبردست مستقل حقوق حاصل ہیں انھیں اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر ان آئینی قیود اور پابندیوں کی حقیقی اہمیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ ہندوستان میں برطانیہ کا جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اس کی مجموعی رقم تیرہ ۱۳ ارب روپئے ہوتی ہے سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء میں برطانوی کمپنیوں کی تعداد جو ہندوستان میں تھیں ۱۱۹ تھی اور وصول شدہ سرمایہ ۱۰ ارب ۸ کرور روپئے تھا ان میں سب سے زیادہ اہم کمپنیاں بنکوں کی ہیں اس کے علاوہ بیمہ کمپنیاں، ریل اور ٹریم، تجارتی و صنعتی کمپنیاں، سن کے کارخانے، چائے کے کھیت، اور مختلف دھات کی کانیں ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم از کم ۱ ارب ۶۱ کرور روپئے ہر سال برطانوی سرمایہ کے سود یا کمپنیوں کے منافع کی صورت میں ہندوستان سے انگلستان چلے جاتے ہیں ہندوستان کی بحری تجارت کا بہت بڑا حصہ برطانوی جہازوں پر جاتا ہے بحری تجارت میں ہندوستانی جہازوں کا حصہ مشکل سے ۲ فیصدی ہے اور ساحلی تجارت پر تقریباً ۸ فیصدی۔

یہ تجارتی اور صنعتی مراعات اور حقوق رکھنے والے انگریز نہ صرف یہ کہ غریب ہندوستان کے معاشی وسائل پر قابض ہیں بلکہ کھلے طور پر ہندوستانی کمپنیوں اور تاجروں کے خلاف نقصان دہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں اگر ہم اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان شریف اور تعلیم یافتہ ڈاکوؤں کو جو اپنے فن میں پیشہ ور ڈاکوؤں سے بھی زیادہ ہشیار اور باکمال ہیں اپنے ملک سے نکال دیں کہ اس کے بغیر ملک کی صنعت کا پنپنا نہایت ہی مشکل ہے لیکن اگر آپ جدید دستور پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہیں تو خوش خبری سن لیجئے کہ اس نے ایسی کوئی کارروائی کرنی بالکل ناممکن کر دی ہے جس سے کہ آپ کے غریب ملک کی تجارت کو فروغ ہو اور یہاں کے رہنے والے خوش حال ہو جائیں اگر آپ نے ہندوستان کی صنعت کی امداد و سرپرستی کے لئے کوئی تدبیر اختیار کی تو گورنر جنرل اس کو خلاف قاعدہ قرار دے کر مسترد کر دے گا ہر معاملہ میں اسکا فیصلہ ایک اٹل اور امٹ فیصلہ کا حکم رکھے گا جس میں کسی حجت کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

گورنر جنرل کے اختیارات | ہندوستان کے موجودہ دستور میں گورنر جنرل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، بادشاہ وقت کے

نائب ہونے کی حیثیت سے فرماں روائی کے سارے اختیارات اسے بخش دئے گئے ہیں اگر آپ گورنر جنرل کے ہمہ گیر اور غیر محدود اختیارات پر ایک گہری نظر ڈالیں تو وہ ان اختیارات سے کسی طرح کم نہ ثابت ہوں گے جو کسی زمانہ میں ایشیا کے مطلق العنان بادشاہوں کو حاصل ہوا کرتے تھے ۔ اگر ہندوستان کے مجوزہ دستور کو آپ جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لاٹ صاحب کو بشرطیکہ خدا آپ کو یہ شرف بخشے، دیکھ لیجئے کہ ایک ذاتِ واحد میں سارا دستور سمٹ کر رہ گیا ہے ۔ گورنر جنرل دستور ہند کے نظام شمسی کا وہ آفتاب ہے جس کے گرد سارے سیارے چکر لگاتے ہیں اور وہ اپنی روشنی سے ساری دنیا کو نہ سہی تو کم از کم سارے ہندوستان کو ضرور منور کرتا ہے ۔ اس بیان میں شاعرانہ مبالغہ سے نہیں کام لیا گیا ہے بلکہ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ ذیل کے سطور میں آپ کو اس دعوی کا ثبوت ملے گا ۔

جدید دستور کا کمال، جسے ہم ہندوستانی جاہل اور تنگ نظر ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتے ہیں یہ ہے اگر ایک طرف وفاقی مجلسیں کمزور اور بے کار بنادی گئی ہیں تو دوسری طرف تمام اختیارات وائسرائے کے ہاتھ میں دے دئے گئے ہیں پہلی بات تو یہ ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ محکمہ جات فوج، معاملات خارجہ اور مالیات کی نگرانی خود گورنر جنرل بہ نفس نفیس فرمایا کریں گے اور جہاں تک ان محکموں کا تعلق ہے وہ وزیر ہند کو جواب دہ ہوں گے ۔ ان اہم ترین محکموں پر کامل اقتدار کے علاوہ انھیں مندرجہ ذیل اختیارات بھی حاصل ہوں گے :-

(۱) اگر ضروری سمجھے تو مجلس قانون ساز کی منظور کردہ مسودہ کو قبول کرنے سے انکار کر دے اور اسکو قانون نہ بننے دے ۔

(۲) بعض خاص قسم کے قوانین مجلس میں پیش کرنے کے لئے سابقہ منظوری عطا کرنا ۔

(۳) کسی مسودہ قانون کو ملک معظم کی منظوری کے لئے روک لینا ۔

(۴) مالیات کے متعلق مجلس قانون ساز کے کسی فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کرنا ۔

(۵) خاص احکامات یعنی Ordinance کسی وقت بھی جاری کرنا ۔

(۶) مجلس قانون ساز کی منظوری بغیر خود گورنر جنرل کے ایکٹ کے نام سے قوانین بنانا ۔

(۷) مجلس قانون ساز کی طلبی اور برخاستگی۔

(۸) مجلس قانون ساز کے ہردو ایوانات کا مشترک اجلاس کرنا۔

(۹) مجلس قانون ساز میں کسی مسئلہ پر بحث روک دینا۔

(۱۰) مجلس قانون ساز کے اختلافِ رائے کے باوجود کوئی کاروائی کرنی۔

(۱۱) ایسی حالت میں کہ آئینی نظامات بالکل موقوف ہو جائیں جملہ اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لینا۔

گورنر جنرل کے اختیارات صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں بلکہ اسے "اختیارات خصوصی" کے نام سے اور بھی کچھ اختیارات دئے گئے ہیں جو مندرجہ بالا اختیارات سے بھی زیادہ دلچسپ اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ اختیارات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہندوستان یا ہندوستان کے کسی حصہ کو بدامنی کا کوئی شدید خطرہ لاحق ہو تو اس کی طرف سے ملک کا تحفظ۔

(۲) وفاقی حکومت کے مالی استحکام اور اس کی ساکھ قایم رکھنے کی ذمہ داری۔

(۳) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ۔

(۴) سرکاری نوکروں کو جو حقوق دئے گئے ہیں ان کے حقوق کا تحفظ اور سرکاری نوکروں کے جایز مفاد کی حفاظت۔

(۵) شعبہ عامہ کے دائرہ عمل میں ان مقاصد کا حاصل کرنا جو امتیازات سے متعلق دفعات میں ظاہر کئے گئے ہیں۔

(۶) برطانوی یا برمی مال سے کوئی امتیازی سلوک روا رکھا جائے تو اسے روکنا۔

(۷) کسی ریاست یا اس کے حکمراں کے حقوق اور وقار کا تحفظ۔

(۸) اس بات کا خیال رکھنا کہ تمیز خصوصی یا انفرادی رائے کے استعمال میں گورنر جنرل کے راستہ میں کوئی روک نہیں ہے۔

دستور میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ جہاں تک گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں کا تعلق ہے وہ اپنے

فرائض کی انجام دہی میں خود انفرادی طور پر فیصلہ کرے گا کہ کیا کارروائی کی جائے، اس کے علاوہ یہ بھی صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ ہر اس معاملہ میں جس کا تعلق گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری سے ہو اس کا فیصلہ آخری سمجھا جائیگا اور اس قسم کے فیصلہ کے حجت کے متعلق اس بنا پر کوئی اعتراض نہو سکے گا کہ اسے اپنے شخصی فیصلہ سے کام لینا چاہئے تھا یا نہیں ان تمام معاملات میں جس کا تعلق اس کی خصوصی ذمہ داریوں سے ہے وزیر ہند گورنر جنرل کی نگرانی کیا کرے گا۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے اور بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ خصوصی ذمہ داریاں اس قدر مختلف النوع ہیں اور ان میں اتنی لوچ اور وسعت رکھی گئی ہے کہ گورنر جنرل ہر وقت مجلس قانون ساز کی رائے کو پس پشت ڈال کر کسی ایک تدبیر سے کام نکال سکتا ہے۔

خصوصی ذمہ داریوں کی اصل اہمیت اور ان کے ہمہ گیر اثر کو ہمیں نہ بھولنا چاہئے۔ امن وامان کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی خصوصی ذمہ داری سے یقیناً ملک کی تمام حریت پسند اور آزادی خواہ جماعتوں کو پسپا کرنے کا کام لیا جائے گا اور قانون وضابطہ کے نام پر عام باشندگان کے مخالفانہ جوش اور جذبات کو دبانے کی کوشش کی جائے گی۔

اس ملک کی مالیاتی استحکام کے تحفظ کی ذمہ داری کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے معتد بہ سرکاری قرضہ کے اس بار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قایم رکھا جائے جو گذشتہ سو سال کے اندر حکومت نے صرف برطانیہ کے مفاد کی خاطر نیز نفع بخش جنگوں پر خرچ کرنے کے لئے فضول قرض لے لے کر اکٹھا کر دیا ہے ۱۹۳۴ء حکومت ہند کے کل قرضہ کی میزان ۱۲ ارب ۱۲ کرور روپئے تھی جس میں سے ۵ ارب ۱۲ کرور روپئے برطانیہ میں قرض لے گئے۔ چنانچہ محصول ادا کرنے والوں پر یہ ایک بہت ہی بڑا بار ہے اور ان کو کروروں روپئے سالانہ اس قرض کا سود ادا کرنا پڑتا ہے اور چونکہ اس قرض کا بیشتر حصہ ان مصارف کے لئے لیا گیا ہے جن سے ہندوستانیوں کو کسی نوع کا فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اس کے برخلاف اس ملک پر برطانیہ کا تسلط اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کی آمدنی پر اس کا بار پڑتا رہے لیکن جدید دستور کے ماتحت سرکاری قرضہ کا بوجھ بدستور قایم رہے گا۔

برطانوی تجارت اور مصنوعات کے خلاف مضرت رساں برتاؤ کرنے کے متعلق گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داری کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشی زندگی پر برطانوی سرمایہ اور تجارتی مفاد کا تسلط قایم رکھا جائے اور ہندوستان کی تجارت، صنعت اور جہاز رانی کو خاص طور پر ترقی دینے اور اس کا تحفظ کرنے سے مجلس قانون ساز کو روکا جائے۔

دیسی ریاستوں اور اس کے فرماں رواؤں کے حقوق کے تحفظ کی مخصوص ذمہ داری کی غرض یہ ہے کہ جاگیرداری کے نظام کو سامراجی نظام کے سہارے اور تقویت کے لئے قایم رکھا جائے۔

اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری گورنر جنرل کے ہاتھ میں ایک ایسا جادو ہے جس کے زور سے وہ ایک فرقہ کو دوسرے سے لڑا سکتا ہے اور اس صورت سے فرقہ وارانہ جھگڑے اور عداوتوں کو ترقی دے سکتا ہے۔

سرکاری ملازموں کے حقوق اور مفاد کا تحفظ اس لئے گورنر جنرل کرے گا تاکہ موجودہ ہندوستانی سول سروس کو قایم رکھا جائے جو نہ صرف یہ کہ دنیا میں سب سے زیادہ گراں خرچ ملازمین ہیں بلکہ باشندگان ملک کے ساتھ ان کا برتاؤ حد سے زیادہ حاکمانہ اور غیر شریفانہ ہے یہ ہندوستانیوں پر اس شان سے حکومت کرتے ہیں گویا یہ بھی جارج ششم کے خاندان میں سے ہیں۔

سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ اہم وہ اختیارات ہیں جو فوج اور معاملات خارجہ کے متعلق گورنر جنرل کو بخشے گئے ہیں۔ فوج اور معاملات خارجہ کے متعلق خصوصی ذمہ داری کا راز یہ ہے کہ برطانوی سامراج اپنی اس طاقت اور قوت کو قایم رکھنا چاہتی ہے جس پر ہندوستان میں اس کی حکومت کی بنیاد ہے اسی کے ساتھ ساتھ وہ مشرق میں برطانوی اثر و اقتدار کو بڑھانے کے لئے ہندوستان کو مستقر بنانا چاہتی ہے ہندوستانی فوج جس پر ۵۰ کروڑ روپئے ہر سال خرچ ہوتے ہیں مستقلاً جنگ کے لئے رکھی جاتی ہے اس لئے نہیں کہ ہندوستان کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے کہ بیرون ہند میں برطانوی مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی ضرورت ہے ہندوستان کے ہزاروں تعمیری کاموں کو روک کر پچاس کروڑ کی خطیر رقم اس فوج پر خرچ کی جاتی ہے جو برطانوی سامراج کے اقتدار اور دبدبہ کو قایم رکھنے کے لئے ہندوستان۔

میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہے گورنر جنرل اس معاملہ میں اپنی خصوصی ذمہ داری کے فرائض کو بڑی احتیاط سے انجام دے گا تاکہ ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کا قلع قمع نہونے پائے۔

دیسی ریاستیں اور وفاق | وفاق ہند کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں ہندوستان کی ریاستوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے انگریز سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستانی حکمراں فیڈریشن میں شامل ہو گئے تو انھیں ہندوستان کی عام سیاسی بیداری کو ختم کرنے میں ان سے بہت زیادہ مدد ملے گی انگریز اپنے اس خیال میں بالکل درست ہیں اور دوستی کی اسی اُمید پر وفاقی مجلس میں دیسی ریاستوں کو بہت زیادہ نمایندگی دے دی گئی ہے۔

وفاق میں دیسی ریاستوں کے داخلہ کا کوئی اثر ان معاہدوں پر نہیں پڑے گا جو شاہ برطانیہ اور والیان ملک کے درمیان ہوتے ہیں اور نہ ان کی مطلق العنانی پر۔ دستور میں یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ چونکہ شاہ برطانیہ کے ساتھ دیسی ریاستوں کے براہ راست معاہدے اور تعلقات ہیں اس لئے دیسی ریاستوں پر جو حقوق، اختیارات عملداری بادشاہ کو حاصل ہے ان پر عمل درآمد وائسرائے بہ حیثیت نائب بادشاہ کے کیا کرے گا اور وفاقی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہوگا اب سوال یہ ہے کہ ریاستوں کی اندرونی خودمختاری میں کوئی دخل اندازی ہوسکے گی یا نہیں ؟ اوّل تو یہ کہ وفاقی مجلس کے کل قوانین کا اطلاق ریاستوں پر نہیں ہوگا ریاست کے فرماں رواکو اجازت دی جائے گی کہ وہ داخلہ کے شرائط میں ان امور کو خاص طور سے بیان کر دے جن کے متعلق وہ وفاقی مجلس کو اپنی ریاست کے لئے قانون سازی کی اجازت دینے پر آمادہ ہے باقی دوسرے امور میں وہ وفاقی مجلس کے قوانین سے بالکل آزاد ہوگا علاوہ بریں ریاستوں کے اندر وفاقی مجلس کے قوانین کا نفاذ ریاست کے اہل کاروں کے ذریعہ ہوگا نہ کہ وفاقی حکومت کے ملازمین کے ذریعہ چنانچہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گو وفاقی مجلس کے ایوان ادنیٰ میں ۳۳ فیصدی اور ایوان اعلیٰ کی ۴۰ فیصدی نشستوں پر ریاست کا قبضہ ہوگا اور برطانوی ہند کے لئے قانون سازی کے وہی اختیارات انھیں بھی حاصل ہوں گے جو صوبہ جات کو دے گئے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وفاقی مجلس قانون ساز کو کوئی اختیار ان ریاستوں کے لئے قانون سازی کا نہ ہوگا۔ سوائے چند مقررہ امور کے

متعلق جن کو فرماں روایان ریاست منظور کرلیں اسکا مطلب یہ ہوا کہ یہ فرماں روا وفاقی مجلس کے جمہوری قوانین کو شکست بھی دے سکتے ہیں اور ریاستوں میں اپنی مطلق العنانی طرز حکومت کو بھی قایم رکھ سکتے ہیں دستور میں کوئی ایک شرط بھی ایسی نہیں ہے جو ریاستوں کے لئے یہ لازم کرے کہ وہ وفاق میں شرکت کے بعد یا تو اپنی رعایا کو جمہوری نظام عطا کر دیں گی یا کم از کم ان کے بنیادی حقوق ہی متعین کر دیں گی ایک اور بات جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ برطانوی سامراج ریاستوں کو ملک کی رائے عامہ کے خلاف ایک آڑ بنانے کی فکر میں ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر شروع شروع ریاستوں کی تعداد جو وفاق میں شریک ہو، دیسی ریاستوں کی کل نشستوں کو پُر کرنے کے لئے کافی نہ ہو تو باقی نشستوں کی خانہ پُری بھی داخل شدہ ریاستیں کریں گی تاکہ ریاستیں اپنے مفاد کا کما حقہٗ تحفظ کر سکیں دیسی ریاستوں کے حقوق اور ان کے فرماں رواؤں کے حقوق دیرینہ کا تحفظ گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داریوں میں داخل کر دیا گیا ہے برطانوی حکومت نے ہمیشہ دیسی ریاستوں کو بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھنا اپنا خاص فرض سمجھا ہے اور ان کے فرماں رواؤں کی مطلق العنانی قایم رکھنے میں ہمیشہ مدد کی ہے۔

وفاق ہند کے ہر پہلو کو اجاگر اور اس پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ و تنقید کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ اس مختصر سے مضمون میں اسکی گنجایش ۔ لیکن پھر بھی وفاق ہند کی جو نامکمل تصویر میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ برطانوی سامراج نے ہندوستان میں اپنی جڑوں کو اور زیادہ مضبوط اور پائیدار کرنے کے لئے وفاق کا یہ سارا کھیل کھیلا ہے اور وفاق کے پردہ میں ہندوستان کو دوامی غلامی کی بشارت دی ہے ۔ سارا کا سارا دستور ایک ایسی قوم کی ذہنیت کا آئینہ دار ہے جو ساری دنیا کو تو تہذیب و شرافت کا سبق سکھاتی ہے لیکن خود کبھی اس کا ثبوت نہیں دیتی ۔ یہی وجہ ہے کہ سارے دستور میں آپ آزادی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھیں گے ۳۵ کروڑ انسانوں کی قسمت چند گورنروں اور اعلیٰ حکام کے ہاتھ میں سونپ دی گئی ہے ملک کو افلاس و نکبت اور جہل ولاعلمی کے عالمگیر مرض سے بچانے کے لئے کوئی قابل عمل تجویز پیش نہیں کی گئی ہے ۔ ملک کے معاشی حالات کو درست اور قومی تعمیری کاموں کو شروع کرنے کا کہیں ذکر تک بھی نہیں ہے ۔ صرف دنیا کو دکھانے اور عام ہمدردی حاصل کرنے کے لئے

اصلاحات اور خود مختاری کا راگ گایا جا رہا ہے ورنہ حقیقت میں موجودہ دستور ۱۹۱۹ء کے دستور سے بھی زیادہ مہمل اور ناقابل قبول ہے ظلم و استبداد پر اسکی بنیاد رکھی گئی ہے اور ملک کے کسی مطالبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں آزاد نہیں کہی جا سکتی جب تک اسے تجارت، فوج، مالیات، امور خارجہ، صنعت و حرفت کے محکموں پر پورا اقتدار نہو اور اس کے افراد دنیا کی ہر قوم اور ہر جماعت کے ساتھ باعزت اور خود دارانہ معاہدہ کرنے کا حق نہ رکھتے ہوں ایسی آزادی سے کیا حاصل جس میں آپ اپنے ضمیر کی آواز کو بلند نہ کر سکیں اور ان خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار نہ کر سکیں جو آپ کے دل و دماغ سوچتے ہیں آزادی کی نعمت تو قوم میں عزت نفس اور خود داری پیدا کرتی ہے کیا ہندوستان کے موجودہ دستور نے کوئی ایسی نعمت اس ملک کے رہنے والوں کو بخشی ہے۔

میرے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے جب کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے مذہبی و معاشری اختلافات مٹا کر آپس میں شیر و شکر ہو جانا چاہئے۔ اور ملک کی آزادی کی خاطر ایک متحدہ محاذ قایم کر کے جلد سے جلد غلامی کے جوئے کو گردن سے اتار دینا چاہئے۔ ہمارے اختلافاتِ قومی ملی ہندوستان کو روز بروز کمزور اور دوسروں کی نگاہ میں ذلیل کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی نجات اس کے بسنے والوں کے سچے اتحاد و اتفاق پر مبنی ہے قوم و ملک نا اتفاقی و شقاق کا خمیازہ ایک عرصہ سے بھگت رہے ہیں کیا اب بھی ہندو مسلمانوں کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا رہیگا اور یہ سیاست و مذہب کے جزوی اختلافات پر آپس میں دست و گریباں ہونا انسانیت و شرافت کا معیار سمجھتے رہیں گے۔ دنیا کی ساری قومیں ترقی و کامیابی کے میدان میں فراٹے بھر رہی ہیں اور ہندوستان کو ابھی اسی جھگڑے سے نجات نہیں ملی کہ خدا کو خدا کہا جائے یا رام اگر یہ نادانی و نافہمی کچھ اور زیادہ عرصہ تک رہی تو ہمارا ملک دائمی غلامی کے جال میں اس طرح پھنسے گا کہ پھر کبھی آزادی کی فضا میں سانس نہ لے سکے گا۔ یہ وہ وقت ہوگا جب کہ چڑیاں کھیت چگ گئی ہوں گی اور ہم اپنی غفلت اور ناسمجھی پر کف افسوس مل رہے ہوں گے

کیفیات

(از جناب کوکب صاحب شاہجہانپوری)

وہ تو کب ملتے ہیں، لیکن آپ کھو جاتا ہوں میں
بس اسی منزل میں کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں

حالِ دل، دل کھول کر، کب اُن سے کہہ پاتا ہوں میں
جی اُمڈتا ہے، مگر گھٹ گھٹ کے رہ جاتا ہوں میں

خندۂ اہلِ جہاں پر اشک بھر لاتا ہوں میں
اپنے پیماں توڑتے ہیں آپ، شرماتا ہوں میں

اپنے دل کو دے رہا ہوں آپ ہی کیا کیا فریب
آہ، اک بے کس کو کس کس طرح بہکاتا ہوں میں

اب مری جمعیتِ خاطر پریشانی میں ہے
یعنی خود اپنے تصور سے بھی گھبراتا ہوں میں

میں نہیں ملتا، اگر وہ مل بھی جاتے ہیں کبھی
مجھ کو ترساتے ہیں وہ، اور ان کو ترساتا ہوں میں

آ رہے ہیں یاد رہ رہ کر گذشتہ سانحات
خود بخود بھولا ہوا افسانہ دہراتا ہوں میں

ضبط کرنے سے جو پھر دل میں اتر آتے ہیں اشک
سرد آہوں سے انھیں شعلوں کو بھڑکاتا ہوں میں

مجھ سا بے تاب و تواں، اور امتحانِ عاشقی
ذکر بھی کرتے ہوئے اب اس کا تھراتا ہوں میں

مجھ کو ترکِ "آرزو" سے جان دینا سہل تھا
لیکن اُن کے واسطے اس کو بھی ٹھکراتا ہوں میں

مجھ کو سودا ہی سہی لیکن اسے کیا ہو گیا
ناصحِ مشفق کو سو سو طرح سمجھاتا ہوں میں

ہمنوائے غیر ہو سکتا نہیں خود آشنا
طنزِ اہلِ دہر کو خاطر میں کب لاتا ہوں میں

دیکھیے مشکل ہوا جاتا ہے پھر ضبطِ جنوں
آپ کو معلوم ہے! دیوانہ کہلاتا ہوں میں

آرزو مشکل نہیں، مشکل ہے ترکِ آرزو
اپنے دل پر، آپ ہی یہ کیا ستم ڈھاتا ہوں میں

ہر قدم پہ اور ہو جاتا ہے اندازِ خرام
ہر نفس پر آپ کو بدلا ہوا پاتا ہوں میں

"خود گرفتار" اور آزادی، یہ ممکن ہی نہیں / ڈگمگا جاتا ہے دل، جس راہ پر لاتا ہوں میں

پھر اُنھیں قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں ہمنشیں / روکنا پھر مجھ کو، پھر بے خود ہوا جاتا ہوں میں

حسرتِ عرضِ تمنّا ہے کہ چھپتی ہی نہیں / بند کرتا ہوں زباں کو، دل کو ٹھیراتا ہوں میں

اب سے نامِ آرزو بھی لب پہ آ سکتا نہیں / لے، زباں دیتا ہوں ظالم، لے قسم کھاتا ہوں میں

دیدہ و دل کا اب اس کے بعد جو انجام ہو! / آخری آنسو، ترے قدموں پہ بکھراتا ہوں میں

کوکبؔ! اُمیدِ وفا رکھتا ہے دل احباب سے

ہائے انگاروں پہ کیا کیا پھول برساتا ہوں میں

اسپین کی خانہ جنگی

اسپین میں جب سے خانہ جنگی شروع ہوئی ہے۔ انگلستان میں تقریباً ہر ہفتے ایک کتاب یا رسالہ اس کے متعلق نکلتا ہے۔ اگرچہ ان میں بہت سے تو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہوتے تاہم اس سے پبلک کے سیاسی شعور اور بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ یہی حال دیگر مغربی ممالک کا ہے۔ جہاں تک کہ اُردو زبان کا تعلق ہے (مجھے ہندوستان کی دیگر زبانوں کا حال معلوم نہیں) میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب یا رسالہ تو درکنار ابھی تک کوئی جامع مضمون بھی نہیں نکلا۔ یہاں میں کوشش کروں گا کہ مختصراً اسپین کی خانہ جنگی کی وجوہات پر روشنی ڈالوں۔ اور اس کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے دکھلاؤں۔

اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسپین کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی جائے۔ جب سے اس ملک کے بادشاہ اور امرا مسلمانوں پر غالب آئے۔ وہ اپنے آپ کو عیسائیت کا علمبردار سمجھنے لگے۔ بعد میں اس اصول پر انھوں نے پروٹسٹنٹ مذہب کی بھی مخالفت کی ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندوں نے مذہبی تعصب پر زندگی کے ہر پہلو کو قربان کر دیا۔ مثلاً تجارت و صنعت کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے کبھی ترقی نہ حاصل کر سکی۔ امرا کے پاس بڑی بڑی ریاستیں تھیں اور یہ پادری اور رہبانوں سے مل کر رعایا کا خون چوستے رہے۔ ان حالات میں درمیانی طبقے کے لئے کلیسا ء روم نے تجارت کی ہمیشہ مخالفت کی یہی وجہ تھی کہ درمیانی طبقہ سولھویں صدی کی تجدید عیسائیت (Reformation) کا حامی رہا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایک بڑی حد تک یہ اس تحریک کا بانی تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے راستے مسدود ہو گئے۔ فرانس کے درمیانی طبقے اور عوام نے مل کر ۱۷۸۹ء کے سرمایہ دارانہ انقلاب کے ذریعہ سے جاگیرداری نظام کی بیخ کنی کی اور مساوات و آزادی کا پیام تمام یورپ میں پہنچا دیا۔ اسپین میں بھی ان دو قوتوں میں انیسویں صدی میں تصادم ہوتا رہا لیکن نظام جاگیرداری اور کلیسا کی قوت بدستور قائم رہی۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو آزادی بیان و خیال

نصیب نہ ہو سکی، تعلیم عام نہ ہوئی اور صنعت و تجارت میں بھی اسپین دیگر مغربی ممالک سے پیچھے رہ گیا۔ امرا کے ظلم و استبداد کی وجہ سے عوام ہمیشہ نالاں رہے اور اپنی نجات حاصل کرنے کے لئے کوشاں۔ ان حالات میں رجعت پسند جماعتوں میں اور ان میں جو استبداد کو مٹانا چاہتی تھیں کشمکش لازمی تھی۔ یہی اس خانہ جنگی کا اصل سبب ہے۔

آخرکار ۱۹۳۱ء میں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ اسکا مقصد ملک میں صنعتی ترقی دینا۔ امرا اور کلیسا کی طاقت کو توڑنا۔ اشاعت تعلیم اور آزادی مذہب و بیان وغیرہ کو قائم کرنا تھا۔ نئی حکومت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتی اگر اصلاحات کے معاملے میں بے اعتدالی سے کام نہ لیتی مثلاً جب عوام نے گرجاؤں کو منہدم کرنا شروع کر دیا، خانقاہیں جلادیں اور مختلف قسم کی زیادتیاں کیں، تو گورنمنٹ نے ان کا کوئی تدارک نہ کیا۔ بلکہ حالات کو بدتر بنانے کے لئے کلیسا کی مالی امداد بند کر دی اور ہر مذہب کو آزادی دے دی گئی یسوعیوں کو ملک سے جلاوطن کر دیا، تعلیم مذہبی راہنماؤں کے ہاتھ سے لے لی، کلیسا اور امرا کی زمینیں کسانوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ کر لیا، مرد اور عورت میں مساوات تسلیم کر لی۔ اور مسئلہ طلاق جو کلیسائے روم کے نزدیک ناجائز ہے جائز قرار دیا۔ ان قوانین سے نہ صرف رجعت پسند جماعتیں برانگیختہ ہوئیں بلکہ پارٹی کے بھی بہت سے لوگوں نے ان کو ناپسند کیا مذہب تو اہل ہسپانیہ کی گھٹی میں پڑا ہے۔ الکازمورا جو کہ پہلے جمہوریت کا وزیر تھا اور بعد میں پریذیڈنٹ ہو گیا کلیسا کی مخالفت پر تیار نہ تھا نیز کابینہ کے اور بہت سے ارکان بھی کلیسا کے معتقد تھے اور انھیں اس کی مخالفت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان باتوں کے باوجود بھی یہ حکومت اپنے نصب العین میں کامیاب ہو جاتی۔ اگر اپنی پالیسی سے عوام کا اعتماد اور ہمدردی نہ کھو دیتی۔

جمہوریہ نے ازانا (Azana) کی زیر وزارت رجعت پسند جماعت کی وقتی سرکوبی کے بعد اشتمالیوں اور نراجیوں وغیرہ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سینکڑوں اشتمالی بغیر کسی قانونی تحقیقات کے جلاوطن کر دئے گئے جس کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں چنانچہ اس حکومت سے جن جماعتوں کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں وہ غیر مطمئن اور نالاں نظر آنے

لگیں۔ جن اصولوں کے تحفظ کی خاطر جمہوریت معرضِ وجود میں آئی تھی یہ حکومت انھیں کی نفی بن گئی۔ یہ کسی جماعت کو خوش بھی نہ کرسکی بلکہ الٹا ناراض کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ازانا (Azana) کو استعفےٰ دینا پڑا اور قدامت پسند پارٹی برسرِ اقتدار آئی (۱۹۳۴ء) اس کے زیر قیادت دو برس میں رجعت پسند جماعتوں نے بڑی ترقی اور مضبوطی حاصل کرلی۔ آزانا کی زیر وزارت جو مفید قوانین نافذ ہوئے تھے۔ خاموش کردیے گئے۔ کلیسا اور امرا کی طاقت پھر عود کر آئی۔ کٹیا لونیا اور باسک کو جو آزادیاں ملی تھیں پھر چھین لی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوسٹاریا میں ایک زبردست بغاوت ہوئی جس میں تقریباً تین ہزار آدمی زخمی ہوئے اور ایک ہزار جانیں تلف ہوگئیں۔ اسی طرح بارسیلونا اور دیگر مقامات پر بھی لوگ گورنمنٹ کی مخالفت کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر کار ملک کی جتنی بھی انتہا پسند جماعتیں تھیں وہ فسطائی اور رجعت پسند قوتوں کا مقابلہ کرنے پر تل گئیں۔ اور جب ۱۹۳۶ء میں انتخاب ہوا۔ تو ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور نئی گورنمنٹ کی وزارت تعمیر ہوئی۔

اس نئی گورنمنٹ سے لوگوں کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن افسوس کہ ان پر پہلے کی طرح اوس پڑ گئی۔ کسانوں کو یہ امیدیں تھیں کہ اب زمینیں ان کے ہاتھ آجائیں گی۔ لیکن اس حکومت نے سوائے وعدوں کے اور کچھ نہ کیا۔ اور مزدوروں کی جماعتوں پر سختی کرنا شروع کردی۔ جمہور کی یہ حالت دیکھ کر فسطائی اور شاہی نے یہ طے کیا کہ زبردستی ملک پر قبضہ کرلیں۔ فسطائی جماعت نے گذشتہ دو سال میں اپنے کو کافی منظم کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ اٹلی کی حبشہ پر فتح نے انکو بڑی تقویت پہنچائی۔ چونکہ اطالوی فسطائی حبشہ پر قبضہ کرنے پر کامیاب ہوگئے۔ اس لئے ان لوگوں نے خیال کیا، کہ ہم بھی اسی طرح اسپین پر قابض ہوجائیں گے۔ مسولینی نے بھی باغیوں کو ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ وہ اس زعم میں تھا کہ اگر فسطائی کامیاب ہوگئے تو نہ صرف اسپین اٹلی کے زیر اثر ہوجائیگا بلکہ مغربی بحیرہ روم بھی برطانوی اور فرانسیسی طاقت کو کمزور کرنے کی یہ بہترین چال تھی۔

فوج کے افسران بھی بغاوت کے لئے تیار تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں جس پارٹی کی بغاوت میں سرکوبی کی تھی۔ وہی اب برسرِ اقتدار تھی اور دیگر رجعت پسند جماعتیں بھی اسکی حامی تھیں۔

موقع بغاوت کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس لئے کہ جمہوریت پسند پارٹی اور دوسری انتہا پسند جماعتوں
ماہر وقت جوتا چل رہا تھا۔ اگر یہ گورنمنٹ یادہ جو ۱۹۳۱ء میں قائم ہوئی تھی حماقتیں نہ کرتی، تو یہ خانہ جنگی
ہرگز نہ ہوتی۔ لیکن اس نے اپنی پالیسی سے ان[۵۱] پارٹیوں کو جنھوں نے اسے حکومت دلائی تھی۔ اپنا
دشمن بنالیا۔ اگر یہ عوام کی دلجوئی کرتی تو فسطائی قوتیں ہرگز اس کے مقابلہ پر کھڑا ہونے کی جرارت نہ
کرسکتیں۔

ان وجوہات کے علاوہ ایک سبب جو اس وقت کی اور اس سے پہلے کی خانہ جنگیوں کا کسی
حد تک ذمہ دار ہے۔ وہ اہل اسپین کی انفرادیت پسند طبیعت ہے۔ یہ البتہ انکی جغرافیائی اور معاشی
ماحول کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس نے اسپین کی تاریخ پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس انفرادیت کا نتیجہ ہے
کہ اسپین میں نراجی پارٹی بہت طاقتور جماعت ہے۔ یہاں کبھی مختلف جماعتوں نے ایک دوسرے
سے تعاون نہیں رکھا۔ اور یہی جمہوریت کی کمزوری کا باعث ہے۔ اس وقت تک بھی گورنمنٹ کی
پارٹیاں آپس میں معرکہ آرا ہیں۔ قومی مفاد و مقاصد اکثر جماعتی مفاد و اغراض پر قربان کردئے جاتے
ہیں۔ اس کے متعلق پروفیسر کیسٹی لیجو، پروفیسر لورٹیگا اور غیر ملکی محققین بالکل ہمرائے ہیں۔ اسی انفرادیت
کی وجہ سے اہل ہسپانیہ مرکزی حکومت کے سخت مخالف ہیں۔ گیلیشیا، باسک، کیٹیلونیا وغیرہ کے
لوگ اپنی تہذیب زبان اور قومیت کے تحفظ کے دلدادہ ہیں۔ یہ لوگ فسطائی حکومت کے خلاف
اس وجہ سے لڑتے ہیں کہ اس کے قائم ہونے پر انکی آزادی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

لڑائی دو برس سے ہو رہی ہے۔ اور اب معلوم ہوتا ہے کہ فسطائی قوتیں کامیاب ہو جائیں گی
لیکن اس سے یہ قطعی ثابت نہیں ہوتا کہ ملک میں ان کے زیادہ پیرو ہیں۔ برخلاف اس کے زیادہ تر لوگ
جمہوریت کے طرفدار ہیں۔ فرانکو کو اس وقت تک جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ وہ جرمنی اور اٹلی
کی مدد سے اور انگلستان اور فرانس کی چشم پوشی اور بزدلی سے۔ خانہ جنگی کے شروع میں عدم مداخلت

---

[۵۱] مزدوروں کی پارٹیوں سے مراد ہے۔

کی کمیٹی میں یہ طے ہوا تھا کہ کوئی مغربی طاقت اسپین میں کسی جماعت کو مدد نہ پہنچائے۔ اس پر جرمنی اور اٹلی نے وعدہ خلافی کی اور فرانکو کی مدد کرتے رہے۔ یہ ممالک فاسٹی جماعت کی فتح چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے نہ صرف مغربی بحیرۂ روم میں انکا وقار و قوت بڑھ جائے گی۔ بلکہ اسپین کی معدنیات سے بھی وہ پورا پورا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ گورنمنٹ برطانیہ کا رویّہ فسطائیوں کے موافق رہا۔ اور اس نے سوا کانفرنس منعقد کرنے کے اور کوئی عملی کارروائی نہ کی۔ برطانیہ اسی پالیسی سے فسطائیت کو قوت پہنچا رہی ہے۔ اس کو یہ ڈر ہے کہ اگر عوام کی فتح ہوگئی۔ تو انگلستان پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا اور اس کی وجہ سے اشتراکیت قوت پکڑ جائے گی۔ انگریز حکومت یہ نہیں چاہتی کہ موجودہ نظام ذاتی ملکیت خطرہ میں پڑ جائے۔ فرانکو کی فتح سے انگلستان کی شہنشاہی کو اگرچہ نقصان پہنچے گا۔ تاہم فرانکو سرمایہ داروں کا نمائندہ ہے لہذا اس کے ہاتھوں سرمایہ دارانہ نظام کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ انگریز ہر حالت میں اشتراکیت پر فسطائیت کو ترجیح دیگا۔ اگرچہ روس نے کچھ مدد دی لیکن وہ اتنی کافی نہ تھی کہ گورنمنٹ فرانکو کا مقابلہ کرسکتی۔ جسکو ہٹلر اور مسولینی ہر قسم کی مدد پہنچا رہے تھے۔ اس پر بھی گورنمنٹ کی افواج نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ اور اب آئندہ اسپین کا کیا حشر ہوگا۔ اس پر کوئی مستقل رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن بدقسمتی سے اگر فرانکو کامیاب ہوگیا۔ تو ملک کے اندر استبداد و مظالم کا اسی طرح بازار گرم ہو جائے گا۔ جیسا کہ جرمنی میں ہو رہا ہے۔ فسطائی مزدوروں کی جماعتوں کو بالکل نیست و نابود کر دیں گے۔ کلیسا اور امراء کا پھر دور دورہ ہوگا۔ اور ہر جگہ رجعت پسندی کی حکومت ہوگی۔ یورپ کی سیاسی فضا بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکے گی۔ فرانکو چونکہ جرمنی اور اٹلی کی مدد سے کامیاب ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ کچھ عرصہ ان دونو کے زیر اثر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی۔ تو وہ فرانس کو تین سرحدوں پر لڑنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں مغربی بحیرۂ روم میں جرمنی اور اٹلی کے اثر قائم ہو جانے کے یہ معنی ہونگے۔ کہ فرانس اپنے افریقہ والے مقبوضات سے مالی اور جنسی مدد لینے سے قاصر ہو جائیگا۔ انگلستان کو بھی مصر اور ہندوستان کی آمد و رفت کے متعلق دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ فسطائی

ممالک کی قوت جوں جوں بڑھ رہی ہے۔ توں توں وہ دنیا کو بربادی اور جنگ کے نزدیک لا رہی ہے۔ لیکن اگر جنگ عظیم چھڑ گئی (اگرچہ اسکا وقت معین نہیں کیا جا سکتا) تو برطانیہ اور فرانس بہت حد تک اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ فسطائی قوتوں کی ترقی کی بہت حد تک یہ دونو حکومتیں ذمہ دار ہیں ؎

(گذشتہ سے پیوستہ)

یہ کون چرواہا پھٹے کپڑے بُرے حال گنتی کی دو چار بکریاں لئے چلا جا رہا ہے۔ اچھا۔ یہ تو تاکش تیمور ہے جو ایان بوغا خان کی اولاد نرینہ لانے کا بیڑا اٹھا کر چلا تھا۔ دشت و بیاباں نورد برفانی پہاڑ بے آب و گیاہ میدان پے سپر کرتا۔ گرم و سرد روزگار دیکھتا۔ دل قول کا پاس قوم کا خیال لئے تلاش مقصود میں رواں دواں ہے۔ سامنے سے ایک مسافر آتا نظر پڑا دعا سلام کے بعد دریافت کیا کہ اس علاقہ میں کہیں دختوئی شیر اول نامی سردار کا قبیلہ رہتا ہے۔ جواب نفی میں ملا۔ ہاتھ پیر جواب دے گئے پر مغل دل نے جواب نہ دیا۔ آس ٹوٹ گئی ہمت نہ ٹوٹی۔ بھوک نے ستایا چاروں طرف نظر دوڑائی کچھ نظر نہ آیا۔ ایک پتھر پر ہو بیٹھا۔ بکریوں کو دیکھا تو گنتی کی رہ گئی ہیں۔ زاد راہ محدود اور منزل مقصود مفقود نظر آئی۔ بکری کا ٹنا نامناسب اور اشتہا کا تقاضہ شدید۔ طبع حاضر نے تدبیر نادر پیش کی بکریوں کے کان کاٹ پیٹ بھر لیا۔ چلتے چلتے کچھ ڈیرے نظر آئے غریب الوطن نے غنیمت جانا جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ دختوئی شیر اول کا قبیلہ کچھ عرصہ یہاں قیام کر مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ امید کا آفتاب جو عرب یاس میں غروب ہو چکا تھا پھر طلوع ہوا۔ رات بسیرا لے زمین کا مسافر۔ آسمان کے مسافر کے ساتھ شرق سے غرب کی جانب روانہ ہوا۔

تاکش تیمور با یوس دنا امید کبیدہ خاطر ایک کبود رنگ کی بکری لئے بیٹھا ہے۔ راہ گیر سے عادت کے مطابق دختوئی شیر اول کے قبیلہ کی بابت دریافت کیا معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پہ ڈیرہ ڈالے پڑا ہے۔ باتوں باتوں میں معلوم کر لیا کہ ماں لیک کا بیٹا جو ایان بوغا خان سے ہے اس وقت پندرہ سال کا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی امید کی ایک صورت نظر آئی۔ رگوں میں خون دوڑ گیا۔ دماغ کامیابی کی تدابیر سوچنے لگا۔

آواز :- ہمت مرداں مدد خدا - اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگا -

تاتش تیمور فائز المرام ایان بوغا خان کے بیٹے تغلق تیمور کو اس کے باپ کے قبیلہ کی طرف لئے جاتا ہے ۔ شاد کام ہے تیز گام جا رہا ہے ۔ خان کی اولاد ہے خان بنے گا ۔ تغلق تیمور ہوائے سرداری در سر اڑا چلا جاتا ہے ۔ گرم جوش مسافر مصائب اور منزلیں طے کرتے برفانی علاقہ سے گذر رہے ہیں ۔ نگاہ نے لغزش کی قدم ڈگمگایا تغلق تیمور نا آموزدہ کار برف کے غار میں جا پڑا ۔ تاتش تیمور غار کے کنارہ سر پکڑے بیٹھا ہے ۔ قسمت سرِ غار کھڑی مسکرا رہی ہے ۔ بہ آواز حال مژدہ سنا رہی ہے کہ اس لڑکے سے مجھے کام لینا ہے اس نونہال کو بارآور ہونا ہے ۔ دور سے قافلہ آتا نظر آیا جان میں جان آئی ۔ امید نے صورت دکھائی ۔ قافلہ سالار کو ساری داستان سنائی اور مدد چاہی ـــــ تاتش تیمور کمر میں رسی باندھ غار میں کود پڑا مصلحتاً پہلے خود اوپر آیا پھر تغلق کو باہر نکالا ۔

آج اکسو شہر میں جشن ہے ۔ ایان بوغا خان کا قبیلہ اپنے سردار کے بیٹے ہونے والے سردار تغلق تیمور کا خیر مقدم کر رہا ہے ۔ فنونِ سپہ گری دکھائے جا رہے ہیں ۔ سب اہل شہر خوشیاں منا رہے ہیں ۔ آج اسیر بلاجی کی آرزو بر آئی خدا نے سردار کی صورت دکھائی ۔

للہ الحمد بر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پسِ پردہ تقدیر پدید

کتک کی جامع مسجد میں بڑا اجتماع ہے آج روز جمعہ ہے ۔ بعد نماز شیخ جمال الدین نے اعلان عام کیا کہ میں تم سے رخصت ہوتا ہوں تمہارے افعالِ بد و اعمال زبوں کی پاداش میں عذاب الہٰی نازل ہونے والا ہے اب قیامت میں ملاقات ہوگی ۔ اتنا کہہ چل دیئے مؤذن ہم عنانی کی اجازت لے ساتھ ہولیا ۔ ابھی تین فرسنگ گئے تھے کہ کچھ ضروری کام یاد آیا اور مؤذن کتک واپس گیا جب مسجد کے قریب سے گذرا تو عصر کا وقت تھا دل نہ مانا عادت نے قدم تھام لئے ۔ مینار پر چڑھ اذان کہی اب جو نیچے اترا تو راستہ بند پایا ۔ پھر اوپر آیا ۔ دیکھا تو آسمان پر سے خاک برس رہی ہے اور راہ مسدود ہوگئی ہے ۔ آہستہ آہستہ خاک مینار تک آن پہنچی اور یہ کود جان بچا شیخ سے جا ملا اور سارا

ماجری کہہ سنایا۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں مسافر بے محل پہنچے۔ ایک جگہ بیٹھ کر دم لے رہے تھے کہ کچھ سپاہیوں نے آکر گرفتار کیا۔ کشاں کشاں سردار پاس لے گئے۔ سردار تغلق تیمور تھا اور اذنِ عام دے رکھا تھا کہ آج ہر شخص سیر و شکار میں شریک ہو۔ یہ عدول حکمی میں گرفتار ہوئے۔ عذر پیش کیا کہ غریب الوطن کنک سے آئے ہیں جو برباد ہوگیا حکم سے آگاہ نہ تھے ورنہ بسر و چشم بجا لاتے۔ تغلق تیمور اس وقت اپنے کتوں کو سور کی ہڈیاں کھلا رہا تھا شیخ سے خطاب کیا اور کہا "تم اچھے ہو یا یہ کتے" شیخ نے جواب دیا "اگر مجھ میں نورِ ایمان نہیں" تو یہ کتے مجھ سے بہتر ہیں ورنہ میں ان کتوں سے بہتر"۔ تغلق نے پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے جو انسان کو کتے پر فوقیت دیتا ہے" شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی۔ تغلق ابھی بااختیار نہ تھا وعدہ کیا کہ جب اختیار پاؤں گا ایمان لاؤں گا۔ وعدہ لیا کہ آکر میرا وعدہ یاد دلاؤ گے مجھے مومن بناؤ گے۔

شیخ جمال الدین بسترِ مرگ پر ہیں۔ بیٹا ارشد الدین قریب بیٹھا ہے۔ شیخ نے دو گھونٹ پانی کے پیئے اور ارشد الدین کو قریب تر آنے کا اشارہ کیا۔ اعضا و جوارح جواب دے چکے ہیں پر ہوش و حواس ابھی باقی۔ لب بمشکل جنبش کرتے ہیں۔ زبان لڑکھڑاتی ہے۔ بات زبان پر آ آ کر رہ جاتی ہے باپ نے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیٹے نے تکیوں کے سہارے بٹھایا دو گھونٹ پانی پلایا۔ حلق تر ہوا، زبان میں طاقت آئی بیٹے سے کہا کہ مدت ہوئی میں نے خواب دیکھا تھا کہ چراغ لئے چٹان پر چڑھ رہا ہوں اور اس کی روشنی سے مشرق و مغرب منور ہے، اس کے بعد بے ربط ٹوٹے پھوٹے فقروں میں تغلق تیمور کا واقعہ بیان کیا اور اس خدمت کے انجام دینے کا وعدہ لیا۔

صبح صادق ہے شب زندہ دارانِ انجم چادر نور اوڑھا چاہتے ہیں۔ عاملانِ کارخانۂ عالم نے واللیل گردانی اور والشمس کھولی۔ روز روشن کا پرچم نورانی لہرایا رات نے اپنا ڈیرہ اٹھایا۔ مغلوں کے ڈیرے ایک میدان میں پڑے ہیں۔ ارشد الدین نے ایک ڈیرہ کے قریب بآواز بلند اذان کہی۔ سوار آئے اور گرفتار کرکے لے گئے۔ خان کے سامنے پیشی ہوئی۔ اس نے غضبناک انداز میں کہا کہ تو کون ہے جو روز میری نیند خراب کرتا ہے" ارشد الدین نے جواب دیا کہ آپ تک پہنچنا چاہتا تھا جب اور کسی طرح

رسائی نہ ہوئی تو یہ طریقہ اختیار کیا' الکریم اذا وعد وفا - آپ نے مدت ہوئی میرے باپ شیخ جمال الدین سے ایمان لانے کا وعدہ کیا تھا آج میں اس کے ایفا کا طلبگار ہوں'۔ تغلق تیمور بولا' مجھے اپنا وعدہ یاد ہے جب سے بااختیار ہوا شیخ کا منتظر ہوں' ارشدالدین نے کہا' وہ تو راہی ملک بقا ہوئے اور مجھے وصیت کر گئے'۔ خان ایمان لایا۔ صبح پہلا آدمی جو دربار میں آیا امیر تولیک تھا۔ تغلق نے پوچھا۔ کہ اسلام قبول کروگے'؟ تولیک نے جواب دیا کہ تین سال ہوئے مجھکو کاشغر میں ایک نیک بندہ نے مسلمان کیا تھا مگر آپ کے خوف سے ظاہر نہ کرتا تھا'۔ خان اور امیر گلے ملے بالآخر ایک ایک کر کے سب ایمان لائے۔ حتیٰ کہ نوبت جرس تک پہنچی اس نے کہا کہ اگر یہ شخص میرے ملازم ستغتی بوقا کو زیر کرے تو میں ایمان لے آؤں گا میں نے اس کو دیکھا ہے کہ اونٹ کے دوسالہ بچہ کو بے تکان اٹھا لیتا ہے۔ مولانا ارشدالدین نے خدا پہ بھروسہ کر شرط منظور کی۔ چند لمحہ گاؤ زوری کے بعد بوقا زمین پر تھا اور مولانا اس کے سینہ پر۔

آواز:- اس ایمان کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔

بعد مغرب دن بھر کے بچھڑے ہوئے ستارے صحن فلک پر جمع ہوئے اہل مغل بھی نماز ادا کر یک جا ہو بیٹھے۔ ترا گی۔ قبیلہ کا خان دوران گفتگو میں بولا' رات میں نے خواب دیکھا اس کی تعبیر چاہتا ہوں۔ سب غور سے سننے لگے۔ خان نے کہا کہ دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چہرہ والے عرب نے مجھے شمشیر برہنہ دی۔ جب میں نے چلائی تو اس میں سے شعلہ نکلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے تلوار گلاب پاشں سے بدل گئی اور اس کی پھوار دور دور پہنچی'۔ یہ خواب سن کر سب کی رائے ہوئی کہ شیخ شمس الدین سے تعبیر طلب کی جائے۔ ترا گی اور قبیلہ کے چند بزرگ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے جواب ملا کہ فرزند ارجمند مبارک ہو۔ اس کی تلوار دنیا کو کفر اور بت پرستی کی گندگی سے پاک کرے گی ایمان پھیلائے گی۔ اس کی اولاد لاتعداد ہوگی اور ممالک دور و دراز تک پہنچے گی'۔

——— ۶ ———

معاشری اصلاح اور قومی ترقی

(جناب محمد عرفان صاحب ندوی متعلم جامعہ)

اقوام عالم کی زندگی کا انحصار ان کی معاشرتی اصلاح پر ہے۔ قومیں اسی وقت تک منازل ترقی بھی طے کرتی ہیں جب تک اُن کے اندر معاشرتی خوبیاں موجود رہتی ہیں۔ گویا معاشری اصلاح اور قومی ترقی آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ کسی قوم کی معاشری اصلاح کے لازمی معنی یہ ہوں گے کہ وہ قوم ترقی یافتہ ہے۔ اور جب کبھی آپ کسی قوم کو قعرِ مذلت میں گرا دیکھیں تو آپ فوراً سمجھ جائیے کہ وہ جماعت معاشرتی خرابیوں، بے ہودہ رسم ورواج، اور اس سے بھی زیادہ دماغی اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہے، اقوام کا بام ترقی پر پہنچنا اسی وقت ممکن ہے جب اصلاح معاشرت کو شمع راہ بنایا جائے اور پھر اس کا بجھنا ہی اندھیری اور بھیانک رات کا آجانا ہے جو اتنی دراز ہوتی ہے کہ "مریض نیمجاں" کو انتہائی کرب و بے چینی اور سخت اضطراب کے بعد بھی سپیدہ صبح دیکھنا پھر نصیب نہیں ہوتا۔

اوپر کے بیان کو تاریخی شواہد اور براہین کے ساتھ مبرہن کیا جا سکتا ہے۔ یونان وروم دنیا کی زبردست سلطنتیں گذری ہیں جنھوں نے اعلیٰ تہذیب وتمدن کے ذریعہ جو اصلاح معاشرت ہی کا نتیجہ ہے اپنے اپنے زمانہ میں دنیا کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ اُن کا تمدن ایک عرصہ تک تمام دنیا پر سکہ جمائے رہا، اور ان کی تہذیب ایشیا کے ہر ملک میں قابل تقلید رہی۔ اس سے کہیں زیادہ شاندار روایات اسلام نے چھوڑیں۔ اسلام نے اصلاح معاشرت کا جو بیڑا اٹھایا تھا وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے، اس نے ایک ایسی قوم کو اصلاح کر کے بام ترقی پر پہنچایا جو اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ جاہل، ناسمجھ اور فسق وفجور میں مبتلا تھی۔ بت پرستی، وہم پرستی، جنگ جوئی، ضعیف الاعتقادی اور جہالت کے تہ بہ تہ پردے اس پر پڑے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان کی اصلاح کی اور جب تک اصلاحی صورت قائم رہی مسلمان دنیا پر بھاری رہے۔ ترقی کی، اور کرتے گئے یہاں تک کہ آخری زینہ پر

پہنچ گئے اور ثریا کو جا لیا۔

تاریخ واقعات کو دھراتی ہے۔ پست کو بلند اور بلند کو پست کرنا زمانہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے' وہ قوم جو ایک عرصہ تک سربلند و با اقبال رہ چکی تھی، آج ذلیل و خوار ہے۔ جو کبھی گمراہوں کی ہدایت، بھولے بھٹکوں کی راہ نمائی، اور پریشان خاطروں کے لئے اطمینان و سکون قلب کے سامان مہیا کرتی تھی آج خود اس پر عرصہ حیات تنگ ہے۔ جو کبھی آفتاب بن کر اپنے حسن کی روشنی سے ایک عالم کو منور کر چکی ہے آج اس کے پاس ٹمٹماتا دیا بھی نہیں جو اس کے چار قدم آگے کے راستہ کو ہی روشن کر سکے۔ اپنا بہترین سرمایہ حیات ڈبو کر آپ نادار بن گئی۔ دوسروں نے اس کے اصولوں کی برتری اور خوبی کو تسلیم کر کے اپنی مشعل راہ بنا لیا اور یہ گم گشتہ راہ ہی رہی۔ وہ معاشرتی بلند اصول جو اسکا طرۂ امتیاز تھے آج ایک ایک کر کے اس سے رخصت ہو چکے ہیں اور وہ ہے کہ روز بروز پستی کی طرف کوچ کر رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ قوموں کی معاشرت بھی بدلتی رہتی ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ نئی نئی ضروریات اور احتیاجات پیدا ہوتی ہیں۔ سوسائٹی کے سامنے پرانے اصول کی جگہ نئے اصول حیات آتے ہیں۔ اور اسی لئے "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ" اور "اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا" کی تعلیم کے ماتحت ہر باخبر اور ہوشمند قوم کے لئے اپنی برائیوں کو دور کرنے اور دوسروں کی اچھائیاں اور خوبیوں کو اختیار کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہے تاکہ اس پر زمانہ کا ساتھ نہ دینے کا الزام نہ عائد ہو۔ سوسائٹی کا حقیقی مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ وہ سماج کی غیر ضروری اور تکلیف دہ جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر افراد کی ترقی اور خوبیوں کی وسعت کو جگہ دینے کے لئے اپنا دامن وسیع کرے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ ہماری معاشرت نے اس وقت کیا کچھ رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اور سوسائٹی کس حد تک اسکی اصلاح کر رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ سوسائٹی اسی رنگ میں رنگ کر قومی ترقی کے لئے اور مشکلات پیدا کر رہی ہے۔

معاشی خرابی اور اس کی اصلاح مسلمان اس وقت پیشوں اور ہاتھ کے کاموں کو حصول معاش کے لئے اختیار کرنا باعث ذلت و توہین سمجھتے ہیں۔ ان کی اس میں کسر شان ہے کہ وہ اپنے ہاتھ

پاؤں چلاکر اپنی روزی اپنی قوت بازو سے حاصل کریں۔ بھیک مانگنا گوارا کریں گے۔ ہٹے کٹے مسٹنڈے ہونے کے باوجود بلا احساس شرم دست سوال دراز کرنے میں ان کو ذرا بھی باک نہ ہوگا۔ لیکن اس میں ان کو شرم محسوس ہوگی کہ سر پر ڈلیا اٹھا کر مٹی پھینکیں، ہاتھ میں پھاوڑا لے کر زمین کھودیں یا ہنسئے سے گھاس کاٹیں اور اس کو بیچ کر اپنی روزی باعزت طریقہ پر حاصل کریں۔ یہ دریوزہ گری اختیار کرنے والا طبقہ قوم کے لئے باعث ذلت ورسوائی ہے۔

یہ حالت تو ہوئی غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کا رجحان لے دے کر ایک ملازمت کی طرف رہ گیا ہے۔ اور ملازمت اتنی کہاں رکھی ہے کہ اس ٹڈی دل لشکر کے لئے وسعت پیدا کرے، تعلیم حاصل کرنے اور ڈگریاں لینے کے بعد ملازمت نہ ملنے کی صورت میں یہ تو کبھی خیال بھی نہیں گذرتا کہ روزی حاصل کرنے کا ذریعہ ان کے لئے "پیشہ" یا ہاتھ پاؤں کی محنت بھی بن سکتی ہے۔ اور اس وجہ سے بیکاری کا ایک مستقل اور کٹھن مسئلہ قوم کے سامنے بہت مہیب شکل میں رونما ہوتا ہے، اور بہت سے نونہالان قوم اس مسلسل اور پیہم کشمکش کی تاب نہ لاکر اپنی عزیز اور نامراد زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کی پیشوں سے بیزاری اور ملازمت کی طرف عام رجحان قومی ترقی کے لئے بہت مضر ہے ملازمت ایک کام ضرور ہے جسکو اور معاشی ذرائع موجود نہ ہونے کی صورت میں اگر اختیار کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یہ بالکل واقعہ ہے کہ ملازمت اعلیٰ اخلاق مثلاً حریت، آزادی ضمیر، مساوات، حب الوطن اور حب قوم کے پاکیزہ جذبات کو بالکل پامال کر ڈالتی ہے۔ اور آدمی بس بندہ زر بنکر شکم پرست بن جاتا ہے۔ جس سے قومی ترقی کو نقصان عظیم پہنچتا ہے۔ کیونکہ جس قوم کا "دل و دماغ" ہی اس سے سرتابی کرے اس کی فلاح و بہبود کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔

قومی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ دونوں میں پیشوں کی اہمیت اور ان کی عظمت و برتری کا احساس پیدا کرایا جائے۔ گداگروں کا ایک بڑا طبقہ جو قوم کے لئے ایک بدنما داغ ہے اس کے لئے کام مہیا کیا جائے۔ اور اسے اخلاقی قوت سے اور یوں نہ ہوسکے تو بجبر اسکے اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے جس سے امید ہوتی ہے کہ قوم ترقی کی منزلوں پر گامزن ہوسکے گی۔

طریقہ بود و باش اور اسکی اصلاح | سلمانوں کے رہنے سہنے اور بود و باش کے طریقوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی حالت قابل اطمینان نہیں ملے گی۔ مکان بنانے میں اس کا قطعاً خیال نہیں رکھا جاتا کہ وہ صحت بخش طریقہ پر بنائے جائیں۔ جن میں نہ ہوا کا گذر ہوتا ہے، نہ دھوپ کا۔ نہایت بھنچے اور دہنسے ہوئے مکانات اور وہ بھی اندر سے اتنے غلیظ کہ الاماں۔ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، لباس پوشاک، غرض کسی چیز میں آپ کو نفاست اور صفائی نہیں ملے گی۔ اگرچہ کپڑا تیار کراتے وقت کبھی ایک دو جوڑوں پر بس نہیں ہوتی لیکن سلیقہ سے ان کو زیب تن کئے ہوئے کبھی بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ مارے شان کے سر پر ترکی ٹوپی تو لگائی جائے گی، اور دو گرہ کی سادہ لیکن آرام دہ ٹوپی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن پھر اس کا کبھی خیال بھی نہ آئے گا کہ اس پر کتنی کیچ جمی ہوئی ہے اور خریدنے کے وقت سے لیکر آج تک کبھی ایک برش بھی اس پر پھیرا گیا ہے یا نہیں۔ نہانا چاہے صحت کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن روز تو کیا مہینوں اس کی نوبت نہ آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کھانا پکانے کی جگہ۔ کھانا رکھنے کی جگہ۔ کھانے کے برتنوں وغیرہ میں صفائی اور ستھراپن کبھی چھو کر بھی نہیں گذرتا۔ عورتیں کپڑے تو بہت بھاری بنوائیں گی، لیکن وہ بھاری جوڑے آنے جانے کے لئے رکھ چھوڑے جائیں گے۔ اور گھر میں نہایت میلے اور گندے کپڑے پہنے رہنا کچھ بھی طبیعت پر نہ کھلے گا۔ نہ ہی وہ کوئی معیوب چیز شمار کی جائے گی۔ بچے جن کی اثر پذیر طبیعت پر پہلے نقوش بمنزلہ فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں ان ہی گندی، غلیظ اور غیر صحت بخش گودوں میں پرورش پاتے ہیں جب ہی بڑے ہو کر ان کی طبیعت میں لطافت اور صفائی کا کوئی میلان نہیں رہتا۔ اور گندگی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اب آپ ہی کی ہم وطن قوم پر آپ نظر ڈالیں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آئیگا غریب سے غریب عورت جس کے رہنے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی کوٹھری ہو، یا کسی مہاجن کا بڑے سے بڑا مکان، ہر روز صبح ہوتے ہی اس کی صفائی اور لیپ جانا اتنا ضروری اور لازمی ہے کہ کبھی فرق نہیں آسکتا۔ گھر کے تمام برتنوں کی صفائی بلا ناغہ اور اس اہتمام سے کہ مٹی راکھ اور بیتوں سے رگڑ رگڑ کر ان کو جھل مل کر دیا جاتا ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے مزدور اور بڑے سے بڑے

تعلیم یافتہ کو صبح آپ اپنے ہاتھ سے لٹیا مٹی سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے ضرور دیکھیں گے۔ کبھی آپ کی بھی اپنے لوٹے پر نظر پڑتی ہے کہ کتنے مہینوں سے اس پر پانی کا ایک ہاتھ بھی نہیں پھیرا گیا ہے، صبح سے روزان کا نہانا اور کھانا کھانے سے قبل نہا دھو چکنے کی ضروری شرط اور ہر روزان کا صاف دھوتی کرتے میں نظر آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صفائی اور نفاست اُن کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ اُن میں اس کی اہمیت کا احساس ہر چھوٹے بڑے کو پورے طور پر ہو چکا ہے۔ سکھ عورتیں بھی روز نہائی ہوئی صاف اور سادہ لباس میں نظر آتی ہیں، کھانا پکانے کا چوکا مجال ہے کہ اس کے بغیر لیپے کھانا پک جائے۔ گندگی کا چوکے کے قریب موجود ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ مجھے چونکہ دیہات کی زندگی دیکھنے کا موقع ملا ہے اور ہندو اور مسلمان دونوں کی دیہاتی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کر چکا ہوں، میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چھوت چھات کے ابتدائی وجوہ چاہے جو کچھ بھی ہوں، لیکن مسلمانوں کی طبعی گندگی اور غلاظت بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے اس جذبہ کو بڑھانے میں بہت کچھ ممد معاون ہوئی ہے۔

ان باتوں کو یہ کہکر ٹالا نہیں جا سکتا کہ یہ نہایت معمولی اور غیر اہم چیزیں ہیں اور ان سے اور قومی ترقی سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی مگر بیتہ کی باتیں ہیں قومی ترقی کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے اس زبردست اور بلند قومی اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے جس کا مشاہدہ اس وقت آپ کے پڑوسیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ معمولی اور روزمرہ کی باتوں کو اہمیت نہ دینا ہی سب سے بڑی جہالت اور پستی کی دلیل ہے۔

مصارف بیجا | مسلمانوں کی آمدنی اور خرچ پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات بہت صاف طور پر نظر آئیگی کہ ان کے اخراجات بمقابلہ آمدنی کے بہت زیادہ ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ زیر بار اور مقروض رہتے ہیں اور ان کی کمائی ایسے نامناسب اور لغو مصارف میں صرف ہوتی ہے جو نہ خود ان کی ذات کے لئے فائدہ رساں ہے نہ ان کی قوم اور ملک کے لئے۔ کپڑے عام طور پر بدیسی جو زیادہ گراں ہوتے ہیں استعمال کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پیسے سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنی اور خرچ میں توازن قائم نہیں ہے، متوسط درجہ کے لوگ ایک دو جوڑے پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ۷، ۸ جوڑے ایک ساتھ

بناتے ہیں، اور ہمیشہ کوشش یہی رہتی ہے اچھے سے اچھے قیمتی کپڑے کا لباس چاہے قرض ہی سے کیوں نہ ہو بنوالیا جائے۔ غرض کسی نہ کسی طرح اپنے بدن کو دیدہ زیب کپڑوں میں ملبوس دیکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں مردوں کے لباس میں اتنے کچھ تکلفات ہوتے ہوں وہاں عورتوں کے لباس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ افلاس اور تنگدستی کے باوجود ایک ایک جوڑا نہایت بیش قیمت کپڑے کا تیار کرا لیا جاتا ہے۔ اور یوں قرض کرکے اپنا اور عورتوں کا شوق پورا کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو دیکھئے جو دولت و ثروت میں مسلمانوں سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ کتنی صاف، سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کرتی ہے۔ عام طور پر ان میں بڑے سے لیکر چھوٹے تک سب سودیشی کپڑا استعمال کرتے ہیں جن سے ان ہی کی قوم اور ملک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دھوتی، کرتہ اور ایک دو گرہ کی دولی ٹوپی جس کو جب چاہو صابن لگا کر دھولو۔ سودیشی کپڑا خریدنے کے ساتھ کم قیمت کا خاص خیال رہتا ہے۔ یہ معمولی معمولی چیزیں اور بعض لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ پاجامہ اور دھوتی کی تعداد گنانا شروع کردی۔ لیکن ان ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ملکر قوم کا کیرکٹر بنتا ہے۔ ان چھوٹی چیزوں میں احتیاط اور خیال کرنے سے آدمی اہم امور میں احتیاط کرنا سیکھتا ہے۔ کفایت شعاری، پس اندازی اور حب وطن جو ہندو قوم کی اہم خصوصیات ہیں یہ سب ان کی عادۃ ثانیہ ان ہی روزمرہ کے معمولات میں مسلسل کرتے رہنے سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

زندگی کے ہر ہر شعبہ میں آپ یہی نقشہ دیکھتے چلئے۔ کھانے کے مصارف کو لیجئے۔ متوسط طبقہ کے غریب سے غریب مسلمان کے دسترخوان پر آپ کو دو ایک طرح کی چیزیں ضرور نظر آئیں گی۔ آپ اس کے دسترخوان پر گوشت ضرور دیکھیں گے، چاہے موسم کے لحاظ سے وہ کتنا ہی مضر کیوں نہ ہو۔ اُسکو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ تو یہ جانتا ہے کہ مسلمان کو گوشت اس لئے کھانا چاہیئے کہ ہندو اس سے ناراض ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ یہ اسلامی طرہ امتیاز ہے۔ مرغن اور چٹپٹی چیزیں جو گراں ہونے کے ساتھ معدہ کے لئے مضر ہیں اور بھوک کو مارتی ہیں آپ اسے چٹخارے لیکر کھاتے ہوئے دیکھیں گے۔ برخلاف اس کے ہندو وہ غذا استعمال کرتے ہیں جو قیمت کے لحاظ سے سستی سے سستی اور افادہ اور حفظ صحت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو۔ ترکاریاں، سستے پھل، دودھ اور دہی وغیرہ ان کی خاص غذا ہے۔ ہم میں کتنے ہیں جو ترکاریاں

کی اہمیت اور حفظ صحت میں ان کے موثر ہونے کا علم رکھتے ہیں اور پھر کتنے ہیں جو استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو غذا سستے داموں ان کی محافظ صحت بن جاتی ہے نہیں وہ گراں قیمت میں بھی میسر نہیں آتی۔ اگر یہ سچ ہے کہ غذا انسان کا مزاج بنانے اور اس کے کیرکٹر کی ساخت میں بڑا دخل رکھتی ہے تو اس کا اثر ہم ہندو قوم میں یوں دیکھ سکتے ہیں کہ وہ نہایت حلیم، بردبار اور صلح کل قوم ہے۔

غلو مذہب اور اسکا اثر معاشرت پر

مسلمانوں کو اپنا مذہب بہت پیارا ہے۔ وہ اسکی راہ میں اپنی زندگی اور اپنا مال ومتاع سب کچھ قربان کرسکتے ہیں۔ جہاں اسلام پر، شعائر اسلام پر، ایک لفظ آئے وہاں یہ اپنا خون پسینہ ایک کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنے مذہب سے ان کی یہ شیفتگی اور والہانہ عقیدت یقیناً قابل قدر ہے اور یہی ان کا حقیقتاً وہ جوہر ہے جو ان کی ہزار کمزوریوں کے باوجود ان کی پوزیشن قائم رکھے ہوئے ہے۔

اسلام نے ہر جگہ عقل کو مخاطب کیا ہے، اپنے پیروں سے تدبر کرنے اور عقل سے کام لینے کا ہر جگہ مطالبہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ عرصہ سے یہ بات ان سے مفقود ہو چکی ہے۔ کورانہ تقلید انکا شیوہ ہو گئی۔ یہ لکیر کے فقیر ہو گئے اور عقل و تدبر سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ اس ایک نقصان سے ہی ان میں ہر طرح کی برائیاں اور بے عقلی کی باتیں زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ظاہر ہوئی ہیں، اور برابر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ایک موٹی سی مثال آپ کے سامنے پیش کروں قرآن پاک اور حدیث شریف میں تعمیر مساجد کو نیک کام اور باعث اجر و ثواب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن و حدیث ہی میں اور بھی بہت سے کام بھی موجب خیر اور باعث اجر قرار دئے گئے ہیں۔ بھوکے کو کھانا کھلانا۔ پیاسے کو پانی پلانا۔ قرضداروں کا قرض ادا کرنا۔ بیوہ اور یتیموں کی خبر گیری کرنا، مفلسوں، ناداروں، اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا، جاہلوں کو تعلیم دلانا وغیرہ۔ اب ہر مسلمان جس کو خدا نے صاحب استطاعت بنایا ہے۔ جب کبھی کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے اسکو سب سے پہلے مسجد ہی بنانے کا خیال آتا ہے، اور وہ مسجدوں کے کافی تعداد میں ہوتے ساتھ اسی جگہ ایک اور مسجد بنا کر کھڑی کر دیتا ہے، جہاں اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور جو مصلین کے نہ ہونے کی وجہ سے ویران پڑی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے کام تھے جو باعث خیر و برکت

بھی تھے اور جو ملکی یا قومی فوری ضروریات کے لحاظ سے بہت اہم قرار دیئے جاسکتے تھے، لیکن ان کی طرف قطعاً توجہ نہیں کی جاتی۔ ایک بستی جہاں کنواں نہ ہو، ایک ایسا گاؤں جہاں شفاخانہ نہ ہو، ایک ایسا موضع جہاں درسگاہ نہ ہو ——— بلا سے نہ ہو۔ مسلمان جب سوچے گا مسجد ہی بنوانے کا تصفیہ کرے گا۔ اگر اس وقت ذرا عقل سے کام لیکر مختلف کاموں میں سے ایک کا انتخاب موقع و محل کی ضروریات کا لحاظ رکھکر کیا جاوے تو وہی کام زیادہ فائدہ رساں زیادہ موزوں اور زیادہ باعث اجر و ثواب ہو سکتا ہے۔

آج وطنی ضروریات کے لئے روپیہ کی حاجت ہے۔ قومی تعلیم کے انتظام کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے اگر اصحاب حیثیت عقل کی روشنی میں صحیح موقع و محل کا تعین کر لیں تو کچھ مشکل نہیں کہ موجودہ وطنی انجمنیں اور قومی ادارے مالی لحاظ سے مطمئن ہو کر مستحکم بنیادوں پہ نہ قائم ہو جائیں۔ اور در اصل قومی ترقی نام ہے ان ہی اداروں اور انجمنوں کے پھولنے اور پھلنے کا۔

شادی بیاہ کی رسومات اور ان کا اثر معاشرت پر

شادی جس کے اصل معنی خوشی کے ہیں اور مسلمانوں میں اُسکا استقبال اگرچہ نہایت شاندار طریقہ پر شادیانے بجاکر اور آتش بازی چھوڑکر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یہ شادی کا پہلا دن ہی ایک مسلسل اور ہولناک ٹریجڈی کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اور اس ایک دن کی شادی کی وجہ سے بعد میں جو جو مصیبتیں اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا دن شادی کا نہیں بلکہ غمی کا تھا۔

شادی کے ایک دن ہی نہیں بلکہ اس کی سلسلہ جنبانی ہوتے ہی جن رسوم کی بھرمار ہوتی ہے ان کی کوئی حد نہیں۔ غریب سے غریب آدمی بھی اس وقت غنی بن جاتا ہے، اور بے دریغ روپیہ قرض لیکر اپنی خوشی سے پھلجھڑیاں چھوڑتا ہے اور طرح طرح کے بیہودہ کھیل تماشوں میں صرف کرتا ہے۔ ان بیہودہ رسوم کو مستحبات یا واجبات ہی کا درجہ حاصل نہیں ہے بلکہ فرائض سے بھی بڑھکر ان کا شمار ہوتا ہے۔ ایک غریب سے غریب آدمی پر بھی سب رسوم کی ادائیگی بہا ضروری ہے۔ بغیر ان کے اول تو شادی ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کسی نے ہمت کرکے کر دی تو اپنے خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ عزیز و اقارب اس سے ملنا جلنا ترک کر دیں گے اور وہ خود مارے ندامت کے زمین میں گڑا جائے گا گویا اس نے سوسائٹی کا

بڑا جرم کیا ہے۔ ہاں عزیز و اقارب اور خود اس کو خوشی اس وقت حاصل ہو گی جب شادی کے بعد قرض کا انبار اسکی گردن پر ہو جائے اور قرضخواہ شادی کے بعد ہی سے آئے دن تقاضا کر کے ادہر میاں بیوی کا عیش اور ادھر ماں باپ کی نیند حرام کر کے جائداد نیلام پر چڑھوا دے۔

ان شادیوں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شادی' بیاہ ہونے کے لئے طرفین کی رضامندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی - اکثر صورتوں میں تو ان میں اپنا نیک بد سمجھنے اور بُرے بھلے میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی اور جن میں ہوتی ہے ان میں لڑکے یا لڑکی کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنا رفیق حیات اپنی مرضی اور منشا سے منتخب کرے۔ بلکہ والدین یا سرپرستوں کی مرضی اور حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ہوتا ہے۔ اور اس کو لڑکے اور لڑکی کی اطاعت اور فرمانبرداری کا بہترین ثبوت تصور کیا جاتا ہے۔ لڑکی کے منہ سے اس معاملہ میں ایک لفظ بھی نکلنا اس درجہ کی بیحیائی میں شمار ہوتا ہے جو تا زیست قابل درگذر نہیں - اول تو ان بے زبانوں کے منہ سے اس قسم کی کوئی بات نکلنے ہی کیوں لگی۔ لیکن اگر کسی باہمت لڑکی نے اپنی زندگی خراب ہوتے دیکھکر اس قسم کا کوئی اشارہ کیا تو بس سمجھئے آفت آگئی، ہر طرف سے تھو تھو ہونے لگتی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر دو ایسی غیر مانوس ہستیوں سے جوڑا بنتا ہے جن کے طبائع مختلف' خیالات مختلف' ذوق مختلف غرض کسی چیز میں مطابقت اور ہمرنگی نہیں ہوتی۔ اور اس سے جو نتائج آجکل کی شادیوں کے فوراً بعد ہی رونما ہوتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ طوطی اور کوا کبھی بھی ایک ساتھ زندگی نہیں گذار سکتے آپ ہزار ان دونوں کو ایک قفس میں بند کر کے رکھیں ان کی معاشرت کبھی نہیں بدل سکتی۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ان تمام بے ہودہ ڈھکوسلوں کو مذہب کی پیروی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں مذہب کے اتنی ہی مخالف ہیں جتنی عقل سلیم کے - پھر یہاں یہ بھی اگر آپ سن لیں تو اچھا ہو کہ حق انتخاب کو والدین جو بلا شرکت غیرے اپنا حق تصور کرتے ہیں اس میں ان کی پسند اور انتخاب کی بڑی وجہ مال و جاہ اور دولت و ثروت کا حصول ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسی مثالیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں کہ ایک نوجوان لڑکی کی شادی تین چار گنے عمر والے سے ہو جاتی ہے جو صاحب مرتبہ اور دولت مند ہو۔ اب مہر کا مسئلہ سامنے لائیے تو یہاں بھی

والدین کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو بڑے سے بڑا عدد یاد ہو وہی مہر مقرر ہو جائے۔ اور یہ فریق ثانی کی طرف سے بہت آسانی سے یوں پورا ہو جاتا ہے کہ یہ چیز کبھی دینے کی تو ہے نہیں جس میں کچھ قیل قال کی گنجائش ہو۔ اس کا خمیازہ اس وقت بھگتنا پڑتا ہے جب میاں بیوی میں اختلاف کی وجہ سے تفریق کی نوبت آئے۔ اور میاں بھی طلاق دیکر اپنا پیچھا چھڑانے پر تیار ہوں لیکن مہر کی ادائیگی کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آنے لگے۔ اور یوں مہر نہ ادا کرنے کی وجہ سے بیوی کو "معلقہ" بنا کر رکھنا پڑے۔ یہاں طلاق کا لفظ آگیا تو اس کے متعلق بھی اتنا کہدوں کہ طلاق کا لفظ منہ سے نکالنا موجودہ معاشرت میں اتنا بڑا جرم خیال کیا جاتا ہے جو ناقابل معافی ہے۔ چاہے میاں بیوی کڑھ کڑھ کر جان ہی کیوں نہ دیدیں بس یہی نہیں کر سکتے۔ اس سے خاندان کی بدنامی لازم آتی ہے جو خاندان کے لئے اتنا بدنما داغ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔

صرف ایک شادی کے معاملہ میں جہالت کے باعث ان بیہودہ رسوم اور ان من گھڑت ڈھکوسلوں کو معاشرت میں وہ درجہ حاصل ہو چکا ہے جس نے اصل اسلامی معاشرت کے چہرہ کو چھپا دیا ہے، اور سماج میں ان کو وہ رتبہ مل چکا ہے کہ اب ان کی مکمل اصلاح معجزہ سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ شکر ہے کہ کچھ ہی خواہان وطن نے شادی کی چند در چند اور پیچیدہ رسموں میں سے سب سے زیادہ خطرناک اور مضر رسم کے استیصال کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور ان کی کوششوں سے بچپن کی شادی کے غلاف ایک طرح کا عام جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ "Age consent committee" نے جس میں ۹ ہندوستانی اور ایک یوروپین ممبر تھا۔ اپنی رپورٹ میں تحریر کیا تھا کہ ہندوستان کی تقریباً نصف لڑکیوں کی شادی ۱۵ سال سے کم عمر میں ہو جاتی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں درج ہے کہ "دس سال کی عمر سے کم میں بیس لاکھ لڑکیوں کی شادی کی جا چکی تھی۔ اور ایک لاکھ ان میں سے بیوہ بھی بن چکی تھیں" سارداایکٹ پاس کرنے کی جو ضرورت محسوس کی گئی اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قانون کے مطابق عورت کی عمر جب تک ۱۴ اور مرد کی ۱۸ سال نہ ہو جائے شادی جائز نہیں سمجھی جاتی۔

لیکن اس ایک خرابی کے علاوہ اور جو رسوم مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں، اُن کے دفعیہ کے لئے بھی ایک متحدہ اور منظم کوشش کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے عوام کے ذہن و دماغ سے جہالت اور توہمات کا پردہ دور کرنا ہی ضروری ہوگا۔ ورنہ ان کی جہالت اور توہم پرستی قومی ترقی کی راہ میں ہمیشہ سنگ گراں ثابت ہوتی رہے گی۔

تعلیم نسواں اور پردہ | اب وقت کا ایک اہم مسئلہ یعنی تعلیم نسواں اور اس سے پیدا شدہ ایک ضمنی بحث پردہ کے متعلق ہمارے سامنے ہے۔ قدیم و جدید نقطہ خیال کے دو مورچے ہمیں یہاں نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ تعلیم کا زبردست حامی ہے تو دوسرا اتنی ہی شدت سے اس کا مخالف۔ ایک جماعت پردہ کو ضروری سمجھتی ہے تو دوسری اسے سوسائٹی سے نکال باہر کرنے پر مصر نظر آتی ہے۔ لیکن عام طور پر بہت واضح اکثریت اسی طبقہ کو حاصل ہے جو پردہ کا حامی اور تعلیم کا زبردست مخالف ہے، اور جس کی وجہ سے مسلم قوم کا نصف عنصر بلکہ نصف سے زیادہ فطری طور پر تاریکی اور جہالت میں پڑا رہنے پر مجبور سمجھا جاتا ہے۔ اور یوں عورتیں بالکل جاہل رہتی ہیں۔ ان کا حس مردہ ہوکر یہ احساس ان میں باقی نہیں رہتا کہ جب وہ اشرف المخلوقات بن کر دنیا میں آئی ہیں تو ان پر بھی کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔ اور سوسائٹی میں برابر کارکن ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کی بلندی یا پستی کی بہت کچھ وہ بھی ذمہ دار ہوسکتی ہیں۔

پردہ کے معنی یہ سمجھ لئے گئے ہیں کہ عورتوں کو مکان کی چہار دیواری میں اس طرح مقید کر کے رکھا جائے کہ بس ان کو موت ہی مکان کی چوکھٹ سے باہر نکال سکے۔ اور اگلے لوگوں کا یہ مقولہ کہ "عورت کا قدم گھر سے موت کے بعد ہی نکل سکتا ہے" مسلم قوم کی عام ذہنیت کو صاف طور پر ظاہر کر رہا ہے۔ اس طرح بیچاری یہ اللہ کی بندیاں مردوں کی مرضی پر بھینٹ چڑھ کر اندھیری کوٹھریوں، غیر صحت بخش مکانوں میں طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو کر بغیر کسی مقصد کے بیکار اور نامراد زندگیاں پوری کرتی ہیں۔ امیروں کے لئے تو یہ زیادہ مضر نہیں ہے۔ لیکن شہر کے غریب گھروں کی تندرستی پر اس کا بڑا خراب اثر پڑتا ہے۔

صرف ایک پردہ کی غیر ضروری حمایت اور تعلیم نسواں کی بلا وجہ مخالفت سے قوم کے جسم و دماغ

کو جیسا کچھ نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی تلافی کی اب یہی صورت ہوسکتی ہے کہ محبان قوم اصلاح معاشرت کا بیڑا اٹھائیں اور لوگوں کو نفع و نقصان سمجھا کر قومی ترقی کا مفہوم ذہن نشین کرائیں۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب قوم سے جہالت دور ہو۔

یہاں اگر ہم پردہ پر جس کو اسلامی فرض قرار دے کر اس کے ذریعہ ایک دوسرے اہم فرض یعنی تعلیم نسواں کی مخالفت کی جاتی ہے کچھ اظہار خیال اسلامی نقطۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

عہد رسالت میں جو عمل تھا اس کو دیکھتے ہوئے نیز حضورؐ کے ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام محدثین و فقہا اس امر کا صراحتہً اقرار کرتے ہیں کہ عورت کا گھر سے باہر نکلنا۔ عام جلسوں میں شرکت کرنا اور مریض کی عیادت وغیرہ کے لئے باہر جانا نہ صرف جائز ہے بلکہ استحبابی درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ البتہ زمانہ مابعد میں علماء نے اجتہاد کر کے اخلاقی بداعمالی کے احتمال سے ناجائز قرار دیا ہے۔ اس علماء کے اجتہاد سے قطع نظر کر کے جہاں تک اسلامی احکامات کا تعلق ہے عورتوں کے باہر نکلنے پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی ہے۔ اور ان کو اجازت ہے کہ ادھر ادھر چل پھر کر حوائج زندگی پوری کریں۔ البتہ آج کل کی مغربی "دوشیزہ" کی طرح زیب و زینت کی تھرکتی ہوئی پتلی بن کر "مستقل دعوت معصیت" بن جانا نہ اسلام کا مقصد ہو سکتا ہے اور نہ کسی اصلاحی نظام کا یہ مقصد ہونا چاہیئے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے سیاسی اور ملی زندگی میں عورت پر زیادہ ذمہ داریاں عائد نہیں کی ہیں کیونکہ قانون "تقسیم عمل" (جس پر ہم ابھی بحث کریں گے) کے لحاظ سے فطرتاً اس کے فرائض کو گھر کی زندگی سے متعلق کیا گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں عورتوں کے واسطے یہ دروازہ بالکل بند ہے۔ اسلام نے عورت کو تمام شرعی معاملات میں اجتہاد کا حق دیا ہے۔ میدان جنگ میں اس کو اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع عطا کیا گیا ہے۔ غرض دنیا کے تمام اجتماعی اور سیاسی مجلسوں میں عورت کو شرکت کی عام اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ عہد رسالت میں نوجوان لڑکیاں۔ خانہ نشین عورتیں "خیر و برکت" کی مجلسوں میں شرکت کرنے کے لئے علانیہ باہر نکلتی تھیں اور مسلمانوں کے تمام جلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔

اب یہ بات صاف صاف ظاہر ہوگئی کہ مسلمانوں نے پردہ کا جو مفہوم اپنے ذہن میں سمجھ رکھا ہے

اور جس کے ماتحت انھوں نے عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں مقید کر رکھا ہے اور اپنے اس فعل کو احکام اسلام کی پیروی کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ اپنے اس عمل میں جادۂ حق سے بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔

پردہ کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس طرح صاف ہو جانے پر یہ بالکل صاف نظر آرہا ہے کہ اسلام کا نظریہ تعلیم نسواں کے متعلق کیا ہوگا۔

قبل اس کے کہ عورتوں کی تعلیم کے متعلق کچھ کہا جائے اس مابہ النزاع مسئلہ پر بھی کچھ مختصراً کہنا ضروری ہے کہ عورت اور مرد کے کیا کیا فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے عورت اور مرد کا مسئلہ کچھ عجیب پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ اور ہمیشہ اس مسئلہ پر کسی نہ کسی پہلو سے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلا رہا ہے۔ لیکن زیادہ تر بحثیں اسی بنا پہ ہوئیں کہ عورت اور مرد کے فرائض اور ذمہ داریوں میں کوئی تقسیم نہیں کی گئی۔ آج ہم عورت اور مرد کے فرائض طے کرلیں تو تعلیم کا مسئلہ نہایت آسانی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ آج کل سماج نے عورت اور مرد کی ذمہ داریاں اور فرائض یا تو بالکل یکساں سمجھ رکھے ہیں یا ایک عنصر کو تمام ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش کرکے ناکارہ بنا رکھا ہے جس سے اس مسئلہ میں پیچیدگیاں رونما ہوگئی ہیں۔

قدرت نے مرد و عورت کو دو مختلف جنس بنایا۔ جن کی طبیعتیں اور خصائل مختلف ہیں۔ کچھ جسمانی فرق بھی رکھا۔ یہ تمام چیزیں بتلا رہی ہیں کہ ان دونوں کے فرائض بھی مختلف ہوں گے۔ قدرت نے عورت پر مرد کے مقابلہ میں بدرجہا ذمہ داریاں، عائد کی ہیں۔ جس وقت ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ عورت کے لئے قدرت نے یہ طے کر دیا ہے کہ وہ گھر کے اندر حکومت کرے، اور مرد بیرونی انتظام اپنے ہاتھ میں لے مرد کمائے اور عورت انتظام کے ساتھ صرف کرے۔ عورت بحیثیت ماں کے بچوں کی لائق معلمہ ہو۔ ان کی تربیت اور ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری اس پر ہو۔ ان ذمہ داریوں کے ساتھ اگر خارجی اتنی ہی کثیر ذمہ داریاں جتنی مرد پر عائد ہیں اس پر اور لگائی جائیں اور عورت ان کو بھی انجام دینے پر مجبور کی جائے تو ظاہر ہے کہ گھر کی وہ خوشگوار فضا باقی نہ رہے گی جو اصول "تقسیم عمل" کی اصل غرض ہے۔ اس لئے کہ اسلام میاں بیوی کے میل ملاپ اور تقسیم عمل سے گھر میں جنت کا سا امن و چین اور اطمینان و سکون پیدا کرنا چاہتا ہے جہاں

دو ہستیاں عیش و آرام اور کامل اطمینان خاطر کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ گھر میں خود اتنے متنوع معاشی کام ہوتے ہیں کہ ان کا سلیقہ مندی سے ادا کرنا بھی عورت کی لیاقت اور قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ چھوٹی سی ایک مثال کو لیجئے۔ آج کل متوسط اور اعلیٰ طبقہ کا یہ حال ہے کہ کپڑوں میں بٹن اور ہک تک درزی کی دوکان سے لگ کر آتے ہیں اور صرف کپڑوں کی سلائی پر آمدنی کا بہت کافی حصہ خرچ ہو جاتا ہے۔ سلائی بعض صورتوں میں کپڑے کی قیمت سے بھی زیادہ پڑ جاتی ہے۔ اگر کپڑے گھر میں تیار ہونے لگیں تو یہ گھر کی بہت کچھ معاشی خدمت ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی اور گھر میں بہت سے چھوٹے چھوٹے کام ہوتے ہیں جن کو اگر عورت اپنی زیر نگرانی پورا کرائے تو گھر ایک چھوٹا سا معاشی نمونہ بن جاتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا اس کا مقصد صاف لفظوں میں یوں سمجھئے کہ افراط اور تفریط کے درمیان ایک "طریق وسطی" نکالنا ہے۔ عورت کو نہ تو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ دفتر میں ٹائپسٹ بن کر اپنی معاش کا خود بندوبست کرے، اور نہ اسکو گھر میں مقید رکھکر صرف چولھے چکی کے کام تک اس کے فرائض محدود کر دئے جائیں۔ بلکہ ایک لائق معلمہ بننے کے لئے اس کو انتہائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے اور گھر کی ہوشیار منتظمہ بننے کے لئے امور خانہ داری میں مہارت بہم پہنچانے کا۔ کیونکہ یہی بیٹیاں آگے چل کر بیوی اور ماں بنتی ہیں اور یہی گھر کے معیار زندگی کا تعین کرتی ہیں۔

اب عورت کی تعلیم کا مسئلہ اور اس کی تعلیم کی غرض و غایت گو بالکل واضح ہو گئی۔ عورت پر بحیثیت بچوں کی معلمہ اور منتظمہ مکان ہونے کے دو جداجدا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بچوں کی تربیت لائق ماں سے زیادہ اچھی کون کر سکتی ہے۔ اس لئے اس کو اصول تربیت و تعلیم سے پورے طور پر واقف ہونا چاہئے اور مکان کے انتظام کے لئے امور خانہ داری میں پوری مہارت ہونی ضروری ہے۔

یہ خیال یہاں بجا طور پر گذر سکتا ہے کہ میں نے عورتوں کے فرائض کو دو عنوانوں کے تحت محصور کر کے سیاسی اور ملی فرائض اور خدمات کے لئے بالکل گنجائش نہیں چھوڑی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اسلام نے سیاسی اور ملی زندگی میں عورت پر زیادہ ذمہ داریاں عائد نہیں کی ہیں کیونکہ قانون

"تقسیم عمل" کے لحاظ سے فطرتاً اس کے فرائض زیادہ تر گھریلو زندگی سے متعلق رکھے گئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عورتوں کے واسطے یہ دروازہ بالکل بند ہے اگر آج اپنے فرائض مفوضہ کی ادائیگی کے ساتھ وہ قوم و ملک کی صدا کو لبیک کہکر سیاسی میدان میں اپنی خدمات پیش کرتی ہیں تو ان کے جذبہ حب وطن و قوم کی قدر اور ان کی ہمت کی داد دے کر اس میدان میں بھی ان کا پُرجوش طریقہ پر استقبال کیا جاسکتا ہے۔ اور اسے قومی ترقی کا آخری زینہ سمجھنا چاہیئے جب قوم کا ہر فرد اس کا خادم بن کر قوم کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک عورتیں شہریوں کے فرائض کو اچھی طرح نہ سمجھیں گی اس وقت تک ملکی اور قومی ترقی نہیں ہو سکتی۔ عورتوں کی ذہانت، گھر کی ذمہ داریوں کا احساس، خانگی کاموں کا تجربہ، ان چیزوں سے عورتوں کی فہم و ذکاوت میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ان کی معاشرتی حیثیت کو بلند کیا جائے اور ان کا مشورہ پبلک کاموں میں بھی شریک رہے تو یہ چیز قوم و ملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ تمدن کی ترقی۔ اعلیٰ نصب العین کے حصول اور اصلاحی کوششوں کے لئے عورتیں بہت کچھ کام کر سکتی ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ تعلیم نسواں کے موجودہ طرز تعلیم اور نصاب تعلیم سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جو اوپر بتایا گیا اس لئے موجودہ کالجوں کی اصلاح یا ایسے علیحدہ کالجوں کا قیام ضروری ہے جہاں صحیح نصب العین کو سامنے رکھکر ان کے لئے نصاب تعلیم تیار کیا جائے اور اس کے ماتحت ان کی تعلیم خاندانی، ملکی، اور قومی ضروریات کے لحاظ سے ان کو دی جائے۔

مردوں کی تعلیم کے بارے میں میرا یہاں کچھ عرض کرنا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ یہ مسئلہ آج بھی خواہان ملک اور مدبران قوم کی خاص توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی موجودہ خرابیوں اور ان خرابیوں کی وجہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کو انھوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا ہے۔ اور اس کے دفعیہ اور کل نظام تعلیم کی اصلاح کی کوششیں برابر جاری ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اقتصادی اور مادی مرفہ الحالی کا انحصار ایک کامیاب صنعتی اور حرفتی نظام تعلیم ہی سے ممکن ہے، اگر ان کی مساعی کامیاب ہوئیں جیسی کہ امید ہے تو پھر اس مدت کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آ جانا کچھ بعید نہیں ہے۔ اور اسی مسئلہ کا

صحیح حل حقیقتاً قوم کے دل و دماغ کے لئے وہ صحیح اور مجرب نسخہ ہوگا جس سے قوم شاہ راہ ترقی پر گامزن ہو سکے گی۔

خاتمہ کلام | ہر ہر شعبہ حیات کے اس دھندلے خاکے سے آپ نے " قومی اخلاق " کی ایک تصویر اپنے ذہن میں ضرور کھینچ لی ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں کی جہالت اور مذہبی رسوم کی بیہودہ جکڑ بندیوں نے قومی امنگوں کو کس طرح پامال کیا ہے۔ اور قوم کے عام اخلاق و عادات پر کیا کچھ اثر کیا ہے۔

عام معاشرتی حالات کا اثر قوم کی اخلاقی حالت پر نہایت اہم پڑتا ہے۔ پس جس قوم کا طرز معاشرت ہمت افزا اور جہد پرور ہے اس کے افراد بالعموم بلند خیال، عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے تجارتی مرکزوں کے مصروف کار ہندوؤں اور شہروں کے کاہل پسند مسلمانوں کی حالت کے موازنہ سے معاشرت کا اثر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اگر ایک اپنے کام میں پوری تندہی اور توجہ سے مصروف ہے، لمحہ لمحہ اس کو جان سے عزیز ہے، اور کام کے شوق میں صحت تک قربان کرنے کو تیار ہے تو دوسرے میں اس گرم جوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری کو دور کر کے شہر شہر اور قصبہ قصبہ ہر ہر فرد میں بہبودی کی امنگ اور کاروبار کا شوق پیدا کرنا قومی ترقی کی طرف زبردست قدم ہو سکتا ہے۔

اخلاق و عادات کا اثر صحت اور تندرستی پر نہایت قوی اور دیرپا ہوتا ہے۔ آج کل بدقسمتی سے مسلم قوم کے بہت سے نوجوانوں کی پس ماندگی، خستہ حالی، اور دائم المرضی کا باعث اُن کی غلط کاریاں، بے اعتدالیاں، اور اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ بادہ نوشی اور آوارہ گردی کا رواج جس کو معاشرتی خرابیوں کی انتہائی حد سمجھنا چاہئے آج بدقسمتی سے ہماری قوم پر مسلط ہے اور قوم کے جسم کا خون جونک کے مانند چوس رہی ہے، مسلمانوں کی اخلاقی حالت حد درجہ تشویشناک ہو چکی ہے اور اس کے بداثرات ہمارے اسکولوں اور کالجوں تک پہنچ رہے ہیں، اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری

معاشرت اس میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے، اگر اخلاقی مدافعت اور حفاظت کا جلد انتظام نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ قوم کا بہترین حصہ جس کی ذات سے قوم کی بے شمار امیدیں وابستہ ہیں ان موذی اثرات کا شکار ہو کر ہمیشہ کے واسطے مسلم قوم کی قسمت کا فیصلہ کر دے۔ لہٰذا بہی خواہان ملک کا اولین فرض ہے کہ اس آتش جہاں سوز کو جلد بجھائیں۔ لوگوں میں نہ صرف اپنی تحریر و تقریر بلکہ اپنے طرز عمل اور ذاتی مثال سے پاکبازی، بلند خیالی اور جہد پسندی کی مستقل عادتیں پیدا کر کے ان کو شاہ راہ ترقی پر لائیں۔ اگر اخلاق کی نگہداشت نہ کی گئی تو ان عادات خبیثہ کو جو طوفان کی طرح بڑھ رہی ہیں، قوم کے لئے پیام مرگ سمجھئے۔

اب تک جو جو معاشرتی خرابیاں اس چھوٹے سے مضمون میں پیش کی گئیں ان سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہر ہر شعبہ حیات میں چھوٹی، چھوٹی خرابیوں اور معمولی معمولی نقائص نے ایک ساتھ ملکر مجموعی حیثیت سے کیا صورت اختیار کر لی ہے۔ اور کس طرح ان چھوٹی چھوٹی پھنسیوں نے قوم کے مضبوط اور قوی جسم کو کمزور و ناتوان کر دیا ہے، اور اگر جلد ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو ڈر ہے کہ یہی معمولی پھنسیاں کچھ دنوں میں دنبالہ کی شکل اختیار کر کے قوم کے نحیف و ناتوان جسم کو سپرد خاک نہ کر دیں۔

اگر اس قوم کو اس خطرناک صورت حال سے بچانا ہے اور اس کو ترقی کی راہ پر لگانا ہے تو زعمائے قوم ہی کا نہیں بلکہ ہم میں سے ہر فرض شناس شخص کا جو درد مند دل رکھتا ہے سب سے اول یہ فرض ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح کا علم صدق دل اور خلوص قلب کے ساتھ بلند کرے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے گھر، اپنے خاندان اپنے محلہ اور اپنے شہر سے اس کی ابتداء کرے تو کچھ بعید نہیں کہ قوم کا مرجھایا ہوا درخت پھر ہرا بھرا ہو کر برگ و بار لے آئے۔

غزل

(از جناب جلیل قدوائی صاحب بی اے)

مرا جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں — ترے ہی پاس مگر چشمِ امتیاز نہیں

سبب یہ ہے جو ہی تو کیف عشق سی محروم — کہ سوزِ عشق تو ہے دل میں تیرے ساز نہیں

کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پر — کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہِ خاموشی — بیانِ رازِ حقیقت میں ہے یہ راز نہیں

وبالِ جاں ہو نہ کیوں عشق کے اسیروں کو — وہ دل جو تیری محبت سے سرفراز نہیں

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں — کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں

بس ایک لفظ محبت کے ماسوا کیا ہے — سُنیں جو وہ تو مری داستاں دراز نہیں

عطائے خاص سے ہے تیری مرا یہ ذوقِ جنوں — عطا پہ ناز ہے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہدے کہ میرا عشق جلیل
بہانہ ساز ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

بیماری جب زور پر ہوتی ہے تو بیمار کو بات سمجھانا، دوا اور پرہیز اور احتیاط کی مصلحتیں ذہن نشین کرنا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی گھبراہٹ میں مریض اور تیماردار سب کے سب اسی شخص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو مریض کو اچھا کرنے کی کوشش کر رہا ہو یہی حال کبھی جھگڑوں میں ثالث یا پنچ کا ہو جاتا ہے، کہ لوگ اسے اپنے جھگڑوں میں اُلجھا دیتے ہیں اور جب اسکا فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے تو جھگڑا کھڑا کرنے کا الزام اسی کے سر تھوپتے ہیں۔ وہ کوئی بڑا ہی شریر آدمی ہوگا جس نے ان دو بلیوں کا قصہ گھڑا کہ جنھوں نے مل کر کہیں سے روٹی چرائی تھی اور اسے ایک بندر کے پاس لے گئی تھیں کہ اس کے دو بالکل برابر حصے کردے۔ بندر بڑا ایماندار تھا، اسے یہ کسی طرح گوارا نہ تھا کہ بلیوں میں سے کسی کو اس کے حق سے زیادہ مل جائے۔ وہ ترازو لیکر بیٹھا، اور چونکہ کاٹنے کے لئے بلیاں کوئی چیز نہیں لائی تھیں اس نے روٹی کا جو ٹکڑا تول میں بھاری نکلا اسے اپنے دانتوں سے کاٹ کر چھوٹا کیا۔ وہ یہ دیکھ کر افسوس کرتا رہا کہ ایمانداری کے باوجود وہ دونوں ٹکڑوں کو بالکل برابر نہ کر سکا، اور بلیوں کے درمیان انصاف کرنے کی خواہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری روٹی بندر کے پیٹ میں پہنچ گئی۔ بلیاں بہت خفا ہوئیں، مگر آپ ہی بتائیے کہ بندر نے جو کچھ کیا اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا، اور اس پر یہ الزام لگانا کہاں تک صحیح ہوگا کہ اس نے انصاف کے نام سے اپنا پیٹ بھرا۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلسطین میں برطانوی سیاست کا مقصد عربوں کے اس لاابالی پن کا علاج کرنا ہے جو ان کی طبیعت میں ایک روگ کی طرح پھیل گیا ہے، یا ملک کی ایسی تقسیم کرنا کہ یہودیوں کے حصے میں آبادی، عربوں کے حصے میں ویرانی رہے، اور انگریزوں کے ہاتھ میں ایسے مرکز آجائیں جہاں سے وہ امن قائم رکھنے، یعنی آبادی کو ویران اور ویرانوں کو آباد ہونے سے بچانے کی تدبیریں

جلد سے جلد کرسکیں۔ بہر حال اس سیاست پر جو الزام لگائے جاتے ہیں ان سے بیار کی بے چینی بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ غصہ میں جوش مارے جانے پر ہر آدمی کو ہوتا ہے مصلحتوں کے سمجھنے اور نیک نیتی کی داد دینے والا اس وقت کوئی بھی نہیں اس کی بھی کسی کو پروا نہیں کہ مسئلہ کتنا پیچیدہ ہو گیا ہے یہودی اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں، عرب اپنی ضد پوری کرنے پر تلے ہوئے اور بڑے افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ وہ شاہی کمیشن جس کی رپورٹ پچھلے سال شائع ہوئی سرکاری ہدایت کے مطابق تجویزیں پیش کرنے کے ساتھ رپورٹ میں ایسی بحثیں چھیڑ گیا کہ جن سے خود برطانوی سیاست پر اعتراض کا پہلو نکلتا تھا، اور اس نے فساد کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ اس کے بعد جو کمیشن بھیجا گیا اور جو ابھی فلسطین سے واپس ہوا ہے اسے زیادہ سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر اور معاملوں میں نہ اُلجھے، اور صرف اس پر غور کرے کہ فلسطین کو انگریزوں، یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کی ایسی کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ جو سب کو مطمئن کر دے۔ اس کمیشن نے کیا طے کیا ہے یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم ہے، مگر عربوں میں جو شورش ہے اس کا سبب غالباً یہ اندیشہ ہے کہ کمیشن کا فیصلہ ان کی مرضی کے خلاف ہو گا۔ یہودی اب تک یہ کہتے تھے کہ ہم بس آباد ہونا اور اپنے گھر کو اپنا کہہ سکنا چاہتے ہیں۔ مگر تقسیم کا نام سن کر ان کے منہ میں پانی آگیا اور طے کر لیا کہ وہ جان پر کھیل کر فلسطین کے اس حصے کو اپنے قبضے میں رکھنے کی کوشش کریں گے جو شاہی کمیشن نے ان کا حصہ تجویز کیا ہے۔

اس وقت اگر یہ طے ہو جائے کہ فلسطین اصل میں کس کا ملک، کس کا وطن ہے تو شاید اسے تقسیم کرنے یا پورا پورا کسی ایک فریق کو دیدینے کی کوئی ترکیب سمجھ میں آجائے۔ لیکن یہ طے کرنا کچھ آسان نہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے کئی ہزار برس ہوئے فلسطین یہودی قوم کو دیا تھا، مگر پھر خدا نے اسے چھین لیا، اور اس کے بعد فلسطین اس قوم کو انعام میں دیا جانے لگا جو خدا کی طرف سے یہودیوں کو ان کی شرارتوں اور گناہوں کی سزا دے۔ مسلمان عرب پہلے لوگ تھے جنھوں نے فلسطین پر قبضہ بھی کیا اور یہودیوں کے ساتھ آدمیت بھی برتی۔ اس کا اعتراف خود شاہی کمیشن نے کیا ہے کہ عربوں کی حکومت میں یہودیوں کو پہلی مرتبہ شائستہ اور آبرو کی زندگی بسر کرنا نصیب ہوا، اور جہاں تک عربوں کا

سلسلہ پہنچا، وہ ظلم اور عذاب سے بچے رہے اسوقت جب تمام عیسائی ملکوں میں یہودی آدمیت سے خارج سمجھے جاتے تھے اور ان کو تکلیف دینا ثواب کا کام مانا جاتا تھا، وہ اسلامی دنیا میں ہر طرح سے ترقی کر رہے تھے اور علمی، تجارتی اور سیاسی زندگی میں پورا حصہ لے رہے تھے۔ لیکن تقدیر نے ان میں احسان فراموشی ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ وہ کبھی نہ اپنے خدا سے راضی رہے اور نہ خدا کے دوسرے بندوں سے۔ اس وقت بھی دیکھئے تو دنیا کی کوئی قوم ان سے خوش نہیں ہے، بس شاید فلسطین کے عرب ہی تھے کہ جو ان کی پرانی روایتوں اور ذہنی تعلقات کے خیال سے انھیں بلا تکلف اپنے ملک میں آباد ہونے دیتے۔ مگر یہاں پہنچ کر انھوں نے بڑے پیمانے پر زمینیں خریدنا شروع کیا، عربوں کو دستکار رکھنے لگے، اپنی آبادی اور کاروبار سے انھیں الگ رکھا اور ایسا کچھ کیا کہ اگر برطانوی سیاست ان کی پشت پر نہ ہوتی تو وہ کب کے مار پیٹ کر نکال دئے گئے ہوتے۔ مگر فلسطین کے عربوں کو دیکھئے تو ان کا اعمال نامہ بھی کچھ صاف نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جنگ عظیم سے پہلے فلسطین پر ترکوں کی حکومت تھی، یہاں کے بڑے اور با اثر لوگوں کو سلطان عبدالحمید کے زمانے میں سرکاری خزانے سے تنخواہیں ملتی تھیں اور وہ مزے میں گھر بیٹھ کر کھایا کرتے اور سلطان کی فیاضی اور رعایا پروری کے چرچے کیا کرتے تھے۔ سلطان نے ان کی ترقی کی فکر نہیں کی نہ کوئی اسکول کھولا نہ رفاہ عام کی تدبیر سوچی، جب ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے حکومت پر قبضہ کیا انھوں نے تمام تنخواہیں بند کر کے اور الٹے ٹیکس لگائے، کیونکہ وہ تمدن اور تہذیب کی زیادہ سے زیادہ نعمتیں اپنی رعایا تک پہنچانا چاہتے تھے اور اس میں جو کچھ خرچ ہوتا اس میں سب کا شریک ہونا لازمی تھا۔ ان کی پالیسی عربوں کی سمجھ میں نہ آئی، امیروں نے غریبوں کو بھڑکایا، اور جنگ عظیم کے دوران میں عرب انگریزوں سے مل گئے۔ اس اتحاد کی چند شرطیں تھیں، لیکن جو مول تول ہوا وہ انگلستان کی وزارت خارجہ اور شریف حسین اور ان کے بیٹے امیر فیصل کے درمیان ہوا، اس میں فلسطینی عربوں کے نمایندے شریک نہ تھے، اور امیر فیصل نے جب دیکھا کہ فلسطین پر قبضہ رکھنے اور حکومت کرنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں تو انھوں نے ایک اور سودا کر لیا۔ اگر فلسطینی عربوں میں

آزادی کی خواہش کے ساتھ محنت کا شوق ہوتا، ان کا ملک سرسبز ہوتا اور شہروں میں آبادی اور کاروبار کی چہل پہل ہوتی تو تاریخ ان کے ملک کو کسی اور کا وطن ثابت نہ کر سکتی اور سیاست اسے خالی اور بے مصرف ٹھہرا کر کسی اور کے حوالے نہ کر پاتی۔ لیکن عرب تو پسینے کو خون سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں وہ آزادی اسے سمجھتے ہیں کہ ان پر کسی طرح کی پابندی اور ذمہ داری نہ ہو اور احسان کرنے والا اسی کو مانتے ہیں جو سب کچھ دیتا رہے اور ان سے کچھ نہ مانگے۔ انگریزوں سے شاید انھیں ایسے ہی احسانات کی امید تھی اور چونکہ برطانوی سیاست ان کے معیار پر پوری نہیں اتری تو وہ اس سے بگڑ گئے ہیں۔

شاہی کمیشن کی رپورٹ دیکھئے تو برطانوی سیاست پر دورخی باتیں کرنیکا الزام آتا ہے۔ پہلے عربوں سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ فلسطین سے یہودیوں کو بے دخل کرنے میں مدد دیں گے تو وہ آزاد کر دئے جائیں گے۔ پھر جب یہودی سرمایہ داروں سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہوئی تو یہودیوں سے وعدہ کیا گیا کہ ان کے لئے فلسطین میں ایک قومی وطن کا انتظام کر دیا جائیگا، لیکن نہ عربوں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ آزادی سے کیا مراد ہے نہ یہودیوں کو بتایا گیا کہ ان کے وطن کی سیاسی حیثیت کیا ہوگی۔ جنگ عظیم کے بعد فلسطین میں انگریزوں کی عملداری ہوگئی تو عرب اس کے منتظر تھے کہ برطانوی حاکم رکھ سکیں تو ہم اطمینان کا سانس لیں اور آزادی کی خوشی منائیں، یہودی کہتے تھے واہ، انگریز کیسے جا سکتے ہیں، وہ تو ہمارے وطن کے محافظ ہیں۔ انگریزی عملداری سے یہودیوں کو طرح طرح سے فائدہ پہنچا، عرب ہر طرح سے نقصان میں رہے۔ یہودیوں نے اس کثرت سے آنا اور آباد ہونا شروع کر دیا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اپنی تعداد کے بل پر ہر طرح کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے امداد باہمی کے ایسے طریقے نکالے کہ جن علاقوں میں وہ آباد تھے وہاں کوئی عرب مزدوری کر کے دو پیسے بھی نہ کما سکتا تھا۔ برطانوی حکومت نے عربوں کے مطالبے پر بھی یہودیوں کی آبادی پر کوئی قید نہیں لگائی، یہودی پرانے شخصی تعلقات کے زور پر حکومت سے اپنے ہر کام میں مدد حاصل کر سکتے تھے عربوں کی غیرت اور جہالت نے انھیں ہر فیض سے محروم رکھا، یہاں تک کہ شاہی کمیشن کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ انگریزی عملداری میں عربوں کی ہر ضرورت اور غرض نظر انداز کی گئی ہے۔ یہودیوں کے

لالچ اور عربوں کے غصے نے آخر کار فلسطین کو بھڑوں کا چھتہ بنا دیا ہے، لیکن برطانیہ کے لئے بھی اپنے خاص عہدے سے عزت کے ساتھ دست بردار ہونا مشکل ہوگیا ہے۔ نہر سوئز کی حفاظت کے لئے لازمی ہے کہ مشرقی بحر روم میں ایک فوجی اور بحری مرکز ہو، اور یہ مرکز اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب اس کی پشت اور بازو مارنے کا امکان نہ ہو۔ پھر موصل سے تیل کا جو پائپ آتا ہے وہ فلسطین سے گذرتا ہے، اور حال میں جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس پائپ میں سوراخ کرنے کی نئی اور کارگر ترکیبیں نکالی ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہی عرب جنھیں کرنل لارنس نے ترکوں کے بنائے ہوئے پل پٹریاں اور سڑکیں توڑنا سکھایا تھا اب نئی حکومت کے بنائے ہوئے پلوں اور پٹریوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں اور بیس برس سے زیادہ بیکار رہنے کے باوجود ان کے ہاتھ میں پہلے کی سی صفائی باقی ہے۔ اب برطانیہ کو مجبور ہو کر مصر سے فوج کو بلانا پڑا ہے، اور شاید یہ سوچا گیا ہے کہ عربوں کے ہر گاؤں اور ہر محلے کی اس طرح ناکہ بندی کی جائے کہ ان کا کوئی رہنے والا تشدد کی جرأت نہ کرسکے اور نہ کسی باغی کو پناہ دی جاسکے۔ اب سیاست نے گویا تلوار میان سے نکال لی ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ مخالفوں کی گردن اسکا لوہا مانتی ہے یا نہیں۔

فلسطین میں پنچ بننے کی کوشش کا جو نتیجہ ہوا ہے اس سے برطانوی سیاست کو سبق لینا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے ایک برطانوی مدبر کو چکوسلواکیا بھیجا گیا ہے کہ وہ حکومت اور جرمن اقلیت کے جھگڑے کو چکائے ابھی تو سب برطانیہ کی انسانی ہمدردی اور صلح پسندی کی داد دے رہے ہیں لیکن سیاست کی یہ گتھی لارڈ رنسی من کے سلجھائے نہ سلجھے گی۔ جرمن اس کی پوری کوشش کریں گے کہ لارڈ رنسی من ایک سنگین بنا کر چکوسلواکیا کے سیاسی جسم میں بھونکیں، انھوں نے برطانیہ کی اس نئی چال کی داد دینے کے ساتھ اس قانون کی مخالفت شروع کردی ہے جو ابھی چکوسلواکیا کی مجلس میں منظور ہوا ہے اور جس سے اقلیتوں کو خارجی سیاست، فوج اور قومی مالیات کے سوا ہر معاملے میں سوراج کے اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ ہٹلر کو ان اختیارات کی آڑ میں بہت کچھ کرنیکا موقعہ ملے گا، لیکن اگر برطانیہ کے ذریعہ سے یہ اختیارات بڑھا دئے جائیں تو اور بھی اچھا ہے، ہٹلر خوش تو

بہر حال تب ہی ہو گا جب سرحد سے چکو سلوواکیا کی سرکاری فوج ہٹانے اور حملہ کے لئے رستہ صاف کرنے کی صورت نکل آئے، پہلے وار کے خالی جانے سے اس کی سیاست کو خاصا صدمہ پہنچا ہے اور اب وہ نہیں چاہتا کہ ناکامیابی کا کوئی اندیشہ باقی رہے۔

واقف کار لوگ کہتے ہیں کہ برطانیہ کے میدان میں آجانے سے عالم گیر جنگ کا خطرہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ مسولینی کا دیوالہ نکل گیا ہے، ہسپانیہ کی جنگ اب واقعی خانہ جنگی ہو گئی ہے اور اس کا خوف نہیں رہا ہے کہ وہاں سے چنگاریاں اڑ کر آگ کو ادھر ادھر پھیلائیں گی۔ جاپان شل ہو گیا ہے، ایسا شل کہ برطانیہ چین کو تجارتی قرضہ دینے کے مسئلہ پر غور کیا جا رہا ہے اور جاپانی مدبر اس پر برہم ہونے کی بجائے برطانیہ سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کا ارادہ ظاہر کر رہے ہیں۔ ادھر مانچوکو کی سرحد پر روس سے جو چھیڑ چھاڑ سات آٹھ مہینے سے جاری تھی وہ اب ایک باقاعدہ جنگ بنی جا رہی ہے اور معلوم نہیں یہ چنگاری اسی جگہ پڑی پڑی بجھ جائیگی یا اڑ کر کہیں اور پہنچے گی۔ جاپانی اس وقت روس سے لڑنا نہیں چاہتے اگرچہ وہ اپنے بیانات کے مطابق، ہر مقابلے میں روسی فوج کو بھگا دیتے ہیں اور اسے وہ بھگاتے بھگاتے ماسکو تک پہنچا دیں تو کوئی تعجب نہ ہو گا۔ لیکن چین فتح کئے بغیر ان کے لئے ایسے محاذ پر لڑنا جو ملک سے بہت قریب ہے ان کے لئے ایک مصیبت ہوگی اور وہ اس میں بہت نقصان اٹھائیں گے۔ ادھر چینی ہیں کہ ہارتے چلے جا رہے ہیں اور ہاری نہیں مانتے۔ جاپانی فوجیں ہانکاؤ کو گھیر رہی ہیں اور اس کے باوجود انھیں پورا یقین ہے کہ فتح انھیں کی ہو گی۔ کوئی ایک مہینہ پہلے ان کی فوجیں سیلاب سے فائدہ اٹھا کر صوبہ شانسی میں گھس گئی تھیں، وہاں سے جاپانی کہتے ہیں وہ نکال دی گئیں، مگر اب کہیں سے اسی طرح کی بے سرو سامان فوجیں مانچوکو میں پہنچ گئی ہیں اور وہاں کی جاپانی فوج اور آبادی کو پریشان کر رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اگر روس نے طاقت آزمائی کی ٹھان لی تو جاپان چست ہو جائیگا یا اسے کوئی بہانہ کر کے اکھاڑے کو چھوڑنا پڑیگا، جو شکست کی ذلت اٹھانے سے بھی زیادہ ناگوار اور نقصان دہ ہو گا۔

جاپان کے لئے امید کی صورت یہی ہے کہ روس کے ڈر سے معاملے کو آگے نہ بڑھنے

دے اور جاپان کو عزت کے ساتھ صلح کر لینے کا موقع دے روس ایشیا میں اُلجھ گیا تو پھر چکوسلو واکیا کی خیر نہیں اور چکوسلو واکیا پر قبضہ ہو گیا تو جرمنی کے لئے دو مکھی کیا جو مکھی لڑنا بھی ایسا آسان ہو جائے کہ یورپ کی ہر ریاست کو اس سے دبنا پڑیگا، اور کمیونزم سے یورپ میں جو عام نفرت ہے اس سے فائدہ اٹھا کر ہٹلر نے اوکرائن کے زرخیز اور کم آباد صوبے پر ہاتھ مارا تو روس کے لئے اسے بچانا بہت مشکل ہو جائیگا۔ مگر دوسری طرف وقت کی مصلحت سٹالن کو ایک مختصر سی جنگ پر آمادہ بھی کر سکتی ہے سوشلزم کے اصولوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے حوصلوں سے قومی تعمیر کا بہت کچھ کام لیا جا چکا ہے اب جوش دلانے کی اور تدبیروں کی بھی ضرورت ہے جن میں جنگ سے بہتر کوئی نہیں۔ یہ روسیوں کے قومی جذبے کو بیدار کر گی۔ پچھلے دو سال میں بڑے بڑے لیڈروں اور فوجی افسروں کو سزائیں دینے سے جو کچھ بے چینی پیدا ہوئی ہے اسے دور کر گی اور روس کے نئے حاکم طبقے کا تسلط مکمل ہو جائیگا۔ اس سے اسٹالن کا اپنا اثر بھی بڑھیگا اور وہ تمام صنعتی منصوبے جو ابھی پورے نہیں ہوئے ہیں تکمیل کو پہنچ جائیں گے۔ یہ تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہو جائیگا کہ اسٹالن نے کیا طے کیا ہے اور اسی کے فیصلے کے مطابق ہٹلر کا رویہ بھی بدلے گا اس کا ہر حال کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ دنیا ایک حالت پر قائم رہیگی ؛

———— ؛ ————

تعلیمی دنیا

(جناب عبدالغفور صاحب لکچرر ٹریننگ کالج علیگڈھ)

رسالہ نیو ایرا (New Era) میں جو تعلیمی دنیا کا نہایت بلند پایہ مجلہ ہے محمد مجیب صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ کی قلم سے ایک مضمون جامعہ پر نکلا ہے۔ یہ مضمون ایڈیٹر نیو ایرا کی درخواست پر لکھا گیا تھا نیو ایرا درحقیقت نیو ایجوکیشن فیلوشپ کا انگریزی ماہنامہ ہے اور اس کی ایڈیٹر مس بیٹرس انسر ہیں جنھوں نے اس تعلیمی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ پچھلے موسم سرما میں جب فیلوشپ کے بین الاقوامی وفد نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا تو انھیں بعض اداروں میں وہ بلند اصول جاری و ساری نظر آئے جن کے لئے نیو ایجوکیشن فیلوشپ آغاز کار ہی سے علمی اور ذہنی جہاد کر رہی ہے۔ ان میں سب سے ممتاز مثال جامعہ ملیہ کی تھی۔ اسی بنا پر ایڈیٹر نے ادارہ کے ایک رکن سے درخواست کی کہ وہ علمی دنیا کو اس شاندار تجربہ سے روشناس کرادیں۔ اسی نمبر میں خواجہ غلام السیدین صاحب کے قلم سے ایک مضمون ٹریننگ کالج علی گڈھ پر بھی نکلا ہے۔

نیو ایرا کے اسی نمبر میں پروفیسر پیر بووے ڈائرکٹر ژی آں ژاک روسو انسٹیوٹ فور ایجوکیشن سائنس جنیوا نے مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے جس میں انھوں نے تعلیمی ہندوستان کے مخصوص مسائل پر پر مغز انداز میں نقد و تبصرہ کیا ہے۔

ان کے خیال میں ہندوستان کی بہترین درسگاہوں میں بچوں کی نشو و نما کے مادی اور روحانی دونو پہلو پیش نظر رکھے جاتے ہیں اور اس لئے ملک کے مفید ترین ادارے تعلیم کو زراعت و صنعت سے ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پروفیسر موصوف وار دھا اسکیم کے اپنا خرچ آپ اٹھانے کے اصول پر یقین نہیں رکھتے تاہم

انھیں امید واثق ہے کہ واردھا کی تعلیمی کانفرنس ہندوستانی دیہی مدارس کی تاریخ میں ایک قابل یادگار کارنامہ ہوگی۔

ایک طرف تو دیہی اسکولوں کی انتہائی غربت اور ناداری انھیں فرانس کے زمانۂ قبل انقلاب کی یاد دلاتی ہے دوسری طرف انھیں ہندوستان کے بعض ترقی یافتہ ادارے مثلاً ٹریننگ کالج علی گڈھ وغیرہ انکے دینے تعلیمی انسٹیٹیوٹ کے پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے اس خوشگوار مثال کا ذکر کیا ہے جو تعلیمی ہندوستان قومیت اور بین الاقوامیت کے صحیح اور متوازن امتزاج کے سلسلے میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یعنی ہندوستان میں جذبۂ قومیت کا خمیر نفرت اور جنگ سے نہیں بنا ہے ۵ے

ہندی۔ اُردو۔ ہندوستانی | انٹر یونیورسٹی بورڈ کے پچھلے اجلاس میں مسئلہ زبان پر کئی ایک دلچسپ تجویزیں منظور کی گئی تھیں اول یہ کہ ہندوستانی زبانوں کو ورنیکلر کی بجائے ماڈرن انڈین لینگویج لکھا اور بولا جائے۔ ورنیکلر کے لغوی معنی غلاموں اور ادنیٰ طبقہ کی زبان ہوتے ہیں۔ نئی اصطلاح سے ان زبانوں کو ہماری تعلیمی اور سماجی زندگی میں وہ اہمیت حاصل ہو جائیگی جو ان کا پیدائشی حق ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ اردو اور ہندی کی بحث تھی۔ بورڈ نے تجویز منظور کی کہ ان اداروں میں جہاں ہندوستانی زبانیں اختیاری مضمون کے طور پر لی جاتی ہیں اردو کو بھی اختیاری مضامین کے زمرے میں شمار کیا جائے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں سے استصواب رائے کیا گیا تھا کہ آیا اردو پڑھنے والوں کے لئے ہندی کا جاننا لازمی اور ہندی کے متعلمین کے لئے اردو زبان سے واقفیت ضروری قرار دی جائے یا نہیں۔

۵ے بنگال کا برت آچاری نوجوان قسم کھاتا ہے کہ وہ بنگال کی خدمت کریگا۔ بھارت ورش کے لئے قربانی کرے گا۔ اور بھارت کے ساتھ ساتھ دنیائے انسان کے لئے بھی جاں نثاری کا ثبوت دیگا پروفیسر موصوف اہل مغرب سے دریافت کرتے ہیں کہ یورپ کے سکاؤٹ یہ قسم کب کھائیں گے؟

نیز اردو اور ہندی کے طلبا پر دیوناگری اور اردو رسم الخط کا جاننا فرض قرار دیا جائے یا نہیں۔

اس ضمن میں مختلف یونیورسٹیوں کے جوابات ان کے ارباب اختیار کے نقطۂ نگاہ اور اس ملک کے طبقہ کی ذہنیت پر جن کی تعلیمی ضروریات کو وہ پورا کر رہی ہیں عجیب دلچسپ روشنی ڈالتے ہیں علی گڈھ یونیورسٹی نے دونو تجاویز سے اتفاق کیا۔ ہندو یونیورسٹی بنارس نے دوسری تجویز کو منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں دونو زبانوں کا جاننا طلبا پر ناقابل برداشت بوجھ ہوگا۔ اردو کو اختیاری مضمون بنانے کے سلسلے میں انھوں نے وعدہ کیا کہ جب مالی حالات اجازت دیں گے تو ہم بخوشی اس اصول کو عملی صورت دینے کی کوشش کریں گے۔

اس کے برعکس ڈھاکہ یونیورسٹی نے جو مشرقی بنگال کی مسلمان آبادی کے لئے قائم کی گئی تھی اور جس میں مسلمان طلبار کی زبردست اکثریت تعلیم پاتی ہے تجویز کیا کہ بی اے کے امتحان میں جو طلبا اردو اختیاری طور پر لینگے انھیں دیوناگری رسم الخط کا جاننا بھی ضروری ہوگا۔

ناگپور یونیورسٹی کی رائے میں طلبار کے لئے دونو رسم التحریر سے واقفیت کی شرط اسکول کی ہائی جماعتوں ہی سے عاید کر دینا چاہئے۔

یو پی میں دونو رسم الخط مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں اس لئے الہ آباد یونیورسٹی کی رائے میں اسے دوبارہ کالج کے درجوں میں رائج کرنا غیر ضروری ہوگا۔ پنجاب اور میسور نے دونو تجاویز سے اتفاق رائے ظاہر کیا۔

مندرجہ بالا آرا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام ہندوستانی یونیورسٹیاں ماسوا بنارس اس بنیادی اصول پر متفق ہیں کہ طلبار کو دونو رسم الخط جاننا ضروری ہیں۔

انٹر یونیورسٹی بورڈ کے استفسارات نے ہمیں مسئلہ زبان کے اہم موضوع پر بڑی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ رسم الخط کے علاوہ دونوں زبانوں کی لغت کے مسئلہ پر بھی ایک لمحہ فکر یہ صرف کریں گے۔ اور ملک کے مقتدر ماہرین تعلیم اور تعلیمی اداروں کے ارباب اختیار سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ سنسکرت آمیز ہندی اور عربی نما اردو کے درمیان میں بڑھتی ہوئی

خلیج کو پاٹنے کی کہاں تک کوشش کرنا چاہیئے۔ آیا اس میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو اس کے لئے کیا ذرائع اور وسائل اختیار کئے جائیں۔

پنجاب یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ ہندوستانی وائس چانسلر مقرر ہو رہا ہے۔ اب تک پنجاب میں یہ عہدہ حکومت کے انگریز وزیر مال یا وزیر داخلہ وغیرہ کا حق سمجھا گیا تھا۔ شاید تعلیم کو اتنا غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ اتنے بڑے تعلیمی ادارے کے انتظام کے لئے ایک بے حد مصروف سرکاری ملازم کے فالتو اوقات کو کافی سمجھ لیا گیا تھا۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے نظام پر حکومت کے ضبط اور اثر کو لارڈ کرزن کے ایکٹ یونیورسٹی ۱۹۰۴ء نے مضبوط کیا۔ اس آہنی گرفت کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی تجاویز نے ایک حد تک ہلکا کر دیا اور جو یونیورسٹیاں کمیشن کے اصولوں کے مطابق کھولی گئیں ان میں ملک کے مختلف ادبی۔ معاشی۔ کاروباری گروہوں اور اعلیٰ پیشوں کی نمائندگی کا خاص لحاظ رکھا گیا۔ یونیورسٹیوں کی انتظامیہ انجمنوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کے لئے نامزدگی کے بجائے انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بعض یونیورسٹیاں پرانے نظام پر ہی قائم رہیں اور ان میں سے پنجاب یونیورسٹی پر سرکاری اثر سب سے زیادہ غالب رہا۔ شکر کا مقام ہے کہ اب یہ ادارہ بھی دوسری ترقی پذیر یونیورسٹیوں کی پیروی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جرمنی یونیورسٹیوں میں نازی حکومت کے زمانے سے طلبار کی تعداد برابر گھٹتی چلی جا رہی ہے، ۱۹۳۲ء میں تمام یونیورسٹیوں میں طلبار کی تعداد ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔ ۱۹۳۶ء میں سرسٹھ ہزار رہ گئی۔ حکومت کے معترضین اس کے کئی وجوہات بیان کرتے ہیں۔ بعض تو قابل یہودی علمار کے اخراج کو اس کمی کا بڑا سبب بتاتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ جرمنی میں بالعموم علمی تحقیقات اور تدریس کا معیار گھٹتا چلا جا رہا ہے، درحقیقت اس کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہے کہ علمی اداروں۔ اخبارات۔ سٹیج، سینما ان تمام ذرائع و وسائل کو جو عوام کی تعلیم اور تربیت کا باعث ہو سکتے ہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، جب ہم مختلف مضامین کے طلبار کے اعداد و شمار پر غور کرتے ہیں تو بے حد دلچسپ انکشافات

ہوتے ہیں۔ مثلاً علم زراعت۔ علم کیمیا اور متعلقہ مضامین کے طلبا کی تعداد میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔
مگر السنۂ جدیدہ کے پڑھنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی ہوگئی۔ ۱۹۳۲ء میں ان زبانوں کے
متعلمین کی تعداد ۹۸۵۴ تھی ۱۹۳۶ء میں ۲۴۸۰ رہ گئی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید جرمنی قوم
نئی نسل میں بین الاقوامی نقطۂ نگاہ اور رواداری پیدا نہیں کرنا چاہتی۔

ریورنڈ سی۔ ایف انڈریوز نے ہندوستانی کے مسئلہ پر لیڈر میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا ہے
جس میں انھوں نے اس گتھی کو بے تعصبی اور فراخدلی سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال
میں آزاد ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی جو سنسکرت آمیز ہندی اور عربی نما اردو کے بین بین ہوگی۔
اردو زبان کے ان معترضین کے لئے جو اس کی فارسی لغت پر اعتراض کرتے ہیں انھوں نے ماہرین
علم اللغت کی علمی کاوشوں سے مثالیں لے کر ثابت کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت کا ماخذ ایک ہی
ہے۔ دو توآرین بہنیں ہیں اور اگر ان دونوں سے نئی ہندوستانی زبان کی تعمیر میں امداد لی جائے
تو کوئی وجہ تصادم یا مخاصمت نہ ہونا چاہیے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا نے پچھلے دنوں سماجی خدمت اور دیہات سدھار کے سلسلے میں
مفید کام کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس تحریک کو منظم شکل دینے کے لئے انھوں نے انجمن امداد دیہات
کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ انجمن خالصتہً سماجی خدمت کے لئے ہوگی اور اس میں کوئی فرقہ وار یا سیاسی
رنگ نہ ہوگا۔ ممبروں کے لئے حاضری لازمی ہوگی اور جو ممبر تین مرتبہ سے زیادہ غیر حاضر رہیگا
اسے انجمن سے خارج کر دیا جائیگا۔ ممبر ہونے کی شرائط یہ ہونگی :۔ ہر ممبر کو اس کام کے لئے
خاص تربیت حاصل کرنا ہوگی۔ تہواری چھٹیوں اور موسم گرما کی تعطیلات میں ہر ہفتہ کم از کم تین گھنٹے
اس کے لئے وقف کر دینا ہوں گے۔ تربیت کے دوران میں طلبا تین تین چار چار کی ٹولیوں میں
گرد و نواح کے دیہات کا دورہ کیا کریں گے اور اس کام کے لئے تجربہ حاصل کریں گے اور دیہاتیوں سے

تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس تربیت کے بعد انکی سرگرمیوں کا مرکز انکا اپنا گاؤں ہوگا۔ جہاں وہ دیہاتی اساتذہ۔ نمبردار۔ مقامی مکھیا وغیرہ سے مل کر دیہات سدھار کا کام جاری رکھیں گے۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں خدمت خلق کی یہ پہلی آواز اٹھی ہے اور ہمیں امید ہے ملک کے طلبا اس کا پورے جوش سے خیر مقدم کریں گے ہماری یونیورسٹیاں اور کالج جہالت اور بے علمی کے اتھاہ سمندر میں چند جزیروں کے مانند ہیں جن میں ان کے گرد چھائی ہوئی تاریکی کم کرنے کے لئے ایک روشنی کا مینار تک نہیں ہے۔ مغرب میں اکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیاں بھی جنھیں ہم استعماری اور سرمایہ داری تعلیم کا گڑھ سمجھتے ہیں (University Settlement) جیسی مفید عام تحریک جاری کردیتی ہیں۔ اور کولمبیا (جنوبی امریکہ) جیسے غیر معروف اور پس ماندہ ملکوں کے بچے بھی جب تھکے ماندے مدرسوں سے واپس جاتے ہیں تو راتوں کو گھر کے بوڑھوں اور نوجوانوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ ہمارے کالج اور مدرسے اس بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں جو تعلیمی مدرسہ اور سماج کے درمیان پیدا ہوگئی ہے اور علم کی برقی حرارت صرف مدرسے کی چاردیواری کے اندر ہی دلوں کو نہ گرمائے بلکہ ملک وقوم کو بھی حیاتِ جدید کی امنگوں سے مرتعش کردے۔

ڈاکٹر سبرا اون وزیر تعلیم مدارس کے صاحبزادے مسٹر کمار منگلم کیمبرج یونین کے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔ کمار منگلم صاحب اس سے پیشتر ہندوستان میں فیڈریشن آف انڈین سٹوڈنٹ سوسائیٹیز کے سکریٹری تھے اور ہندوستانی طلبا کی تنظیمی اور سماجی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں اس معزز عہدہ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اوکسفورڈ یونین میں باوجود جامعہ کی معروف قدامت پسندی کے ہندوستانی طلبا اکثر یونین کے صدر اور سکریٹری چنے گئے مگر کیمبرج میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب ہے کیمبرج یونیورسٹی کے طلبا بین الاقوامی رواداری کے اس مظاہرہ پر قابل مبارکباد ہیں۔

مسٹر جان سارجنٹ ہندوستان کے نئے تعلیمی کمشنر مقرر ہوئے ہیں جو اس سے پیشتر کاؤنٹی آف ایسکس کے ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ اس تقرر پر اخباروں میں کچھ نکتہ چینی بھی ہوئی اور یہ امر بہت سے اصحاب کو گراں گذرا کہ ہندوستان کے بہت سے ذی قدر اصحاب کو چھوڑ کر ایک غیر ملکی ماہر تعلیم کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ یہ امر قابل تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کا تجربہ اور انکی ذاتی قابلیت انھیں اس ممتاز عہدے کی ہر طرح اہل بناتی ہے۔ تاہم کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہندوستان کے محکمہ تعلیم کے سب سے بڑے عہدہ دار کا ملک کی سماجی۔ اقتصادی۔ کلچرل اور روحانی زندگی سے ایک گہرا رشتہ ہو۔ اور وہ ملک کی تعلیمی ضروریات کو اس کے سیاسی اور سوشل حالات سے منطبق کر سکے۔ آج تک تعلیمی کمشنر محض پنشن خوار ڈائرکٹر تعلیمات ہوتے رہے ہیں جو اپنی عمر کا بہترین حصہ کسی صوبے کے تعلیمی محکمہ میں گزار آئے اور آخری عمر میں انھیں تعلیمی کمشنر کا عہدہ بطور انعام دیا گیا تھا۔

اس لئے وہ عمر اور صحت کے لحاظ سے بالعموم اس قابل نہ ہوتے تھے کہ ایسے اہم عہدہ کے فرائض تسلی بخش طریق پر انجام دے سکیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس عہدہ دار کا فرض انصرام امور نہیں بلکہ ایک مجموعی تعلیمی لائحہ عمل کی تشکیل دینا ہے تو اس مقصد کے لئے بھی ایسا انتخاب موزوں نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جو عمر بھر دفتری کاروبار کی الجھنوں میں پڑے رہے اور جنھوں نے محکمہ تعلیم میں رہ کر بھی دوسرے محکموں کی استبدادی ذہنیت پیدا کر لی وہ نئی نسلوں اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بدلتے ہوئے ماحول کے لئے کیا نئی تعلیمی فضا پیدا کریں گے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نیا تقرر کم از کم اس نقص سے ضرور پاک ہوگا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے ۱۸۰ اساتذہ جو ملک کے ہر حصے سے آئے تھے ۱۹۳۷ء کو روانہ ہو گئے ہیں امسال اس جگہ ایک بین الاقوامی اخوت اور برادری کا کیمپ منعقد ہو رہا ہے جس میں فرانس بلجیم۔ ہالنیڈ۔ امریکہ اور زیکوسلاواکیا کے نمایندے شرکت کر رہے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو نے اپنے پروگرام میں تعلیمی سکشن بڑھانے کا ارادہ کیا ہے۔ دہلی اسٹیشن کے ارباب اختیار اس اقدام پر قابل مبارکباد ہیں۔ متمدن ممالک میں ریڈیو تعلیمی ذرائع میں ممتاز حیثیت پاچکا ہے بعض ملکوں میں ریڈیو کے ذریعہ باقاعدہ سبق دئے جاتے ہیں۔ ملک کے متعدد لیڈر۔ ادیب اور شاعر ریڈیو پر اپنا کلام سناتے ہیں اور بچوں کی دنیا کو اس خوشگوار حقیقت کا احساس دلاتے ہیں کہ وہ سب بڑے اور چھوٹے ایک ہی انسانی برادری میں منسلک ہیں۔

تعلیمی سکشن کی ترقی کے لئے ضرورت ہے کہ معلمین تعلیمی دنیا اور ریڈیو کے ارباب اختیار کے مابین کامل یکجہتی اور اتحاد عمل ہو۔ ریڈیو کی مختصر سی زندگی میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ماہرین تعلیم اور اساتذہ ریڈیو کے سلسلے میں بہترین خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

بی۔ بی۔ سی کے خبروں کے ایڈیٹر لندن یونیورسٹی کے ایک سابق پروفیسر ہیں۔ اور ڈاکٹر اوگلوی جو بی۔ بی۔ سی کے نئے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے ہیں وہ بھی اوکسفورڈ اور بلفاسٹ میں معلمی کر چکے ہیں بہرحال تعلیمی سکشن کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے حکومت ہند کے محکمہ ریڈیو کی ایک دفتری شاخ سمجھنے کی بجائے ایک مشاورتی کمیٹی کے سپرد کیا جائے جس میں اساتذہ۔ ماہرین تعلیم۔ ماہرین نفسیات وغیرہ کی پوری نمایندگی ہو۔

تعزیت

ہمارے خاص کرم فرما جناب محمد اسمٰعیل شریف صاحب بی اے (سینیر اسسٹنٹ کمشنر واسپشل مجسٹریٹ واونگر۔ میسور) کے ہم زلف اور جامعہ کے ہمدرد حضرت پیر سید شاہ محی الدین صاحب قادری کی وفات ہم سب کے لئے غمناک ہے۔ خدا مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

(مدیر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت:- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی

جلد ۳۰	نومبر سنہ ۱۹۳۸ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

زندگی یا موت؟

(ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری بی اے جامعہ، پی۔ ایچ ڈی، برلن)

زندگی یا موت یہ وہ اہم ترین سوال ہے جو زمانہ نے مسلمانان ہند کے سامنے پیش کردیا ہے۔ اب یہ خود انکی اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ "زندگی کو پسند کریں یا موت کو" وقت کی صبار فتاری نے آج تک کسی کے لئے بھی انتظار نہیں کیا ہے اور نہ وہ ان کے لئے اپنی رفتار کو دھیمی کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ ہواؤں کے طوفان دریاؤں کے تلاطم۔ موجوں کے تھپیڑے۔ اپنے ہنگامہ و شورش میں مشغول ہیں۔

دریا کو اپنی موج سے طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار لگے، درمیاں رہے

آفتاب، ماہتاب، ستارے، زمین و آسمان بلکہ کل کائنات اپنی تعمیر میں منہمک ہے۔ نشوونما کی ہنگامہ آرائیاں جاری ہیں۔ بقاء اصلح کی خونچکاں تلوار بغیر پس و پیش کمزوروں اور نااہلوں کی گردن کو اڑادیتی ہے اس ہمہ گیر قانون کے سامنے عاجزی و انکساری بھی رحم و کرم کے لئے داد و فریاد کا کام نہیں دیتی۔ وہ بے پناہ ہے۔ اسکی اس طاقت میں لوگوں کو ظلم و خوں نشانی دکھائی دیتی ہے۔ مگر وہ اپنے داخلی فطری قانون سے مجبور ہے۔ وہ ضعیفوں کے لئے قوت والوں کو روک نہیں سکتا۔ وہ نااہلوں کے لئے قابل انسانوں کی راہ میں روڑا نہیں اٹکا سکتا ہے۔ وہ ذلیل بھیک مانگنے والی اقوام کے لئے سربلند و خوددار اقوام کی راہ میں کیوں مزاحم ہو؟ وہ تو صرف ان اقوام کا ساتھ دیتا ہے جو اپنی قوتوں کی صحیح طور پر جانچ کریں۔ زمانہ اور زمانہ کی تحریکات کو سمجھیں اور پھر اپنی داخلی قوتوں، تاریخی بنیادوں، زمانہ کی تحریکوں پر ایک بلند و بالا نصب العین استادہ کریں۔ پھر اس بلند و بالا نصب العین کو شور و ہنگامہ کے ذریعہ نہیں بلکہ استقلال اور پائدار عمل کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کریں یہ زندگی کا قانون ہے۔ ایسی زندگی کا جو پھولتی ہے اور پھلتی ہے۔ جو لوگوں کو آرام کے لئے ٹھنڈا سایہ اور کھانے

کے لئے میٹھے پھل دیتی ہے۔ وہ زندگی جو انسان کو تری و تازگی بخشتی ہے۔ جو اس کے جسم میں صحت در خون اور اس کی روح میں پُرکیف نغمہ بھر دیتی ہے۔ جس سے انسان حیوانی بنیادوں سے بلند ہو کر نفسی اور روحانی منازل کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے۔

مسلمانان ہند | بد قسمت مسلمانان ہند حیران و پریشان ہر ایک کا منہ تکتے ہیں۔ اس یتیم بچہ کی طرح جس کے والدین کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا ہو اور جو شفقت و محبت کے لئے ہر ایک کا منہ تکتا ہو۔ اسکا چہرہ پژمردہ۔ اسکی جبیں غم آلود اور اسکی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہوں۔ اُن کے سر پر کوئی بھی محبت سے ہاتھ پھیرنے کے لئے تیار نہو۔ سینے محبت بھرے آغوش میں کوئی بھی انکو لینے کے لئے آمادہ نہ ہو۔ اس کی قسمت میں ہر طرف سے بے رخی۔ بے پروائی اور جھڑکی لکھی ہوئی ہو مغلیہ سلطنت کے خاتمہ نے مسلمانان ہند کو یتیم کر دیا پہلے انھوں نے انگریزوں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ شروع شروع میں انھوں نے اپنی ملکی مصالح کے باعث ان کی طرف کچھ توجہ شروع کی۔ لیکن فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ نہ اصلی محبت ہو سکتی تھی اور نہ تھی۔ بعد میں پھر انھوں نے ہندوؤں کی طرف رخ کیا۔ وہاں بھی بعینہ وہی پیش آیا۔ اب وہ ایک مایوس جھنجلائے ہوئے بچہ کی طرح خفا و غصہ ہو رہے ہیں۔ حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ تحریری معاہدہ چاہتے ہیں۔ لیکن نہ تو دراصل یہ حقوق منظور کئے جاتے ہیں اور نہ کوئی معاہدہ ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن بفرض محال اگر یہ سب کچھ کر بھی دیا جائے اور اس کے بعد پھر اس سے انکار کر دیا جائے تو پھر یہ کیا کریں گے۔ وہی چیخنا و چلانا وہی شور و شغب۔ اور بالآخر وہی بے بسی و مایوسی۔

بد قسمتی سے مسلمانان ہند کے سامنے اس وقت نہ کوئی نصب العین ہے اور نہ کوئی متعینہ راہ عمل۔ وہ ایک منتشر پریشان گلہ کی طرح ہیں جسکا کوئی نگہبان نہیں۔ انکی قومی زندگی ایک حقیر بے مایہ تنکے کی طرح ہو گئی ہے جس کو ہوا کی رو جدھر چاہے اڑا کر لے جائے۔ راہ ہی متعین نہیں ہے تو راہبر کا متعین ہونا کیسا۔ یہ شعر؎

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

ابھی تک اسی طرح صادق آتا ہے جس طرح آج سے ربع صدی قبل مسلمانان ہند بیچارے اُس گم کردہ راہ کی طرح ہیں جو ایک خوفناک بگولہ میں گھر گیا ہو۔ وہ مخبوط الحواس حیران و سراسیمہ ہر سمت دوڑ کر جاتا ہو اور وہاں سے پھر ہواؤں کے طوفان اور گرد و غبار کے تھپیڑے اس کو واپس کردیتے ہوں۔ اس کش مکش میں بالآخر وہ غریب اپنی آنکھوں کی بینائی بھی کھو دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک یہ نوبت تو نہیں پہنچی ہے لیکن ڈر ہے کہ اس پریشانی۔ سراسیمگی اور انتشار کے اس خوفناک طوفان سے جلد نجات حاصل نہ کی گئی تو ہماری قومی بصیرت ہی غائب نہ ہو جائے۔ قومیت۔ اشتراکیت فسطائیت۔ اور خدا جانے کون کون سی تحریکات ہندی مسلمان کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔ ہر تحریک اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ اپنے درد کی دوا کے لئے اسکی طرف بے ساختہ دوڑا ہوا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے مرض کا علاج کہیں بھی نہیں ہوتا۔ اس کی بیماری بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس کی تشنہ کامی کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ دوسروں کے لئے یہ تحریکات چشمۂ بقا ہی کیوں نہ ثابت ہوں لیکن مسلمان کی پیاس کو تو یہ ذرا بھی بجھا نہ سکیں۔ اس قدر متضاد تحریکات کی کش مکش دنیا کے کسی بھی خطہ میں اس وقت اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ ہندوستان میں ہے۔ یہاں بہت سی مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ پھر جدید تحریکات کی کش مکش کا بھی یہ آماجگاہ بن گیا ہے ان مختلف عناصر کے باعث یہاں کا تمدنی مسئلہ دراصل بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ مسلمانان ہند کے لئے اپنا نصب العین متعین کرنیکے بعد ضروری ہے کہ وہ ان تحریکات کے ان عناصر کو تو قبول کرلیں جو خود انکی اپنی تمدنی تاریخی روایات سے ہم آہنگ ہوں لیکن ان کو مسترد کردیں جو ان سے متضاد ہیں۔ بچہ کی طرح کوئی قوم بھی اس وقت تک صحیح طور پر نشوونما نہیں پاسکتی جب تک کہ وہ اپنے داخلی نفسی قویٰ کی پابند نہ ہو۔ پھر تاریخی ارتقا کے دور میں اس نے جو مستقل عادات اختیار کرلی ہے اس کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے قبل اس کے کہ ہم عہد جدید کی تحریکات سے بحث کریں اور دیکھیں کہ وہ کس قدر ہمارے تمدنی

نصب العین میں جذب ہو سکتی ہے ہمیں خود اپنے تمدن کی ماہیت اصلی کا پتہ چلا لینا ضروری ہے ۔ تاریخی ارتقاء کے دور میں اس نے جو مخصوص نفسی کیفیات اختیار کر لی ہیں اس سے بھی ہم چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ صرف انھیں بنیادوں پر ہم زندگی کی عمارت کو کھڑا کر سکتے ہیں اور صرف یہی بنیادیں پختہ اور مستقل ثابت ہو سکتی ہیں ۔

۲ - تمدن اسلامی کی ماہیت | اسلامی تمدن کی عمارت کلیتاً روحانیت پر استادہ ہے ۔ اسلام کائنات کی اصل "روح" قرار دیتا ہے ۔ مادہ ایک ضمنی اور حقیر چیز ہے جس کو روح اپنے اظہار کے لئے پیدا کرتی ہے اور فنا کرتی ہے ۔ روحانی ارتقا ہی اصلی ارتقا ہے ۔ اس روحانی ارتقا کے لئے کارساز حقیقی نے اسی طرح سامان مہیا کر رکھا ہے جس طرح مادی ارتقا کے لئے اس نے سامان بہم پہنچائے ہیں ۔ جب وقت گرمی سے زمین خشک بیابان ہو جاتی ہے ۔ سرسبزی و شادابی کی جگہ خشکی وافسردگی لے لیتی ہے تو رحمت الٰہی باران رحمت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے جھلس دینے والی ہواؤں کی بجائے فرحت انگیز ہوائیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں ۔ بادل آسمان پر گھر آتے ہیں ۔ اور آناً فاناً زمین پر موتیوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے ۔ خزاں بہار سے بدل جاتی ہے خشک ندی نالے پانی سے لبریز ہو کر ہنگامہ آرائی شروع کر دیتے ہیں ۔ رنگ برنگ کے پھول سوکھی ہوئی زمین کو لالہ زار کر دیتے ہیں اسی طرح جب دلوں کی روحانی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں ۔ غریب انسان مایوس و حراساں ہو جاتا ہے ۔ اس کے نفس کا تعلق اصلی سرچشمہ حقیقت سے باقی نہیں رہتا تو رحمت الٰہی اپنا نزول کرتی ہے ۔ پیغمبر کی شخصیت انسانی زندگی کو گھیر لیتی ہے ۔ اور رحمت ایزدی پیغمبر کے ذریعہ اپنا روحانی فیض نازل کرتی ہے خشک انسانی زندگیاں سرسبز ہو جاتی ہیں ۔ انسانی اخوت و ہمدردی کی نہریں اس میں بہنا شروع ہو جاتی ہیں ۔ انسانی زندگی کا ہر شعبہ اس روحانی فیض کے باعث پھلنا اور پھولنا شروع ہوتا ہے تمدن انسانی میں وہ کلیاں پھوٹتی ہیں ۔ پھول کھلتے ہیں اور پھل آتے ہیں کہ انسان خود اس پر رشک کرنے لگتا ہے ۔ مذہب ، اخلاق ، سیاست ، معیشت غرضکہ تمدنی زندگی کا ہر شعبہ مالامال ہو جاتا ہے ۔ اس کی بنیادیں خود غرضی اور نفسانیت پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ایک اعلیٰ روحانیت اور انسانی ہمدردی پر مبنی ہوتی ہیں ۔ اور

اور پھر زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے علیحدہ نہیں ہوتا بلکہ ایک نظام میں منسلک ہو جاتا ہے۔

ہر پیغمبر کا ظہور ایک نئے تمدنی دور کا محرک ہوا ہے۔ جب انسان کی روح مادی قید و بند سے آزاد ہوتی ہے تو وہ دنیاوی دیگر بندشوں کو بھی کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس آزادی روح کا اظہار مذہب و اخلاق علم و فن۔ سائنس ٹیکنیک وغیرہ میں بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ صلعم کی روحانی تعلیمات نے جب روح انسان کو آزاد کیا اور اس کا رشتہ اس کے اصلی سر چشمہ سے جوڑ دیا تو بہت ہی تھوڑے عرصہ میں دوسرے تمدنی صیغوں میں حیرت انگیز ترقی شروع ہو گئی عربوں نے پہلے تو اخلاقی تعلیم کے ذریعہ اپنے نفس پر فتح حاصل کی۔ پھر ملکوں کو فتح کیا پھر علم و فن کے خزانوں کو فتح کیا۔ آزادی کی روح جو قرآن کی تعلیمات نے مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی وہ ان کے زوال کے بعد یورپ میں پہنچی اور عہد جدید کے تمدن احیا کا باعث ہوئی۔

قرآن کی تمام تعلیمات کا مرکز ایک خدا کا تصور ہے۔ جو تمام کائنات کا اصلی روحانی عنصر ہے جو اعلیٰ ترین نصب العین ہے اگر جدید مغربی فلسفیانہ اصطلاح میں گفتگو کی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ "اعلیٰ ترین قدر" ہے۔ ایک خدا کے تصور سے "لازماً" منطقی طور پر انسانیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کی پیدا کردہ تمام مخلوق باہم ایک دوسرے کی بھائی بھائی ہے۔ ان میں باہم کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ انسانیت کا یہ تصور ہیں وہ معیار دیتا ہے جس سے ہم ہر تمدن کو پرکھ سکتے ہیں۔ ہر وہ تمدن جو انسانیت کو مساوی تسلیم کرے اس کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کرے جو اس تصور کے حصول میں مد ہو تو وہ صحیح ہے۔ رسول اللہ نے ایک ایسے ہی تمدن کی بنیاد ڈالی تھی جس میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی مساوات کا خیال پیش پیش تھا۔ مساوات سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر قسم کے نفسیاتی اختلافات سے چشم پوشی کر لی جائے۔ بلکہ انسان کی داخلی بنیادوں، اس کی فطری صلاحیتوں، اس کے طبعی رجحانات کا خیال کرتے ہوئے۔ اس کی انفرادی آزادی قائم رکھتے ہوئے جہاں تک ہو سکے اس کی جسمانی نفسیاتی اور روحانی ارتقا میں مدد پہنچائی جائے۔

اسلامی احکامات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کے ذریعہ شریعت اسلامیہ میں انسان کی

اس مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی مساوات کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلامی احکامات کے فلسفہ کو تفصیلی طور پر بیان کرنیکا یہ وقت نہیں ہے لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ روحانیت کی بنیاد پر یہ ہیئت اجتماعیہ کی ایک ایسی عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں کہ انسانیت کا نصب العین عملی جامہ پہن سکے۔ ان احکامات کو مرتب کرتے وقت نہ نصب العین سے چشم پوشی کی گئی ہے اور نہ انسان کی نفسیاتی بنیادوں سے جیسا کہ ہم آگے چل کر مطالعہ کریں گے۔

اسلامی تعلیمات پر ایک نہایت ہی سرسری نظر مسلمانان ہند کے نفسی عوامل کو سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ انھیں کوئی بھی چیز متحرک نہیں کر سکتی جب تک اس کا تعلق اس بنیادی امر سے نہ ہو۔ مسلمانان ہند کی تحریک مندرجہ ذیل تین عناصر سے لازماً مرکب ہوگی۔

۱۔ خدا کا تصور

۲۔ انسانیت کا نصب العین

۳۔ اسلامی تمدن

مسلمانان ہند کی نفسی زندگی کے ان عناصر کو سمجھنے کے بعد اب ہمارے لئے یہ آسان ہوگیا ہے کہ ہم اب اس بات کو متعین کریں کہ وہ کس حد تک ہند جدید کی تحریکات کو قبول یا رد کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی بنیادی قومی خصوصیتوں کو قائم رکھتے ہوئے ان تحریکات میں حصہ لیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر وہ انکو قربان کر دیتے ہیں تو ہم اس کو انکی قومی موت تصور کرتے ہیں۔ زندگی یا موت صرف حیوانی زندگی یا موت کا نام نہیں ہے کسی قوم کی نفسی یا روحانی موت اس کی حیوانی موت سے زیادہ درد انگیز ہے یہ بہتر ہے کہ انسانوں کے کسی گلہ کا دنیا میں وجود ہی نہو۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت خود کو قوم کے نام سے تعبیر کرتی ہے تو اس کے لئے اپنی نفسی و روحانی زندگی کو باقی رکھنا ازبس ضروری ہے۔ انسانوں کو صرف انسان کی طرح زندہ رہنا چاہیئے اگر وہ صرف حیوانی زندگی پر قانع ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنی جگہ چوپاؤں کے لئے خالی کر دے۔

۲۔ تحریک قومیت و کانگریس | ہندوستان کی تحریکات میں سب سے اول جو چیز ہمیں اپنی طرف

متوجہ کرتی ہے وہ ہندوستان کی قومی تحریک ہے۔ اس قومی تحریک نے بہت سی صورتیں اختیار
کی ہیں۔ اولاً تو ہندوؤں کی وہ تحریک ہے جو ہندوؤں کے عہد ماضی کا دوبارہ احیا چاہتی ہے اس
تحریک کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ایک نہایت جابرانہ ہے جسے مسلمانوں کا وجود ہی ہندوستان
میں برا معلوم ہوتا ہے اور وہ جبراً اگر انکا بس چلے تو مسلمانوں کو ہندوستان میں ختم کر دینا چاہتی
ہے۔ ہندو مہاسبھا اور آریہ سماجیوں کی تحریک اسی قسم کی ہے۔ ان تحریکات سے تو ہمارا ظاہر
ہے کہ کوئی بھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا یہاں تو کھلم کھلا مخالفت ہے۔ یہ فسطائی تحریکات ہیں جو
اپنی نسل اور قوم کی برتری کے خیال پر مبنی ہیں ہندوؤں کی دوسری تحریک وہ ہے جو سیاست
اور معیشت میں تو مسلمانوں کو حقوق دینا چاہتی ہے اور وہ ان کے تمدنی معاملات میں بھی مداخلت
نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن وہ خود ہندوؤں کے لئے قدیم ہندو تہذیب کا احیا چاہتی ہے۔ اس
تحریک کے سب سے بڑے علمبردار گاندھی جی ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور بھی تقریباً انھیں خیالات کے
حامی ہیں لیکن ان پر مغربی تہذیب و تمدن کا کافی اثر پڑا ہے۔ اس لئے ان کے خیالات میں
زیادہ لوچ ہے۔

اس تحریک سے مسلمانان ہند کو دراصل کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی ہندوؤں کو اس بات
کا حق حاصل ہے۔ گاندھی جی بہر صورت ہندو ہیں اور اگر وہ ہندی ساہتیہ سمیلن یا ہریجن سیوک سنگھ
کے لئے کام کرتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اگر مسلمان ان کے ان کاموں پر معترض ہیں
تو بجا طور پر ہندو بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کی تصنیف پر معترض ہو سکتے ہیں۔ کوئی
تمدن دراصل اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب اولاً اس میں زندگی کی صلاحیت ہو۔ پھر وہ زندگی
کے مسائل حل کر سکے اور اس کے بعد اس تمدن کو عملی جامہ پہنانے اور حفاظت کرنے کے لئے ایک
مستقل مزاج اور ایثار کرنے والی جماعت بھی موجود ہو مسلمان کسی دوسری قوم کی ترقی کو بہر صورت
اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے تو روک نہیں سکتے۔ اور نہ اس طرح اپنے تہذیب
و تمدن کی حفاظت ہو سکتی ہے۔ گاندھی جی کا کانگریس پر ۱۹۲۰ء سے اس قدر زیادہ اثر ہے کہ

کانگریس اور گاندھی جی دراصل ہم معنی الفاظ ہوگئے ہیں۔ مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔ گاندھی جی مذہباً ہندو ہیں اور ان کے خیالات پر جین مت اور مسیحی فلسفہ کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ حالانکہ کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہیں جو مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتے اور جب سے کانگریس برسر اقتدار آئی ہے اس میں بہت سے مہا سبھائی بھی حکومت میں اپنا رسوخ پیدا کرنے کے لئے شریک ہوگئے ہیں۔ کانگریس بیشک ہندی تحریک قومیت کی علمبردار ہے۔ لیکن اس علمبرداری کے صرف اس قدر معنی ہیں کہ وہ ہندوستان کی غلامی کی بندشوں کو توڑنا چاہتی ہے اور یہاں کی غربت کو دور کرنا چاہتی ہے وہ دراصل وسیع معنوں میں تمدنی ادارہ نہیں ہے بلکہ اس میں ہر قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ جمع ہیں البتہ وہ ہندوستان کی آزادی کے معاملہ میں متفق ہیں۔ لیکن چونکہ کانگریس میں اس وقت اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے جس جگہ ہندو کوتاہ خیال اور متعصب ہوتے ہیں وہاں وہ اس سے مہا سبھائی خیالات کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اس میں ہندوؤں کا بھی قصور ہے اور مسلمانوں کا بھی۔ ہندوؤں کا اس لئے کہ ابتک وہ صحیح قومیت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں اور مسلمانوں کا اس لئے کہ انھوں نے کانگریس کو ایک خوفناک چیز سمجھ کر بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ وہاں موجود نہیں ہیں تو ان کے حقوق کی اس جگہ حفاظت کون کریگا۔

ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا۔ یہاں کی غربت کو دور کرنے کے لئے کوشش کرنا مسلمانان ہند کا وطنی اور مذہبی فریضہ ہے۔ اور یہ فریضہ سوائے ان لوگوں کے ساتھ تعاون کے حاصل نہیں ہوسکتا جو اس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ گذشتہ بیس برس میں اس کے لئے کانگریس نے جو کچھ کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسری جماعت نے نہیں کیا ہے۔ اور کانگریس کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ کچھ کم نہیں رہا ہے۔ خلافت کی تحریک کو تو چھوڑ دیئے کہ وہ ایک مذہبی تحریک تھی لیکن سنہ ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۲ء کی خالص وطنی تحریک میں بھی مسلمانوں نے کافی قربانیاں کی ہیں مسلمانان ہند نے عام طور پر ضرور اس تحریک میں حصہ نہیں لیا لیکن سرحد کے بہادر پٹھانوں نے اس فرض کفایہ کو اپنا خون بہاکر پورا کر دیا۔ جو ہندو اور مسلمان بغیر ہندو مسلم اتحاد کے

ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں وہ دراصل ایک مغالطہ میں مبتلا ہیں انگریزوں کی قوت کو ہٹانا دراصل اس قدر آسان نہیں ہے۔ جب تک کہ ہندو اور مسلمان یکجا ہو کر اس کو دور کرنے کی کوشش نہ کریں گے ان کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں۔ انگریز ہر وقت اپنی قدیم پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" پر عمل پیرا ہوگا اور نادانستہ طور پر ہندو اور مسلمان اس کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہیں گے۔

گاندھی جی کے زیر اثر کانگریس نے عدم تشدد یا اہمسا کو بھی بحیثیت ایک اصول کے تسلیم کر لیا ہے۔ اگر عدم تشدد کے یہ معنی ہی ہیں کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے تو بحیثیت اخلاقی نصب العین کے مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا چونکہ اسلام کی اخلاقی تعلیم میں بھی یہ سب سے اعلیٰ اخلاقی اصول ہے لیکن اگر اس کا یہ مفہوم ہے کہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی قوت کو استعمال نہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسلام بعض صورتوں میں بدی کو دور کرنے کے لئے قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اور ایسی صورتوں میں دراصل قوت کا استعمال بدی نہیں رہتا بلکہ نیکی ہو جاتا ہے۔ ٹالسٹائے سے ان مسیحی خیالات کو گاندھی جی نے لیا اور وہ حتی المقدور کانگریس کو اپنے خیالات کا حامل بنانا چاہتے ہیں۔

۴۔ متحدہ تحریک قومیت کے مقاصد اور مسلمان گاندھی جی اور ان کے متبعین تو ہندوؤں کے تمدن کی ترقی خود انکی تاریخی روایات پر کرنا چاہتے ہیں اور وہ مسلمانوں کا بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خود ان کی تاریخی روایات کے مطابق ترقی کریں۔ لیکن ہندوستان میں ایک زبردست طبقہ ایسا بھی ہے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت کی تعمیر چاہتا ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور اس کی بجائے مغربی وضع کی ایک قومیت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ مذہب کا وہ کھلم کھلا مخالف تو نہیں ہے مگر اس کو صرف ایک خانگی چیز تسلیم کرتا ہے۔ وہ صرف شہریت کی بنا پر قومیت کو استوار کرنا چاہتا ہے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اس قدر مذاہب موجود ہوں غالباً اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہیں ہے کہ سیاست اور مذہب بالکل جدا گانہ ہوں ہندوؤں کے لئے تو اس تحریک میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چونکہ اکثریت انکی ہے اور وہ اپنی حکومت کے ذریعہ اپنے تمدنی اثرات کو غالب

کرنے کی کوشش کریں گے اور پھر اگر اس متحدہ قومیت کی کوشش سے کوئی نئی مشترک چیز بھی پیدا ہوجائے تو بہر صورت ہندوؤں کو وہ ناگوار نہیں ہوسکتی چونکہ ہندو بہر حال ہندو رہتا ہے چاہے وہ ایک خدا کو تسلیم کرے یا ہزاروں کو۔ زندگی کے بارے میں وہاں کوئی متعین راہ نہیں ہے۔

مسلمان متحدہ قومیت کی تحریک کے صرف اس پہلو کو تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ ملک کے لئے آزادی حاصل کی جائے یا ہندوستان کے معاشی مسائل کا حل کیا جائے لیکن وہ اس کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ اپنی قومی ہستی کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں ضم کر دیں۔ زندگی کے متعلق انکا خاص تصور ہے۔ وہ اس تصور کے ماتحت زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے عادی ہیں اور . . یہ سمجھتے ہیں کہ انکا تصور زندگی نہ صرف ان کے لئے مفید ہے بلکہ ہندوستان اور تمام دنیا کے لئے بھی مفید ہے۔ وہ دنیا کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے اپنے پاس ایک نسخہ کیمیا رکھتے ہیں جس کو وہ کسی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ "وطن" اور "روٹی" کی وہ بت بناکر پرستش نہیں کر سکتے گو کہ وطن کو آزاد کرنے اور روٹی کے مسئلہ کو حل کرنے میں وہ کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں ظاہر ہے کہ جو ریاست قائم ہوگی اسکا مذہب سے تعلق نہوگا۔ باوجود ہندوؤں کی کوشش کے بھی غالباً اس کا کسی خاص مذہبی فرقہ سے تعلق نہ ہوسکے گا۔ اس صورت میں مسلمان صرف یہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے مذہبی اور تمدنی امور کے لئے اپنی ایک علیحدہ جماعت قائم رکھیں اور اپنی تاریخی روایات کے مطابق ملک کی دیگر جماعتوں کے ساتھ مشترک معاملات کے لئے اتحاد عمل کریں۔

لیکن ایسی متحدہ قومیت جس میں انکا ملی وجود۔ انکا خاص تصور زندگی۔ انکی مخصوص تاریخی روایات فنا ہوجائیں ان کے لئے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

خیالات میں یہ کش مکش لازمی طور پر جاری رہیگی اور اسی جماعت کے خیالات ملک پر مسلط ہوجائیں گے جن میں زیادہ زندگی ہوگی۔ جو موجودہ پیچیدہ مسائل کا بہتر حل پیش کریں گے اور جن کے لئے ایک سرفروش جماعت اپنی زندگیاں وقف کر دینے کے لئے بلکہ اپنی زندگی کا آخری

خون بھی بہانے کے لئے آمادہ رہیگی۔

۵۔ اشتراکیت ہندوستان میں کانگریس پر تسلط حاصل کرنے کے لئے چند نوجوان جماعتیں ہندوستان میں کوشش کر رہی ہیں۔ یہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹیاں ہیں اس کے علاوہ ٹریڈ یونین کانگریس وغیرہ بھی انھیں خیالات کی حامل ہیں اگرچہ وہ اس وقت تک کانگریس سے باہر ہیں۔ اس تحریک کے سب سے ممتاز رہبر پنڈت جواہرلال نہرو ہیں۔ یہ دراصل بین الاقوامی تحریک اشتراکیت کی صرف ایک شاخ ہے جس کا مرکز روس ہے۔ مارکس اس کا بانی ہے۔ لینن نے اس کو ایک قابل عمل اصول بنادیا ہے اور اسٹالن اسکو اس وقت عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ ہندوستان میں یہ تحریک سرعت سے بڑھ رہی ہے اور ممکن ہے کہ جلد کانگریس پر اس کا پورا قبضہ ہوجائے اس وقت حکومت اشتراکیت کی تعلیم کی حامل ہو جائیگی۔

اشتراکیت کا مفہوم ہے باہم مل جل کر کام کرنا اور اس جد و جہد سے جو حاصل ہو اُس کو آپس میں برابر تقسیم کرلینا۔ اس قسم کی اشتراکیت اکثر پیغمبروں کے زمانہ میں پائی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ اور ان کے حوارئین اسی اصول کے قائل تھے۔ ہندوؤں میں بھی گرو اور چیلوں کی زندگی میں اسی قسم کی معیشت کا وجود ملتا ہے۔ عیسائی کلیاؤں میں بھی اسی قسم کا معاشی نظام پایا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت اس قسم کے تمام اشتراکی نظامات سے بحث نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف اُس باقاعدہ اشتراکی نظام اور اس کی تعلیمات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس کا بانی کارل مارکس ہے اور جس کو عملی جامہ لینن اور سٹالن نے پہنایا ہے۔ اس لئے کہ یہی تعلیمات ہیں جو ہندوستان میں پھیل رہی ہیں اور ہمیں انھیں سے دوچار ہونا ہے۔

مسیحی اشتراکیت کے خلاف مارکس کی اشتراکیت بالکل مادی ہے۔ یہاں مسیح کی طرح مادہ کی تحقیر منظور نہیں ہے بلکہ مادہ ہی سب کچھ ہے۔ روٹی اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اس سے انسان اپنی جسمانی ضرورت پوری کرے تاکہ وہ آئندہ روحانی منازل ترقی پوری کرسکے بلکہ روٹی خود بالذات مقصود ہے۔ روٹی خود خدا ہے۔

کارل مارکس کے خیالات سمجھنے کے لئے اس وقت کی سوسائٹی کا نظام سمجھ لینا ضروری ہے۔ پھر مارکس کی تعلیمات اس کی انفرادی نفسی کیفیت سے بھی بہت . . متاثر ہوئی ہیں۔ مارکس کا عہد سرمایہ داری کا عہد تھا جس میں چند انسانوں کے پاس بے پناہ دولت جمع ہو گئی تھی اور مزدور فاقہ کش تھے۔ معیشت میں انفرادیت کی تعلیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ سرمایہ دار اور عیسائی کلیسا عوام کو لوٹنے میں باہم ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ پھر بیچارہ مارکس خود تمام عمر غریب مفلس اور پریشان حال . . . ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھرتا رہا۔ بندوں کی شفقت اور محبت سے انسان خدا کی محبت سیکھتا ہے۔ وہ اس سے اکثر محروم رہا۔ نسل کا یہودی۔ ذہنی اعتبار سے بہت بلند جس کے باعث اس کی طبیعت بے چین اور زود حس ہو گئی تھی۔ وہ سوائے اس کے کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا کہ تمام انسانیت کی دھجیاں اڑانے کا تہیہ کر لے۔ وہ انسانیت کے مذہب۔ اخلاق۔ سیاست و معیشت۔ رسم و رواج اور قوانین کا مذاق اڑانا چاہتا تھا۔ وہ اس میں کس حد تک کامیاب رہا اس کو آج دنیا دیکھ رہی ہے۔

۷۔ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر | مارکس کی تعلیمات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک اس کا نظری پہلو دوسرا اس کا معاشی پہلو۔ مارکس ہیگل کا شاگرد تھا۔ ہیگل نے اپنے اثبات۔ نفی اور ترکیب والے نظریہ سے تمام کائنات کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ہیگل کے لئے ذہنی عین آخری حقیقت تھی۔ اس دنیا میں اس عین کی حامل حکومت ہے اس لئے حکومت ایک مقدس چیز ہے۔ فائرباخ نے اس تعلیم کو الٹ دیا۔ دنیا کی اصل عین نہیں ہے بلکہ مادہ ہے۔ گو کہ ہیگل کے اصول تضاد کو اس نے بجنسہ باقی رکھا۔ کائنات خدا کے باعث وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ خدا انسانی دماغ کی ساخت کے باعث وجود میں آیا ہے جو کہ مادی ہے۔ مارکس نے فائرباخ کا یہ نظریہ تسلیم کر لیا اور اس نے مذہب اور تمام ذہنی تحریکات کو مادی تحریکات کے عمل اور ردعمل کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی تاریخی مادیت (Historical Materialism) مارکس کی تعلیمات کی اولین خشت ہے۔ مارکس یہ غلطی کبھی بھی نہ کرتا اگر وہ نفس انسانی کے مختلف عناصر کو اچھی طرح سمجھ جاتا

انسانی شعور مادہ نہیں ہے۔ مادہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ زمان و مکان کا پابند ہو۔ لیکن شعور مکان کی پابندیوں سے بالکل آزاد ہے۔ یہ مسئلہ مستقل بحث کا طالب ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ پھر انسانی شعور میں اخلاقی۔ مذہبی اور جمالی عناصر خود اپنی مستقل بالذات حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی روحانی تعلیمات کے کون سے مادی محرکات تھے؟ محمدؐ رسول اللہ کی تعلیمات میں صرف مذہبی جذبہ کام کر رہا تھا۔ بعد میں اسلامی اقوام نے دیگر ممالک کو ضرور معاشی وجوہ کی بنا پر فتح کیا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذہب مادی وجوہ کی بنا پر پیدا ہوا۔ جو مفکرین رسول اللہؐ کے زمانہ کے مذہبی انقلاب کو مادی محرکات سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل مذہب اور ایک مذہبی قوم کے دیگر سیاسی و معاشی اعمال میں غلط بحث کرتے ہیں کتنے شعرا نے شعر صرف مادی مفاد کے لئے کہا ہے؟ کتنے بہترین صناعوں کی صناعی صرف دام و درم کی محتاج تھی؟ دنیا میں آج تک کتنے انقلاب ہو سکتے اگر انسانوں کے دل اخلاقی احساس سے لبریز نہ ہوتے؟

نری مادیت جو دنیا کو صرف ذرات کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے انسان کو کبھی بھی تشفی نہیں دے سکتی۔ انسان صرف بہائم کی زندگی گذارنا نہیں چاہتا۔ مادیت کا لازمی نتیجہ "لذتیت" ہوتا ہے جس پر ایک نظام اجتماعی کو کبھی بھی استوار نہیں کیا جا سکتا۔ مارکس انسانوں کو آئندہ نسلوں کے لئے قربان کرنے کو کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی راحت و عیش قربان کر دیں۔ اگر دنیا مادی ذرات کی ایک اندھی کش مکش ہے جس کا نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی مفہوم تو انسان کیوں اپنی راحت و عیش کو قربان کرے۔

مارکس کہتا ہے کہ سوسائٹی کے مختلف طبقات میں ہمیشہ سے جنگ چلی آرہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ امیروں نے ہمیشہ غریبوں کو لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ یونان کے امیروں نے غلاموں کے ساتھ بدترین سلوک کیا۔ کارخانہ دار اور مزدوروں میں جنگ جاری ہے۔ لیکن یہ قانون ایسا ہمہ گیر نہیں ہے جیسا کہ مارکس اس کو پیش کرتا ہے۔ جس طرح امیر غریب کا دشمن ہے اسی طرح امیر امیر کا بھی دشمن ہے۔ امیروں میں بعض ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو غریبوں کے بھی دوست ہیں۔

مارکس کا یہ نظریہ اس بات پر مبنی ہے کہ وہ انسانیت کا اصل جذبہ محبت و ہمدردی تسلیم نہیں کرتا بلکہ نفرت عداوت یہ فطرت انسانی کے اعلیٰ نہیں بلکہ اسفل پہلو کی طرف دیکھتا ہے۔ اس میں دراصل وہ بہت کم قصوروار ہے چونکہ انسانیت نے اکثر اپنے اسفل پہلو ہی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حکومتوں اور مذہبی پیشواؤں نے خونخوار درندوں کی طرح غریبوں کو خاک و خون میں ملایا ہے۔

۷۔ اشتراکیت کا معاشی نظریہ | مارکس کا "قدر زائد" (Surplus Value) کا نظریہ صحیح ہے۔ دولت جماعت کی عمومی ترقی کا نتیجہ ہے جس میں مزدوروں اور کسانوں کا زبردست ہاتھ ہے مگر اصل نفع سرمایہ دار کی جیب میں جاتا ہے اس نظریہ پر مبنی یہ خیال کہ دولت پر اجتماعی قبضہ ہونا چاہیئے صحیح ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں اگر انفرادی ملک ہونگی تو اس کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری ہوگا اور اس سے بے روزگاری اور غربت پیدا ہوگی۔ غربت نفس انسانی میں اعلیٰ جذبات کی بجائے اسفل جذبات پیدا کریگی۔ محبت کی بجائے نفرت ہمدردی کی بجائے مقابلہ لازماً پیدا ہوگا اور جماعت کے مختلف طبقات میں ہمیشہ جنگ باقی رہیگی۔ طبقات کی جنگ ختم کرنیکا سب سے موثر ذریعہ یہی ہے کہ ان طبقات کے اختلافات کو بہت کم کر دیا جائے لیکن مارکس اس فرق کو بالکل ہی مٹا دینا چاہتا ہے جو فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ انسان مختلف قویٰ اور صلاحیتیں لیکر پیدا ہوا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ سب کو کلی طور پر مساوی کر دیا جائے۔ اگر جماعت کو ایک مرتبہ ایسا کر بھی دیا جائیگا تو پھر وہ اپنی فطری حالت پر عود کر آئے گی۔

معاشی نقطہ نظر سے بھی مارکس کی اس تعلیم پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ وہ (Private enterprise) انفرادی جدوجہد کا خاتمہ کر دیتی ہے جس پر دراصل تمام انفرادی اور اجتماعی ترقی کا دارومدار ہے۔ لینن نے جب مارکس کے خیالات کو عملی جامہ پہنانیکی کوشش کی تو اس کو مارکس کے بہت سے فرضی نظریوں کو خیرباد کہنا پڑا۔ ذاتی ملک کو کسی حد تک تسلیم کئے بغیر نہ لینن کچھ کر سکا اور نہ اسٹالن۔

اشتراکیت نے بیشک روس میں بہت کچھ بے روزگاری کو دور کیا۔ بچوں۔ عورتوں اور

ضعیفوں کی نگاہ داشت کی۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی۔ سائنس و ٹیکنک میں تحقیقات کیں۔ لیکن ساتھ ہی ان مسائل کو حل کرنے کے لئے انفرادی آزادی کو قربان کر دیا۔ شعور انسانی کے بہترین عناصر خصوصاً مذہب کا خاتمہ کر دیا۔ کلیسا کا جھوٹا مذہب، سرمایہ داری کی پشت پناہ عیسائیت برباد ہو جاتی تو ہمیں کچھ رنج نہ ہوتا۔ لیکن وہاں تو ایک خدا کی بجائے اب " روٹی " کی پرستش ہوتی ہے اور رزق کا دینے والا رزاق العالمین نہیں ہے بلکہ " لینن " کا بت ہے جس پر احترام و عقیدت کے پھول نچھاور کئے جاتے ہیں۔ سرمایہ داری کے پنجہ سے نکالنے کے لئے اشتراکیت نے انسانیت کو " بندۂ شکم " بنا دیا ہے۔ انسانیت اپنے اعلیٰ درجہ کی بجائے حیوانیت کی منزل میں اتر آئی ہے۔ انسانی اعمال کے محرکات اعلیٰ روحانی و اخلاقی مقاصد نہیں بلکہ زبان اور پیٹ کی حیوانی لذات ہیں۔

جو کچھ سرمایہ داری نے انسانیت کے ساتھ سلوک کیا تھا اس سے کم برا سلوک اشتراکیت نے نہیں کیا ہے۔ اصل انفرادی آزادی دونوں میں مفقود۔ جابر و ظالم حکومتیں دونوں کا لازمی نتیجہ۔ سرمایہ داری کے نئے مظہر فسطائیت میں بھی وہی ہو رہا ہے۔ اٹلی اور جرمنی میں ویسی ہی انفرادی آزادی کو کچلنے والی حکومتیں قائم ہیں جس طرح روس میں۔ اٹلی نے حبش کو ہضم کر لیا۔ جرمنی نے اسٹریا کو ختم کر دیا۔ جاپان بے تحاشا چین کو نگلے چلا جا رہا ہے۔ برطانیہ کا دست خونیں ابھی تک ہندوستان کے گلے کو دبائے ہوئے ہے۔ فرانس کے مظالم سے عالم اسلامی ابھی تک نوحہ خواں ہے۔ قوت کے نشہ سے یہ مخمور سلطنتیں غالباً بہت جلد آپس میں ٹکرائینگی اور انسانیت کا سارا امن و امان خاکستر ہو جائیگا۔ ع تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی۔

۸۔ اسلامی اجتماعیت Islamie Socia اور اس کا ذہنی پس منظر

ہندوستان کی تحریک قومیت اور اشتراکیت کے سرسری مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانان ہند کو ان میں سے ایک بھی کلی طور پر مطمئن نہیں کر سکتی۔ دونوں تحریکوں میں ایسے بہت سے عناصر ہیں جو ہماری قومی زندگی کی بنیادی نفسی خصوصیات کے بالکل خلاف ہیں۔ اگر ہم اپنا قومی نفسی وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم اپنی تعلیمات کو عہد جدید کی روشنی میں دوبارہ مرتب کریں اور ان کے ذریعہ آجکل کے

تمدنی مسائل حل کرنے کی کوشش کریں۔

(الف) مذہبی تصور | مادیت کا یہ طوفان سب سے بڑا خطرہ ہے جو اس وقت انسانیت کو پیش ہے۔ اسلام اس کا سخت ترین مخالف ہے۔ وہ انسان کو حیوان نہیں رکھنا چاہتا بلکہ حیوانیت کے درجہ سے بلند کرکے اعلیٰ روحانی منازل طے کرانا چاہتا ہے۔ خدا کا تصور انسانیت کی سب سے اعلیٰ قدر ہے اور اس کے تحت میں وہ تمام کائنات کی زندگی کو منظم کرنا چاہتا ہے ہم اس مسئلہ کی نوعیت پر اس وقت تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ اشارتاً ہم پہلے ہی اس کا ذکر کرچکے ہیں بہر صورت یہ یقین ہے کہ انسانیت کی پیاس صرف مادی چیزوں سے نہیں بجھ سکتی بلکہ اس کو داخلی روحانی تسکین کی ضرورت ہے جو صرف ایک سچے مذہب ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ مذہبی جذبہ یعنی تمام کائنات کو ایک واحد نظام میں مرتب کرنیکا جذبہ۔ اپنی زندگی کو ایک بامقصد اور باہم بنانیکا جذبہ۔ انسانی زندگی کو ابدی قرار دینے کا جذبہ انسان کی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر خدا کی پرستش بند کروائی جائیگی تو اس کی مخلوق " لینن" اور دیگر رہنماؤں کے بتوں کی پرستش شروع کردیگی۔

(ب) اخلاقی تصور | خدا کے تصور کا لازمی منطقی نتیجہ جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے عالمگیر انسانیت کا نصب العین ہے۔ اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی بھی اساس ہے۔ فطرت انسانی بد نہیں بلکہ نیک ہے۔ ماحول صرف اس کی فطرت کو خراب کردیتا ہے انسان بالطبع بد پیدا نہیں ہوا ہے اس لئے اپنی جدوجہد اور عمل کے ذریعہ وہ سربلند ہوسکتا ہے۔ انسانیت کے گناہوں کے لئے کسی کو کفارہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خدائی قوتوں کا مظہر ہے اس لئے اسلامی اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ خود کو خدائی قوتوں سے متصف کرے (لذتیت) Hedonism افادیت (Utilitarianism) وغیرہ کا اسلام مخالف ہے چونکہ وہ اخلاقی قدور کو مستقل بالذات تسلیم کرتا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان اسلام میں عیسائی کلیسا کی طرح کسی وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اخلاقی فرائض بلا واسطہ اس تعلق کے باعث پیدا ہوتے ہیں جو بندے کو

اس کے خالق سے ہے۔ اسلامی اخلاقی تعلیمات کا مقصد انفرادی ضمیر کا نشو و نما ہے لیکن یہ نشو و نما بغیر اجتماعی زندگی کے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اسلامی اخلاقی تعلیم اجتماعی بھی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں دراصل انفرادیت اور اجتماعیت کو باہم یکجا کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔ وہ نہ یکطرفہ انفرادیت کو پسند کرتا ہے اور نہ یکطرفہ اجتماعیت کو۔ جماعت کی اس وقت تک ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ افراد کی ترقی نہو۔ لیکن اگر افراد بغیر جماعتی بندشوں کے ترقی کرنا چاہیں تو اسکا نتیجہ صرف نزاع ہوتا ہے۔ اجتماعی ماحول کے بغیر انسان دراصل انسان ہی نہیں ہو سکتا۔ صحیح انفرادیت اور صحیح اجتماعیت باہم ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔

۹۔ اسلامی اجتماعیت کا اجتماعی تصور (الف) سیاسی تصور :۔ اسلام میں سیاست کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ انسانیت کے اخلاقی نصب العین کی پابند ہے۔ ریاستوں کو انسانیت کے نصب العین کو عملی جامہ پہنانیکی کوشش کرنی چاہیئے۔ میکاولی کے سیاسی تصور کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ سیاسی قوت حاصل کرنے کے لئے انسان ہر قسم کے جائز و ناجائز ذرائع استعمال نہیں کر سکتا۔ ریاست خود بالذات کوئی مقدس اور سب سے بلند ادارہ نہیں ہے جس طرح کہ ہیگل سمجھتا تھا یا آج کل کی فاسستی حکومتیں (جرمنی۔ اٹلی) سمجھتی ہیں۔ اسلام اقوام کی آزادی کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح کہ وہ افراد کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن یہ آزادی اخلاقی قوانین کے تابع ہے۔

سیاست کے اس نظریہ سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام شہنشاہیت کا مخالف ہے وہ ایک قوم کی دوسری قوم پر بغیر اس کی مرضی کے حکومت کبھی بھی تسلیم نہیں کرتا وہ جمہوریت کا قائل ہے۔ شہریوں کو اپنے امام کو منتخب کرنیکا حق حاصل ہے اور وہ امام اسی وقت تک حکومت کر سکتا ہے جب تک کہ وہ قرآن و سنت کا پابند ہو اور جمہور کی اکثریت اس کے خلاف نہو۔ قرآن میں دیگر احکامات کی طرح سیاسی احکامات بھی درج ہیں۔ اور یہ سیاسی احکامات مسلمانوں کے لئے سیاسی آئین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بین الاقوامی سیاست میں جدید حالات میں اسلام صرف ایک بین الاقوامی وفاق کا ہی

قائم ہو سکتا ہے۔ اقوامِ آزاد ہوں لیکن وہ انسانیت کی خدمت کے لئے باہم متحد ہوں اسلام کا سیاسی نصب العین تو دراصل تمام دنیا میں ایک عالمگیر حکومت کا قیام ہے لیکن جب تک انسانیت کا شعور عام نہ ہو جائے اس وقت تک صرف یہی درمیانی راہ ممکن ہو سکتی ہے۔

(ب) معاشی تصور | ایک خدا کے تصور ار انسانیت کے نصب العین کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں میں جہاں تک ہو سکے نہ صرف سیاسی حقوق میں بلکہ معاشی حقوق میں بھی مساوات ہو۔ دولت کی بالذات اسلام میں کوئی حیثیت نہیں ہے وہ صرف ایک ذریعہ ہے اپنی ذات اپنے خاندان اور انسانیت کی خدمت کا۔ حصول دولت پہ ضرورت سے زاید زور دینے سے سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ اشتراکی بھی جب انسان کی مادی ضروریات پہ بہت زائد زور دیتے ہیں اور "روٹی" کو انسانوں کا خدا بنا کر پیش کرتے ہیں تو وہ انسان کی نفسی و روحانی زندگی کی تحقیر کرتے ہیں۔ مادی ضروریات کا پورا ہونا بیشک نفسی زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن مادی ضروریات تو بالذات کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ صرف ایک ذریعہ ہیں۔ اور ذریعہ کو مقصد قرار دینا دماغ کے الجھاؤ کا بین ثبوت ہے۔ اسلام دراصل نہ عزبت کو پسند کرتا ہے اور نہ امارت کو۔ وہ مسیحی راہبوں یا ہندو جوگیوں کی طرح دولت سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا اور نہ وہ اہل مغرب کی طرح دولت کی پرستش کروانا چاہتا ہے۔ رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کا اسوۂ حسنہ اس معاملہ میں ہمارے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ وہ تجارت کرتے تھے۔ دولت جمع کرتے تھے لیکن اس کو صرف بھی اسی فراخدلی کے ساتھ کرتے تھے۔ ذاتی جدوجہد کو (Private initiative) معیشت میں اسلام نے ختم نہیں کر دیا ہے کیونکہ جماعت کی ترقی کا دراصل یہی موجب ہوتی ہے۔ مارکس کے خیالات کو جب لینن نے عملی جامہ پہنانا چاہا تو اسے بھی یہی کرنا پڑا۔ لیکن اس ذاتی جدوجہد کے لئے اجازت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ افرادِ جماعت کو لوٹیں بلکہ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ وہ خود بھی آرام سے زندگی گذاریں اور جماعت کے لئے بھی آرام کے وسائل مہیا کریں۔ اس بنا پر جب حد سے زائد دولت بڑھانا شروع کی جاتی ہے تو اسلام اس کو روک دیتا ہے۔ وہ طرح طرح کے ٹیکسوں کے

ذریعہ انفرادی دولت کو اس قدر بڑھنے نہیں دیتا کہ وہ جماعت کے لئے مضر ثابت ہوں۔ مثلاً وہ زکوٰۃ لازم کرتا ہے تاکہ اس پیسہ سے اور بہت سے کاموں کے علاوہ غریبوں کے لئے ایسے کام مہیا کئے جائیں تاکہ وہ اپنی روزی کما سکیں۔ ان تمام اقوام کا بیت المال میں جمع ہونا ضروری ہے تاکہ اجتماعی طور پر معاشی خرابیوں کا سدباب ہو سکے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی وجہ سودی کاروبار ہے۔ روپیہ کے ذریعہ روپیہ کمانا یہ وہ لعنت ہے جس میں انسانیت اس وقت کیا ہمیشہ سے مبتلا چلی آتی ہے۔ اہل زر اس کاروبار کے باعث کاہل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو اس طرح زائد محنت نہیں کرنا پڑتی۔ جب وہ محنت سے واقف نہیں ہوتے تو وہ انسانیت کے درد دکھ کا بھی پتہ نہیں چلا سکتے۔ انسانیت کی محبت کے لئے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ وہ صورتاً تو انسان دکھائی دیتے ہیں لیکن باطناً وہ خونخوار درندے ہوتے ہیں۔ مقروض انسان بےلبس ہو جاتا ہے، اس میں خود محنت و مشقت کا ولولہ باقی نہیں رہتا اور وہ بالآخر فنا ہو جاتا ہے۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیکر ان تمام برائیوں کا انسداد کر دیا ہے۔ جب سرمایہ ہی کسی انسان کے پاس جمع نہیں ہوگا تو پھر سرمایہ دارانہ نظام کیا؟

وراثت کے قوانین کے ذریعہ سے بھی اسلام نے دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکا ہے۔ دولت اس قدر حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دار کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔

زمین کو اسلام نے بعض مفسرین کی رائے کے مطابق قوم کی عام ملک تسلیم کیا ہے۔ اجارہ کی اس نے بیخ کنی کر دی ہے۔ مثلاً اس امید پر کہ غلّہ کی قیمت آئندہ زائد ہوگی کوئی شخص اپنے مکان میں غلّہ جمع نہیں کر سکتا حالانکہ لوگوں کو اس وقت غلّہ کی ضرورت ہے۔ اسلامی فقہ کے احکامات غور سے پڑھنے سے یہ باتیں واضح ہو سکتی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ صرف مارکس و لینن کے اقوال سند رکھتے ہیں امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام ایسا معاشی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جہاں ذاتی ملکیت کلیتاً تباہ تو نہ ہو لیکن سرمایہ داری بھی پیدا نہ ہو سکے۔ وہ معیشت میں انفرادیت (Individualism

اور اجتماعیت (Socialism) کی خوبیوں کو جمع کرنا چاہتا ہے۔ وہ انسانی اشتراکیت کے ذریعہ انسان کی عملی قوتوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا اور نہ انسانی انفرادیت کے ذریعہ اس کو حریص و طامع بنانا چاہتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی انفرادیت کو بھولنا نہیں چاہتا گو کہ وہ ایک اجتماعی نظام زندگی ہے۔ وہ ریاست کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ سماج کی بہبودی کے لئے افراد کی معاشی جدوجہد کی دیکھ بھال کرے اور بوقت ضرورت اس میں مداخلت بھی کرے اور اگر معاشی نظام نے اس وقت پیچیدگی اختیار کر لی ہے اور سرمایہ داری کی خرابیوں کا انسداد ہو نہیں سکتا جب تک کہ بڑی بڑی صنعتیں ریاست کے قبضہ میں نہ آجائیں تو اسے اس قسم کی کسی اصلاح سے عار نہیں ہے۔

اسلام کی تعلیمات جامد نہیں ہیں بلکہ نامی ہیں۔ اپنی روح اور اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے وہ زمانہ کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کا معاشی نظام دراصل عہد حاضر کی معاشی مشکلات کا حل ہے۔ "اجتہاد" کے ذریعہ اس وقت کے حالات کے لئے معاشی اصولوں کو فقہ اسلامی کی روشنی میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس اجتہاد سے ہر وقت کام لیا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس وقت تک امت اسلامیہ پر ایک جمود و تعطل طاری ہو گیا ہے وہ اسلام کی روح سے محض ناواقف ہو گئی ہے۔

۱۰۔ اسلامی اجتماعیت اور مادی اشتراکیت کا فرق اسلام کے اس تصور زندگی کو ہم جدید علمی اصطلاح میں اسلامی اجتماعیت کے نام سے تعبیر کریں گے۔ اشتراکیت اور اس میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اس کی بنیادیں روحانی ہیں۔ اسلامی اجتماعیت مادہ کو نہیں بلکہ روح کو اصل حقیقت سمجھتی ہے۔ اس فلسفہ میں بھی اصول تضاد کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ تضاد مادہ اور روح کا ہے، روح حقیقت کا اثباتی پہلو ہے اور مادہ اس کا منفی پہلو، روح بالآخر مادہ پر غالب آجاتی ہے۔ اور اس ترکیب کے باعث انسان اپنی ترقی کی ایک منزل اور طے کر لیتا ہے۔

دنیا میں دو متضاد جماعتوں کے تصادم کے باعث انقلابات ہوتے ہیں لیکن انقلاب کے اصل عوامل صرف مادی نہیں ہوتے۔ یہ عوامل اکثر نفسی و روحانی ہوتے ہیں۔ جب انسانی شعور

ترقی کرتا ہے۔ اسکا اخلاقی حس تیز ہو جاتا ہے۔ وہ ایک غیر محسوس مذہبی فریضہ محسوس کرنے لگتا ہے اس وقت وہ انقلاب پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور بغیر مادی مفاد کا خیال کئے ہوئے وہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام غربا انقلاب میں ایک طرف ہوں اور تمام امرا ایک طرف۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ غریبوں کے انقلاب کی راہ نمائی ایسے افراد نے کی ہے جو خود غریب خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے یہ کام صرف اس لئے کیا کہ انکا اخلاقی احساس بلند ہو گیا تھا۔

اسلامی اجتماعیت کی بنیاد انسانوں کے باہمی مقابلہ اور عداوت پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کی محبت اور تعاون پر مبنی ہے۔ وہ خونی انقلاب کے ذریعہ لوگوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا بلکہ تعلیم قانونی اصلاحات اور رائے عامہ کی تربیت کے ذریعہ انقلاب کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اگر یہ انقلاب پرامن ذرائع سے نہ ہو سکے تو وہ قوت کو بھی ایک حد تک استعمال کرنا جائز سمجھتی ہے۔ لیکن یہ قوت کا استعمال اسی وقت جائز ہے جب وہ انسانیت کی محبت کی خاطر کی جائے اور اس سے ایک ایسی جماعت کا قیام مقصود ہو جس میں ظلم و تشدد نہ پایا جائے۔ اسکی مثال ایسی ہے جس طرح کہ مرض کی خطرناک صورت میں ڈاکٹر آپریشن کو جائز قرار دیتا ہے حالانکہ گاندھی جی اور (Pacifism) کی طرح یہ عدم تشدد کو اعتقاداً تسلیم نہیں کر سکتی یعنی یہ کہ تشدد کا استعمال بہر حال و بہر صورت قابل ملامت ہے۔

اسکا نعرہ جنگ یہ نہیں ہے کہ " دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ " بلکہ یہ ہے کہ " زمین پر بسنے والے انسانو متحد ہو جاؤ "۔ ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں کی تعلیمات ان خیالات سے سب سے قریب تر ہیں اس لئے وہ پہلے مسلمانوں کو باہم ان مقاصد کے لئے متحد کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ دوسری قوموں کے لئے نمونہ کا کام دیں۔ دوسرے لوگ بھی اگر وہ ان مقاصد سے متفق ہیں تو اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

۷۔ اسلامک سوشلسٹ پارٹی (Islamic Socialist Party) یہ ہے
غرضکہ وہ عظیم الشان کام جسے ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام دینا ہے اس طرح نہ صرف وہ
اپنے میں زندگی پیدا کر سکتے ہیں بلکہ انکا وجود ہندوستان ۔ عالم اسلام اور تمام دنیا کے لئے مبارک
ثابت ہو سکتا ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں میں کون ہے جو اس مقدس فریضہ کو ادا کرے؟
جمعیۃ العلماء ہند کی مذہبی اور ملکی خدمات قابل قدر ہیں ۔ لیکن جمعیۃ صرف علما کے طبقہ کی جماعت
ہے وہ عوام کی نمائندہ جماعت نہیں ہے اور یہ کام تو صرف جمہور اسلام کے نمائندے ہی انجام
دے سکتے ہیں۔

مجلس احرار کی سرفروشیوں سے انکار نہیں ہے لیکن کچھ دنوں سے انکا آفتاب
غبار آلود مطلع میں چھپ گیا ہے ۔ اور پھر یہ مجلس تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعت بھی نہیں
کہلائی جا سکتی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے کچھ دنوں سے کروٹ بدلی ہے ۔ اس کا آئین بھی اب جمہوری
کر دیا گیا ہے لیکن اس پر ابتک سرمایہ داروں کا قبضہ ہے کانگریس کی نقالی کے طور پر تو اس نے
ملک کی مکمل آزادی اور معاشی پروگرام کو تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ صرف نقل ہی نقل ہے ۔ اصل کا
پتہ تک نہیں ہے ۔ ابھی تک اس پر خان بہادروں ۔ سروں ۔ نوابوں ۔ اور راجاؤں کا قبضہ ہے
جو اس کی مسلمہ عوام کی جماعت بننے کی راہ میں حائل ہیں۔

خدائی خدمت گاروں کی جماعت ایک نہایت بہادر اور باعمل جماعت ہے لیکن اس کا اثر و
اقتدار بہر صورت صرف ایک صوبہ تک محدود ہے ۔

مسلمانان ہند میں ویسے ہی کیا کم نفاق اور جماعت بندی ہے کہ ایک نئی جماعت کے قیام
کا خیال پیش کیا جائے ۔ برسات کے کیڑوں کی طرح جماعتیں ابھر رہی ہیں اور بگڑ رہی ہیں خصوصاً
سرزمین پنجاب تو اس معاملہ میں بہت زرخیز ہے ۔ نئی نئی جماعات کا قیام در اصل ہماری بربادی
کا پیش خیمہ ہے بلکہ اب یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ان تمام جماعتوں کو ختم کر دیا جائے اور مسلمانان

ہند کی دراصل ایک ہی جماعت ہو جو اصل اسلامی تعلیم کی جس کے لئے ہم نے جدید علمی اصطلاح "اسلامی اجتماعیت" وضع کی ہے حامل ہو۔ جو کوئی جماعت اس تعلیمات کو قبول کرے۔ اس کو علمی جامہ پہنانے اور اس کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کرنے اور قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے ہم سب کو اس میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ وہی مسلمانان ہند کی واحد جمعیت ہو اور اسی کو اسلامی اصولوں کے تحت میں اجتہاد کا حق ہو۔

ایسی اسلامی جمعیۃ کا قیام اسلامی ممالک میں بہت آسان ہوتا اور وہ جماعت بالآخر حکومت پر قبضہ کر کے اس کے ذریعہ اپنے اصولوں کو علمی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی۔ ہندوستان میں چونکہ ایک دوسری قوم بھی آباد ہے اس لئے اس قسم کی ایک جماعت کا قیام بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔

۱۲۔ اس پارٹی کا پروگرام اور ملک کی دیگر جماعتیں | اس جماعت کا دوگونہ پروگرام ہوگا۔ اولاً اخلاقی اور مذہبی جو اس جماعت کے صرف مسلم اراکین کے لئے مخصوص ہوگا۔ دوم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاسی اور معاشی پروگرام۔ اس پروگرام سے جو غیر مسلم متفق ہوں گے وہ بھی اس جماعت میں شریک ہو سکیں گے۔ مختصراً جمعیۃ کے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ روحانیت کی بنیادوں پر ایک نظام زندگی کا قیام

۲۔ انسانیت کے نصب العین کو علمی جامہ پہنانا

۳۔ ہندوستان کی مکمل آزادی

۴۔ ایک ایسے معاشی نظام کا قیام جس میں سرمایہ داری کا تو خاتمہ کر دیا جائے مگر انفرادی جدوجہد کا خاتمہ نہ کیا جائے۔

ان اصولوں کے لئے تفصیلی پروگرام جمعیۃ خود مرتب کریگی۔ اول الذکر دو مقاصد صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوں گے اور موخر الذکر مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے۔

اس جمعیۃ کا اپنا ایک آزاد اور مستقل وجود ہونا چاہئیے لیکن ملک کے دیگر سیاسی ادارے

مثلاً اگر کانگریس انکو شرکت کی اجازت دے تو ان کو فوراً اس میں شریک ہو کر اپنے مقاصد کو وہاں بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس طرح کہ آج کل کانگریس سوشلسٹ پارٹی کر رہی ہے لیکن اس جمعیتہ کو بہر صورت اپنے نظام کا پابند ہونا چاہیئے۔ اس طرح پر جمعیتہ مندرجہ ذیل مقاصد پورے کر سکے گی۔

۱۔ یہ مسلمانوں اور دیگر تمام اقلیتوں کے حقوق (مذہبی سیاسی و تمدنی) کی محافظ ہوگی

۲۔ یہ ملک کی آزادی کامل کی طرف رہنمائی کرے گی۔

۳۔ یہ ایک معاشی اجتماعی نظام کو قائم کرنے کی کوشش کریگی۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی کی موجودگی میں ایک غالب اسلامی جمعیتہ کے قیام کی کیوں ضرورت ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ کانگریس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ اقلیت کو اپنی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ جماعت کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ ہندوستان بالخصوص نہایت ہی متعصب ملک ہے یہاں اقلیتوں کی قسمت کو غیروں کے رحم و کرم پر چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دوم مسلمان واقعتاً ملک کی مکمل آزادی چاہتے ہیں۔ اگر ہندو انگریزوں کے ساتھ ملکر ڈومینین اسٹیٹس پر صلح کرلیں تو ہم ملک کی آزادی کے لئے اور آگے جدوجہد کر سکیں۔

سوم کانگریس پر اب تک سرمایہ داروں کا بہت اثر ہے۔ پنجاب اور بنگال میں اب تک وہ ساہوکاروں۔ بنیوں اور زمینداروں کا ساتھ دیتی ہے۔ ہم واقعتاً ایک اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں چونکہ سب سے زیادہ قلاش مسلمان ہی ہیں اور ویسے بھی ہمارا اسلامی فریضہ ہے کہ سب سے زیادہ غریبوں کی خدمت کریں۔ سوشلسٹ پارٹی سے بھی ہمیں پورا اتفاق نہیں ہے۔ اولاً تو وہ مادئین اور ملاحدہ کی ایک جماعت ہے۔ اور مادیت ہمارے بنیادی نفسی خصوصیتوں کے خلاف ہے ہمیں ڈر ہے کہ اس وقت تو وہ مذہبی (بے عملی) کا وعظ کرتے ہیں لیکن جب انکا پورا قبضہ ہو جائیگا تو یہ مذہب اور آزادی ضمیر پر ویسی ہی پابندیاں عائد کریں گے جس طرح کہ روس میں آج کل ہیں۔

دوم اُن کے معاشی حل سے ہمیں کلی اتفاق نہیں ہے۔ وہ مقابلہ چاہتے ہیں ہم تعاون

وہ ذاتی ملک کو بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں ہم صرف سرمایہ داری کو۔ بہرصورت ہماری جمعیۃ کسی کی خواہ مخواہ مخالفت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ ان جماعتوں کے سیاسی اور معاشی پروگرام کا اس حد تک ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہے جہاں تک اس کے بنیادی اصول اور اسکا سیاسی اور معاشی پروگرام اس کو اجازت دیتا ہے۔

اس جمعیۃ میں غالب اکثریت چونکہ مسلمانوں کی ہوگی اس لئے وہ ہندوستان کے ان صوبوں پر تو قبضہ کرلے گی جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً بنگال۔ پنجاب۔ سندھ صوبہ سرحد اور بلوچستان۔ البتہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے مثلاً بمبئی۔ مدراس۔ سی پی۔ بہار۔ ممالک متحدہ۔ آسام وغیرہ میں اس کو دقت پیش آئے گی۔ لیکن اس جماعت کی اصل کامیابی دراصل مسلمانوں کی قلت یا کثرت پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان تعلیمات کی سچائی پر ہے جو یہ جماعت پیش کر رہی ہے۔ وہ تعلیمات کس حد تک عہد جدید کی تمدنی مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں اور کس حد تک ایک سرفروش جماعت اس کے لئے ایثار و قربانی سے کامیابی کا راستہ مہیا کرتی ہے۔ اگر یہ ضروری اسباب میسر آگئے تو غیر اسلامی صوبوں میں بھی یہ جماعت کامیاب ہو کر رہیگی۔

۱۴۔ تحریک پاکستان اور اسکی غلطی | بعض حضرات کہتے ہیں کہ کیوں نہ شمالی ہند ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے تاکہ وہاں صحیح اسلامی تہذیب و تمدن کی نشوونما ہوسکے اور اسلامی سیاسی و معاشی نظام قائم کیا جاسکے۔ مثلاً پاکستان کی تحریک کے حامل یہ خیال پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ خیال دراصل خوف پر مبنی ہے۔ ہمیں اکثریت سے خائف نہ ہونا چاہیے ہم کو ان سے علیحدگی نہ اختیار کرنی چاہیے بلکہ .. ان کے ساتھ مل کر زندگی گذارنی چاہیئے تاکہ ہم اپنی زندگی اور اپنی تعلیمات سے ان کو متاثر کرسکیں۔ اگر خود ہم میں زندگی ہے تو ہم تمام دنیا کو اس رنگ میں رنگ سکتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی تاریخی روایات کو بہرحال اس قدر جلد فراموش نہ کر دینا چاہیئے۔ چند لاکھ مسلمانوں نے ہندوستان کی تاریخ کی کایا پلٹ دی لیکن اس وقت ہم آٹھ کروڑ ہونے کے باوجود بھی بے دست و پا ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ علیحدگی سے قوم زندہ نہیں ہوسکتی بلکہ صرف مقابلہ اور جدوجہد سے۔

۱۴۔ مسلمانانِ ہند کی غلامی اور اس سے نجات کا واحد طریقہ

اسلامی حکومت کے تباہ ہونے کے بعد مسلمانانِ ہند نہ صرف سیاسی و معاشی غلامی میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ وہ بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہو گئے ہیں انگریزوں کی ریاست کے ساتھ وہ انگریزوں کے تمدن اور علم و فن کو سب سے اعلیٰ سمجھنے لگے چنانچہ انھوں نے انکی ذہنی غلامی شروع کر دی۔ اب ہندوؤں کا اقتدار ہو رہا ہے تو وہ ان سے مرعوب ہو رہے ہیں اور بھارت ورش کے دیوتاؤں کی پرستش شروع کرنا چاہتے ہیں۔ کل ان کا خیال ہو کہ شاید اشتراکیین قابض ہو جائیں اس لئے وہ اندھا دھند اس تحریک کے پیچھے بھی دوڑنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ غرضکہ ان میں کوئی بھی نفسی توازن باقی نہیں ہے۔ ہر چیز وہ غیروں کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اپنی چیز سے وہ ناواقف محض ہیں اگر کسی قدر سطحی طور پر واقف بھی ہیں تو اس کو حقیر سمجھتے ہیں علما کا زائد وقت . . . . . چند قابلِ قدر ہستیوں کو چھوڑ کر صرف مسح و وضو کے مسائل بیان کرنے ہی میں صرف ہوتا ہے۔ ایک پر قدامت پرستی چھائی ہوئی ہے تو دوسرے پر جدید مغرب پرستی کا بھوت سوار ہے۔ یہ بھوت چاہے وطن پرستی کی صورت میں نمودار ہو یا اشتراکیت کی صورت میں۔ اسلام کی تعلیمات ' اسکی روح ' اور جدید مسائل کے لئے اس کے بیش بہا حل سے کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے جو انفرادیت اور اشتراکیت کی خطرناک صورتوں کے درمیان انسانیت کے لئے ایک موزوں راہ بتلاتا ہے۔ یہ مشرق کے ترکِ دنیا کے فلسفہ اور مغرب کے دنیاداری کے فلسفہ کے درمیان ایک صراطِ مستقیم ہے جس میں انسان کی سعادت مضمر ہے۔

خود مسلمانوں کی زندگی کے باعث بھی دراصل یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اصلی اسلامی تعلیم کے عامل مسلمانوں میں بہت کم ہیں۔ قارون کی طرح مسلمانوں نے بھی دولت و حشمت کے ڈھیر جمع کر رکھے ہیں۔ فرعون کی طرح ان میں بھی ظلم ، استبداد اور شہنشاہیت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ مخلوقِ خدا ٹکڑے ٹکڑے کو ترس رہی ہے۔ انسانیت ظلم و جور کی چکی میں پسی جا رہی ہے۔ ان کے علما صحیح خدا ترسی کی بجائے اپنی شکم پری کی فکر میں منہمک ہیں ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو سوائے عیش و آرام

کے کسی دوسری چیز کی فکر نہیں ہے۔ عوام کو تو چھوڑیئے بچارے غریب مفلس - نہ دین سے واقف نہ دنیا سے۔ روحانیت اور اخلاق کے مدعی لوگ انکے پیٹ میں روٹی کا ٹکڑا بھی نہ ڈالیں اور رزاق العالمین کی درگاہ میں ہر وقت سربسجود ہونیوالے سلمان اگر انکی بے بسی پر ترس بھی نہ کھائیں تو بھلا وہ کس طرح رزاق العالمین اور ایک روحانی اخلاقی نظام پر یقین کریں۔ مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو صرف اسلامی تعلیمات روک سکتی ہیں اور یہ بھی صرف صحیح اسلامی تعلیمات۔ روحانی بنیادوں پر جدید سیاسی و معاشی مسائل کا حل صرف اسلام پیش کر سکتا ہے لیکن مسلمان تو قرانی تعلیمات کے چند حصوں کو تسلیم کرتے ہیں اور ان حصوں کو جن سے انکی جیب پر ضرب پڑتی ہے ترک کر دیتے ہیں۔ اگر مسلمان واقعتاً اپنی ہندوستان کی اور تمام عالم کی نجات چاہتے ہیں تو ان کو مکمل اسلامی تعلیم کے نظام کو لیکر آگے بڑھانا چاہیئے۔ اس تعلیم کے لئے ان کو قربانی کرنا چاہیئے۔ انفعال پذیری کو چھوڑ کر انکو خود اب اپنی تعلیمات اور عمل سے دنیا کی رفتار پر اثر ڈالنا چاہیئے۔ جو دوسروں پر اثر نہیں ڈالتا اس پر دنیا خود اپنا اثر ڈالتی ہے۔ جو دنیا کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتا دنیا اس کو خود اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔

اس دنیا میں کسی چیز کو بھی سکون حاصل نہیں ہے۔ انسان آگے بڑھتا ہے یا پیچھے ہٹتا ہے اگر مسلمانان ہند آگے بڑھیں گے تو نئی زندگی کی راہیں (اپنی تمام رنگینیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ) انکے لئے کھلی ہوئی ہیں۔

لیکن وہ اگر ساکن رہیں گے تو ان کے لئے مہیب و غضب ناک موت منہ کھولے کھڑی ہے یہ اب انہیں طے کرنا ہے۔ وہ زندگی چاہتے ہیں یا موت ؟

جگر پارے

(حضرت جگر مراد آبادی)

اسی چمن میں ہمارا بھی اک زمانا تھا
یہیں کہیں کوئی سادہ سا آشیانہ تھا

الٰہی توبہ! میں اس جذبِ دل سے باز آیا
کہ آج اُس کا ہر انداز والہانہ تھا

شباب و عشق کا اپنا بھی اک زمانا تھا
خبر نہیں کہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا

تھیں گذر گئے دامن بچا کے ورنہ یہاں
وہی شباب، وہی دل، وہی زمانہ تھا

چمن، چمن تھا میری چشم شوق میں جبتک
شرار و برق کے سائے میں آشیانہ تھا

کہاں کے حسن و محبت، کہاں کی مہر و وفا
بس ایک سحر جوانی تھا اور زمانا تھا

مٹا مٹا سہی ظالم۔ وہ دل تھا میرا دل
بجھا بجھا سہی پھر بھی چراغ خانہ تھا

خوشا وہ دور کہ جب عشق ہی زمانا تھا
نہ دشت دور تھے نہ گلشن نہ آشیانہ تھا

کہاں کا واقعہ، بس اتنا یاد ہے اب تک
نگاہ مل کے مٹی تھی کہ دل نشانہ تھا

نظر نے اور کیا کیا حصول غم کے سوا
کہ ربطِ خاص محبت تو غائبانہ تھا

تری قسم، ارے او جلد روٹھنے والے
غرور عشق نہ تھا نازِ عاشقانہ تھا

رُلا دیا ہمیں تو نے، تو رنج کیا لیکن
ہمیں بھی تیری محبت کو بھول جانا تھا

سمندِ عشق کہاں، سیرگاہِ شوق کہاں
کہ ہر نفس رہِ منزل میں تازیانہ تھا

اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات پر ایک نظر

(جناب احمد علی صاحب علوی متعلم جامعہ)

لوگ کہتے تو یوں ہیں کہ اردو زبان کی ابتدا حضرت امیر خسروؒ سے ہوئی، پر وہ زبان اور تھی۔ اصلی بات یہ ہے کہ اُردو نام کی زبان اس کے بہت دنوں بعد مغلیہ شہنشاہی کے شروع میں پیدا ہوئی۔ دکن میں قطب شاہی خاندان نے شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت نے اور اودھ میں نوابوں نے اس کو گودوں میں کھلاکر پروان چڑھایا۔

شروع شروع میں دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو بھی صرف بات چیت کرنے اور اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے ہی تھی مگر تھوڑے دنوں کے بعد ہی صوفیوں نے تصوف کے رسالوں اور نصیحتوں کے خزانوں سے اسے مالا مال کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ عربی اور فارسی کے لفظ برج بھاشا میں سموئے۔ اب کیا تھا شاعروں نے بھی اسے اپنانا شروع کر دیا۔

ولی، خان آرزو، شاہ مبارک، میر و سودا اور پھر حضرت خانخاناں نے سدا بہار پھولوں کے تختے لگائے۔ اب اردو علمی اور ادبی زبان بننے لگی۔ دفتری زبان فارسی ہونے کے باوجود عام ہندوستانی قوموں نے تحریر و تقریر کا ذریعہ اسے ہی بنایا۔

۱۸۰۰ء میں انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قایم کیا اور اردو زبان و قواعد کی ترتیب و تدوین شروع ہوئی۔ اس زمانے میں بہت سے ناول، قصے اور کہانیاں لکھی گئیں۔ فلسفہ اور اخلاق کی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ اس کالج کا قیام تو اس لئے ہوا تھا کہ افتراق و اختلاف کا بیج بوئے اور ہندوستانی جماعتوں میں تفرقہ پیدا کرے اور اس میں کامیابی بھی ہوئی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ ہندو اور مسلمان جہاں مشترک تہذیب و تمدن میں الگ الگ رستہ پر لگ گئے وہاں قومیت کا احساس بھی شروع ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا ہو چلا جس نے

آخر میں غدر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی۔

اُردو ادب میں سیاسی رجحان کی ابتدا ۱۸۲۲ء میں شروع ہوئی جبکہ سب سے پہلا اُردو اخبار عالم وجود میں آیا۔ اور اس زمانے سے اُردو ادب میں ہمارے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی حالات پر بحث و نظر شروع ہو گئی۔

۱۸۵۷ء تک اخبارات میں اور بعض دوسری کتابوں میں بھی سیاسیات اور معاملات خارجہ پر کافی تنقید کی گئی جیسا کہ آگے کی تحریروں میں ملے گا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً خاموشی اختیار کر لی گئی اور اگر کبھی کچھ لکھا جاتا تو بہت نرمی کے ساتھ بلکہ یوں کہئے کہ خوشامد اور چاپلوسی کے لہجے میں اظہار خیالات کیا جاتا۔

اردو ادب کے ۲ دور کئے جا سکتے ہیں

۱۔ برطانوی سامراج سے قبل سامنتی سامراج کا دور

۲۔ برطانوی سامراج یا صنعتی سامراج کا دور

شاید آپ کہیں کہ سیاسی اور معاشی زندگی کے ان ادوار سے ادب اور خاص کر اردو ادب کو کیا تعلق؟ اس لئے آیئے ہم اور آپ ادب کے نظریے پر تھوڑی سی باتیں کر لیں تاکہ ایک دوسرے کا نقطۂ خیال سمجھ سکیں اور پھر اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات کا ذکر کیا جائے۔

"ادب انسانیت کا نقاد ہے، وہ انسانیت کی بلندی و پستی کا ظاہر کرنے والا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب و عریاں کرنے والا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان کی حیات چند روزہ کو دائم و قائم بنا دے اور اس کی بے کلی اور تڑپ اس لئے ہوتی ہے کہ وہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں بلکہ دراصل حالات اور ماحول اس کے غلام و بندے ہیں۔ وہ آدمی کو یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند، دورِ جدید کا رہنما اور قدامت شکن ہے۔" (میکسم گورکی)

ہمارے ایک نوجوان ادیب نے کہا ہے۔

"ادب ماضی، حال اور مستقبل میں تعلق پیدا کرتا ہے رنگ و نسل، ملک اور قوم کا رشتہ توڑ کر انسانی وحدت کا سبق دیتا ہے"

ایک یونانی فلاسفر نے ادیب اور ادب کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے۔

"......... ادیب اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یعنی ادب جذبات کی اصلی مصوری کرتا ہے"

مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں ادب کیا ہے اور اسے ہماری زندگی کا رفیق اور ساتھی بننا چاہیئے یا نہیں؟ ادب کیونکر بنا؟ کے سوالات قائم کر کے غور کیجئے۔ مانا کہ یہ سوالات فرسودہ اور پرانے سہی مگر صرف یہ خیال کرتے ہوئے کہ آجتک جتنے جوابات دئے گئے وہ مکمل نہیں ہیں اور اس بنا پر ضرورت ہے کہ ہم اور آپ اور ہر اُردو ادب سے ذوق رکھنے والا اپنی کوشش اور اپنی بساط کے موافق ان کے حل کی تلاش کرے اور انھیں مکمل بنانے کی جرارت کرے۔ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسکی قسمت ہی میں یہ کامیابی اور خوش نصیبی لکھی گئی ہو یعنی یہ منصب تکمیل اسے ہی ودیعت کیا گیا ہو۔

ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق ادب دراصل سماج کے وسیع اور بلند درخت کی ایک شاخ ہے چنانچہ اسی لئے سماج کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ سوچے اور اپنی رائے کا اظہار بھی کر دے تاکہ آئندہ غور کرنے والے، سوچ بچار کر کے راستہ تلاش کرنے والے اس کی روشنی، چمک اور ہدایت سے بہرہ مند اور فیضیاب ہو سکیں۔

موجودہ دور میں ہماری سماجی کشمکش اور افکار اتنی ترقی پکڑ چکے ہیں، اور کرۂ ارض کا ہر آباد و معمور حصہ اس معاشی زمانے اور ابتلا کے اس دور سے گذر رہا ہے جو آج تک ہماری اس اجڑی دنیا، تباہ حال و پریشان خیال دنیا میں نہ آیا تھا۔ بنا بریں آج ہی ہمکو اسکی اشد ترین ضرورت ہے کہ ہم غور کریں، سوچیں اور فکر کریں کہ ابتک ہمارے اسلاف نے کیا کیا اور اب اخلاف کو کیا کرنا چاہیئے کہ اس عالم حیرانی و سرگردانی سے ہٹ کر سکون، اطمینان اور فارغ البالی کی جنت تک پہنچ سکیں؛

لہٰذا ہم کو گذشتہ زمانے کے ادیبوں اور سوچنے والوں کے کارنامے پورے غور و فکر کے ساتھ جانچنے چاہئیں انکے کاموں کی پڑتال کرنی چاہیئے، انکے افکار و آرا کا تجزیہ کرنا چاہیئے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو اور ہم یہ سمجھ سکیں کہ ہمارے پیشروں پر حالات اور ماحول کی فضا نے کیا اثر ڈالا تھے اور ہم اس سے کیا کیا نتائج نکال سکتے ہیں اور کون کون سے فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے بلکہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ یہ طے کر لینا چاہیئے کہ ہر دور کا لٹریچر حقیقتاً اس دور و فضا کی اقتصادی اور معاشی ترقی و تنزل کا ایک آئینہ ہوتا ہے اس زمانے کے خد و خال کا بالکل ٹھیک ٹھیک عکس اور چربہ، یعنی صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں یوں کہا جائے۔

"زندگی اور ادب ایک دوسرے کا آئینہ ہیں"

اس سے قبل ایک یونانی فلاسفر کا قول نقل کیا گیا ہے کہ "ادب جذبات کی اصلی مصوری کا نام ہے" اب اگر اس خیال کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ بہت صاف، روشن اور واضح ہے۔

جذبہ دراصل گرد و پیش کے ماحول ہی سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے جذبات ہمارے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے، پیدا ہوتے، اور مٹتے رہتے ہیں۔ غمناک مناظر ہمیں آنسو بہانے پر مجبور کرتے ہیں خوشی کا ماحول اور اسکی فرحتیں ہمیں ہنسا کر ہی چھوڑتی ہیں۔ یعنی حالات کی تبدیلی۔ مناظر کی الٹ پلٹ ہماری خوشی، مسرت اور ہنسی، رونے، منہ بنانے اور افسردگی کے اصلی اسباب اور حقیقی وجوہ ہیں۔ اس کی ایک مثال ایک نوجوان ہندوستانی ادیب کی زبانی سنئے۔

"موت اور بھوک کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ ایک کیلئے قدرت، دوسرے کے لئے سماج ذمہ دار ہے اگر یہ دونوں مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت (افسردگی) کم ہو جائے گی اور فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اُسے رنج دیا کریں گی"

ہم نے اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ادب کے متعلق مندرجہ بالاخیالات صرف اس لئے نہیں پیش کئے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہمارا موضوع بحث مختصر ہو جائے بلکہ جب ہم نے اس نظریہ کے مطابق اپنے ادب کا جائزہ لیا تو ہمیں بڑا دکھ ہوا کیونکہ ہمارے ادب میں حقیقی سیاسی رجحانات کی تحریریں بہت کم ملتی ہیں۔ اخبارات اور رسائل (صرف موجودہ دور کے) کے علاوہ بہت کم کتابیں ایسی ملیں گی جن میں ہمارے مصنفین نے حالات کی تصویر اصل کے مطابق کھینچی ہو اور آئندہ زندگی کی کوئی خیالی تصویر بھی پیش کی ہو۔ بہرحال جو مل سکا اُسے پیش نظر رکھکر آئندہ سطور میں اظہار خیال کیا ہے اور مثال کے طور بعض تحریریں بھی زیب قرطاس کی ہیں۔

ہمارا گذشتہ ادب کیا تھا اگر اس پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف دو طبقے اس کے مالک تھے ایک تو صوفیا رعلمار دوسرے امرا ورؤسار۔ ظاہر ہے کہ ان کو سماج اور جنتا کی روزمرہ کی زندگی سے نہ تو تعلق تھا اور نہ انکو اس کی ضرورت ہی تھی۔ اس لئے آپ اپنے گذشتہ شعرا ادبا کے کارنامے پڑھ کر یہ محسوس کریں گے اور آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اُردو کے گذشتہ ادب میں رنج و الم اور منافقت کا حصہ بہت وافر ہے۔ میرامن کی باغ و بہار مرزا سرور کی فسانہ عجائب، سودا کی ہجو اور قصائد۔ میر تقی میر کی غزلیں اور مثنویاں رنج والم کی داستانیں، منافقت کی کہانیاں، اور جنوں بھوتوں یا پریوں کے قصے ہیں نہ کہ اصلی زندگی کی تفسیر و تشریح۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بہت کم ہے اور تقریباً بیکار ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　میر دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

یہ شعر بڑے دردناک ہیں۔ انکی زبان اور بندش بہت خوب ہے۔ مگر یہ تو بتائیے کہ آخر اس رونے سے حاصل کیا اور اس قنوطیت کا مدعا کیا ہے!

سودا کا شہر آشوب، گھوڑے کی ہجو، فنی حیثیت سے کتنی ہی کامل سہی پر یہ تو بتائیے کہ اسے زندگی کی دشواریوں سے کیا تعلق، زندگی کے مصائب کا اس میں کون سا حل ہے کیا رونا

پیٹنے اور واویلا کرنے سے زندگی سدھر جاتی ہے؟
بھوتوں، دیوؤں، عفریتوں اور پریوں کی داستانیں آخر ہمیں عمل کا کونسا سبق دیتی ہیں۔
اُردو ادب میں تین بہت بڑی اور خطرناک خرابیاں آپ کو نظر آئیں گی۔

(۱) موضوعات بہت پرانے، کہنہ فرسودہ اور محدود ہیں۔
(۲) معانی و مقاصد کو لطف بیان اور زیب داستان پر قربان کردیا گیا ہے۔
(۳) ادب پیشہ تھا۔

یہ کیوں ہوا؟ سبب وہی ہے جو اوپر بتلایا گیا کہ امرا و صوفی علم و فن کے واحد ٹھیکیدار تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ پڑھ ڈالئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ سوائے چند شاعروں اور نثر نویسوں کے سب کے سب نثار اور شاعر امرا تھے یا ان کے دست نگر۔ اس لئے ان کے یہاں خوشامد، چاپلوسی اور بڑھی نظر آتی ہے یا اپنے مصائب کا رونا تاکہ پیسے ملجائیں۔ جو ادیب صوفیوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ سماج اور زندگی سے بیزار یا بالفاظ دیگر فانی دنیا سے غیر متعلق ہوکر دنیائے ابدی کی سیر میں مصروف۔ اس لئے ان کے یہاں بھی ماحول کی تصویر کشی سے معذوری ملے گی۔ اب ظاہر ہے کہ جب وہ ماحول کی مصوری نہ کرسکے تو بھلا مصائب کا حل کیا پیش کرتے۔

۱۸۲۷ء سے اردو ادب میں سیاسی رجحانات کی ابتدا ہوئی ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا تھا تو مضائب کا ایک اور پہاڑ آپڑا جس سے وہ پھوڑا جو پک رہا تھا پھوٹ گیا مگر ظالم فصّاد نے پٹی اتنی کس دی کہ خون کا باہر نکلنا محال ہوگیا۔ اخبارات پر پابندی عائد کردی گئی۔
بیچارے بہادر شاہ ظفر پکڑ کر رنگون بھیج دیئے گئے۔ ساتھیوں اور غلاموں نے اُف نہ کی اور کرتے تو کس طرح توپوں کے دہانے اور پھانسی کے پھندے سامنے تھے۔ لوگوں کے دل پر کیا گذر رہی تھی اس کا اندازہ آپ ایک جلے ہوئے دل کی آہ یا ٹوٹے ہوئے تاروں کے اس نغمے سے کرسکیں گے۔

نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا کوئی میرا سنکے کریگا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

میں رہوں کہاں میں بسوں کہاں نہ یہ مجھسے خوش نہ وہ مجھسے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں

مرا رنگ وروپ بگڑ گیا، مرا بخت مجھسے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا، میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

اس زمانے (۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۰ء) میں اخبارات کے علاوہ دوسری کتابوں میں بہت کم کیا بلکہ تقریباً سیاسی تحریریں ملتی ہی نہیں اس لئے مجبوراً بعض اخبارات سے ہی چند تحریریں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے مارچ میں یعنی غدر سے قبل یہ خبر شائع ہوئی ہے

"اعلان شاہ ایران کی کئی کاپیاں گلیوں اور سڑکوں کے نکڑ پر چسپاں ہیں اس اعلان کی ایک نقل ہمارے ایک معزز دوست نے کرلی ہے جو جامع مسجد کی پشت پر چسپاں ہے .... مختصراً اس کا حاصل یہ ہے کہ :-

"جو لوگ مذہب حق کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ عیسائیوں کی مدد نہ کریں .... اور ہم مسلمانوں کی مدد کریں وہ وقت قریب آرہا ہے کہ ما بدولت (شاہ ایران) تختِ ہند پر متمکن ہوں گے اور رعایا کو اتنا ہی خوشحال بنادیں گے جتنا کہ انگریزوں نے مفلوک الحال بنا دیا ہے اور ہم کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کریں گے"

اڈیٹر نے اس خبر پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے :-

"ہندوستانی تو صرف اس وقت خوش ہوں گے جبکہ شاہ ایران شاہ عباس صفی کی طرح ہمارے خاص بادشاہ کو سلطنت دیدیں اور تعجب نہیں جو وہ ایسا کریں کیونکہ خود تیمور نے ایرانیوں کو سلطنت بخشی تھی اور نظرِ غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی احسان کے بدلے شاہ عباس صفی نے ہمارے ہمایوں کی مدد کی تھی"

صادق الاخبار ۱۹ مارچ ۱۸۵۷ء

مندرجہ بالا خبر اور نوٹ سے یہ صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی عام آبادی کے جذبات

کیا تھے اور ان میں کس حد تک سیاسی شعور پیدا ہو چلا تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد ایک اخبار میں شائع ہوا ہے:۔

"امیر نے یہ سن کر کہا کہ جب گورنمنٹ (ہند) پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو وہ لوگ لاکھوں پونڈ صرف کر دیتے ہیں اور اب جبکہ ایرانی، روسیوں کی تحریک پر افغانستان پر چڑھائی کر رہے اور محض گورنمنٹ ہند کو دق کرنے کی نیت رکھتے ہیں تو گورنر جنرل نے ......
...... امیر (افغانستان) کے عہد و پیمان پر غور کیا ہے کہ وہ قائم رکھنے کے قابل ہے یا نہیں۔"

غدر ۱۸۵۷ء تک اردو پریس نے کافی تنقیدیں کی ہیں سیاسی خبریں شائع کی ہیں اور سیاسی و معاشی معاملات پر بھی رائے زنی کی ہے مگر جب ان باتوں کی روک تھام کے لئے پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا تو ان کا لب و لہجہ بدل گیا اور اب ان کا موضوعِ سخن اشاعت علوم مغربی، تعلیم کی خوبیاں بیان کرنا۔ سرکار بہادر کے فضل و احسان کی تسبیح پڑھنا رہ گیا تھا۔ اور اس سے جو فرصت ملتی تو امراء و نوابین کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے۔ انکی سات پشتوں کی مدح و ثنا کی جاتی۔

اسی زمانے میں سر سید احمد خاں مرحوم رفارمر بنے اور سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ رسالہ اسباب بغاوت لکھ کر چھپوایا مگر ۵۰۰ نسخے ممبران پارلیمنٹ کو بھیج دیئے اور ایک گورنر جنرل کو تاکہ بغاوت پھیلانے کے جرم میں پکڑے نہ جائیں۔ انھوں نے حکومت اور عمال کو تلقین کی کہ ہندوستانیوں سے ملیں اور ان کے خیالات، جذبات اور کیرکٹر کو سمجھیں۔

۱۸۶۸ تا ۱۸۷۷ء تقریباً دس سال تک اخبارات نے خاموشی اختیار کرنے کے بعد ۱۸۶۸ء سے پھر ملکی تنقیدیں لکھنی شروع کیں اگرچہ احتساب اب بھی شدید تھا اور لکھنے والے ڈر ڈر کر اظہار خیال کرتے تھے۔ سر سید کی تعلیمی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بعض کتابوں میں بھی معاشی سیاسی اور تعلیمی مسائل پر کبھی کبھی تھوڑی جرأت کر کے اظہار خیال کیا گیا۔ انگریز عہدے داروں کے اصول حکومت پر تنقید کی گئی اور ان سے خواہش کی گئی کہ ہندوستانیوں سے مساویانہ تعلقات پیدا کریں۔

"غلط فہمی حاکم و محکوم کو عملداری انگریزی کے نامطبوع کرنے میں بڑا دخل ہے۔ حکام اوائل عمر سے عموماً ولائت میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہاں کی رسم ورواج وقید وضوابط وعادات وطریقوں سے واقف ہوتے ہیں اور انھیں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی عادات اور ان کی عقائد سے انکو بخوبی علم نہیں ہوتا۔ انکی ساری کارروائی انہی اصولوں اور خیالات پر مبنی ہوتی ہے جو انھوں نے اوائل عمر سے اپنے وطن میں کسب کئے ہیں...... اور اس امر کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہندوستانی بھی انہی اصولوں پر چلیں۔" اکمل الاخبار

۲۹ر جولائی ۱۸۶۶ء

اس دور میں غالب کے روزنامچے میں جس کے ٹکڑے اخبارات میں بھی شائع ہوئے حسب ذیل عبارتیں ملتی ہیں۔ اگرچہ شاعروں کی طرح وہ بھی صرف اپنے حزن وملال ہی کا اظہار کرسکے ہیں تاہم ان میں اصلی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

"اس چرخ کج رفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ملک ومال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ وتوشہ چند مفلس دبلے لوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک (درد) اور تو یہاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا" روزنامچہ غالب ص۳۲

ایک دوسری جگہ شہر کی حالت بیان کرتے ہیں اور جو سختی آنے جانے والوں پر تھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔

"رہنا شہر میں بے حصول۔ اجازت حاکم احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو اگر خبر ہو جائے تو البتہ قیامت ہے۔ دلی کی عملداری میرٹھ، آگرہ اور بلاد شرقیہ کے مثل نہیں ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے نہ قانون نہ آئین، جس حاکم کی جو رائے میں ہو وہ ویسا کرے۔"

روزنامچہ ص۴۳

ایک جگہ بہت لطیف پیرائے میں انگریزی حکمت عملی اور روباہ کاری پر اشارہ کرتے ہیں۔

"سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ (الور) کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہی ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دے رکھا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضہ قدرت میں رکھا آدمی کو بدنام کیا۔" ص۳۲

آپ نے ملاحظہ کیا کتنے عمدہ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ میر تقی میر نے ایک شعر میں شاید خدا اور قضا کے متعلق نہیں بلکہ ہماری سرکار کی اس پالیسی کے متعلق یہ فرمایا ہے:۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خودمختاری کی　　چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

۱۸۶۵ء کے بعد ملک میں سیاسی جذبات اور قومی احساسات بیدار ہونے لگے۔ انکم ٹیکس کے خلاف جذبات کا ریلا خوب زوروں پر اُبلا۔ بجٹ پر بھی اردو اخبارات میں خوب خوب بحثیں ہوئیں۔ ہندوستانیوں کے خون کے قصاص کا مسئلہ بھی زیر بحث رہا۔ سوامی دیانند سرسوتی، اور سر سید احمد خاں کی تحریکیں چلیں اور ان مباحث نے اردو ادب پر بھی اثر ڈالا۔ انکم ٹیکس کے مسئلہ پر ایک اخبار نے لکھا:۔

"امرئی ۱۸۶۹ء کے اجلاس کلکتہ میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے انکم ٹیکس کی نسبت ایک سال سے زیادہ جاری رہنے کے نسبت اہل فرنگ کی مانند گرفت کی ہے۔ پس ہم (ہندوستانی) بھی بایں لحاظ انگریزوں کے مثل ہیں کہ جو محصول اپنے ذمے ہم خود تجویز نہ کریں اس کو ہم اپنے ذمے قائم رکھنا پسند نہیں کرتے۔" اکمل الاخبار ۲۸ مئی ۱۸۶۹ء

دربار دہلی کے موقع پر نواب مردان علی خاں صاحب نے ایک بیان پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا۔ جس کا نام ہند کے مطالبات ہے۔

ہند کے مطالبات

"سرکار کمپنی تاجر تھی مگر اب شاہنشاہی دور ہے اس لئے برتاؤ بھی شہنشاہی ہونا چاہیئے۔ یہ دربار کھیل تماشے کیلئے نہیں ہوا ہے۔ اس لئے ہمارے ان مطالبات کو منظور کیا جائے۔

(۱) جے پور کو نصف سانبھر واپس ملے۔

(۲) مارواڑ کو نصف سانبھر اور علاقہ تالاب امرکوٹ و مگھر امٹر واڑہ واپس ہوں

(۳) گوالیار کو قلعہ گوالیار واپس کر دیا جائے۔

(۴) اودے پور کو علاقہ گنگا پور وغیرہ علاوہ نیمچ کے ملے۔

(۵) نظام کو بار دید یا جائے۔

(اس کے بعد حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔)

"عہد سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ سرحدیں مستحکم تھیں رعایا خوشحال تھی اور صرف تیس کروڑ آمدنی تھی۔ دس لاکھ فوج تھی اور اس پر بھی شاہی خزانے معمور، عجب کہ اب ۴۵ کروڑ آمدنی ہے اور صرف دو لاکھ ساٹھ ہزار فوج اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے ازحد قرض .... ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

سالانہ بجٹ خوب بنتا ہے مگر جب بچت نہیں تو لفافہ ہے بارک ماسٹری کمسریٹ اور مہم وغیرہ میں کروڑوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ یہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ سرکار ایسی لکھ لٹ ہے کہ پنڈورہ کی لوٹ بھی اس نے مات کر دی۔" کوہ نور ۱۴ $\frac{11}{1867}$ ء

ان حالات کے زمانے میں سرسید کیا لکھ رہے تھے وہ تہذیب الاخلاق سے پیش کیا جائیگا مگر دو تین تحریروں کو اور ملاحظہ کیجئے۔

"یہ مصیبت کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عملداری نے ہماری دولت و ثروت، رسم و رواج، لباس وضع، تجارت، مذہب، علم و ہنر، تہذیب و عزت، طور، طریقہ سب چیزوں پر تو پانی پھیرا ہی تھا ایک زبان تھی اب اس کا بھی یہ حال ہے کہ انگریزوں نے عجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی، غلط، نامربوط اردو بولنی شروع کی اور ادھر ہر عیب کہ سلطان بپسند و ہنر است۔ ہمارے بھائی بند بھی لگے اسکی تقلید کرنے۔" ابن الوقت صث

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے اس زمانے میں بہت کچھ لکھا مگر انھوں نے یا تو معاشرتی ناول لکھے یا انگریزوں کے حکم کے مطابق قانون فوجداری کا ترجمہ کیا۔ البتہ اسی زمانے میں شبلی، سجاد حسین وغیرہ نے سیاسی مباحث پر قلم اٹھایا۔ شبلی نے بہت سی تاریخی کتابیں لکھیں اور نظمیں بھی کہیں جس سے ہیں

یہ احساس ہونے لگا کہ ہم کیا تھے۔ کیا ہو گئے اور اب کیا کریں۔ سجاد حسین مرحوم نے اس دور میں سب سے بڑا کام کیا ان کا اخبار اودھ پنچ مذاق ہی مذاق میں معاشی، سیاسی اور تمدنی معاملات پر سب کچھ کہہ جاتا تھا انھوں نے حکومت پر بھی تنقید کی۔ ہمارے لیڈروں کو بھی ٹوکا اور ہماری غفلت اور بے حسی پر ہمیں بھی ڈانٹا۔ ان کی کوششوں سے اور انکی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ سیاسی، معاشی معاملات پر قلم اٹھانے لگے اودھ پنچ نے چار بہت مشہور لکھنے والے پیدا کئے سید محمد آزاد۔ احمد علی شوق۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف اور مرحوم اکبر الہ آبادی۔ ان کے علاوہ شرر بھی اسی زمانے سے لکھنے لگے تھے۔ اگرچہ اودھ پنچ تھا تو ادبی اخبار مگر اس نے سیاسی بیداری میں بہت کام کیا۔ ولائت سے واپسی کے بعد سر سید نے جہاں تعلیم پر بہت زور دیا تھا وہاں وہ سب ہندوستانیوں کو تہذیب اور معاشرت میں بھی انگریز بنانا چاہتے تھے۔ مگر اس سلسلے میں انکی مخالفت بہت شدید کی گئی اور وہ ناکام ہوئے۔ اودھ پنچ چونکہ مزاحیہ اخبار تھا اس لئے اسے بہت آسانی تھی کہ سیاسی مباحث پر مذاق میں جو چاہے لکھے۔ انگریزوں کی دماغی حالت اور انکی پالیسی پر مضمون ذیل میں جو تبصرہ ہے اُسے ملاحظہ کیجئے۔

مسٹر اودھ پنچ کی اقلیدس

حدود

(۱) عہدنامہ ایک ایسی تحریر ہے جو ہر وقت ٹوٹ سکتی ہے

(۲) سول سروس وہ میوہ ہے جو سفید رنگ کے لئے مخصوص ہے

(۳) وائسرائے ایک بڑا عہدہ دار ہے جو شاعری کے شغلے پر قیام رکھتا ہو اور بدر چاچ کے جواب میں موقع بے موقع اپیچ بصورت اسنیچ کہتا ہو۔

(۴) جسکا سر چھوٹا اور کم وزن ہو وہ دیسی ہے۔

(۵) اس قطعے (اودھ) میں جس شخص کے پاس علاقہ ہو (خواہ چھوٹا یا بڑا) اور اسکی توقیر نہ ہو تو اسے تعلقہ دار کہتے ہیں۔

(۶) تخفیف ایک نشیب ہے جس میں سرکار بآسانی گر پڑتی ہے۔

اصولِ موضوعہ

(۱) ٹیکس ہر جگہ جاری ہو سکتا ہے۔

(۲) ہر صوبہ ہر ملک ضبط کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دیسیوں کو خوش کرنے کیلئے زبانی وعدے شاہی اشتہارات میں درج ہو سکتے ہیں۔

علومِ متعارفہ

(۱) دیسی باوجود تعلیم کے دیسی ہے

(۲) اگر یورپ میں نقصان ہو تو ہندوستان میں تخفیف کی جائے۔

(۳) دیسیوں کی ہر بات قابلِ مضحکہ ہے۔

دعویٰ

(۱) دیسیوں کو باوجود ذی علم اور لائق ہونے کے ذلیل کرو۔

(۲) دیسی صرف تباہ و برباد کئے جانے کیلئے پیدا ہوا ہے۔

عمل

(۱) ایک قاعدہ ایسا مقرر کرو کہ ۱۹ برس سے زیادہ عمر کے لوگ سول سروس کے امتحان میں شریک نہیں ہو سکتے۔

(۲) دیسیوں کو سول سروس میں کوئی عہدہ نہ دو۔

(۳) دیسی جو رائے دے اس کی حقارت کے ساتھ ہنسی اڑاؤ۔" (انتخاب اودھ پنچ ص ۱۳۲ تا ۱۳۵ ملخصاً)

(اودھ پنچ ۲۸ اگست ۱۸۷۷ء)

ہماری شاعری میں ابھی تک سیاسی رجحانات بہت کم تھے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے ایک نئی راہ نکالی تھی مگر انکا فلسفہ طنز ہے۔ وہ رجعت پسند تھے اور قدامت کے بڑے دلدادہ و علمبردار۔ انکا طنز صرف مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے اور اگر زیادہ گہری نظر اور غور و فکر سے ان کی

شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ صنعتی زندگی یا حرفتی دور کے بہت بڑے مخالف تھے اور انکی شاعری سائنتی تحریک کی نزعی ہچکیاں کہی جا سکتی ہے۔ اکبر اپنی تہذیب و تمدن کے مٹنے پر مرثیئے کہتے تھے۔ ماتم کرتے تھے لیکن قومیت کی تباہی انھیں محسوس بھی نہ ہوتی تھی۔ حالی اور آزاد نے بھی غزل کے مختصر میدان کو چھوڑ کر نظم کے وسیع، طویل اور ناپیداکنار صحرا میں شبدیز قلم کو تگ و پے کے لئے چھوڑ دیا۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل (غالب) کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

آزاد کو سیاسی شعور نہ تھا اور آخر عمر میں ان کی دماغی حالت بھی خراب ہو گئی تھی ورنہ ممکن تھا کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی کچھ کہتے۔ حالی کی مسدس اس زمانے کی بے مثل چیز ہے اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی قومی نظمیں کہی ہیں۔

اس عصر میں بہت سے معاشی مسائل پر نظمیں کہی گئی ہیں اور ابنائے ملک کو تجارت، صنعت و حرفت کی تباہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو جو صنعت و حرفت کے متعلق کہی گئی ہے۔ شاعر کا نام نہ معلوم ہو سکا۔

دل ساکنانِ ہند سے کیونکر خفا نہ ہو — افسوس یاں تو صنعت و حرفت ذرا نہو
ہر شخص کو وہاں کے یہی دھن ہے رات دن — ممکن ہے کوئی بات نئی ڈھونڈتا نہ ہو
طاقت ہے یورپینوں کی شے ہو نہیں لطیف — ممکن ہے ہند کی کوئی شے بد نما نہو
تشبیہ انکی دیتا ہوں اس جانور سے میں — آنکھیں تو کھل رہی ہوں ولے دیکھتا نہو
اعضا ترے درست ہوں پھر لوٹری بنے — اے بے حجاب تجھکو ذرا بھی حیا نہ ہو
گر یہی حالتیں دلِ وحشی تری رہیں — کیا جانے کیا ہو، دیکھئے کیا جانے کیا نہو
مشکل وہ کونسی ہے جو آساں نہو کبھی — افسوس دل سے چاہو اگر تم تو کیا نہو

بلبل بھی نالہ سنتے ہی بیدار ہو گئی
اے بے خبر، خبر تجھے مطلق ذرا نہ ہو

سرسید نے انگلستان سے واپسی پر بڑے زور وشور سے تعلیمی تحریک شروع کی اور اسی سلسلے میں اخبار بھی نکالا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے سفر نے ان کی نظروں میں خیرگی اور چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان آکر جو تاریکی کا سامنا ہوا تو ہوش ...... اڑ گئے۔ علی گڈھ کالج قائم کیا تو انکی کوشش یہ تھی کہ آکسفورڈ اور کیمبرج بنا دیں بلکہ ان کے اختیار میں ہوتا اور ان کا بس چلتا تو ہندوستان کو انگلستان بنا دیتے۔ تھے وہ بڑے دھن کے پکے اور قدرت نے ان کو بہت ذہین بنایا تھا۔ مقرر بھی تھے۔ اس لئے اٹھے اور سارے ملک پر چھا گئے۔ مگر ان کی راہ نمائی غلط راہ کی طرف تھی اس لئے مسلمانوں نے جہاں انکی تعلیمی تحریک سے منافع حاصل کئے وہاں سیاسی دنیا میں نقصان بھی اٹھائے۔ شروع شروع میں انھوں نے سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جیسا کہ اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے۔

> مجھے یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات مٹ نہ جائیں اور ان کو حکومت کے قانون میں دخل ہو، اسوقت تک دونوں قوموں (انگریز و ہندوستانی) کے درمیان اصلی دوستانہ تعلقات قائم نہ ہوں گے۔ زندگی، سوشل، خوشی و موافقت پولٹیکل ہمسری سے ہی، ایک قانون کے زیر حکم رہنے سے اور یکساں عدالتوں کے تابع رہنے سے پیدا ہوتی ہے...... اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یورپین ہوں یا یوریشین، اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور ان کے پولٹیکل حقوق یا کانسٹی ٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیئے۔" (تہذیب الاخلاق)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام مسٹر ہیوم اور چند دیگر لبرل انگریزوں کی کوشش سے ہوا تو سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے اسباب کیا تھے۔ چند باتیں تو بہت روشن ہیں اور باقی کچھ پس پردہ۔

سب سے پہلا سبب یہ تھا کہ سرسید کی دوستی ان انگریزوں سے تھی جو کنسرویٹو (قدامت پسند)

خیال کے تھے اور وہ ہندوستانیوں میں ذرا سا سیاسی شعور بھی اپنے مفاد کے لئے مضر سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے سرسید کو ذریعہ بنایا۔ دوسری بات سرسید کو یہ سمجھائی گئی کہ ہندو تعلیم اور تجارت میں بہت ترقی حاصل کر چکے ہیں اور اگر سیاسی مسائل میں مسلمان ان کے ساتھ ساتھ چلے تو تعلیمی کمزوری کی بنا پر وہ ہندوؤں کے غلام بنجائیں گے۔ یہ سبب ذرا معقول بھی کہا جا سکتا ہے تیسرا سبب یہ بھی تھا کہ سرسید قائد تھے سپاہی بننا انھیں نہ آتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس کی بہت سخت مخالفت کی اور مسلمانوں کو سیاسی میدان سے واپس ہٹایا۔ اس سے چند نقصان ہوئے۔

۱۔ ملکی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کرنے سے مسلمانوں کی سیاسی بصیرت سے محرومی۔

۲۔ انگریزوں کی مرضی کے مطابق ہندو اور مسلمان قوموں میں افتراق و عناد کی پیدائش۔

۳۔ اردو اور ہندی کے جھگڑے کی ترقی جس سے اردو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور جس کی تلافی ابتک نہ ہو سکی۔ بلکہ اب اور بھی شدت ہو گئی ہے اور جھگڑے کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۱۸۸۵ء میں مسٹر بیک علی گڈھ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے تشریف لائے اور انکا اتنا شدید اثر سرسید پر پڑا کہ رسالہ اسباب بغاوت ہند کا مصنف اور مندرجہ بالا تحریر لکھنے والا جو انگریزوں سے ہمسری و برابری کا داعی تھا اپنے مقام سے ہٹ کر پستی کی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس کے ثبوت میں چند ٹکڑے ان کی تحریر و تقریر سے زیب قرطاس ہیں۔

"ہر شخص جانتا ہے کہ ترکوں کے آگے یونانیوں کی کیا حقیقت ہے اگر وہ مقابلہ پر آجائیں تو جس طرح ایک باز چڑیا کو مار لیتا ہے اسی طرح یونانیوں کو ترک مار لیں گے۔ اندیشہ تو یہ تھا کہ یونانیوں کو ترکوں سے مقابلہ کی جرارت کیونکر ہوئی اور اسی لئے یہ خیال ہوتا تھا کہ در پردہ کوئی بڑی طاقت یونانیوں کی مددپر ہے اس شبہ کو مسٹر گلیڈ اسٹون (سابق وزیر اعظم برطانیہ) کی نامعقول تقریروں اور ٹیلی گرافوں نے زیادہ قوی کر دیا تھا مگر ہر سمجھدار سمجھ سکتا ہے کہ گلیڈ اسٹون حکومت پر نہیں ہے اور نہ وہ قلیل ریڈیکل ممبران پارلیمنٹ کا

گورنمنٹ پر اثر پڑ سکتا ہے " (آخری مضامین سرسید صہ ۶)

مندرجہ بالا تحریر تو ان کی آخری تحریروں میں سے ہے اس سے قبل کی حالت کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیجئے ۔

" آپ نے جو کچھ ذکر ان خدمتوں کا کیا ہے جو میں نے گورنمنٹ کی کیں ۔ میں آپ کی اس قدردانی کا ممنون ہوں لیکن آپ (طلبائے لاہور) اس بات کو یاد رکھئے کہ مجھ سے اگر کوئی اچھی خدمت یا وفاداری گورنمنٹ کی ہوئی تو وہ بالکل میں نے اپنے مذہب کی پیروی کی ہے میں اپنے خدا و رسول جن کا میں ماننے والا ہوں اور جن پر میں یقین رکھتا ہوں ۔ یہی حکم سمجھتا ہوں کہ جس حاکم کی امن میں رہیں اس کی اطاعت کریں ۔ بس میں نے جو کچھ کیا اپنے خدا و رسول کی اطاعت کی ۔ بیشک میں نے گورنمنٹ کی اطاعت کی ہے مگر اس کا اصلی سبب وہی تھا ۔ تمام ہندو اور مسلمان اس کو یاد رکھیں کہ رعیت کا کام ہے کہ جس حاکم کی اطاعت میں ہوں اور اس کے امن میں ہوں اس کی اطاعت کریں " (مجموعہ لکچر صہ ۲۰۶)

اس سے زیادہ تکلیف دہ اور افسوسناک روش کانگریس کی مخالفت اور ہندوؤں کی مخالفت میں تھی ۔ انکی ایک عبارت حالی نے نقل کی ہے ۔

" ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر میں مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے " (حیات جاوید صہ ۱۴۲)

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ کرنے پر انکی دماغی حالت اور قلبی تکلیف کا زیادہ صحیح اندازہ ہو سکے گا ۔ کانگریس اور بنگالی ہندو کی مخالفت نے اب جنون کی شکل اختیار کر لی تھی ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ برٹش گورنمنٹ کی حکومت میں تمام چیزیں اچھی ہیں .... اسوقت سلطان روم جو مسلمان شہنشاہ ہیں .... انکی مسلمان رعایا کو ان سے کچھ شکایات ہیں .... کوئی سلطنت ایسی نہیں ہے کہ تمام لوگ اس سے راضی ہوں اگر ہم کو بھی انگریزی گورنمنٹ سے کچھ شکایت ہے تو نئی بات نہیں خدا کی گورنمنٹ میں بھی

تو لوگ اس کا شکریہ نہیں ادا کرتے۔ میں نہیں کہتا کہ گورنمنٹ سے کچھ نہ مانگو .... مگر وہ جو وہ تم کو دے سکتی ہو .... اگر تم ایسی چیز مانگتے ہو جو وہ نہیں دے سکتی تو گورنمنٹ کا قصور نہیں بلکہ مانگنے والے کی بیوقوفی ہے اور جو کچھ مانگو اس طرح پر نہیں کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں کو ظالمانہ کہو .... اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دار کو دشنام دہی .... جس قدر سخت و نا ملائم الفاظ ہوں وہ لارڈ لٹن اور لارڈ ڈفرن کے حق میں ادا کرو اور تمام انگریزوں کو ظالم بتاؤ - اور اسی مضمون سے اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ کر دو۔ ان باتوں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ تمھارے اوپر خدا نے انھیں حاکم کر دیا ہے۔ یہ خدا کی مرضی ہے۔ ہمیں خدا کی مرضی پر شاکر رہنا چاہیئے۔ اور خدا کے حکم کی اطاعت کر کے انکا (انگریزوں کا) وفادار اور دوست رہنا چاہیئے۔ نہ کہ ان پر بیجا الزامات لگائیں اور دشمنی پیدا کریں۔ نہ یہ عقلمندی کا کام ہے اور نہ ہمارے پاک مذہب کی ہدایت ہے ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں۔ پس ہم کو اپنی قوم کی تعلیم کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ بیرونی پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے جو تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے وہ انہی کے پاس رہنے دو کیونکہ ہم سے دوکان پر بیٹھ کر آٹا دال نہ بیچا جائے گا - نہ سوت کپاس۔ ہمارے ملک کی پیداوار کی تجارت جو انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہ ان سے چھیننے کی کوشش کرو۔ ان سے کہدو کہ اب آپ تکلیف نہ کریں ہم خود اپنا چمڑا انگلستان جانوروں کی ہڈی امریکہ اور روئی غلہ یورپ پہنچا دیں گے یہ کبھی مت خیال کرو کہ گورنمنٹ تمھاری اس تجارت میں ہرج ڈالے گی۔ مگر یہ سب باتیں حاصل ہونا تعلیم کی ترقی پر موقوف ہیں۔" (مجموعہ لکچر سرسید ص ۲۶۲)

آپ نے دیکھا کہ آپ کا ماحول کیونکر بدلا جا رہا ہے۔ آپ کے ادب میں کس چیز کا اضافہ کیا جا رہا ہے؟ کون سے سیاسی رجحانات پیدا کئے جا رہے ہیں۔ سرسید کی اس تحریک مخالفت نے ملکی ادب کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ادب کا کام اتحاد و اتفاق نہیں بلکہ منافرت و نفاق پھیلانا ہو گیا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوؤں سے منافرت پیدا کی جانے لگی۔ غلامی پر خوش ہونے کی تلقین کی جانے لگی مگر سجاد حسین اور ان کے ساتھیوں نے اودھ پنچ کے ذریعے سے اور سرسید کے بعض مخالفین نے دوسرے اخباروں کے ذریعے سے ایک متحدہ محاذ جنگ قائم کر کے، ایک نیا اور مضبوط مورچہ بنا کر اس کے خلاف جنگ کی اور ان کی تحریر و تقریر کو رد کیا۔ جس سے ایک حد تک ملکی ادب اور اردو ادب نے ایک نئی کروٹ لی اور ملکی تحریک نے پھر سنبھالا لیا۔ ہماری شاعری اس دور میں کس حالت سے گذر رہی تھی اس کے اندازے کے لئے چند نظموں اور مختلف شعروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ کسی نامعلوم الاسم شاعر نے کہا ؎

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستاں بڑھو　　آگے نکل رہے ہیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو　　کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو
بیٹھے ہو پاؤں توڑ کے کیوں کنجِ غم میں تم　　دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں بڑھو
ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے　　چلا رہا ہے طوطیِ ہندوستاں بڑھو

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم نے اس زمانے میں ایک نئے طرز کی ابتدا کی اور غزل کی تنگنائی چھوڑ کر نظم کے وسیع میدان میں آ کر سیاسی۔ معاشی اور تمدنی مسائل پر روشنی ڈالی۔ ہندوستانی عورت کی ناگفتہ بہ حالت پر سب سے پہلے قلم اٹھایا اور ان کو پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ بیوہ کی مناجات اور دیگر پر جوش۔ سادہ اور اصلیت کے مطابق نظمیں لکھیں۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

اے ماؤ بہنو بیٹیو　　دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں　　قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو　　عفت کی تم تدبیر ہو
گھٹی میں ہے صبر و رضا　　انساں عبادت تم سے ہے

ایک اور مقام پر ہندوستانی عورت سے اس طرح کلام کرتے ہیں۔

جو سنگدل سفاک پیاسے تھی تمھارے خون کے — ان کی تو بے رحمیاں مشہور عالم ہیں مگر
تمنے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ — شوہر ہوں آپس یا پدر یا ہوں برادر یا پسر
گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رہے — وہ نیک ہوں یا کہ بد سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں — آئی ہو جیسی بے خبر، ویسی ہی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجہول و گمنام دنیا میں رہو — ہو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمھاری کچھ خبر

ان کی سب سے مشہور نظم مسدس حالی ہے جو ۱۸۷۹ء میں لکھی گئی۔ یہ مسدس مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان ہے اور بڑی پُر درد۔ اس کتاب نے ہماری شاعری پر بے انتہا اثر ڈالا حقیقت یہ ہے کہ ادب میں سب سے زیادہ موثر شئے شعر ہے۔ قوموں کی تباہی اور ترقی میں شاعری کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہماری شاعری چونکہ بالکل فارسی شاعری کا چربہ ہے۔ اور فارسی شاعری کو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجداروں کی عیاشی اور عیش کوشی نے حقیقت اور جذبات سے دور کر کے صرف استعارات و تشبیہات سے بھر دیا تھا۔ کیونکہ ہر طرف بزم نشاط و محفل رقص، شراب و ساقی، کے جھگھٹے رہتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ رزمیہ مثنویاں، زوردار قصائد۔ کے بجائے غزل ہی غزل رہ گئی تھی۔ ہم نے فارسی شعرا کی تقلید کی اور جلوۂ یار و مئے ناب کے سوا کچھ نہ نظر آیا۔ یہ قصے تھے دلچسپ لہذا رنج و غم، کے ماحول میں اسی سے دلبستگی حاصل کی اور آج تک ہماری فطرت پر وہ اثر باقی ہے، جب جلوۂ یار اور مئے ناب میں کمی ہونی شروع ہوئی تو استعارات و تشبیہات کے گورکھ دھندے اور صنائع و بدائع کے طلسمات پیش نظر رہنے لگے۔ اس سے دل اکتایا تو پھر راجہ اندر اور انکی پریاں۔ عجائبات کا پٹارہ لئے سامنے موجود۔ غرضکہ جب تک حکومت تباہ نہیں ہوئی یہ حال رہا اس کے بعد ہم تھے اور غلامی کی لعنت سامنے، اب مصائب کے سمندر کی لہریں اژدہے بن کر نگلنے کو موجود نتیجہ یہ ہوا کہ عیاشوں اور بزدلوں کی عادت کے مطابق آہ و نالے پر کمر باندھی۔ اپنا آشیاں برباد کر چکے تھے صیاد کے کاشانے کو فریاد کے دھویں سے اُڑانا چاہا۔ اس میں ناکامیابی پر غم غلط کرنے کے لئے۔ بے خودی اور مستی کی

عادت بادۂ انگوری سے ڈالی۔ جب حکومت بالکل تباہ ہوگئی۔ شہزادے دربدر ٹھوکریں کھانے لگے تو ہمارا نشہ ذرا کم ہوا مگر پھر خمار کی انگڑائیوں نے ستایا۔ کچھ دھکے اور لگنے بدے تھے وہ بھی برداشت کئے تب آنکھیں کھلیں مگر دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی اس لئے اب اپنا عروج و زوال آنکھوں کے سامنے آیا کچھ نے اس کو اب بھی خواب سمجھا اور سو گئے کچھ نے حقیقت سمجھی اور جھٹ پٹ اٹھے کمر باندھ کر میدان میں آ ڈٹے۔ ان کے آگے آگے چلنے والے اور رہنما حالی اور شبلی تھے۔ مصائب کے سمندر سے ساحل مراد تک پہنچنے کے لئے ان دونوں نے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے۔ اکبر نے بھی ساتھ دینے کی کوشش کی۔ ایک آدھ بار چپو ہاتھ میں لیا اور کشتی کو کھینے کی کوشش کی مگر وہ بہت جلد تھک گئے اور دھارے کی تیزی نے کشتی کو دوسری طرف پھیر دیا۔

حالی کی مسدس سے ۲ ٹکڑے نذر ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے اس بیان کی تائید ہو سکے۔

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے | پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے | کوئی انمیں سوتا کوئی جاگتا ہے

جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں انپہ خنداں زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو | کس امید پہ تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو | نہ چھوڑیگا سوتوں کو اور جاگتوں کو

بچوگے نہ تم اور نہ ساتھی تمھارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبوگے سارے (مسدس حالی)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

رئیسوں کی جاگیرداروں کی دولت | فقیہوں کی دانشوروں کی فضیلت
بزرگوں کی اور واعظوں کی نصیحت | ادیبوں کی اور شاعروں کی فصاحت

جنچے تب کچھ آنکھوں میں اہل وطن کی ؛ جو کام آئے بہبود میں انجمن کی

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت — جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت
رہی ہے نہ ہرگز رہے گی سلامت — نہ شخصی بزرگی نہ شخصی حکومت
وہی شاخ پھولے گی یاں اور پھلے گی
ہری ہوگی جڑ اس گلستاں میں جس کی — (مسدس حالی)

ایک نظم میں مادر وطن سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تباہی کا سبب افتراق و عناد ہے۔ افتراق پیدا کرنے والے کون ہیں یہ بھی بتلا دیا۔ مرض کی تشخیص صحیح اور نسخہ کے بعد بھی اگر ہم علاج نہ کریں تو الزام طبیب پر کیوں دیا جائے۔

اے مقدس آریہ ورت آئی کیا تجھ پہ بلا — جس نے بزم یکدلی کو تیری برہم کر دیا
کوچ کر جاتا نہ گر تجھ سے وفاق اتحاد — کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا
تو کہاں اور اہل مغرب کے بھلا حملے کہاں — ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھکو سزا

جنگ و خونریزی کے خود آکر ہوئے وہ رہنما — ورنہ فتنے کا قدم یاں تک کبھی آیا نہ تھا
یک بیک آیا خلل امن و اماں میں ہر طرف — اک تنزل پڑ گیا ہندوستاں میں ہر طرف

اب اکبر مرحوم کے چند شعر سنئے تباہی سے بچنے کی تدبیر بتاتے ہیں:-

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو — باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

ہوتی ہے نصیب تلخ کامی تم کو — محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار نہیں بنا سکتے تم کو غلام — ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

ہمارے بعض غزل گو شعرا کے یہاں بھی کچھ کچھ نئے اشارات ملتے ہیں مصائب پر افسردگی اور

رونا تو پرانا شیوہ تھا مگر اب حقیقت کی آمیزش نے اثر کو بڑھا دیا ہے۔ ان اشعار سے جہاں دل کی کرب و تکلیف کا پتہ چلتا ہے وہاں کچھ کچھ خواہش نجات بھی آ چلی ہے۔

اور کچھ باتیں کر دلے ہمصفیرانِ چمن — یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھکو آرام آگیا

نگاہِ یاس سے ہے آئینۂ غم فردا — نظر کے سامنے ساماں ہیں قیامت کے

مری ضد میں چمن کو بجلیوں نے خاک کر ڈالا — کہاں سے کنج میں پھولوں کی طرح آشیاں رکھدے

یہ گمراہی یہ خود آگہی اچھی نہیں اے دل — کسی وادی میں کھو جا اور اپنی جستجو کر لے

تمام رات ستاروں نے مجھکو سمجھایا — کہ فکر کر کوئی دنیا نئی بسانے کی

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

(باقی)

ڈاکٹر انصاری اور فن مصوری

(جناب عبدالغفور صاحب ایم۔ اے۔ لکچرار مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج علی گڈھ۔)

میرے لئے یہ صبح نئی دلی کی پہلی صبح تھی۔ سردیوں کے دن تھے اور گرم گرم دھوپ ایک سردیوں سے اکڑی ہوئی دنیا کے بند ڈھیلے کر رہی تھی۔ کناٹ پلیس میں زرد زرد دھوپ کا سیلاب آگیا تھا۔ میرے ارد گرد چمکتی ہوئی سنہری دھوپ کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو معلوم ہوتا کہ زرد چمکیلی لہروں پر بہتا ہوا چلا جا رہا ہوں میرے بدن کا ہر مسام اس پیاسے مسافر کی طرح تھا جو گنگا کے کنارے پہنچ کر ایک گھونٹ میں ہی دریا کی وسعت کو ختم کر دینا چاہتا ہے اس آتش سیال کی تلچھٹ تک پی جانا چاہتا ہے۔ میرے ارد گرد ایک تمدن تھا جس کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ تھی۔ ایک تہذیب تھی جس میں ایک قدم کی لغزش موت کا پیام لئے ہوئے تھی۔

اس ماحول میں میرے دل میں کچھ غیر معمولی تمنائیں تڑپ رہی تھیں۔ کوئی نامعلوم خواہش، میرے دل میں ایک ہلکا ہلکا درد، ایک چبھن، ایک ناقابل اظہار بے چینی تھی شاید میں اپنے آپ کو اس نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں کر سکا۔۔۔ جب سے مجھے الف لیلہ کے مشہور قالین پر اچانک ایک چھکڑے اور پیادہ پا رفتار پر چلنے والے تمدن سے اس قدر سرعت کی رفتار کے تمدن میں منتقل کرنے سے ذہنی یا نفسی صدمہ ہوا۔ میں نے ایک مرتبہ ایک کمھار کو لاری میں دیکھا تھا۔ اگرچہ موٹر کی رفتار اس کے گدھے سے زیادہ تیز تھی اور اس میں وہ دلچسپ ٹھونگے بھی نہ تھے جو گدھا اپنے سوار کو ہر قدم پر دئے جاتا ہے۔ تاہم کمھار کا سر چکرا رہا تھا اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اس' بھوپوں گاڑی کی تیز رفتاری کی تاب نہ لا سکتا تھا۔

شاید میری بے چینی ..... جسمانی نہیں تھی۔ میں اس تہذیبِ جدید کے جزیرے میں جو فلاکت اور ناداری کے سمندر میں اپنی چمکیلی سنگ مرمر جیسی دودھیا سفید عمارتوں سے برفیلی چوٹیوں کا نظارہ پیش کر رہا تھا اور گرد و نواح کے تاریخی ماحول میں مطابقت پیدا نہ کر سکا میں ایک تاریخی شہر میں تھا۔ وہ جگہ جہاں انسان کے تخیل نے پتھر اور اینٹ کو احساس حسن کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیا۔ جہاں کے رہنے والوں کے ہاتھ میں سنگ موسیٰ اور مرمر موم بن گئے۔ جن کے ہاتھوں نے چونے اور گارے میں زندگی کی سوتیں دوڑا دیں میرے ایک جانب ایک سڑک دور تک چمکیلے فیتے کی طرح پھیلتی چلی گئی تھی۔ جہاں جامع مسجد دہلی کے انڈوں جیسی سفیدی والے گنبد آسمان کی طرف ہمک رہے تھے دوسری جانب سنٹرل ایشیا کے نوادر کا عجائب خانہ اور اس کی بیٹھواں سنگین عمارت اس کو دیکھ کر میرے دل میں وہی خوف پیدا ہوا تھا جو ایک انقلابی کو پیرس کا بدنام آفاق قید خانہ Bastille بیسٹل دیکھ کر ہوتا ہوگا۔ ایک وہ دن تھا جب بابر نے ان ہندی صناعوں کی دلکش سطور کی تعریف کی تھی جو انھوں نے مرکزی ایشیا کی دلھن یعنی بخارا کی جامع مسجد بنانے میں استعمال کی تھیں اور ہندوستان کے زندہ دل اور صاحب مذاق فاتح کو اعتراف تھا کہ ہندوستان کے صناعوں اور کاریگروں کی چابک دستی نے اس کے وطن کی تزئین اور خوبصورتی میں کتنا حصہ لیا۔ آج ہم نے بابر کی فتح کا تاریخی انتقام لے لیا یعنی اس کے وطن کے نوادر کو بدصورتی اور بدنمائی کے شاہکار میں محبوس کر دیا۔

میرے ایک طرف بہت دور صبح کے دھند میں قطب مینار نظر آرہا تھا۔ صبح کے دھند نے مینار کے نچلے حصے کو چھپا دیا تھا۔ اور قطب مینار کسی آسمانی شہر کے مینار کی مانند نظر آرہا تھا۔ یا ایک آتشیں گیند جس کو کسی جناتی ہاتھ نے آسمان سے نیچے لٹکا دیا ہو۔ وہ مینار جس پر کسی زمانے میں انسان نے اللہ کا نام بلند کیا۔ وہ عمارت جس نے فن تعمیر کی

دلفریب سطور میں ہندو مسلم اتحاد کو ازلی نقش دیدیا۔ وہ زمانہ جس کے ذریعہ انسان نے دکھادیا کہ وہ اللہ کی عنایت کی ہوئی قوتوں سے کس قدر بلند تعمیر کر سکتا ہے۔ اور اس بلندی سے اس عالم گیر ہستی کی برتری اور عبودیت کا اعتراف کرتا ہے۔

میرے دوسری جانب باب الفتح یا گیٹ آف وکٹری تھا جس کا بھدا طرز مجھے ہمیشہ کسی دیہاتی گرجا کے بلفری کی تصویر یاد دلا دیتا ہے۔

پچھلے دنوں جب ایک مشہور انگریز ماہر فن تعمیر نے مغل دہلی اور انگریزی دہلی کا موازنہ کیا تھا تو اسے زمانہ جدید کی یادگار مغلیہ عمارتوں کے مقابلے میں ایک طفلانہ کوشش اور وقت کو مٹانے والی ہیبت ناک قوت کے خلاف اک بے مایہ اور کمزور چیز نظر آئی۔ جہاں مغلیہ دہلی ایک باوقار ملکہ کی مانند ہے جس کے خد و خال میں جس کی لباس کی ہم آہنگی میں حسن و توازن کی ازلی دلکشی موجود ہے وہاں نئی دہلی موجودہ زمانے کی اڑتی ہوئی تتلی ہے جس کے رنگ شام کے بادلوں کی طرح ہر لحہ نئی جھلک دکھاتے ہوں

میرا دل بے چین تھا مجھے اس سطحی زندگی سے، مجھے اس سطحی تمدن سے مجھے اس سطحی فن تعمیر سے جو روح کی بجائے جسم کو۔ جو تخیلات کی بجائے محسوسات کو مطمح نظر بنائے ہوئے تھا۔ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرا دل اس ازلی اور ابدی حقیقت کے لئے تڑپ رہا تھا جس کے حسن کی جھلک تاج محل کے پتھر کی بولتی ہوئی رگوں میں نظر آتی ہے۔ میرا دل فضائے بسیط اور وقت کی تنگ وادیوں سے چھٹ کر کسی ایسی دنیا کو چاہتا تھا جہاں اہل دنیا کے یہ فلسفیانہ اصول بچوں کے کھلونے ہوگئے ہوں، جہاں وقت کے دریا کا برق صفت بہاؤ ہمالیہ کے گلیشیر کی طرح منجمد ہو کے رہ گیا ہو۔ جہاں فاصلہ کو مسجد کے قالین کی طرح لپیٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔

بعض اوقات دل اک غیر محسوس طریق پر آنے والے واقعات کا ترجمان ہو جاتا ہے اور فاؤسٹ کے جادوگر کے اس متحرک گنبد کی طرح آنے والی امیدوں اور خوف

کو شیشے کے دھندلکے میں واضح کر دیتا ہے۔ اس جام جم کی طرح جس کی سطور و نقوش میں آئندہ کے واقعات حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میری نگاہوں کے مقابل ایک اشتہار لگا تھا" فنون لطیفہ کی سالانہ نمائش" معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیر معلوم طاقت کسی پوشیدہ مقناطیسی قوت نے مجھے یہاں کھینچ کر لا ڈالا ہے۔ جہاں میرا بے چین دل۔ میری پھڑپھڑاتی روح سکون حاصل کر سکتی ہے۔

میں اوپر چلا گیا۔ یہ ہندوستانی آرٹ کی نمائش تھی۔ وہ آرٹ جس کا رنگین تخیل میرے سامنے اکبر کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ جب وہ ایک کہار کے بچے کو جو کوئلہ سے محل کی دیوار پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ مشہور شاہی نقاش استاد عبدالصمد کے سپرد کر دیتا ہے اور یہی بچہ بڑا ہو کر جہانگیر کے دربار کی زندگی کو آئندہ نسلوں کے لئے کاغذ اور رنگ کے ذریعہ حیات دوام دیتا ہے۔ مغل آرٹ! وہ مغل آرٹ جس میں بولتا چالتا۔ جیتا جاگتا کاغذ مغل دربار، شکار، رقص و سرود، رنگینیٔ چمن، محفل برسات کی خاموش فلم دکھاتا ہے وہ فلم جس کا ہر snap ایک ماہر فن کا شاہکار تھا۔

مگر یہ نمائش ہندوستان کے فن جدید کا مظاہرہ تھی۔ جس میں ایک طرف تو ہندو تخیل بنگالی اسکول کے دلکش رنگوں اور روحانی لحاظ سے متکلم سطور میں پیش کیا گیا تھا۔ کہیں مہاتما بدھ ایک خوابیدہ انداز میں فضا کو گیان اور دھیان سے معمور کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف عمر خیام ٹھیٹھ ہندوستانی پس منظر اور لباس میں داد عیش دے رہے تھے۔ بہرحال پوری نمائش نمونہ تھی زندگی کے اس تنوع اور رنگ برنگی کا جس کا نظارہ ہم ہندوستان کے دیہاتی میلوں میں پاتے ہیں۔ جہاں گہرے رنگوں کا طوفان ہوتا ہے۔ جہاں ہر دیہاتی نازنین کے سر پر قوس قزح پھولی ہوتی ہے۔ جہاں ایک جانب مذہبی تقدس بھبوت رمائے موجود ہے تو دوسری جانب مادی زندگی کی دلچسپ رنگینیاں

بھی اسی تصویر کا ضروری پسِ منظر مہیا کر دیتی ہیں، اور خود مصور، وہ بھی زندگی کے متحرک اور متنوع البم کا دلچسپ شاہکار تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، قدرے پریشان بال، اک عجب انداز استغنا اک عجب ادائے بے توجہی۔ اس کی طرز۔ چال ڈھال میں عجب دلکش غیر ہم آہنگی اور بے ترتیبی تھی۔

نمائش میں کئی ایک اسکول کے انداز کی چیزیں موجود تھیں۔ مذہبی۔ رومانی۔ جذباتی۔ میری نگاہ کے ساتھ ساتھ مصور کی چھچلتی ہوائی تنقید بھی تصویروں پر سے گذرتی جارہی تھی۔ یہ مس شیر گل کا کام ہے اس میں جدید اصولوں کے مطابق جزئیات نہیں دکھائے جاتے۔ دیکھنے والے کا فرض ہے کہ اس قسم کا غیر ضروری عنصر خود مہیا کرے۔ یہ مصور کے ایک شاگرد کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ مصور کا اپنا مجموعہ ہے، عید کا چاند، مرقدِ عاشق۔ درگاہ کا نظارہ، مگر سب سے دلچسپ تصویر اک اندھی ماں کی تھی جس کو اس کی کمزور بچی لاٹھی سے پکڑے لئے جارہی تھی ان کے پیچھے اک طوفان چلا آرہا تھا۔ خوفناک بادل آسمان پر چھپٹ رہے تھے۔ دور دور تک چرند و پرند کا نام و نشان نہ تھا۔ اب بھی میں جب آنکھیں بند کرکے اس کا تصور کرتا ہوں تو ہزار شور میں بھی میرے دل کی گہرائیوں میں وہ سکوت و خاموشی چھا جاتی ہے۔ جو اس تصویر کی فضا کی روح تھی۔ اور اس خوفناک سکوت میں فطرت کی اس ڈراؤنی گود نہیں بلکہ جنگل میں ہندوستان کی یہ مظلوم بیٹی خدا معلوم کہاں چلی جارہی تھی۔ دور، دور، بہت دور افق سے پرے شاید وہ کسی ایسے جہان کی تلاش میں نکلی تھی جہاں کے باشندے دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی کھاتے ہوں گے۔ جہاں محبت اور انسانی ہمدردی کا ابلتا ہوا چشمہ زمین کو سیراب کرتا ہوگا۔ جب میں اور مصور تصویروں کو دیکھ کر لوٹے تو ایک مرتبہ مصور پھر اس تصو کے سامنے رک گیا۔ اس کا دل جذبات سے پُر تھا۔ اور اس کی زبان ان خیالات کی ترجمانی سے قاصر تھی۔ کہنے لگا کہ بس میرے لئے تو اگر کوئی تصویر ہے تو یہی ہے۔ دیکھو یہ تصویر میرے ملک کی صحیح تصویر ہے۔ تم اس میں اک کمزور عورت دیکھ رہے ہو نہیں

نہیں میرے لئے یہ مادر وطن ہے، بھارت ماتا اپنی انتہائی غربت، انتہائی افلاس، انتہائی بیکسی میں، بھارت ماتا جس کی بیٹی اس کی نئی نسل ہے۔ وہ بھارت ماتا جسے خود پتہ نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

میں رخصت ہونے کو ہی تھا

کہ دفعتاً اس نے مجھ سے پوچھا آپ کو معلوم ہے ہماری تصویروں پر بہترین تنقید کس نے کی؟ مجھے اس کا جواب سننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ ہندوستانی اور دوسرے اداروں میں اکثر رائے لکھنے کے لئے ایک کتاب رکھی ہوتی ہے جس میں لوگ اپنے تاثرات کو لکھ جاتے ہیں۔ گویا ادارے کے ارباب اختیار صرف زبانی تعریف کو ہی شہد کے گھونٹ بنا کر نہیں پیتے بلکہ چاہتے ہیں کہ ان ذہنی تاثرات کی بھی ایک تصویر لے رکھیں۔ اور شاید ان کو یہ بھی ڈر ہے کہ اس زمانے میں آرٹ کی ابدی اپیل کے لئے بھی لوگ حسب ضرورت عارضی نظریہ رکھتے ہیں، اور جب اس کیف رنگ و بو سے دور ہو جائینگے تو شاید وہ اپنی رائے بدل ڈالیں گے۔ بہرحال کچھ بھی ہو مجھے ایک امریکن سیاح کا لطیفہ نہیں بھولتا جو اس نے شانتی نکین کے ارباب مہمان خانہ سے کیا۔ مہمان خانے کے مہتمم نے چلتے وقت ان کے سامنے رائے بک پیش کر دی۔ امریکن سیاح نے قلم اٹھایا۔ اور بعینہٖ اسی جنبش اور گھماؤ سے گویا نپولین کسی سپاہی کو جرنیل کا عہدہ عطا کر رہا ہے، لکھ دیا۔ O.K.

کچھ اسی قسم کی لمبی کاپی اس نمائش گاہ میں بھی موجود تھی۔ اور چونکہ مصور کی نقاشی کے تخیلی پہلو اور سرمئی قلم کے کام نے ان کے سٹڈیو کو چار چاند لگا دئے تھے ان کے ہاں بھی شانتی نکیتن کی طرح مشہور و معروف اکابرین کی کوئی کمی نہ تھی۔ پہلے ہی لارڈ ریڈنگ کا نام نظر آیا۔ وہ نام جو اگر کسی ہندوستانی راجہ کی کتاب پر لکھا جاتا تو شاید ہیرے جواہرات میں جڑوا کر عبادت کے لئے رکھ لیا جاتا۔ اس کے بعد کئی وائسرائے

الٹ پلٹ کردیئے گئے۔

کہیں کہیں نام جھلک جاتے تھے۔ اروِن۔ ولنگڈن۔ لارڈ ارتھلون۔ مگر واہ رے آرٹسٹ۔ تمہارے فنا فی الفن ہونے کا کیا کہنا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو ایک ایک نام پر، گھنٹوں قصیدہ خوانی کرتا۔ اور اس معزز ہستی کی آمد کے جزئیات کو بیان کرتا۔ فلاں لارڈ اس تصویر کے سامنے یوں جھکے۔ انہوں نے غور سے دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں اتنے ملی میٹر بند کرلیں۔ انہوں نے ازراہ خوشنودی اتنے دانت دکھائے۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لئے تمام رجسٹر مردہ کی کتاب .Book of the dead تھی جو قدیم مصری دفینوں میں مردوں کے ساتھ بند کردیتے تھے۔ اس کی نگاہ میں یہ بلندپایہ دستخط کرنے والے محض اس ناسمجھ بچے کی طرح تھے جو ایک خوبصورت گڑیا کو دیکھ کر مسکرادیتا ہے۔

آخرکار اس کے چہرے پر کامیابی کی روشنی چمکی۔ ایک سکوت آمیز تبسم کے ساتھ اس نے کتاب کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا یہ رہا! نقاش خود۔ اس فرطِ عقیدت سے لبریز اس جوش سے کیف اندوز ہو رہا تھا جس سے وہ الفاظ جھلک رہے تھے۔ اس کا چہرہ اک جذبۂ افتخار سے تمتما اٹھا اور وہ والہانہ جوش سے پکار اٹھا۔ دیکھو زندہ دل یوں داد دیا کرتے ہیں! میں نے جھک کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انداز میں لکھا تھا۔

I have & really lived through these brief moments.

معلوم ہوتا ہے قدرت نے ڈاکٹر انصاری کو آرٹسٹ کا دل و دماغ دیا تھا یہ کیف آور الفاظ ایک ایسی ہستی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس نے اس رنگین دنیا کے حسن کو ایک زندہ دل شاعر کی نگاہ سے دیکھا ہو۔

آرٹسٹ کے دل میں ان الفاظ کو پڑھ کر پھر ایک جوش اٹھا۔ کہنے لگا "سچ بتاؤ ایسی اچھی، تنقید بھی کبھی دیکھی، ہم ڈاکٹر صاحب کی صفات کہاں تک گنائیں، ڈاکٹر صاحب ہمارے بڑے

مربی تھے۔ انھوں نے محض الفاظ سے ہی ہماری ہمت نہیں بڑھائی بلکہ عملاً بھی اس کا اکثر ثبوت دیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے آدمی تھے۔ بڑے اور بہت بڑے۔ نہ صرف خود اونچے تھے بلکہ اوروں کو اونچا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اک مقناطیس تھے جس سے ناقص لوہا بھی لگ کر جاذبیت پیدا کر لیتا ہے۔ وہ سماج اور فن کی دنیا کے مہکتے ہوئے پھول تھے جن کی صحبت میں گلِ ناچیز بھی مشک و عنبر کا ہم پایہ ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب خود آرٹ کے قدر دان تھے اور ان کے دل سے چنگاریاں اُڑ، اُڑ کر دوسرے دلوں میں بھی یہ آگ لگا سکتی تھیں۔

ایک مرتبہ مصور نے ولایت میں تاج محل کی تصویر تیار کی۔ یہ اس کا پہلا مقبول شاہکار تھا۔ ایک نمائش کے موقعہ پر ملکہ میری نے اس کو بے پسند کیا اور خاص اپنے لئے خرید لیا۔ ہندوستان پہنچکر مصور نے اس کی ایک نقل تیار کی مگر یہاں قدر دان کہاں! دن اور ہفتے انتظار میں گزر گئے۔ اتنے میں ایک دن ڈاکٹر انصاری آ پہونچے۔ کہنے لگے اچھی چیز ہے دیکھا جائے گا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب مہارانی ٹراونکور کا علاج کر رہے تھے ایک تو تصویر اچھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا پر اثر بیان اور تعریفی کلمات۔ اسی دوران میں کہیں آپ نے نواب بھوپال سے بھی ذکر کر دیا۔ اب ایک چیز کے دو خریدار پیدا ہو گئے اور دونوں منہ مانگی قیمت دینے والے شاید مصور کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس کی تصویر کی اصل نہیں بلکہ نقل کیلئے دو خریدار پیدا ہو گئے

مصور جوش میں خدا جانے کیا کہتا چلا گیا۔ مگر میرے کانوں نے اس سے زیادہ نہ سنا۔

اس کمرے کی دھندلی روشنی میں یہاں دو سبچے ہرے بھرے سے مزار پر چاند کی روشنی میں رات کی ساکن فضا کو معصوم گیتوں سے مرتعش کر رہے تھے۔ جہاں جہاتما بدھ اپنی معنی خیز مسکراہٹ سے وزیٹر کو اک مشفقانہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ اس کمرے کی معنی خیز خموشی میں جہاں جذبات واحساسات کا طوفان بپا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی روح موجود ہے اور مجھ اور مصور کو ایک شان کریمانہ سے تک رہی ہے۔

مزارِ رہنما

از جناب مجاز بی اے (علیگ)

یہ چند اشعار میں نے اپنے مخلص دوست ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی تحریک پر ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مزار کے لئے قلمبند کئے تھے۔ (مجاز)

سنیں اربابِ دل، اہلِ نظر بھی
نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی

مریضِ عشق بھی اور چارہ گر بھی
رہِ الفت کا سالک بھی خضر بھی

خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں
خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی

سکونِ دہر، تقدیسِ کلیسا
گدازِ امتِ خیر البشر بھی

یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گذر بھی

دنیا

(جناب خواجہ محمد شفیع صاحب، دہلی)

بعد مغرب، دن بھر کے بچھڑے ہوئے ستارے صحن فلک پہ جمع ہوئے اور مغل بھی نمازِ مغرب ادا کر ایک جا ہو بیٹھے۔ طراغے۔ قبیلہ کا خان دوران گفتگو میں بولا۔ "رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر چاہتا ہوں"۔ سب غور سے سننے لگے۔ خان نے کہا "دیکھتا کیا ہوں کہ ایک نورانی چہرہ والے عرب نے مجھے شمشیر برہنہ دی، جب میں نے چلائی تو اس میں سے شعلے نکلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے تلوار گلاب پاش سے بدل گئی اور اس کی پھوار دور دور پہنچی" یہ خواب سن کر سب کی رائے ہوئی کہ شیخ شمس الدین سے تعبیر لی جائے۔ قبیلہ کے چند معمر اور وجیہ افراد شیخ کے پاس گئے اور خواب بیان کیا۔ جواب ملا۔ "فرزندار جمند مبارک ہو۔ جس کی تلوار دنیا کو کفر اور بت پرستی کی آلودگی سے پاک کر کے ایمان پھیلائے گی۔ اور اس کی اولاد دا حفا د اقصائے عالم میں پھیلے گی۔

امیر طراغے اپنی بیوی کو وضع حمل کے بعد شیخ کی خدمت اقدس میں قدم بوسی کے واسطے لیکر حاضر ہوا ہے وہ سر سطھوتیں سورۃ تلاوت فرما رہے ہیں۔ امیر کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا اور فرمایا۔ "ہم نے تمھارے لڑکے کا نام تمر رکھا"۔

مکتبِ فطرت کا بہترین شاگرد کتاب حیات کے سات ورق گردان چکا اور مکتب میں بیٹھا ہے۔ اُستاد نے شاگردوں سے سوال کیا کہ بہترین نشست کونسی ہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔ اب نظریں تیمور پر ہیں۔ وہ کھڑا ہوا اور بولا۔ "بیٹھنے کا بہترین طریقہ دو زانو ہے"۔ چونکہ ہمارے رسول ؐ نے نماز میں اسی طرح بیٹھنے کو فرمایا ہے۔

ہفت اقلیم پر فتح پانے والا سپاہی جنگِ زیست کی سات رنیں سر کر چکا ہے۔ سپہ سالار بنا ایک ٹیلہ پر کھڑا ہم مکتبوں کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر لڑا رہا ہے۔ جس فریق کو کمزور پاتا ہے اسے

کمک پہنچاتا ہے۔

آواز :۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات ۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔

بیازی اگر نیز آہنگ بود　　　عدیش زدیہیم و اورنگ بود

بآئین فرماں دہی داشت میل　　　شدندے بر ش کودکاں خیل خیل

شدہ کودکے بر سپاہش امیر　　　یکے نصب گشتے برسم وزیر

تیمور سولہ سال کا ہے اور اپنے باپ کے ساتھ خانقاہ کی طرف جارہا ہے ۔ خدا پرست خانۂ خدا میں جا بیٹھے۔ باپ نے بیٹے سے کہا " جانِ پدر ہمارے آبا و اجداد نسلاً بعد نسلِ چغتائی اور برلاس قبیلے کے سپہ سالار رہے ہیں ۔ آج تک میں حسبِ دستور اس کام کو انجام دیتا رہا حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم مجاز میری نظر میں فریب نظر ہے ۔ اس قلزم فنا کی خوش آئندہ ۔ خواب آور ۔ اور مہلک لہروں میں پھنس کر مینائے[۵۱] مقصود کو فراموش کرنا نہیں چاہتا ۔ چاہتا ہوں کہ اس عالم آب و گل سے یا لودہ دامن نکل جاؤں ۔ اب یہ منصب بسلسلہ نسب تمھیں پہنچا ہے مبارک ہو۔ میں دست بردار ہوتا ہوں ۔ یہ گاؤں اور یہ خانقاہ میرا لگایا ہوا باغ ہے ۔ اب تم اس کی آبیاری کرنا۔ خاندان کی آبرو تمھارے ہاتھ ہے ۔ ہمارے خاندان کا سلسلہ طومنا خاں Tumanah khan تک پہنچا ہے اور ان کا سلسلہ Japhet یافث بن نوح سے جا ملتا ہے ۔ اس خاندان کا شخص اول جو مشرف بہ اسلام ہوا ۔ قراچار نویان Karachar Nuyan تھا۔ عقل بالغ اور وجدان سلیم سے بہرہ ور تھا اسلام لایا اور قبیلے والوں سے کہا " بھائیو میں اپنے گرد و پیش ایک عالم دیکھتا ہوں لیکن فراست سے سمجھتا ہوں کہ اور بھی عالم ہیں ۔ اسی طرح وجدان سلیم یقین دلاتا ہے کہ خالق جزو کل قادر مطلق ذات واحد ہے ۔ جب اس عالم فانی کو اس نے برگزیدہ فرمایا اپنا پرتو اسی پر ڈالا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نائب بنا کر بھیجا اور ان کے نائب خلفا ہیں ۔

---

[۵۱] بندرگاہ

بیٹا اپنے جدِ اعلیٰ کا یہ قول میرے لئے باعث تسلی و تشفی ہے اور میں نے صدق دل سے اسلام قبول کیا ہے۔ تم کو وصیت کرتا ہوں کہ۔

اوّل تو:۔ اسلام پر اعتقاد واثق رکھنا۔ صراطِ مستقیم سے نہ ڈگمگانا۔ علما و فقرا کی عزت کرنا۔ درویشوں سے طالب دُعا رہنا۔ سادات کی خدمت کرنا اور خلق خدا پر ترحم۔

دویم:۔ تبلیغ اسلام کرنا۔

سویم:۔ اپنے کو خادم خدا سمجھنا۔ قضا و قدر پر ایمان رکھنا۔ حکم قضا سے برافروختہ خاطر نہ ہونا۔ خدمت خلق خدا لازم سمجھنا۔

چہارم:۔ دوستوں کے ساتھ تلطف اعزا کے ساتھ التفات سے پیش آنا۔ ظلم و تعدّی سے احتراز کرنا۔ قبائے انصاف زیب بر۔ تین دن سے زیادہ کسی کو قید نہ رکھنا۔ بند محبت سے پابند کرنا۔ بُری صحبت سے بچنا۔ رعایا پر لطف و کرم کرنا۔ ورنہ اقتدار کھو بیٹھو گے۔

جب باپ یہ سب نصیحتیں کر چکا بیٹے نے قبلہ رو بیٹھ اُنپر کاربند ہونے کا تہیہ کیا۔

مردِ میدان مرد خدا کے سامنے آتا ہے۔ دنیوی تاجدار مخدوم روزگار صاحب خدمت کے دربار میں حاضر ہے۔ معتقدین اور اہل حال و قال حضرت امیر کلال کو گھیرے بیٹھے ہیں اور تیمور صفِ نعال میں حاضر ہے۔ دُرِ دریائے معرفت کی نگہ گوہر شناس گوہرِ یکتائے تاج سروری و دُردانۂ طرۂ خسروی تیمور پر پڑتی ہے۔ صاحب کشف و کرامت بیک نظر حقیقتِ حال کو سمجھ جاتے ہیں۔ اپنے پاس بلا کر بٹھاتے اور کہتے ہیں۔ ' یہ لڑکا گو دیکھنے میں چھوٹا دلے رتبہ میں سب سے بڑا ہے ' اتنا کہہ کر قدرے آرام فرماتے ہیں۔ جب بیدار ہوتے ہیں تو خادم کچھ روٹیاں اور مٹھائی پیش کرتا ہے۔ سات روٹیاں اور تھوڑی مٹھائی تیمور کو عطا ہوتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے ' اس میں سے تھوڑا تھوڑا کھا۔ ہفت اقلیم کی سلطنت تیرے لئے ہے ' حاضرین محفل تیمور کو بنظر استعجاب دیکھتے ہیں۔

آواز:۔ بزرگ کردۂ اورا فلک نہ بیند خورد　　　عزیز کردۂ اورا جہاں ندارد خوار

آج تیمور اور اس کے والدین حضرت امیر کلال کے دربار میں حاضر ہیں ۔ اخروٹوں کی ایک ٹوکری حضرت کلال کے سامنے رکھی ہے طراغے کو حکم ہوتا ہے کہ ان کو گن ۔ وہ تین سَو ستر نکلتے ہیں ارشاد ہوتا ہے کہ تیمور کی اولاد میں ستر افراد تین سَو سال تک صاحب طبل و نگیں رہیں گے بشرطیکہ تبلیغ اسلام اور آل رسول کا احترام کرتے رہیں ۔

سریرآرائے سمائے سروری ۔ ماہتاب فلک فرماں روائی ۔ اٹھارویں منزل میں ہے۔ بیمار ضعیف ۔ بیہوشی و نحیف پلنگ پر پڑا ہے ۔ اعزا مثل نبات النعش گھیرے ہیں ۔ مرگ و زیست میں کش مکش ہے ۔

ملک الموت کو ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں　　سربسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے

علاج صد آزار نے آنکھ کھولی ۔ انار کے چند دانے کھا بیہوش ہو گیا ۔ اقربا رونے لگے ۔

گر از من نشان مرگ ظاہر شد کہ می بینم　　عزیزاں را نہانی آستیں بر چشم تر امشب

اطبا سمجھ گئے کہ تیمور[۵۱] موت کے آہنی پنجہ میں ہے ۔ تدبیر سے کام لیا لوہے کو آگ دکھائی ۔ سابہ اور ابہام کے درمیان داغا ۔ بیمار ہوش میں آیا ۔ بولا مجھے بھوک لگی ہے ۔ یخنی اور تیماخ لاؤ ۔ سیر ہو کر کھایا اور سو گیا ۔ پسینہ آیا اور مزاج رو بہ اصلاح ۔

تیمور باپ کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہے ۔ دوران گفتگو میں اپنے آباؤ اجداد کی بابت دریافت کیا ۔ باپ نے جواب دیا ترکوں کی تواریخ میں لکھا ہے کہ ہماری نسل یافث اغلان سے چلتی ہے جن کو ابوالاتراک بھی کہتے ہیں ۔ یافث اغلان ترکوں کے تاجدار اول جعفت Japhet تمر کے بیٹے تھے جب کہ جعفت کا پانچواں لڑکا اولجہ خان Oljeh khan تخت نشین ہوا ۔ خدائے متعال نے اس کو جوڑواں بچے دئے ۔ ایک کا نام تاتار اور ایک کا مغل رکھا ۔ اولجہ خان نے اپنی زندگی میں

---

[۵۱] تیمور ۔ بمعنی فولاد

سلطنت ترکستان ان دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دی۔

تاتا۔ اور مغل نے با اختیار ہونے کے بعد طریق حقیقت ترک کر دیا اور مذاہب غیر حق پر گام زن ہوئے۔

تاتار کے آٹھ لڑکے تھے جن سے آٹھ اولوس Oulus قبیلوں کا سلسلہ چلا۔ مغل کے نو[9] لڑکے جن سے نو قبیلوں کی بنا پڑی۔ یہ دونوں جتھے ترکستان کے میدانوں میں اکثر مصروف جنگ رہتے تھے۔

آخر الامر طومنا خاں بر سر اقتدار آیا۔ اس کے ہاں کجولی اور قبلائی خاں توام لڑکے ہوئے۔ جب یہ دونوں بھائی جوانی کو پہنچے تو کجولی نے خواب دیکھا کہ اس کے بھائی قبلائی خاں کے سینے سے دو ستارے بلند ہوئے اور غروب ہو گئے۔ بعدہٗ ایک اور ستارہ طلوع ہوا۔ جو آب و تاب میں آفتاب جہاں تاب کا ہم پلہ تھا۔ یہ خواب بیٹے نے باپ سے بیان کیا۔ اس نے بشارت دی کہ تیرے بھائی کے ہاں تیسری پشت میں با اقبال کامگار و کامراں لڑکا ہوگا۔

کچھ عرصہ بعد طومنا خاں نے خوانین اور بزرگان قوم کو مدعو کیا۔ اس مجمع کے روبرو دونوں بھائی بغل گیر ہوئے اور عہد کیا کہ باہمی جنگ و جدال سے احتراز کریں گے اور یہ قرار پایا کہ خانی کا اعزاز قبلائی خاں کی اولاد میں رہے گا اور کجلی کی اولاد سپہ سالار۔ اور یہ قول و قرار ایک تختی پر کندہ کر کے محفوظ کئے گئے۔

۵۴۹ھ میں قبلائی خاں کے بڑے بیٹے منغو بہادر Mango-Bahadur کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کے دونوں ہاتھوں میں خون تھا۔ تیموجے Timuji نام رکھا۔ انچاس برس کی عمر میں سخت خطروں اور دشواریوں کے بعد یہ لڑکا تخت ترکستان پر متمکن ہوا۔ اسی دن ایک مرد خدا بر سر دربار آیا اور اعلان کیا کہ بارگاہِ باری تعالیٰ سے چنگیز خاں کا خطاب اور تاجداری ہفت اقلیم تجھے عطا ہوئی ہے۔

چنگیز خاں نے اپنی وفات کے دن صبح کے وقت حکومت ماوراء النہر اپنے بڑے لڑکے

چغتائی خاں کو دی اور قراچار نویان ولد ایزدامجان برلاس Ayzdumjan Barlas ولد کچولی بہادر کو وزارت اور سپہ سالاری عطا فرمائی قراچار نویان میرے چوتھے اور تمھارے پانچویں جد ہیں بعدہٗ وہ عہد نامہ طلب کیا جو کچولی اور قبلائے خاں کے درمیان ہوا تھا۔ پہلے چغتائی خان نے پڑھا اور پھر قراچار نویان کو دیا اور گورگان (شہریار جلیل القدر) کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

قراچار نویان کو خدا نے لڑکا دیا جس کا نام ایچل نویان رکھا۔ قراچار مجوسی کیش تھا جو خدا کا وجود ہر شئے میں مانتے ہیں۔ یہ اعتقاد قراچار کے واسطے باعث تشفی نہ تھا اس وجہ سے اکثر بزرگان دین سے جویائے حق رہتا۔ اس ہی سلسلہ میں کسی مسلمان سے اعتقادات اسلام دریافت کئے اس نے۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی تلقین کی۔ قراچار ایمان بالیقین لایا اور وسعتِ ملک میں دین پھیل گیا۔ پھر انتظامِ ملک داری کی طرف رجوع ہوا اور سرزمینِ ایران کو ایلات میں منقسم کر دیا۔ اور کیش کے سرسبز میدانوں کو اپنے قبیلہ برلاس کے لئے مختص کیا۔ پھر ملک گیری کا ارادہ کیا۔ کاشغر۔ بدخشاں۔ اندیجان۔ حصار۔ اور خراسان کو فتح کر اپنا ذاتی تعلقہ بنالیا۔

جب قراچار نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا تو اس کا خلف الرشید۔ الطی قوص Altiqus عہدہٗ سپہ سالاری پر مامور ہوا بعدہٗ جب تمھارے دادا امیر برقل سپہ سالار ہوئے تو قبیلہ میں فساد و عناد کی گرم بازاری تھی اس فضا سے برداشتہ خاطر ہو کر عہدہ سے دست بردار ہوئے۔ ان کے بعد میں قبیلہ کا سردار بنا اکثر درویشوں کی خدمت میں رہتا تھا اور طالب دعا۔ کہ ربِّ کریم مجھے فرزند ارجمند عطا فرمائے۔

میں صحبت مصاحبین خدا میں حاضر تھا کہ ایک نجومی آیا اور کہا کہ "گردشِ کواکب انجم سے یہ بات آشکارا ہے کہ ۷۳۶ھ میں تمھارے صلب سے فاتح عالم پیدا ہوگا۔"

آواز۔

دراحکام ہفت اختر آمد پدید   کہ دنیا بدو دار خواہد کلید

تنقید و تبصرہ

دلی کا سنبھالا سنتے آئے ہیں اور دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے کہ مرنے والا بیمار مرتے مرتے ایک بار سنبھالا لیتا اور موت کے سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے ایک دفعہ ابھر تا ہے، بیماری کی ساری تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں اور موت کی سب علامتیں غائب منہ پر رونق اور بدن میں جان سی آ جاتی ہے۔ ہچکی کا تڑپنا سکون سے بدلتا ہے اور کرب آرام سے جو دیکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ بیمار تیماردار دونوں کی آس بندھ جاتی ہے۔ یاس و ناامیدی کے چھائے ہوئے بادل پھٹتے ہیں اور زندگی کا بجھتا ہوا چراغ پھر سے روشن ہو جاتا ہے اسی کو سنبھالا کہتے ہیں مگر سنبھالا لینے والا ابھی سنبھلنے نہیں پاتا کہ دفعتہً صرصر فنا کا جھونکا آتا ہے اور ایک جان ناتواں کے چراغ کے ساتھ ہزاروں امیدوں کی شمعیں بجھاتا ہوا اس شان بے نیازی سے نکل جاتا ہے کہ گویا کہیں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ان کو پرواہی نہیں ہوتی کہ پس ماندوں پر اب کیا گذر گئی۔ وہ روتے رہ جاتے ہیں اور اتنا روتے ہیں کہ ان کا رونا بھی اکثر ایک یادگار بن جاتا ہے۔ ادبی دنیا میں مرنے والوں کی تاریخ اور مرثیے رونے والوں کے رونے ہی کی تصویریں ہوتی ہیں جن کو مرنے والوں کے نام لیوا چھاتی سے لگائے لگائے پھرا کرتے ہیں۔

یہ سانحہ جسے سنبھالا کہتے ہیں کچھ آدمی ہی کو پیش نہیں آتا بلکہ جس چیز کے لئے استعارۂ حیات و ممات ممکن ہے ادبی دنیا میں وہ بھی سنبھالا لیتا ہے، خواہ وہ علم ہو یا ہنر، تہذیب ہو یا تمدن، قوم ہو یا حکومت، شہر ہو یا ولایت اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ دلی کا سنبھالا کیا ہوگا۔ اگر نہیں سمجھے تو مجھ سے سنئے۔

دلّی، پرانی دلّی نہیں بلکہ شاہجہاں کی نئی دلّی کبھی سارے ہندوستان کی راج دھانی بلکہ ساری راج دھانیوں کی رانی تھی، دنیا بھر کی خوبیاں اس کی ذات میں جمع تھیں، طاقت و شوکت، تہذیب و تمدن، آن بان کونسی بات تھی جو بدرجہ کمال اس میں نہ تھی، لیکن ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے سدا رہے

نام سائیں کا آخر اس کا بھی آخری وقت آیا۔ رفتہ رفتہ دم خم سب رخصت ہوئے ضعف کی بیماری نے زور پکڑا اور نوبت یہاں تک آئی کہ جان پر آن بنی مگر مرتے مرتے اس نے بھی سنبھالا لیا۔ تن مردہ میں جان سی آگئی وہ دم خم تو اب کہاں تھے مگر کچھ کچھ اہل کمال اس میں وہ پیدا ہوئے اور جابجا نظر آنے لگے جو ایک مدت سے مفقود تھے، اسی دور مختصر کی ایک داستان کا نام دلّی کا سنبھالا ہے۔ دیکھنے والوں نے اس دور کو دیکھا۔ جو دیکھا تھا اولاد کو سنا گئے۔ ان سننے والوں نے اپنی اولاد کو پہنچایا۔ وہی سنی سنائی باتیں ہیں جن کو خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے دلّی کا سنبھالا نام کتاب میں درج کر دیا ہے۔
یہ داستان یا سستان کیا ہے اور لکھنے والے نے کیسی لکھی ہے اس کی تفصیل خود کتاب بتائے گی اجمال اس کا یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں دلی کے آخری دور، اس دور کی سوسائٹی اس کے علم و ہنر فضل و کمال، اخلاق و ادب، طرز ماند و بود، طور معاشرت انداز نشست و برخاست، ناچ رنگ، بولی ٹھولی کی ایک خوبصورت و خوش رنگ تصویر کھینچی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی بہت سی بھولی بسری باتیں اور حکایتیں اس سے یاد آ جاتی ہیں، اور پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپکو کسی اور ہی عالم میں پاتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں بہت سی مجلسیں جمائی اور محفلیں سجائی ہیں پلاٹ داستان کا خیالی ہے مگر اشخاص تقریباً سب واقعی۔ نام البتہ کسی کسی کے بدل دئے ہیں وہ بھی بمصلحت، ورنہ کتاب کی بات بات حقیقت واقعی کا آئینہ ہے زبان کتاب کی خاص دلی کی زبان ہے۔ وہ بھی روزمرہ اور محاورات میں ڈوبی ہوئی مگر رواں اور اتنی رواں کہ رکنا، اٹکنا الجھنا جانتی ہی نہیں، انداز بیان سادہ بھی ہے اور رنگین بھی متانت لئے ہوئے بھی اور شوخی میں ڈوبا ہوا بھی مگر ہر رنگ اپنی جگہ پر کھلتا ہوا فنی اصطلاحات بھی جو ادب و انشا پردازی کا ایک لوازمہ ہیں، جا بجا آ جاتی ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ بڑا لطف دیتی ہیں ادب لطیف کے شوقینوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ کتاب کی کتابت میں کہیں کہیں غلطیاں ہیں جو نہ ہونی چاہئے تھیں۔ امید ہے کہ مکتبہ جامعہ ملیہ دوسرے اڈیشن میں صحت کتابت کا زیادہ اہتمام کرے گا۔

”ع“

تین پیسے کی چھوکری (از جناب قاضی عبدالغفار صاحب) داستانِ حسن و ہوس کو قاضی صاحب موصوف جس انتظام اور شرح و بست کے ساتھ بیان کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ کتابِ دل ان کے روبرو کھلی رہتی ہے۔ بادۂ حسن چھلکتی اور اربابِ عشق سے چھیڑ چھاڑ ان کا پرانا مشغلہ ہے۔

قاضی صاحب کی انگلیاں وہ انگلیاں ہیں جنھوں نے صحیفۂ عشق کی برسوں ورق گردانی کی ہے۔ نبض عاشق کو پہچانتے شکنِ جبینِ حسن کو جانتے اور سیہ مست طبع بوالہوس سے پوری طرح واقف ہیں۔

پہلی کہانی خنگِ ادہم ہوس رانی کی داستان ہے۔ اس میدان میں مصنف کی طبع چابک دست شہسوارانہ کلیلیں کرتی چلی جاتی ہے۔

استیف۔ گاؤں کا بچھیرا سمندِ حسن کی چالوں سے ناآشنا ملکہ تھیوڈورا کی نظر چڑھ جاتا ہے اور انجام کار نذرِ امواج باسفورس ہوتا ہے۔

اس تین پیسے کی چھوکری کے دستِ قدرت میں عنانِ فرسِ قسمت جن چالوں سے آتی ہے وہ اس طبقہ کے پرانے ہتکھنڈے ہیں جن سے مرد آشنا ہوتے ہوئے ناآشنا بنتے اور "ہلاکِ فریبِ مجاز" ہوتے ہیں۔

استیف تو گرفتار جب حسنِ مرد آزما سے دوچار ہوتا ہے تو جو کیفیات دل و دماغ پر طاری ہوتی ہیں ان کا سمجھنا اور بیان کرنا قاضی صاحب کا حق ہے اور حق ادا کرتے ہیں۔

جہاں تک داستان کی زبان کا تعلق ہے خامۂ تنقید سرِ نیاز جھکا کر عرض پرداز ہے کہ قابل مصنف نے اس جانب زیادہ کاوش نہیں کی ورنہ قاضی صاحب جیسے ادیب سے ایسے پیش پا افتادہ سہو ہو جانے قرینِ قیاس نہیں مثلاً صفحہ گیارہ پر فرماتے ہیں کہ "ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی بھاتا نہ تھا۔ اب وہ منظرِ عام پر تھرکنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی"۔ ہماری رائے میں اس جملہ میں زبان کا توازن قائم نہیں رہا ایک طرف بھاتا نہ تھا' اور 'تھرکنے' پر نظر پڑتی ہے دوسری طرف 'منظرِ عام' اور 'مخصوص خلوتوں میں بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی' نظر آتا ہے۔ آگے چل کر صفحہ بارہ پر فرماتے ہیں۔ 'حسین تھیوڈورا اپنی دکانِ حسن کھولتے ہی دلوں

کی مالک ۔ آنکھوں کا تارا ۔ کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی' اس فقرہ کی آخری تینوں صفتیں یعنی 'آنکھوں کا تارا ۔ کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ' زبان میں حسن فروشی معشوق کے لئے نہیں بلکہ اولاد کے لئے استعمال کی جاتی ہیں ۔ اسی صفحہ پر آگے فرماتے ہیں 'نوجوان شہنشاہ جسٹینین بار ہا اس کو تھیٹر میں ناچتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجوم عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا' جہاں تک ہمارا علم ہے چہل پہل کرنا نہیں بولا جاتا ۔

'وہ میرا انتظار کر رہی ہے' کے عنوان سے جو چیز لکھی گئی ہے پرواز تخیل شکوہ زبان اور انداز بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتی ۔ تاہم کہیں کہیں زبان کی طرف سے 'بے پروائی ظاہر ہوتی ہے مثلاً صفحہ چونتیس پر تین سطروں میں سات جگہ لفظ 'تھی' استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ تکرار طبع لطیف پر بار ہے ۔ ہم قابل مصنف سے نیاز مندانہ درخواست کریں گے کہ اپنے قدر دانوں کی خاطر ۔ زبان اردو کی خاطر ۔ زبان کی طرف ذرا زیادہ اعتنا فرمایا کریں ۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی تحریر ایک گلزار ہے ۔ اگر یہ کانٹے نہ ہوں تو بے خار بن جائے ۔

'میں' کے عنوان سے جو مضمون ہے اس کی تعریف حد امکان سے باہر ہے ۔ زبان مرصع ہے ہر لفظ لعل و گہر ۔ کیفیات حیات جو غیر محسوس طریقہ پر ہر نوجوان پر طاری ہوتی ہیں ان کا مرقع ہے ۔ شہباز تنقید پابوس ہو کر رہ جاتا ہے ۔

قمیص ۔ ترجمہ ہے لیکن ترجمہ معلوم نہیں ہوتا صفحہ اکسٹھ پر شرابیوں کی بے ربط گفتگو سہل الممتنع کا نمونہ ہے ۔ صفحہ انچاس پر ایک سطر میں چار جگہ لفظ 'تھا' اور ایک جگہ 'تھی' استعمال کیا گیا ہے اور سارے پیراگراف میں جو دس سطروں کا ہے اس لفظ کی تکرار چھبیس جگہ نظر آتی ہے اور مضمون کو نظروں سے گراتی ہے ۔

'دیوتاؤں کا صدقہ' چاہ کن را چاہ درپیش کی اچھی مثال ہے ۔

'ڈپٹی صاحب کا کتا' اور 'سراغ رساں' پولیس کی ذہنیت اور قابلیت کی مثال کا ایسا نمونہ ہے جو ہندوستان میں دن رات نظر آتا ونے نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ ادیب انہی چیزوں کو پیش

کرتا ہے اور پڑھنے والا کہتا ہے ' یہ بھی میرے دل میں ہے '۔

'سزائے موت' کی زبان نہایت عمدہ اور اندازِ بیان بہت سلجھا ہوا ہے۔ لیکن اس قسم کے مضامین عموماً کسی تخیل کے ماتحت لکھے جاتے ہیں۔ یعنی ملک یا قوم کا کوئی قانون یا دستور مدنظر ہوتا ہے اس کی ہجو یا مدح مدعا۔ لیکن قاضی صاحب کے اس مضمون کا کچھ عقدہ نہیں کھلتا۔ یا تو عنقائے معنی ایسا بعید ہے کہ شاہینِ فہم و فراست کی گرفت میں نہیں آتا یا عنقا ہے۔

'گھوڑا' ٹگور کا تخیل ہے۔ گھوڑا استعارہ ہے اور نفس مدعا کچھ اور طبیعت سزائے موت میں اس ہی مدعا کی متلاشی ہے جو نہیں پاتی اور کمی محسوس کرتی ہے۔ قاضی صاحب کے ترجمہ کی یہ خصوصیت ہے کہ مضمون کو کچھ ایسا اپنا لیتے ہیں کہ اپنا بنا لیتے ہیں۔

'نتیجہ برا ہے' میں ماسٹر صاحب کی تصویر مصنف نے ایسی کھینچی ہے کہ گویا آنکھوں کے سامنے لا بٹھایا۔ روزمرہ کی زندگی میں اکثر خاص قدرت کے نمونے نظر آتے ہیں لیکن قاضی صاحب کی نظر درکار ہے جو ان کا اس طرح جائزہ لے لے۔ اس مضمون میں بھی زبان میں ایک چیز نظر آتی ہے جس کو کہتے ہوئے زبان رکتی ہے۔ صفحہ ۱۳۲ ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں 'عینک۔ اپنے خانہ کے اندر ملفوف ہو جاتی تھی' ہمارے خیال سے خانہ میں چیز ملفوف نہیں ہوتی۔ داخل ہوتی ہے۔ رکھی جاتی ہے۔ بند کی جاتی ہے۔ 'لف' کے معنی لپٹنے کے ہیں اور خانہ میں چیز لپٹتی نہیں۔

"فریب' ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

'میں اکیلا ہوں' میں فلسفۂ موت و زیست اچھے الفاظ اور اچھے انداز میں لکھا گیا ہے۔

کتاب زیرِ نظر قابلِ قدر ہے۔

"خ۔ م۔ ش"

تاجدار بیوی کا بے تاج شوہر (از آنریبل سر شیخ عبدالقادر صاحب) افراد کے نام حسنِ ذوق کا نتیجہ ہیں اور نہایت موزوں۔ زبان شستہ ہے۔

تیسری سطر میں شعر انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا ہے اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔

گفتگو کی زبان بولنے والے کے مناسب اور صنف نازک کے مطابق ہے۔ بعض بعض جگہ شہزادی اور ملکہ کی زبان میں توازنِ لفظی قائم نہیں رہتا۔ لیکن جب ہم بولنے والوں کے کیرکٹر پر غور کرتے ہیں تو یہ عیب نہیں رہتا۔ وہ عورتیں ہیں لیکن سیاست سے وابستہ۔ پس زبان میں بھی دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔

مدبر الملک جو کچھ کہتا ہے نہایت ادب لیکن وثوق کے ساتھ۔

صفحہ دس پر شہزادی حسن پسند اپنی بھتیجی ملکہ جمیلہ سے شہزادہ غیرت مند کی تعریف کرتی ہے ملکہ جواب میں کہتی ہے مجھے اس کو دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے! آگے چل کر شہزادہ غیرت مند اپنے باپ طامع شاہ کے روبرو ملکہ کی طرف خطاب کرکے کہتا ہے۔ کہ آپ کی لطف آمیز مہمان نوازی۔ واللہ یہ سیر نہ بھولے گی، ملکہ کی بات زیادہ اور شہزادہ کی قدرے کم مشرقی طبیعت کو اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ قصہ مغرب کا ہے مشرق کا نہیں۔

زبان میں کہیں کہیں معمولی سقم نظر آتے ہیں صفحہ ۸ پر فرماتے ہیں کہ از روئے کانسٹی ٹیوشن کے اس کے بعد کے کیا۔ واللہ اعلم کاتب کی غلطی ہے یا مصنف سے سہو ہوا ہے صفحہ ۱۸ پر شہزادہ غیرت مند ملکہ جمیلہ سے کہتا ہے اس وقت مجھے بے کلی سے ذرا کل آئی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ مندرجۂ ذیل شعر پر بر سر مشاعرہ جو مومن پر اعتراض ہوا تھا اس کی یہاں بھی گنجائش ہے ؎

وہ شوخ گرم گرم جو آکر چلا گیا   وہ بے کلی ہوئی کہ مجھے غش سا آگیا

وطن آخر وطن ہے، ترجمہ ہے اور صاف طور پر ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ بہرکیف اس قسم کے افسانوں کی ملک اور قوم کو ضرورت ہے۔

دل ہی تو ہے، ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

کتاب زیر تبصرہ اچھی ہے اور پڑھنے کے قابل۔

"خ۔ م۔ ش"

یادگارِ محشر | از عبداللہ صاحب محشر مرحوم مرتبہ اشفاق حسین خانصاحب گورکھپوری۔ مطبوعہ آسی پریس گورکھپور۔ سائز چھوٹا۔ صفحات ۸۴۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً اشفاق حسین خانصاحب ہی سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب مسٹر عبداللہ صاحب محشر مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جس کو ان کے دوست اشفاق حسین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ مرحوم سینٹ انڈریوز کالج گورکھپور میں بی۔اے میں تعلیم پا رہے تھے کہ عین آغاز شباب میں صیاد اجل کی نذر ہو گئے۔ اسی سبب سے ان کا اپنا کلام صرف ۶۲ صفحوں پر مشتمل ہے جو صفحہ ۲۲ سے لیکر صفحہ ۸۴ پر ختم ہو جاتا ہے۔ شروع میں جناب مجنوں گورکھپوری اور دیگر حضرات کے مختصر نوٹ ان کے کلام اور حالات زندگی کے متعلق درج ہیں جن کو مشکل ہی سے تبصرہ یا تنقید کہا جا سکتا ہے۔ کتاب میں مرحوم کی دو تصاویر بھی شامل ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔

مصنف نے باوجود کم سنی کے قریب قریب ہر صنف شعر میں طبع آزمائی ہے لیکن کلام کا بیشتر حصہ غزلوں ہی پر مشتمل ہے جن کی تعداد پچیس تیس سے زائد نہ ہوگی۔ جو پختگی کہنہ مشق شعراء کی خصوصیت ہوتی ہے وہ تو محشر صاحب کے کلام میں نہ ملیگی لیکن ان کے بعض اشعار میں جاذبیت ہے جو کیف و اثر سے خالی نہیں اور جو اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ وہ اگر زندہ رہتے تو آئندہ چل کر ایک خوشگو شاعر ہو جاتے۔ اشعار میں کہیں کہیں جذبات کا سیلاب بھی امڈا نظر آتا ہے اور بعض جگہ دلپذیر و دلفریب تراکیب بھی ملتی ہیں جس سے کلام میں مزید دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ ان کے کلام سے درج کئے جاتے ہیں:-

کس کے حسنِ شوق افزا کی نمائش کیلئے — ذرہ ذرہ اس جہاں کا آئینہ بردوش ہے
المدد اے ضبطِ جاں راز افشا ہو نہ جائے — اس فضائے صبح میں کوئی سراپا گوش ہے

اللہ رے فریب تماشائے رنگ و بو — دنیا کو بھی نظر نے پری خانہ کر دیا
مرجع ہے تشنگانِ مئے عشق کا یہی — اہلِ جنوں نے دشت کو میخانہ کر دیا

اف تری زلفوں کا شانوں پر بکھرنا الاماں   حسن کی معصومیت منت کش شانہ نہیں

(ح ۔ ی ۔ ع)

ہندوستان کی کہانی | از عبد السلام قدوائی ندوی ۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ سائز درمیانہ صفحات ۷۶ ۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک رسالہ ہے جس کو مصنف نے ابتدائی مدارس کے بچوں کے لئے سہل اور آسان زبان میں تحریر کیا ہے ۔ اب تک جتنی کتابیں چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں اُن میں زیادہ تر افسانوی رنگ جھلکتا ہے ۔ اگرچہ یہ رنگ بچوں میں تاریخ جیسے خشک مضمون کا ذوق پیدا کرنے کے خیال سے اختیار کیا گیا ہے لیکن بعض حضرات پر یہ رنگ اس بری طرح غالب ہے کہ انھوں نے ان کتابوں میں من گھڑت اور بے بنیاد قصے بھی لکھ ڈالے ہیں جو تاریخی اعتبار سے ہرگز قابل اعتماد نہیں ۔ جدید تحقیق نے ان واقعات کو قطعاً بے بنیاد ثابت کر دکھایا ہے مگر لکھنے والے "بلیک ہول" جیسے جھوٹے واقعات کو ابھی تک برابر داخل کتاب کئے جاتے ہیں اور بچوں کو غلط اور فرضی تاریخی واقعات سے روشناس کراتے ہیں ۔ عبد السلام صاحب نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہ لکھی جائے جو تاریخی حیثیت سے غیر مستند ہو ۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بچوں کے لئے مفید ہے ۔ اس کے علاوہ مصنف نے افسانوی رنگ بھی اختیار نہیں کیا ہے بلکہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے لکھا ہے ۔

کتاب میں شروع سے لیکر انگریزوں کے زمانہ تک کی تاریخ درج ہے لیکن افسوس ہے کہ مصنف نے بعض چیزوں کو اس قدر اختصار کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ مزید شرح و بسط کی محتاج ہیں ۔ مسلمانوں کے عہد حکومت کی تاریخ ۸۰ صفحوں میں ختم ہوتی ہے لیکن ہندوؤں کے زمانہ کی تاریخ صرف چار صفحوں میں تحریر کی گئی ہے ۔ اسی طرح انگریزی عہد حکومت کے بعض واقعات کو بھی بےحد مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے ضرورت ہے ان کو کسی قدر اور پھیلاؤ کے ساتھ تحریر کیا جائے تاکہ کتاب میں توازن قایم رہے اور ہندوستان کے سیاسی اور تاریخی ارتقا کو بچے آسانی سے سمجھ سکیں ۔ کتاب کا کاغذ اور چھپائی عمدہ مگر قیمت زیادہ ہے ۔   (ح ۔ ی ۔ ع)

تعمیرِ نو | مصنفہ عبداللہ انور بیگ صاحب۔ مطبوعہ اُردو اکیڈمی پنجاب لاہور۔ قیمت عہ

عہدِ حاضر میں جبکہ تمام قومیں سیاسی اور اقتصادی تگ و دو میں بازی لے جانے کی فکر میں ہیں، نظامِ کہن کو شکست کیا جا رہا ہے، ہماری سوسائٹی ایک زبردست انقلابی دور سے گذر رہی ہے اور ہر قوم کے لئے مختلف مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ہندوستان بھی بین الاقوامی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن آج بھی ہندوستانی مسلمانوں پر جو کسل وجمود طاری ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو ایک شاہراہِ عمل دکھلا کر ان میں ہیجان و ولولہ پیدا کیا جائے اور قصرِ اسلام کی از سرِ نو تعمیر کی جائے۔ اسی خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مصنف نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔

مسلمان آج ہر جگہ پستی میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں جس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی روایات کو ترک کر دیا، قرآن پاک جو ہمارے لئے شمعِ ہدایت کا کام دیتا ہے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، بجائے اس کے کہ اقوام ہماری تقلید کرتیں ہم ان کے مقلد بن گئے اور اپنے اخلاقِ حمیدہ کو چھوڑ کر بد اخلاقیوں کی دلدل میں جا پھنسے۔ اسلام میں حکومت کی بنیاد جمہوریت پر قائم تھی، ہمارے خود پرست بادشاہوں نے رائے عامہ کی پروا نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی اور اقتصادی کمزوری پیدا ہو گئی۔

مصنف نے کتاب میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب وعلل سے اچھی طرح بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ اب ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ انھوں نے زور دیا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی روایات کو پھر سے زندہ کریں اور قرآن پاک کو علومِ جدیدہ کی روشنی میں مطالعہ کریں اور اس کے مطابق عمل کریں کیونکہ عمل ہی زندگی کا دوسرا نام ہے، عمل ہی سے ہم اپنے لئے فردوس تیار کر سکتے ہیں اور عمل ہی سے ہم اپنے آپ کو جہنم میں ڈال سکتے ہیں ورنہ ؏ "یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے" انھوں نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ موجودہ مادی دور میں سائنس اور مشین سے استفادہ کرنا لازمی ہے کیونکہ دورِ حاضر کی ایجادات سے روگردانی کے معنی یہ ہیں کہ ہم افلاس وبیچارگی میں گھر جائیں۔ مسلمانوں میں

تجارتی ذہنیت کی تربیت کی بھی ضرورت بتلائی ہے کیونکہ صنعت وحرفت اور تجارت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ من حیث الکل عبداللہ انور صاحب کی یہ تصنیف پڑھے جانے کے قابل ہے۔

(ح۔ ی۔ ع)

مطائبات | از سندباد جہازی مطبوعہ اُردو اکادمی پنجاب لاہور۔ چھوٹا سائز قیمت عہ

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اخبار احسان لاہور میں سندباد جہازی کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین سیاسی لطیفوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض صرف پھبتیاں ہیں۔ کتاب مجموعی طور پر اچھی ہے۔ کہیں کہیں لطیف مذاق کی چیزیں بھی نظر آجاتی ہیں جیسے "سر شہاب الدین کی بھینس"، "مصنوعی دل"، اور "علمی ذوق رکھنے والی گائے" وغیرہ۔ کتابت چھپائی معمولی ہے۔ (ح۔ ی۔ ع)

تفسیر جواہر | علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور عربی تفسیر کا اردو ترجمہ جزاول تا سورۂ بقرہ۔ مترجمہ مولانا عبیدالرحمٰن صاحب رحمانی استاد جامعہ عربیہ دارالسلام عمرآباد۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، طباعت وکتابت وکاغذ عمدہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات تقطیع ۲۶×۲۰/۸۔ قیمت فی نسخہ ۲ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری صاحب عمر لائبریری عمرآباد متصل آمبور ضلع شمالی ارکاٹ صوبہ مدراس۔

علامہ طنطاوی جوہری زندہ مفسرین میں سے ہیں۔ اور انکی تفسیر نے شہرت عام حاصل کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ عہد کی حالت اور ضرورت کو پیش نظر رکھکر قرآن کریم کی تشریح کی ہے۔ یہ تفسیر بہت مطول ہے۔ مولانا عبیدالرحمٰن صاحب رحمانی نے اسکی نافعیت کو دیکھتے ہوئے اس کا ترجمہ اردو میں کیا۔ کے محمد اسمٰعیل صاحب صدر جامعہ دارالسلام عمرآباد نے ازراہ خدمت اسلام اس کے مصارف طباعت اپنے ذمہ لئے اور کے محمد ابراہیم صاحب سکریٹری عمر لائبریری

نے اس کو چھپواکر شائع کیا۔

ترجمہ صاف اور اچھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ کتاب اردو ہی میں لکھی گئی ہے۔ ابھی اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ بقیہ جلدیں بھی سلسلہ وار شائع کی جائیں گی۔

تراجم علماء حدیث ہند | جماعت اہل حدیث کا آج سے پچیس سال پہلے سے یہ خیال تھا کہ انکے علماء کی تاریخ میں ایک کتاب مرتب کی جائے۔ چنانچہ اسی وقت سے علماء کے تراجم فراہم کئے جانے لگے جن میں سے بعض بعض اخبار اہل حدیث امرت سر میں شائع ہوتے رہے۔ امسال مولوی ابویحیٰی امام خانصاحب نوشہروی نے علماء حدیث کے تراجم جن کی تعداد دوسو سے بھی زیادہ ہے جمع کرکے مندرجہ بالا نام سے شائع کئے ہیں اس میں صرف دہلی اور صوبہ متحدہ کے گذشتہ اور موجودہ علماء اہل حدیث کے تراجم ہیں۔ دوسری جلد میں بقیہ حصص ہند کے علماء اہل حدیث کے تراجم ہونگے اس کتاب میں مصنف نے بہت محنت کی ہے۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ سالہا سال سے وہ اس میں لگے ہوئے تھے یہاں تک کہ انھوں نے اپنی تجارت اور مالی حالت بھی اس کے پیچھے خراب کرلی۔ جابجا سفر کیا اور علماء سے ملاقاتیں کیں اور ان کے حالات فراہم کئے جس کے بعد یہ کتاب جو ۷۷۵ صفحوں کی ہے شائع کرکے جماعت اہل حدیث کی دیرینہ آرزو پوری کی۔ اگرچہ یہ پہلی کوشش ہے اور ابھی اس میں اضافہ اور اصلاح کی گنجائش ہے لیکن پھر بھی نہایت قدر کے قابل ہے۔ مجھے امید ہے کہ جماعت اہل حدیث کے افراد اپنی اس متاع گرانمایہ کو جو ان کے علماء کے حالات میں ہے بہ شوق سے خریدیں گے۔ اور مصنف کی حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ وہ دوسری جلد بھی شائع کرسکیں۔ قیمت فی نسخہ ۶ہر ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ عبدالحئی دارالاخوان مقام سوہدرہ۔ گوجرانوالہ۔ پنجاب

طلوع اسلام | یہ رسالہ دہلی سے مولوی محمد عثمان صاحب کی ادارت میں مئی ۱۹۳۸ء سے ماہوار نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے پیش نظر مسلمانوں میں خالص اسلامی اور جماعتی زندگی پیدا کرنا ہے۔ اور قرآن کریم اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اشعار کے حقائق کی توضیح اسکا نمایاں امتیاز ہے۔ اب تک اس کے پانچ نمبر نکل چکے ہیں۔ مقاصد اور مضامین کے لحاظ سے ہر نمبر اپنے سابق سے بڑھ کر ہے۔ اور ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جن خوبیوں کا یہ حال ہے، انکے مطابق اس کی قدردانی بھی ہو رہی ہے۔ یہ رسالہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے اور اس کی آمدنی صرف اسی رسالہ پر یا اسکے مقاصد کے متعلق دیگر تصانیف پر خرچ کی جائے گی۔

ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو پابندی وقت کے ساتھ ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۸۰ صفحات کی ضخامت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ قسم کا۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ (صہ)

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ طلوع اسلام۔ بلیماران، دہلی۔

برہان | یہ ماہانہ رسالہ دہلی کی ندوۃ المصنفین کی طرف سے جولائی ۱۹۳۸ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ جماعت علمار دیوبند کی ہے جنھوں نے اس سال ندوۃ المصنفین دہلی اس غرض سے قائم کی ہے کہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے عہد حاضر میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے اور علوم مغربیہ و مادیہ کے رواج کے باعث مذہب سے مسلمانوں کو جو بعد ہوتا جا رہا ہے اس کو روکنے کی موثر تدابیر اختیار کرے۔ یہ حضرات اپنے ارادوں میں پختہ اور مقاصد میں مخلص ہیں اور ضروریات زمانہ اور اسلامی علوم سے باخبر۔ اس لئے مجھکو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو اپنے مقاصد میں کامیاب کریگا۔

رسالہ کے مدیر اور مرتب مولوی سعید احمد صاحب اکبر آبادی ہیں جو دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور ایم اے کی ڈگری اور اس کے ساتھ اسلامی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اور سلیقہ تحریر میں بھی ممتاز ہیں۔

ابتک اس رسالہ کے تین نمبر نکل چکے ہیں جو اپنے مقاصد کے لحاظ سے نہایت موزوں اور مضامین کے لحاظ سے نہایت اچھے ہیں۔ اور مزید براں کتابت طباعت اور کاغذ کے لحاظ

سے ممتاز ہیں۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔
ملنے کا پتہ :- ناظم صاحب ندوۃ المصنفین۔ قرولباغ۔ نئی دہلی۔

نیپّون | یہ عربی زبان کا ماہوار رسالہ جاپان کے دارالخلافہ ٹوکیو سے نکلنا شروع ہوا ہے جسکا پہلا نمبر جنوری ۱۹۳۸ء کا ہمارے پاس ریویو کی غرض سے موصول ہوا ہے۔ رسالہ مصور ہے اور کاغذ اور طباعت کے لحاظ سے انگریزی کے اچھے اچھے رسالے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس میں جاپان کے جغرافی، تاریخی، تعلیمی، صنعتی اور قوت دماغی وغیرہ کے حالات کے متعلق مضامین ہیں نیز جاپانیوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا جو احترام ہے اس کی بھی تشریح ہے۔ اور غالباً اس رسالہ کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے ذریعہ سے مسلمانوں کے ساتھ جاپانی قوم کا رشتۂ مودّت مستحکم کیا جائے۔ معلوم نہیں کہ جاپانی زبان میں بھی کوئی اس قسم کا رسالہ وہاں نکالا جاتا ہے یا نہیں جس کے ذریعہ سے جاپانی قوم جو اس رسالہ کے بیان کے مطابق اسلام کے قریب تر آچکی ہے کچھ اسلامی تعلیمات سے واقف ہو۔ (ا۔ ج)

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

ہٹلر نے چکوسلوواکیا فتح کر لیا، جو لوگ اس کی سیاست کو سمجھے نہ تھے ان کا خیال تھا کہ وہ لڑیگا' جو برطانیہ اور فرانس کی سیاست کو سمجھتے نہ تھے ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں مل کر اس کی مخالفت کریں گے اور روس اور شاید رومانیہ ان کا ساتھ دیگا ہٹلر کے حملے کی تاریخ بھی معلوم کر لی گئی تھی اور اس میں بھی شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ اسی تاریخ کو یورپ کے بارود خانے میں آگ لگ جائے گی، لیکن ہٹلر نے اپنا مطلب حاصل کر لیا اور بارود خانہ ویسا ہی ٹھنڈا پڑا ہے' بارود ہوتی تو جلتی۔ برطانوی سیاست کا ارادہ تو اسی وقت ظاہر ہو گیا تھا جب لندن ٹائمز نے دوستانہ طریقے پر چک حکومت کو مشورہ دیا کہ سڈیٹن علاقے کو الگ کر دے' لیکن یہ ارادہ پہلے تو ٹائمز پر خفا ہو کر چھپا پا گیا اور پھر فرانس کی تیاری کے چرچے کر کے اور برطانیہ کی اس قدیمی وفاداری کا بار بار اعلان کر کے جو ہر دوست کے آڑے وقت میں کام آتی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہر فون ربن کروپ گنیرال فون گو رنگ اور ہر ہٹلر کو اس غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں کہ انگلستان اور فرانس نہ لڑنا چاہتے ہیں نہ لڑنے کو تیار ہیں' اس لئے ہٹلر کو یہ بات صاف صاف بتا دینا چاہیئے کہ انگلستان اور فرانس اپنے معاہدوں کی پابندی کریں گے یہ دکھانے کے لئے کہ یہ خالی دھونس نہیں ہے' انگلستان اور فرانس کے فوجی افسروں میں لمبے مشورے بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ہٹلر بغلیں جھانکنے لگے، چنانچہ اخباروں نے مشہور بھی کر دیا کہ وہ سخت پس وپیش میں ہے اور اپنی تقریریں بار بار پھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور پھر نئے سرے سے لکھتا ہے' یعنی کوئی نئی پالیسی سوچتا ہے اور پھر اس کی رائے بدل جاتی ہے۔ مگر ۱۲ ستمبر کو دوشنبے کے دن جب ہٹلر کی تقریر ہوئی تو اس سے نہ پریشانی ظاہر ہوتی تھی نہ ارادے کی کمزوری' ہاں یہ ضرور تھا کہ اس میں جنگ کا اعلان نہیں تھا۔ صرف یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ سڈیٹن جرمن

آبادی کو فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ چکوسلوواکیا کی ریاست میں شامل رہنا چاہتی ہے یا جرمنی میں شامل ہونا۔ اس کے علاوہ نہ کی بات نہ صرف ایک اشارہ تھا فلسطین اور نو آبادیوں کی طرف لیکن ایسی اشارہ بازی سیاسی آداب کے خلاف ہے ہم یہاں اسکا ذکر نہیں کر سکتے۔

ہٹلر کی اس تقریر کا سب کو انتظار تھا اور اگرچہ اس میں کوئی ایسی صفت نہیں تھی کہ اسے سیاست کا سبق سمجھ کر سنا جائے، ہمیں بعد کو معلوم ہوا کہ بعض ملکوں میں تقریر کے وقت کیبنٹ کا اجلاس کرایا گیا اور تمام وزیروں نے بیٹھ کر ریڈیو پر اسے سنا۔ اس کے جواب میں یہ خبر پھیلانا مناسب سمجھا گیا کہ برطانوی وزارت کی طرف سے ہٹلر کو ایک تحریر بھیجی گئی تھی جس میں برطانیہ کے ارادے اور ذمہ داریاں واضح کر دی گئی تھیں تاکہ وہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو دماغ کے اندر خصوصاً ہٹلر کے سے منچلے دماغ کے اندر اسی طرح جمع ہوتی رہتی ہیں جیسے جسم پر میل۔ برطانوی حکومت جو اپنے ہاں کے اخباروں کو خوب جانتی پہچانتی ہے اس خبر کی تردید بھی نہ کرپائی تھی کہ اخباروں کے ایک گروہ نے جن کا مالک اور پالیسی ایک ہے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سڈٹین جرمن آبادی سے عام ووٹ لیا جائے کہ وہ کیا چاہتی ہے یعنی وہ وہی کہنے لگے جو ہٹلر کہہ رہا تھا اور جسے کہتے ہوئے برطانوی اور فرانسیسی وزیر شرماتے تھے۔ حکومت اور اخباروں کی ملی بھگت ہونا بیشک برا ہے۔ لیکن اخبار اگر اپنی طرف سے اس کا انتظام کر دیں کہ سیاست قلا بازیاں کھائے اور اس کے چوٹ نہ لگے تو یہ ایسا احسان ہے جس کی برطانوی حکومت ہمیشہ قدر کرتی رہی ہے۔

ہٹلر نے ۱۲ ستمبر کو تقریر کی اور اس سے ایک دن پہلے ہی سڈٹین جرمن لیڈر گفتگو اور مصالحت کی کوششوں کا پردہ ہٹا کر میدان میں آ گئے۔ انھوں نے پہلے ہی سے آپس میں طے کر لیا تھا کہ اس روز ہر جگہ بلوے ہوں گے۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے توڑے جائیں گے۔ چک پولیس اور سرکاری ملازموں اور دفتروں پر پتھر برسائے جائیں گے اور ہر طرح سے چکوں کو چھیڑ کر ایسی وارداتوں کا انتظام کیا جائیگا کہ جنھیں جرمنی سیاست دخل اندازی کا بہانہ بنا سکے۔ انھوں نے اپنی طرف سے تو کوئی کسر نہیں رکھی، لیکن چک حکومت نے بڑی موقع شناسی صبر اور احتیاط سے کام لیا، اور پولیس

نے کہیں بھی زیادتی کی تو فوراً تفتیش کرائی اور الزام ثابت ہو گیا تو سزا دینے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ مگر بات اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایسی شرافت اور صلح پسندی صرف نقصان سے بچا سکتی تھی، فائدے کی امید رکھنا فضول تھا۔ سڈٹین جرمن حکومت کو اس لئے چھیڑ رہے تھے کہ انھیں امید تھی کہ ۱۲ کی شام کو جرمن فوجیں سڈٹین علاقوں میں داخل ہو جائیں گی، اور فساد کرنے والے اگر کسی کو سرحد کی طرف سے آتے دیکھتے تو دوڑ کر پوچھتے تھے کہ بتاؤ جرمن فوجیں کہاں تک پہنچی ہیں۔ مگر جرمن فوجوں کی اب ضرورت نہیں رہی تھی۔ چک حکومت کے حواس درست رہے تھے تو کیا، برطانیہ اور فرانس کی بے چینی حد سے گذر گئی تھی، وہ آپس میں بار بار ٹیلیفون پر مشورے کر رہی تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر چمبرلین نے نہ اپنی حیثیت کو دیکھا نہ اپنے بڑھاپے کو نہ اپنے نزلہ کی مستقل شکایت کو، اور ہٹلر سے ملنے کو پہنچ گئے۔ کوئی سمجھا کہ وہ بزرگانہ نصیحت کرنے جا رہے ہیں، جو زیادہ عقیدت رکھتے تھے انہیں امید تھی کہ وہ ہٹلر کے کان نہ اینٹھیں تو ایسی سخت سست ضرور کہیں گے کہ وہ آئندہ پھر ایسے جھگڑے نہ کرے لیکن مسٹر چمبرلین چند گھنٹے گفتگو کرنے کے بعد واپس آ گئے تو ان تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، اور جب کیبنٹ سے مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ ان کا ہٹلر سے دوبارہ ملاقات کرنے کے لئے جانے کا ارادہ ہے تو سب کو پتہ چل گیا کہ ملاقات میں مسٹر چمبرلین نے ہٹلر کو نصیحت نہ کی ہوگی بلکہ خود اس کی تقریر کے پھیر میں آ گئے اور اس کے جوش سے مرعوب ہو گئے۔ اس طرح ایک چال جو باہمت اور روشن خیال سیاست کا کارنامہ معلوم ہوتی تھی محض ایک تجارتی چال بن گئی۔ یعنی سیٹھ صاحب ایک من چلے کو جوان کی اور ان کے پڑوسی کی دکان لوٹنے کی دھمکی دے رہا تھا جب اور کسی طرح راضی نہ کر سکے تو خود دوڑ کر اس کے پاس پہنچے، مگر اس پر نہ ان کی شخصیت کوئی اثر ڈال سکی نہ ان کی دولت، اور وہ دل میں یہ ارادہ لیکر واپس ہوئے کہ یہ آدمی ہے بڑا بے ڈھب، اور دوکان بچانا ہے تو یہ جو کچھ مانگ رہا ہے دینا ہی پڑے گا خالص سیاسی اعتبار سے دیکھئے اور یہ بھول جائیے کہ چال کا نتیجہ کیا نکلا تو مسٹر چمبرلین بے شک تعریف کے مستحق ہیں کہ انھوں نے رسم و رواج کا خیال نہ کیا۔ اس غصہ کو پی گئے جو شورش پسند مخالف جان بوجھ کر

پیدا کرتے ہیں اور امن قائم رکھنے کی خاطر بڑے ہوتے ہوئے چھوٹے کے سامنے جھک گئے۔ مگر دوسری ملاقات کے اعلان نے اس تدبیر کی سیاسی آبرو کو بھی بگاڑ دیا۔ اگر درمیان میں صلح نہ ہو گئی ہوتی تو مسٹر چیمبرلین ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ کیبنٹ کے کارندے کی حیثیت سے جاتے، اب جو وہ صلح کے بعد جا رہے ہیں تو اس سے ذرا سی اشک شوئی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

پیرس میں بعض واقف کاروں کا خیال تھا کہ چیمبرلین اپنی خواہش سے نہیں بلکہ فرانس کے وزیر اعظم دلادیے کے اصرار پر ہٹلر سے ملاقات کرنے گئے۔ بعد کے واقعات کو دیکھتے ہوئے کوئی تعجب نہیں کہ موسیو دلادیے کی طرف سے اصرار کیا گیا ہو۔ جب کیبنٹ کے سامنے وہ شرائط پیش کی گئیں جن پر کہ ہٹلر نے مسٹر چیمبرلین اور فرانس کے ذمہ دار وزیروں کو بتایا تھا کہ وہ مصالحت کرنے پر راضی ہے تو فرانسیسی سیاست کی قلعی کھل گئی۔ یہ سیاست ہٹلر کی ہر دھمکی اور ہر چال کا جواب تو دے رہی تھی مگر یہ جانتے ہوئے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور نہایت ہی ادنیٰ قسم کا جھوٹ جو پکڑا جاتا ہے اور بدنام و رسوا کرتا ہے۔ فرانس اور انگلستان میں جو مشورے ہوئے ان میں سمجھئے موسیو دلادیے مسٹر چیمبرلین سے کہہ رہے تھے کہ بھئی ہٹلر ہمکو دھمکیاں دے رہا ہے اور ان کا جواب دینا لازمی ہے، لیکن اگر اس نے کہیں چیکوسلوواکیا پر حملہ کر دیا تو ہم بری طرح سے پھنس جائیں گے، کہ ہم کو کرنا ضرور پڑیگا اور لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ اگر ہم ہٹ گئے تو جانو تم کو بھی میدان میں آنا ہی پڑے گا، اور ہم جانتے ہیں کہ تم بھی لڑائی سے بھاگ گئے ہو۔ اس لئے اگر اس بدنامی اور نقصان سے بچنا چاہتے ہو تو جلد کوئی تدبیر کرو۔ مسٹر چیمبرلین اس کا اس طرح جواب دیتے ہوں گے کہ ہاں ہم بھی اپنی آبرو رکھنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہٹلر جب ڈکے تو ہم بھی غرائیں، لیکن ہمارے شہری کبھی اس پر تیار نہ ہوں گے کہ چیکوسلوواکیا کی ریاست کے ایک حصے کو بچانے کے لئے اپنا خون بہائے، اور ہٹلر نے ملک میں اپنا پروپگنڈا ابھی اتنا کر لیا ہے کہ لوگ اس کے مطالبے کو بالکل غلط اور بے جا نہیں سمجھتے۔ ہٹلر کو یہ سب معلوم ہے، اور اسی وجہ سے کہ وہ ہماری

غلطیوں کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتا پھر یہ بھی دیکھو کہ ہمارا تمھارا معاملہ تو صاف ہے۔ تمھارے ملک پر کوئی حملہ کرے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ تمھاری مدد کریں، لیکن اگر تم کسی سے اپنے معاہدوں کے سبب سے اُلجھ جاؤ تو تمھیں اس کا حق نہیں کہ ہم کو اُلجھ جانے پر مجبور کرو۔ چکوسلوواکیا کو تمھاری سیاست نے بنایا، تمھاری سیاست نے قائم رکھا، اب یہ تمھاری سیاست ہی کا فرض ہے کہ اس کی سلامتی کی تدبیر کرے۔ اس میں ہم تمھاری مدد کریں گے، لیکن صرف گفتگو اور مصالحت کی کوشش تک، مار پیٹ ہونے لگی تو ہم الگ ہو جائیں گے۔ یہ ہمارا کام نہیں۔

آپ نے یہ بات سنی ہوتی تو سمجھ جاتے کہ مسٹر چمبرلین کی بھی ایک رگ دبتی ہے یعنی اگر فرانس اور جرمنی میں چل گئی تو اس کی جلد نوبت آجائیگی کہ برطانیہ بھی پل پڑنے پر مجبور ہو، اور ایسی مصیبت سے بچنے کے لئے انھوں نے ہٹلر سے ملاقات کرنے کی ٹھانی۔ چکوسلوواکیا سے فرانسیسیوں اور انگریزوں کو کتنی ہمدردی ہے یہ ہم نہیں جانتے اور اس پر غور کرنا فضول ہے جب واقعات نے صاف ظاہر کردیا کہ انگلستان اور فرانس چکوسلوواکیا کو سلامت رکھنے کی فکر میں تھے ہی نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ جرمنی اعلان جنگ نہ کرے اور چکوسلوواکیا کو ان معاہدوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ ملے جو انگلستان اور فرانس کو اس کی مدد کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کوشش میں انھیں پوری کامیابی ہوئی۔ سڈٹین علاقہ میں ۱۱ ستمبر سے بڑے پیمانہ پر بلوے ہونے لگے اور آخر کو خاص اس دن جبکہ مسٹر چمبرلین ہٹلر سے ملاقات کرنے کو گئے تھے چک حکومت نے مجبور ہو کر سڈٹین پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کردے۔ پھر ہزاروں سڈٹین جرمنی بھاگ کر جرمنی پہنچے اور وہاں ملک کو آزاد کرنے کے لئے رضاکاروں کی ایک فوج بنائی جس کی تعداد تین چار دن میں چالیس ہزار کے قریب ہوگئی۔ اب لڑائی چھڑنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی مگر اس کے چھڑنے ہی سے پہلے فرانس اور برطانیہ نے فیصلہ کرلیا کہ ہٹلر کے مطالبے منظور کرلینے چاہئیں، اور جب انھوں نے منظور کرلیا تو پھر بیچارے چک کیا کرسکتے تھے یورپ کی جمہوری حکومتوں کی آبرو چین کے بدلے بیچ دی گئی ہے، لیکن تجربہ تو یہی سکھاتا ہے کہ آبرو کے بغیر چین کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

انگلستان اور فرانس نے یہ طے کیا ہے کہ وہ سڈٹین علاقے جہاں جرمن آبادی ۵۰ فیصدی سے اوپر ہے چک ریاست سے الگ کردئے جائیں، جہاں جرمنی اکثریت ۵۰ اور ۶۰ کے درمیان ہے وہاں کی حکومت جس قدر ممکن ہو خود مختار کر دی جائے یہاں تک تو خیر چکوسلوواکیا کا اپنا معاملہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا ہے کہ چکوسلوواکیا کی اپنی کوئی خارجی پالیسی نہ رہے یعنی ریاست اپنے طور پر کسی دوسری ریاست سے معاہدہ وغیرہ نہ کر پائے، بلکہ اس کے تمام پڑوسی اور ان کے ساتھ انگلستان فرانس اور اٹلی اسے سلامت رکھنے کی ذمہ داری لیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چکوسلوواکیا کے فرانس اور انگلستان سے جو خاص معاہدے تھے وہ سب منسوخ ہو گئے، اب وہ خاص ان سے مدد نہیں مانگ سکتا اور اگر اس نے کبھی مانگی تو بڑے لمبے مشورے کئے جا سکیں گے کمیٹیوں کے بیسیوں جلسے ہونگے، اور اس کا کوئی خطرہ نہ ہوگا کہ فیصلہ کرنے یا صاف بات کہنے کو کہا جائے، شاید قبل اس کے کہ تمام فریق چکوسلوواکیا کے محافظ بننے پر راضی ہو جائیں ہنگری اور پولینڈ اس پر منہ ماریں گے اور کچھ نہ کچھ مار ہی لے جائیں گے ہنگری نے بسم اللہ تو کر ہی دی ہے۔

چکوسلوواکیا کی ریاست کے گھُل کر مرا ہو جانے سے پوری سیاست کی ایک گتھی سلجھ گئی ہے اور جب تک کوئی اور ٹھنڈا نہ پڑے اس سیاست کی سانس چلتی رہے گی۔ آگے کیا ہوگا یہ ہم سے نہ پوچھئے۔ ابھی تو بس ہٹلر کی جوانی بے ادب کی ان رسموں کو توڑا ہے جو بڑے بوڑھوں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں نے کہہ بھی دیا ہے کہ ہمیں بس چین سے رہنے کی خواہش ہے، ہم تمھارے دشمن یا مخالف نہیں۔ اب ہٹلر کا جوش ہوگا اور سیاست کے ہنگامے۔

(باجازت اے - آئی - آر)

تعلیمی دنیا

(جناب عبدالغفور صاحب ایم۔اے۔ لکچرار مسلم یونیوسٹی ٹریننگ کالج علی گڈھ)

ڈاکٹر کرشنن نے جو ڈاکٹر رامن کے ایک ہونہار شاگرد ہیں کرشنن ایفکٹ کے نام سے نئی قسم کی شعاع معلوم کی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے رسالہ انڈین ایکادمی فار سائنس میں مضامین کا ایک سلسلہ بھی لکھا تھا۔ اس اہم تحقیقات کے سلسلے میں مغربی سائنس داں بھی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ رائل سوسائٹی آف لندن کی پچھلی اشاعت میں کیونڈش۔ کیمرج یونیوسٹی کے ایک مشہور ماہر طبیعیات نے پروفیسر فاؤلر کا ایک مقالہ اس موضوع پر چھاپا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ڈاکٹر کرشنن کے تجربی نتائج اور نظریوں کی تائید کی ہے۔ ان کے خیال میں نئی ایجاد طبیعیات اور کیمیا کے بہت سے اہم مسائل کے لئے بڑی اہم اور ضروری ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر کرشنن ہندوستانی سائنس دانوں کے اس ممتاز گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی تعلیم و تربیت کے لئے کسی مغربی ادارے کے مرہون منت نہیں ہوئے انہوں نے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہی انتہائی علمی اعزاز حاصل کئے۔ یہاں کے معملوں میں تحقیقاتی کاوشیں کیں۔ اور ہندوستانی اداروں میں سامان اور سرمایہ کی کمی کے باوجود دنیا کے سائنس دانوں کی صف اول میں جگہ لی۔ اس بلند مرتبت گروہ کا پہلا رکن رامانجم۔ دوسرے رامن۔ تیسرے۔ میگھ ناتھ سہا۔ اور چوتھے کرشنن ہیں۔ ہم علم میں کسی اجارہ داری یا جھوٹے جذبۂ افتخار کے قائل نہیں۔ تلاش علم انسان کا فرض ہے اور یہ چشمہ خواہ آکسفورڈ سے پھوٹ نکلا ہو یا کولمبیا سے۔ ہر سچے متلاشی کا حق ہے کہ وہیں جا کر اپنی پیاس بجھائے۔ تاہم ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقوں میں جو ایک مذموم نفرت ہندوستانی ڈگریوں کے متعلق پائی جاتی ہے وہ کسی قدر الم انگیز ہے۔ ہندوستانی

یونیورسٹی کے ارباب اختیار ایک ولایتی ادارے کے تھرڈ کلاس کو اپنے فرسٹ کلاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر رامن یا اس انگریز ہمدرد کی جگہ جس کی نگاہ جوہر شناس نے رامانجم کے دل و دماغ کو ایک نظر میں جانچ لیا تھا اس قسم کے لوگ ہوتے تو دنیا کرشنن ایفکٹ اور راما نجم کی ریاضی کی تحقیقات سے محروم رہ جاتی۔

انڈیشر اکاڈیمشر ویرائن *Indischen Akademischen Verein*

پچھلی جولائی میں پروفیسر ساھنی، لکھنؤ یونیورسٹی نے وی آنا میں ایک بڑے مجمع اور مشہور ہندوستانیوں کی موجودگی میں بھارت بھون کا افتتاح کیا جو ہندوستان اکادمک ایسوسی ایشن وی آنا کا مرکز ہوگا۔ انجمن کے صدر نے پروفیسر ساھنی سے مرکز کی افتتاح کی درخواست کرتے ہوئے انجمن کی بنیاد اور اس کی علمی اور سوشل دلچسپیوں کی تاریخ بیان کی۔ یہ انجمن دس سال پہلے سوبھاش چندر بوس کے مبارک ہاتھوں سے معرض وجود میں آئی اور اس پودے کی آبیاری وہ پرجوش طلبا اور ڈاکٹر حضرات کرتے رہے۔ جو تعلیم یا سیاحت کے سلسلہ میں وی آنا آتے تھے۔ اس قسم کی انجمنیں۔ برلن۔ پیرس۔ لندن۔ روم وغیرہ میں بھی قائم ہیں اور یہ نہ صرف ہندوستانی اصحاب کے لئے ایک معاشی اور علمی مرکز کا کام دیتے ہیں بلکہ یہ ادارے ان ممالک میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے بہترین تبلیغی مرکز ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ان غلط فہمیوں کا بھی اکثر ازالہ کرتے رہتے ہیں جو ہندوستانیوں کے متعلق اکثر طبقے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

کُل دنیا کی دوسری نوجوان کانفرنس پہلی نوجوان کانفرنس جنیوا میں ۱۹۳۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تھوڑے عرصے میں کانفرنس بڑی ہردلعزیز ہو چکی ہے اس کے ممبروں کی تعداد چار کرور تک پہونچ چکی ہے۔ امسال یہ کانفرنس واسر کالج نیویارک میں منعقد

ہوئی۔ اس میں تقریباً ۵۲ قوموں اور ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے کانفرنس کا ایک اہم بنیادی اصول امن وآتشی کا پرچار ہے اور شاید اسی لئے اس مرتبہ جرمنی۔ اٹلی اور جاپان نے کانفرنس کی دعوت قبول نہیں کی۔ ہندوستان سے بھی نوجوان کارکن اور طلبا کی کانفرنس کے نمایندے شرکت کے لئے روانہ ہو چکے ہیں ان میں مسٹر پربودھ چندر۔ خواجہ احمد عباس اور مسٹر مہر علی کے نام قابل ذکر ہیں نیویارک میں کانفرنس کے مندوبین کا استقبال ایک شاندار جلوس کے ساتھ کیا جائے گا جس میں مشہور مصنفین۔ اہل قلم۔ فلم ایکٹرز۔ اساتذہ اور طلبا شریک ہونگے کانفرنس کے پنڈال میں ہر نمایندہ اپنی قوم اور ملک کا مخصوص لباس پہنکر تقریر کرے گا اس جدت کا مقصد دنیا پر یہ واضح کرنا ہے کہ اس کانفرنس کے پلیٹ فارم پر رنگ و مذہب تراش خراش کسی بات کی تمیز نہیں۔

پروفیسر نکولاس روریچ نے جن کا ذکر ہم ان اشارات میں ایک مرتبہ کر چکے ہیں سالہ ایگریکلچر کے جولائی نمبر میں ان احسانات کا تذکرہ کیا ہے۔ جو مشرق نے مغربی تمدن پر کئے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں۔

"زراعت میں مشرق نے مغرب کو بہت کچھ سکھایا۔ مکئی ایشیا سے آئی۔ نیشکر۔ چاول۔ نیل۔ زعفران۔ چائے۔ اور بہت سے پھلدار درختوں اور سبزیوں کا اصلی وطن مشرق ہی تھا۔ ہر سال ہزاروں زائرین جو ارض مقدس کی زیارت کو جاتے تھے۔ اپنے ساتھ واپسی پر خوبصورت پھولدار پودوں کے بیج لے آتے تھے۔ آڑو دمشق سے لایا گیا۔ قبرس۔ غازہ۔ اسقلون کی شرابیں۔ یونان اور فلسطین کی کشمش۔ عربی النسل گھوڑے۔ قراباغ اور قراشلخ نسلیں۔ گدھے خچر۔ یہ سب ایشیا کی عظیم الشان وسعتوں کے تحفے ہیں۔ پون چکیاں بھی ایشیا ہی سے لائی گئیں۔

صنعت وحرفت اور اس کی پیداوار کے لئے تو مغربی ممالک ہمیشہ ایشیا کے مرہون

منت رہے۔ انطاکیہ اور طرابلس کی شکر، بیروت کی روئی۔ تاثر کا ریشم۔ موصل کی ململ۔ ایران کے قالین۔ قرطبہ کا چمڑا۔ یہ سب معاشی زندگی کی رنگینیاں مشرقی ممالک کے طفیل یورپ میں پہونچیں۔ اس کے علاوہ روزمرہ بول چال اور لغت میں سینکڑوں مشرقی الفاظ داخل ہوگئے۔ میدانِ جنگ میں اہلِ مشرق نے فنونِ حرب۔ فوجوں کے ضبط کے اصول سکھائے مشرقی ممالک سے روابط ہونے کے بعد یورپ میں نائٹ فوجی شہسواروں کے سلسلے یا آرڈرز قائم ہوگئے۔ مغربی جنگجو زرہیں استعمال کرنے لگے۔ اور دمشق کی تلواریں تو اپنی خوبی کی وجہ سے اب تک مغرب میں ضرب المثل ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔ کہ دنیا میں بڑی ہستیوں کی ممتاز خصوصیت احسان شناسی رہی ہے۔ اہلِ مغرب کو بھی ان کی مبارک مثال کی پیروی کرنا چاہیئے۔ اور ان تمام افراد اور اہم احسانات کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جو اہلِ مشرق نے ہم پر کئے ہیں۔"

سی۔ پی کے مسلمانوں کا نمایندہ وفد مسٹر شکلا وزیر اعظم صوبجات متوسط سے ملا۔ گفتگو کے دوران میں انہوں نے شکلا کی توجہ مسلمانوں کی ان شکایات کی طرف مبذول کرائی جو انہیں ودیا مندر اسکیم کے متعلق پیدا ہو چلی ہیں۔ مسلمانوں کے خیال میں ودیا مندر کے نام میں فرقہ وارانہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔ اور لفظ 'مندر' دوسرے لفظوں سے مل کر بھی اپنے مذہبی معنی برقرار رکھتا ہے۔ وزیر اعظم کے خیال میں لفظ مندر یہاں محض گھر کے مترادف ہے اور اسکو کوئی مذہبی رنگت نہیں دی جا سکتی ہے۔ ان کے خیال میں ارکان وفد اور لیڈروں کو چاہیئے کہ اس کا صحیح مفہوم عوام پر واضح کر دیں۔

وفد کی دوسری درخواست یہ تھی کہ فی الحال 'پرائمری اسکول' کا نام برقرار رکھا جائے۔ اور اگر کوئی نیا نام رکھنا ضروری ہی ہے۔ تو اس بارے میں پہلے اسمبلی کے مسلمان ممبروں سے مشورہ لیا جائے۔ وزیر اعظم نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بالتصریح اعلان کیا کہ موجودہ کانگریس حکومت کا منشا اردو اسکولوں کو بند

کردینے کا نہیں ہے۔ نیز حکومت لوکل باڈیز کی اردو اسکولوں کے نام ودیا مندر میں بدلنے کے سلسلے میں ہمت افزائی نہ کریگی۔ نصابی کتب کی کمیٹوں میں سب زبانوں کی مناسب نمایندگی ہوگی۔

ودیا مندر کے متعلق متقدر مسلم لیڈروں اور ارباب علم نے مسلمانوں کا نظریہ واضح کردیا ہے۔ پچھلے دنوں مولوی عبدالحق صاحب نے ملک وقوم کی توجہ اس صریح بے انصافی کی طرف مبذول کرائی ہے جو مندر کے نام کی ترویج میں اور اردو اسکولوں کی ہمت افزائی کے سلسلے میں اختیار کی جارہی ہے۔

جہانتک لفظ مندر کا تعلق ہے اس کے معنی لغوی ہیر پھیر یا اس کی لسانی تاریخ کے مطالعہ سے بدلے نہیں جاسکتے۔ ہر لفظ کے لک تو وہ معنی ہوتے ہیں جو ہمیں کسی سستی لغت کی کتاب سے مل سکتے ہیں۔ اور ایک اس لفظ کے ..... مذہبی یا نفسیاتی مطالب ہوتے ہیں۔ جو چوں "بو بہ گلاب اندر" اس میں مضمر اور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ معنی ایسے لطیف اور حروف سے یکجاں ہوتے ہیں کہ یہ تشریح توضیح کی تاب نہیں لا سکتے تاہم قوم کی معاشی اور روحانی زندگی کا عکس لکھے ہوئے حروف نہیں ہوتے بلکہ یہی مطالب اور ذہنی ماحول ہوتے ہیں جن کا ہر لفظ حامل ہوتا ہے۔ لفظ 'مندر' متفقہ طور پر ایک خاص مذہبی رنگت لئے ہوئے ہے۔ اور یہ اس زمانہ میں بنا ہوگا جب ہندوؤں کی معاشی اور مذہبی زندگی میں گہرا رشتہ ہی نہ تھا بلکہ دونوں ایک ہی تھیں۔ اور یہی مذہبی رنگ اس میں اب تک موجود ہے۔

آچاریہ نرندر دیو صاحب نے جن کا یو۔ پی تعلیمی اصلاحاتی کمیٹی اور یوپی تعلیمی اصلاحات سے خاص تعلق ہے۔ کانپور میں طلبا کے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے تعلیمی کمیٹی کی چند اہم تجاویز کی طرف اشارہ کیا۔ کمیٹی نے اساتذہ کی سروس کو محفوظ کرنے کے لئے تجویز ہے، کہ

کوئی استاد بغیر انسپکٹر کی منظوری کے برخاست نہ کیا جائے۔ نیز ہر برخاست شدہ ٹیچر کی اپیل ایک مرکزی تعلیمی بورڈ میں سنی جایا کرے۔ نیز اساتذہ اور انتظامیہ انجمنوں کے مابین اختلاف کی صورت میں مرکزی بورڈ اساتذہ کا ایک ادارے سے دوسرے میں بدلنے کا انتظام کردیا کرے۔ مالی وجوہات کی بنا پر اساتذہ کی تنخواہوں میں ترقی کی سفارش کرنا تو ناممکن تھا تاہم ان کے لئے کم از کم شرح تنخواہ مقرر ہو سکے گی جو ہر استاد کو ملنا چاہئے۔

ان کے خیال میں صنعتی تعلیم کا مقصد اسکولوں میں طلبا کو کامیاب کماؤ بنانا نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے ایک ہم آہنگ اور متوازن تربیت کے مقصد کے لئے استعمال کیا جائے

ہندوستان میں قومی امدادی اداروں کے بہی خواہ کمیٹی کی اساتذہ کے شرائط ملازمت کے متعلق سفارشات پر اظہار استحسان کریں گے۔ ان مدارس میں اساتذہ کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اور اکثر انتظامیہ کمیٹی کے ہر ممبر یا منیجر کے رحم پر ہوتے ہیں۔ مگر ایک حد تک اس کی ذمہ داری خود اساتذہ کرام پر بھی عاید ہوتی ہے۔ آج کل ترقی پسند ممالک کیا ہندوستان میں بھی مزدوروں۔ کاریگروں تک نے اپنی یونین اور انجمنیں قائم کرلی ہیں۔ مگر اساتذہ جو بچوں کو اتفاق اور امداد باہمی کے اصول پڑھانے کے دعویدار ہیں اس پر عملاً کام کرنے کو تیار نظر نہیں آتے۔ آج انگلستان کے ہر معمولی دیہی مدرسہ کا استاد بھی رائل سوسائٹی فار ٹیچر کا ممبر ہے۔ اور استبدادیت پسند منیجر کے سامنے وہ ایک بے چارہ اور کم حیثیت مکتب کا ملا نہیں۔ بلکہ ایک باوقار۔ بااثر اور منظم جماعت کا فرد ہے اگر ہندوستانی اساتذہ بھی اپنی انجمنوں کی تنظیم میں سرگرمی دکھائیں اور ان کو جیتی جاگتی زندگی سے متحرک چیز بنادیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا ان کی شرائط ملازمت پر ہی نہیں بلکہ عام تعلیمی حالت اور ضبط پر اچھا اثر پڑے۔

آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس منعقدہ شملہ میں تقریر فرماتے ہوئے

ڈاکٹر مسٹر گوکل چند نارنگ نے ہندوستانی زبان کی قومی اور کلچرل اہمیت پر خاص طور پہ بحث کی۔ ان کے خیال میں ایک مشترکہ زبان کا وجود متحدہ قومیت کے لئے سب سے ضروری چیز ہے۔ ان کے خیال میں آسٹریا اور ہنگری۔ انگلستان اور آئرلینڈ وغیرہ کی علیحدگی کی سب سے بڑی وجہ ان دونوں ممالک کی زبانوں کا مختلف ہونا تھا۔ اور اگر ہمیں ہندوستان کے منتشر شیرازہ کو متحد ومتفق کرنا ہے تو ایک مشترکہ زبان اس کے لئے اولین شرط ہے۔ ان کے خیال میں ایک خوددار قوم کے لئے یہ امر موجب ندامت ہے کہ وہ بین الصوبائی تبادلۂ خیالات کے لئے ایک غیر ملکی زبان کا سہارا لے۔

ہندی اردو کے مسئلہ پر ان کے خیالات مخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب ہندو مہاسبھا کی روح رواں ہیں اور اس کے سیاسی اور سماجی عقائد کے حقیقی نمایندے کہلائے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ پنجابی سیاست کے بھی ایک درخشاں ستارے ہیں ان کے مفصلہ ذیل الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم زبان کے بارے میں ہمارے فرقہ دار گروہوں اور انجمنوں میں بھی نئی ذہنیت پیدا ہو چلی ہے جو ایک حد تک امید افزا ہے: "جب میں ہندی کو مشترکہ زبان بنانے کے لئے اپیل کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ نہیں کہ ہندی اور زبان ہے اور اردو اور زبان۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مشترکہ زبانیں ہیں اور ان کا نام ہی ہندوستانی زبان ہے۔ ہمارے مسلم دوستوں کو کسی قسم اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے اگر وہ چاہیں تو ہندی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھ سکتے ہیں۔"

ان کے ان الفاظ کا ڈاکٹر کر تو کوٹی شنکر آچار کی اس تقریر سے مقابلہ کرنا چاہیئے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ہندوستان ہندواستھان ہے اور دوسری قومیں یہاں محض ان کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرکے رہ سکتی ہیں۔

اپنے ایڈریس کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی پرزور حمایت کی ہے۔ ان کے خیال میں ہندی زبان کی خصوصیت محض یہ دو چیزیں

ہی ہونا چاہئیں۔ فارسی زبان شیریں ہے اور پچھلے سالوں میں فرانسیسی زبان اور اس کے تمدن کے اثر نے ایرانیوں میں اس شیرینی کو اس قدر تیز کر دیا کہ یہ حنظل بن کے رہ گئی۔ اور ان کے ماہرِ تعلیم اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ اپنے بچوں کو فرانس میں تعلیم دینے کی بجائے جرمنی میں بھیجیں تاکہ فرانسیسی 'شیرینی' جوان بچوں کو ایک تنزل یافتہ تمدن کے گہوارے میں پرورش کر رہی ہے جرمنی ضبط اور احساسِ فرض سے بدل جائے۔ پھر شیرینی کے معیار بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پرفیسر یونے۔ نوگوچی شاعرِ جاپان کو اپنے دورۂ ہندوستان میں اردو غزلوں اور گانوں میں بہ نسبت کسی اور زبان کے زیادہ مٹھاس ملی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جو زبان "صوبے کی حد بندی میں جکڑی ہوئی ہو۔ وہ ملک کی مشترکہ زبان بننے کے قابل نہیں"! اگر مشترکہ زبان کا معیار یہی ہے تو ہمیں خوف ہے کہ ہندی زبان اس پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اگر ہندی زبان۔ یو۔پی اور بہار میں رائج ہے تو اردو زبان کا سکہ ہر اس جگہ ٹکسالی ہے جہاں مسلمان بستے ہیں اگر برما کے دشوار گذار جنگلات میں اردو اسکول قائم ہیں سرحد کا پٹھان بچہ۔ سندھ کا دیہاتی بمبئی کا تاجر اور مدورا کا مسلمان بساطی بھی اردو جانتا ہے۔ اس کی بیوی بچے گھر میں اردو بولتے ہیں۔ اس کی تہذیب و تمدن۔ اس کے رہنے سہنے۔ اس کے خیالات اور اس کے مذہب کا آئینہ یہی زبان ہے۔

آج مدراس کی ترقی پسند حکومت صوبے میں ہندی کی ترویج پر زور دے رہی ہے اور تامل اور تلگو بولنے والے طبقات کی طرف سے اک زبردست ستیہ گرہ کی تحریک جاری کر دی گئی ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زبان کو جنوبی ہندوستان کے دراوڑی تمدن سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور جنوبی ہندوستان کے غیر برہمن اس کی جبریہ تعلیم کو ایک جارحانہ کارروائی سے کم نہیں سمجھتے۔ مگر مدراس کے مسلمانوں کے خیالا

اور جذبات کا ذریعہ اظہار اردو زبان ہی ہے ۔ ان کے مذہبی مبلغ ۔ ان کے قائدین کرام
ان کے اساتذہ اسی زبان کے ذریعہ عوام کے سامنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس
لحاظ سے اردو زبان صوبائی خلیجوں کو پاٹ کر ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل کر چکی ہے جو ہندی زبان
کو حاصل نہیں ہے ۔ اگر ہم بیرونی ممالک کو دیکھیں تو جہاں جہاں مسلمان زائر، مسلمان
ملازم یا مسلمان کاریگر پہونچتا ہے وہاں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، کابل کے
بازاروں میں۔ آبادان کے کارخانوں میں ۔ مکہ و مدینہ کے نخلستانوں میں ہر جگہ اردو زبان
سے کاروباری کام چلایا جا سکتا ہے ۔ اردو زبان ایسے مخصوص رسم الخط کے ذریعہ اس
اس عظیم الشانی لسانی برادری میں شامل ہے جس کا سکہ ٹیونس سے پیکن تک چلتا ہے
اور یہ اس زبان کی بین الاقوامی حیثیت ہے ۔ سینگاپور کی ملائی زبان ۔ مالدیپ کی مقامی
بولی ۔ مشرقی افریقہ کی سواہلی بخارا کی ترکی ۔ سب عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں ۔ اگر نائیجریا
کا مسلمان حکمران ایک سوداگر کو پروانۂ راہداری دیتا ہے تو اسی رسم الخط میں ۔ اور اگر
جبل القمر دریائے نیل کے منبع کا رہنے والا خانہ بدوش کسی کو پیغام بھیجتا ہے ۔ تو خط نسخ میں

اگر ہندوستان کو ایک بین الاقوامی ادبی اور کلچر برادری میں معزز جگہ لینا ہے تو
خط نسخ ایک حد تک اس کے لئے راستہ تیار کر سکتا ہے ۔ اور یہ نہیں تو بقول سبھاش
بابو اور بنگال اسکول، لاطینی رسم الخط اختیار کر لینا چاہیئے ۔ جہاں تک بین الاقوامی سوال
کا تعلق ہے دیوناگری رسم الخط خارج از بحث ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد [illegible]	نومبر ۱۹۳۸ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب کو صدمہ جانکاہ!

۲۹ اکتوبر چہارشنبہ کو صبح ۵ بجے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے والد بزرگوار سید عابد حسین صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ۔

مرحوم مذہب تاریخ اور ادب کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے شعروشاعری سے بھی خوب دلچسپی تھی اور آپ کو تاریخ نکالنے میں بڑا زبردست ملکہ تھا۔

اسہال کی شکایت تقریباً بیس سال سے تھی لیکن گذشتہ چھ مہینوں سے اس شکایت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مرحوم کی عمر ستر (۷۰) سال کی تھی۔ دہلی میں انتقال فرمایا اور یہیں تجہیز وتکفین کے مراسم ادا کئے گئے جس میں شہر کے عمائدین، اساتذہ وطلبائے جامعہ نے شرکت کی۔

ہم ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے اس صدمہ عظیم میں دلی شرکت کرتے ہیں اور خدا سے دست بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

(آمین)

اسلام، آزادی اور خوش حالی

(از محمد عاقل صاحب ایم۔اے ،استاد معاشیات جامعہ)

چین کے مشہور رہنما ڈاکٹر سن یات سین نے چینیوں کے سیاسی نصب العین کو مختصر طور پر تین لفظوں میں بیان کیا تھا۔ قومیت، جمہوریت اور روزی۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو بھی اسی طرح تین لفظوں میں مختصر طور پر بیان کیا جاسکتا ہے یعنی اسلام، آزادی اور خوش حالی۔ میں اپنے مفہوم کو سمجھانے کے لئے ان تینوں اصطلاحوں پر الگ الگ کچھ باتیں بیان کروں گا۔

اسلام اسلام کو میں نے قصداً سب سے اول رکھا ہے۔ کیونکہ اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے ہندوستان میں ابھی تک آبادی کے ایک بہت کثیر حصہ کی زندگی پر مذہب کا پورا تسلط قائم ہے۔ اس میں شک نہیں مذہب کا اعلیٰ تصور لوگوں کے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ توہم پرستی اور تعصب نے مذہب کو ایک تعمیری اور اصلاحی قوت کی جگہ ایک تخریبی اور قدامت پسند قوت بنادیا ہے۔ مذہب، ترقی کی قوتوں کا ہراول بننے کی جگہ رجعت اور انتفاع ناجایز کی قوتوں کا آلہ کار بن گیا ہے۔ مذہب کے اعلیٰ جذبہ سے صحیح کام لینے کی جگہ غلط کام لیا جارہا ہے۔ مارکس کے الفاظ میں مذہب کو ایک نشہ کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے جس سے قوائے عمل یا تو مضمحل اور بے کار ہوجاتے ہیں یا کجروی اور گمراہی کی طرف مایل ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات، مذہب کے نام پر انسانی جانوں کی قربانی اور آئے دن کی شر انگیزی اور فتنہ پروری یہ سب مذہبی گمراہی کے نتائج ہیں۔ جب میں مذہبی زندگی کی حمایت کرتا ہوں تو میرے پیش نظر مذہب کا یہ تصور ہرگز نہیں ہوتا۔ اس مذہب کی مخالفت میں تو میں کارل مارکس سے بھی دو قدم آگے جانے کے لئے تیار ہوں۔ مذہب کی کورانہ تقلید،

مذہب کی روح کو چھوڑ کر اس کے الفاظ پر اصرار، اور لفظی اختلافات پر فرقہ بندی اور ہنگامہ خیزی اور قوم کی قوتوں کو بے کار اور مہمل مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر کے ضایع کرنا ان چیزوں کو میں مذہبی خدمت نہیں بلکہ مذہب کے ساتھ دشمنی سمجھتا ہوں۔

لیکن مذہب کا ایک دوسرا تصور بھی ہے جو ہر چند فی الحال مفقود اور معدوم ہے لیکن جسے ایک زندہ اور فعّال قوت بنایا جا سکتا ہے۔ مذہب کا یہ تصور وہ ہے جو فتنہ کی جگہ امن پیدا کرتا ہے، زخموں پر مرہم رکھتا ہے، ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتا ہے۔ محبت اور ایثار کے اعلیٰ ترین معیاروں کو قائم کرتا ہے۔ جس سے بنی نوع انسان کی یکجہتی، اتحاد اور باہمی انحصار کا احساس تیز ہوتا ہے۔ جو موجودہ محدود اور نامکمل زندگی کے مقابلہ میں ایک زیادہ مکمل اور وسیع تر زندگی کی اُمید قائم کراتا ہے۔ جو انسانی قوتوں کے پوشیدہ امکانات کی ترقی کے بارے میں ایک راسخ عقیدہ رکھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ جو فانی، گمراہ، جاہل اور مجبور انسان کو ایک ازلی اور ابدی، علیم و بصیر، مختار و مقتدر قوت سے وابستہ کر کے اس کے حوصلوں کو بلند، اس کے عزائم کو پختہ اور اُس کی کوششوں کو وقیع بنا دیتا ہے۔ مذہب کی یہ اور اسی طرح کی اور بہت سی دوسری خدمات ہیں جن کی وجہ سے میں مذہبی زندگی کی حمایت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مذہبی زندگی کو جو بنیادی اہمیت ابھی تک حاصل رہی ہے وہ آئندہ بھی اُسے حاصل رہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذہب کا مفہوم وہ نہ لیا جائے جس کا اس وقت غلبہ ہے اور جو ہماری پستی اور بدنصیبی کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

مذہب کی اہمیت پر ایک عام تبصرہ کرنے کے بعد میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں اسلام کو کیوں بنیادی اہمیت حاصل رہنا چاہیئے۔ اسلام، مسلمانوں کی کشتی کا بادبان، ان کے جہاز کا انجن اور ان کے تمام اجتماعی اعمال و افعال کا محرک ہے۔ اسلام کی تعلیمات، مسلمانوں کو پست خود غرضیوں، ذاتی فایدوں اور انفرادی لالچوں سے بلند کر کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے قربانیاں کرنا سکھاتی ہیں۔ اسلام کی تاریخ ان کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ دنیا میں اخلاقیات اور فلسفہ کے بہت سے نظام پیش کئے گئے ہیں لیکن اسلام

کی اخلاقی تعلیم اور فلسفہ نے جیسی قوت عمل اپنے ابتدائی پیروؤں میں پیدا کی تھی اس کی مثال دنیا میں بہت کم ملتی ہے۔ پھر تاریخ اور روایات کی وابستگیاں زبان، ادب اور تمدن و معاشرت کے رشتے اتنے قریبی اور شدید ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کو ان سے جدا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہر جماعت کی چند خصوصیات ہوتی ہیں جو اُسے دوسری جماعتوں سے ممتاز کرتی ہیں اور جو اس کی زندگی کے لئے بنیاد کا کام انجام دیتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی بنیاد ان کا مذہب ہے۔ اسلام کے بغیر ہندوستان کے مسلمانوں کا تصور قائم کرنا مشکل ہے۔ اسلام اُن کی زبان اُن کے ادب، اُن کی سیرت، ان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور اس کا اس طرح حاوی ہونا ہندوستانی قومیت کے لئے مضر نہیں بلکہ بہت زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔ اسلام نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذاتی فایدوں اور انفرادی زندگی کے تحفظ کے مقابلہ میں نصب العین کے لئے جان و مال کی قربانی کرنا خوب اچھی طرح سکھلا دیا ہے۔ اسلام کی حفاظت اور عزت کے لئے جاہل اور غریب مسلمان بھی اپنی جان تک کی بازی لگانے میں تامل نہیں کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ قربانیاں اسلام کی لفظی حفاظت کے لئے صرف کی جاتی ہیں اسلام کی روح کی حفاظت کے کام سے وہ بیچارے ناواقف ہیں۔ لیکن اگر اسلام کی روح کی حفاظت کے لئے ان کی سرفروشی کو استعمال کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ جاہل اور غریب مسلمان جن پر آج مذہبی دیوانگی کا الزام لگایا جاتا ہے کل ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں کے لئے ایک نہایت جاں نثار فوج بن سکتے ہیں۔ ضرورت اسلام کے صحیح تخیل کو عوام تک پہنچانے کی ہے۔ جب یہ تصور مسلمانوں میں عام طور پر پھیل جائے گا تو ان کی وہ پوشیدہ قوتیں جو اس وقت سوئی ہوئی ہیں یا غلط راہوں پر پڑ کر انتشار اور افتراق کا موجب بنی ہوئی ہیں، بیدار اور مجتمع ہو کر وہ زبردست کام انجام دیں گی جن کی مثال دنیا نے آج تک کبھی نہیں دیکھی ہے۔

جو لوگ اسلام کی جگہ اور دوسرے محرکات کو مثلاً قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو بیدار کرکے مسلمانوں سے کام لینا چاہتے ہیں ان کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ایک طاقت ور انجن کی جگہ

ایک کمزور انجن سے مشین کو چلانا چاہتے ہیں۔ وہ کم ہمت ہیں زیادہ طاقتور انجن کو چلانے سے ڈرتے ہیں، اس لئے ایک کمزور انجن سے فایدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ طاقتور انجن موجود ہے اور ان کی کوششوں سے آسانی کے ساتھ توڑا نہیں جا سکتا اس لئے اگر اس انجن سے وہ کام نہ لیں گے تو یہ انجن ترقی کی دشمن قوتوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا اور وہ اسے ان کے خلاف استعمال کرکے اُن کی قوت کو کمزور کرتے رہیں گے۔

وہ لوگ اس کا جواب شاید یہ دیں کہ ایک ہی سمت میں چلنے والا ایک کمزور انجن مخالف سمتوں میں چلنے والے کئی طاقتور انجنوں سے زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ کمزور انجن تو بہر حال آگے کی طرف ہی بڑھے گا لیکن مخالف سمتوں میں چلنے والے کئی طاقتور انجن ایک دوسرے کی قوت کو کمزور کرتے رہیں گے اور ترقی یا تو بالکل نہیں ہوگی یا بہت آہستہ آہستہ ہوگی یا اگر ایک وقت میں باہمی اتحاد کی وجہ سے ترقی زیادہ ہوجائے گی تو دوسرے وقت میں باہمی نفاق کی وجہ سے دوبارہ بہت پیچھے ہٹنا پڑے گا یہ اعتراض صحیح ہوسکتا ہے اگر مذہب کا موجودہ تنگ نظری پر مبنی تصور قائم رہے لیکن اگر اس کی جگہ مذہب کے ایک زیادہ بلند اور وسیع تصور کے پھیلانے کی کوشش کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض باقی نہیں رہے گا اور اس صورت میں ہم ہندوستان کی آبادی کے اندرونی رجحانات اور بنیادی میلانات کو پوری طرح تکمیل کا موقع دیتے ہوئے انھیں اجتماعی ترقی کے مقاصد کے لئے استعمال کرسکیں گے۔

پھر قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو دو طریقہ پر محرک بنایا جاسکتا ہے۔ یا تو اسے مذہبی جذبہ کا حریف اور بدل بنانے کی کوشش کی جاسکتی ہے یا اس کو ایک زاید محرک کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ مجھے دوسری صورت پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ حقیقتاً میں نے اپنا یہ مضمون جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے اسی مقصد کی حمایت میں لکھنا شروع کیا ہے۔ میں اسلام، آزادی اور خوش حالی تینوں محرکات سے فایدہ اٹھانا اور ان تینوں نصب العینوں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر قومیت کے جذبہ یا روٹی کے سوال کو مذہب کا بدل یا حریف بنا کر پیش کیا گیا تو مشین کے چلنے میں وہی دقت پیدا ہوجائے گی جس کا ذکر ابھی اوپر کیا جاچکا ہے یعنی کئی طاقتور انجن مشین کو مختلف سمتوں میں کھینچنا

شروع کر دیں گے اور مشین آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

مندرجہ بالا تمام امور کے پیش نظر میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست میں اسلام کو ضرور بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے اور ایسی تمام کوششیں جو متحدہ قومیت کا نام لے کر یا معاشی سوال کو نمایاں کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو اسلام سے ہٹاتی ہیں بالآخر خود ہندوستان کی ترقی کے لئے سخت مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس قسم کی کوششوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں جن تحفظات کی وہ ضرورت محسوس کریں ان کے حصول کے لئے اپنی پوری جدوجہد کو جاری رکھنا چاہیئے۔

اس نصب العین کے حصول کے لئے انھیں کس قسم کی کوششیں کرنا چاہیئے۔ آیا مسلم لیگ کی طرح کا ایک ادارہ قائم رکھنا چاہیئے جو سیاسی اور معاشی مقاصد میں تو کانگریس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آزاد اور جداگانہ جماعتی وجود کو تسلیم کرانے پر مصر ہے یا مسلمانوں کو انفرادی طور پر کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیئے اور جب کبھی اسلامی معاملات پیش ہوں کانگریس کے اندر ایک متحدہ محاذ بنا لینا چاہیئے اور ایسی ضمانتوں کو کانگریس سے تسلیم کرانا چاہیئے جس سے اسلامی معاملات میں یہ لوگ اپنی اقلیت کی وجہ سے بالکل مجبور اور بے بس نہ ہوں۔ ان سوالات کے جواب میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ میں یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے تحفظات کا جہاں تک سوال ہے موجودہ حالات میں، میں ان کی ضرور تائید کرتا ہوں۔

آزادی اسلام کے بعد دوسری چیز جسے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نصب العین میں داخل کرنا چاہیئے وہ آزادی ہے۔ میں نے آزادی کو اسلام کے بعد اس لئے رکھا ہے کہ میرے نزدیک اسلام ایک کُل ہے جس کا ایک جزو سیاسی آزادی بھی ہے۔ اسلام تمام اعلیٰ محرکات کا سرچشمہ ہے جس کی ایک شاخ آزادی بھی ہے۔ آزادی میں، میں دونوں چیزوں کو شامل کرتا ہوں۔ غیر ملکی تسلط اور استفاع ناجائز سے آزادی نیز جمہوری طرز حکومت۔

غیر ملکی تسلط ہندوستانیوں کے قومی وقار اور عزت نفس کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ کسی

قوم کو دوسری قوم کا غلام رہ کر زندگی بسر نہیں کرنا چاہیئے۔ ہندوستانی قوم کی محکومیت انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ ہم اسے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ہمارے اخلاقی احساس اور روحانی جذبہ کا ایک ایک مظہر اس کے خلاف بغاوت کے لئے آمادہ ہے۔ خود مختاری ہمارا حق ہے۔ ہم غیر ملکی حکمرانوں کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ اگر غیر ملکی حکمراں نہایت اچھے اور ان کی حکومت ہمارے لئے بہت فایدہ رساں بھی ہوتی تب بھی ان مادی فایدوں کے معاوضہ میں ہم اپنی آزادی کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ ہم کسی قیمت پر اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پھر جب غیر ملکی حکومت ہم سے ناجایز فایدہ اٹھا رہی ہے اس کی پچھلی تاریخ مہذب لوٹ کھسوٹ کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ہماری صنعتوں کی تباہی، ہمارے محاصل کی زیادتی، ہماری عدیم المثال غریبی، ہماری جہالت، ہمارے دیہاتوں کی ویرانی ہمارے شہروں کی بے رونقی، حکومت کی جانب سے ہمارے آرام و آسایش کی طرف سے لاپرواہی، ہمارے عوام کی بے بسی اور ہمارے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کی گمراہی اور بے روزگاری اور ان تمام حالات کی موجودگی میں غیر ملکی حکومت کی سخت دلی اور ہماری آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے کی کوششیں —— یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے الزامات سے غیر ملکی حکومت کا اعمال نامہ بالکل سیاہ ہو چکا ہے ایسی صورت میں ہم غیر ملکی حکومت سے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔

لیکن ہماری آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم سفید دفتری حکومت کی جگہ ایک بھورے رنگ کی دفتری حکومت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ہمارا مقصد جمہور کی آزادی ہے۔ سیاسی زندگی میں کوئی ایک شخص دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ اقتدار کا مالک نہیں ہو سکتا۔ قانون کی نگاہ میں سب مساوی ہونے چاہئیں، قانون کے بنانے میں سب کو شرکت کرنی چاہیئے۔ ایک کا بنایا ہوا قانون اگر دوسرے پر اس کی مرضی کے خلاف عاید کیا گیا تو اس کی آزادی ختم ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں جماعتی زندگی میں انفرادی آزادیاں ایک نسبتی اور اضافی مفہوم رکھتی ہیں۔ یہ ایک مفاہمت اور مصالحت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں افراد کی متفرق اور مخالف آزادیوں میں ایک ہم آہنگی اور تناسب پیدا کرنے کی

کوشش کی جاتی ہے۔ افراد کے انفرادی نفس اور جماعتی نفس، وقتی مفاد اور مستقل اور دیرپا مفاد میں توازن پیدا کیا جاتا ہے اور اسی توازن کی تنظیم کا نام ریاست یا مملکت ہوتا ہے۔

آج کل کے زمانہ میں جب کہ کلی طرز کی حکومتوں نے جمہوریت کو ایک حسین فریب کے نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا ہے اور ان ملکوں میں جہاں اس کا تجربہ کئی صدیوں سے کیا جا رہا ہے اس کی خرابیاں اور بدعنوانیاں روز بروز ظاہر ہوتی جا رہی ہیں، جمہوریت کے نظام کو پسندیدہ قرار دینے کے لئے بھی دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بلاشبہ ان تمام خوش آیند امیدوں کو جو انقلاب فرانس کے بانیوں نے اس کے ساتھ وابستہ کی تھیں پاش پاش کر دیا ہے۔ سرمایہ کی طاقت ہمارے زمانہ میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہماری تمام قانونی آزادیوں کو اپنے مسموم اثرات سے برباد کر سکتا ہے۔ سرمایہ کا گھن اندر ہی اندر ہماری آزادیوں کو کھاتا رہتا ہے۔ جمہوریت کا ظاہری فریب قائم رہتا ہے اور پردہ کے پیچھے سے سرمایہ دار جس طرح چاہتے ہیں سیاسی کٹھ پتلیوں کو نچاتے رہتے ہیں۔ تعلیم اور پروپگنڈا کی مشین پر پوری طرح ان کا قبضہ ہوتا ہے اپنی ہشیاری اور چالاکی سے یہ لوگ سب کام اپنے مطلب کے موافق کرا سکتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو تنظیم دیتے ہیں۔ انتخابات پر پورا اقتدار رکھتے ہیں۔ لالچ، دھمکی اور دھونس کے ذریعہ ذلیل اور ادنیٰ درجہ کے وقتی جذبات کو بھڑکا کر اپنے پٹھوؤں کو منتخب کرا لیتے ہیں اور اس طرح حکومت کی پوری مشین پر اپنا تسلط قائم کر لیتے ہیں۔ مغربی جمہوریتیں دراصل سرمایہ داروں کے اقتدار مطلق کا دوسرا نام ہیں۔ جمہوری نصب العین کی اس گمراہی اور خرابی کو دیکھ کر تو بلاشبہ جمہوریت کی طرف سے ایک تنفر اور حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن کلیت پسند ریاستوں کے کارناموں اور ان کے حکمرانوں کی کارگزاریوں سے بھی طبیعت میں کوئی اطمینان کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اقتدار کو اگر مطلق رکھا جائے تو اس کو غلط طریقہ پر استعمال کرنے کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کسی انسان کو غلطی اور خطا سے پاک نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہر ریاست میں حکمرانوں کو ان کی غلطی سے متنبہ کرنے والے لوگ موجود ہونے چاہئیں اور اپنی پالیسی کی ناکامی کی صورت میں حکمرانوں کو اقتدار کی جگہوں سے علیحدہ کرنے کے لئے صرف خونی

انقلاب کا ہی راستہ کُھلا ہوا نہ ہونا چاہیئے بلکہ امن وامان کے ساتھ ایک حکمراں کی جگہ دوسرے حکمراں کو مقرر کرنے کا امکان ہونا چاہیئے۔ موجودہ آمروں کے جانشینوں کا مسئلہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ آج جو لوگ یورپ کے ڈکٹیٹر بنے ہوئے ہیں ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ کوئی شخص لے سکے گا یا نہیں اور ان کے زمانہ میں جو ملک کو ترقی ہوئی ہے اُسے جاری رکھا جاسکے گا یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ جمہوریت میں اس قسم کی کوئی مشکلات نہیں ہیں۔ اگر سرمایہ کے اقتدار کو کم کیا جاسکے اور تقسیم دولت میں زیادہ مساوات پیدا کی جاسکے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ جمہوریت آمریت کے مقابلہ میں کیوں زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب جمہوریت کو اُن نئی تدبیروں کے ساتھ اختیار کیا جائے جن کے ذریعہ سے اقلیت کو اپنی آواز کو مؤثر بنانے کے لئے کافی مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔

خوش حالی | آزادی کے بعد تیسری چیز جسے مسلمانوں کو اپنے سیاسی نصب العین میں داخل کرنا چاہیئے وہ خوش حالی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا آزادی کو معاشی مساوات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر خوش حالی ایک خوش نصیب اقلیت تک محدود نہ ہوگی بلکہ آبادی کی کثیر اکثریت اس میں پورے طور پر شریک ہوگی تو جمہوریت کی وہ خرابیاں جو معاشی محکومیت اور مجبوری اور تعلیم و تہذیب کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں پیدا نہ ہوسکیں گی۔

ہندوستان میں جس بھیانک قسم کی غریبی اس وقت پائی جاتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو غریبی کو دور کرنے کے مقصد کو مسلمانوں کے سیاسی نصب العین میں اول جگہ ملنا چاہیئے تھی۔ لیکن سوال انفرادی غریبی کے دور کرنے کا نہیں ہے۔ سوال نفع ذاتی اور خود غرضی کا نہیں ہے۔ سوال کل جماعت کی آیندہ خوش حالی کے لئے اجتماعی کوشش کرنے کا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ غریبی کا علاج صرف اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب نہایت بڑے پیمانہ پر ہماری آبادی ایثار اور قربانی کے لئے آمادہ ہو۔ یہ قربانی فوری اور ذاتی نفع کے لئے نہ کی جائے بلکہ مستقبل کے اجتماعی اور دائمی فایدہ کے لئے کی جائے۔ سب سے اول تو ہمیں آزادی کے حصول کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں

کرنا پڑیں گی لیکن ہماری قربانیوں کا سلسلہ آزادی کے حصول کے بعد ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ صبر آزما اور حوصلہ فرسا طریقہ پر شروع ہوگا۔ آزادی کے حصول کے بعد اس کا پورا امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ ہمارے اندر جاہ و اقتدار کے حصول کے لئے رقابتیں پیدا ہو جائیں۔ ہم اپنی قربانیوں کا فوری معاوضہ طلب کرنے لگیں۔ ہمارا احساس فرض اور ضبط و تنظیم کمزور ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ہندوستان کے لئے بڑی بدنصیبی کا دن ہوگا۔ کیونکہ ہماری تعمیر نو کا کام بہت سخت ہے۔ ہماری جیسی غریبی اور محرومی کی دنیا میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس کی کوئی تھاہ اور انتہا نہیں ہے۔ غریبی اور محرومی کے اس گہرے گڑھے کو پاٹ کر اپنی آبادی کو مہذب ملکوں کی خوش حالی کی سطح پر لانا آسان کام نہیں ہے۔ ہمیں پہاڑوں کو توڑنا ہے۔ دریاؤں کو سدھانا ہے۔ جنگلوں میں اپنے مطلب کی چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے مارا مارا پھرنا ہے۔ ہمیں مشینوں کو کھڑا کرنا ہے ہمیں بجلی کی طاقت کو پیدا کرنا ہے۔ ہمیں کارگذار مزدوروں، صنعتی ماہروں، مالی رہنماؤں اور منتظموں کو پیدا کرنا ہے۔ ہمیں اپنی تندرستی کو بہتر بنانا ہے۔ اپنے تعلیمی نظام میں اصلاح کرنی ہے۔ اپنی سیرت میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ ہمیں عملی محرکات میں تیزی پیدا کرنا ہے۔ ہمیں کاموں کو ولولے، جوش، امنگ اور ہماہمی کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رکھنا ہے۔ جب ہم یہ سب کام کریں گے تب ہی اپنی آبادی کو خوش حال بنا سکیں گے۔ کم اجرت پر زیادہ عرصہ تک سخت محنت کے کام ایمانداری اور احساس فرض کے ساتھ کرنے کے لئے ایک نہایت قوی محرک کی ضرورت ہے اور وہ قوی محرک مذہب کا ہی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ میں حوصلہ اور امنگ کا ایک لازوال سرچشمہ موجود ہے۔ اسلام کے غازی اپنے نصب العین کی اشاعت کے سلسلہ میں کوہ و بیابان، دریا اور سمندر پر مارے مارے پھرتے تھے۔ گھر بار، عزیز اقربا سب سے بے نیاز ہو کر ان کا ہر قدم آگے کی سمت بڑھتا تھا۔ جان کی انھیں پروا نہیں تھی۔ ان کی متاع، ان کا اوڑھنا بچھونا صرف ان کا ایمان ہوتا تھا۔ وہ اسلام کے نام کو روشن کرنے اور توحید کی اشاعت کرنے کے لئے زندہ رہتے تھے۔ اپنے نصب العین کے لئے جن کوششوں اور کامیابیوں کا نمونہ مسلمانوں نے

پیش کیا ہے تاریخ اس کی مثالیں کم پیش کر سکتی ہے۔ اگر مسلمانوں میں مذہب کا صحیح جذبہ پھر بیدار ہو جائے اور وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے موجودہ زمانہ میں ان کے فرائض کیا ہیں انھیں ترقی کی کن راہوں پہ سفر کرنا ہے، انھیں کس قسم کے دشمنوں کو زیر کرنا ہے، ان کے جہاد کی منزل مقصود اب کیا ہونا چاہیئے. انھیں نئے حالات میں کس قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرنا چاہیئے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ معاشی سیاسی اور تمدنی تعمیر نو کے کام میں مسلمان آج بھی اپنے ایمان کی برکت سے سب قوموں سے آگے رہ سکتے ہیں۔

غرض کہ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کو تین لفظوں میں مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے ہم اسلام کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ ہماری زندگی اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ البتہ اسلام پر قائم رہتے ہوئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کو غیروں کی محکومی سے آزاد کرائیں ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم کریں اور ملک کے افلاس اور غریبی کے مسئلہ کو حل کرنے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ کوشش کریں

ہندوستانی تمدن وتہذیب

(از محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات جامعہ)

موہنجوداڑو اور ہڑپا کے آثار قدیمہ کے انکشاف نے ہندوستان کی تمدنی زندگی کو دنیا کے قدیم ترین تمدنوں کے زمرے میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے تمدن کی جو خصوصیت اسے دنیا کے دوسرے تمدنوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا تسلسل ہے۔ اس خصوصیت میں چین کے علاوہ ہندوستان کا کوئی دوسرا سہیم وشریک نہیں ہے۔ آریوں کی آمد کے بعد سے تو یہاں کی تمدنی زندگی ایک ایسی زنجیر میں منسلک معلوم ہوتی ہے جس کی کوئی کڑی غائب نہیں ہے اس لئے ہندوستان کے عمرانی مسائل کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں پانچ ہزار[51] یا کم از کم چار ہزار سال کی تاریخ کے پس منظر کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔

مغرب کے ان ملکوں میں جو آج تہذیب جدید کے علمبردار ہیں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس کے تمدن کی تاریخ ہندوستان کے برابر قدیم ہو۔ تمدن کے وہ معیار[52] جنھوں نے ہندوستان میں بودھ عہد

---

[51] مقابلہ کے لئے سر جان مارشل کی تصنیف Mohenjo-doro and the Indus Civilisations کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔ "پانچ ہزار سال قبل جب کہ آریوں کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا، پنجاب اور سندھ میں ایک نہایت ترقی یافتہ اور نمایاں طور پر یکساں تمدن پایا جاتا تھا جو مصر اور بابل ونینوا کے ہم عصر تمدنوں سے بہت سی باتوں میں مشابہ بلکہ بعض اعتبارات سے اعلیٰ اور افضل تھا۔"

[52] مقابلہ کے لئے The Periplus of the Erythrean Sea. کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔ "پہلی صدی عیسوی میں جو مال ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جاتا تھا اس میں گرم مسالے (مثلاً سیاہ مرچ اور ادرک)، مصنوعات (مثلاً مختلف قسم کے سوتی اور ریشمی

میں یعنی آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل ایک عام شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی اور جنھوں نے یہاں کی معاشی اور معاشرتی زندگی کو اس نہج پر ڈال دیا تھا جس پر خفیف رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کے بعد ہندوستان آج بھی بڑی حد تک قائم ہے، ان سے یورپ کے جدید ترقی یافتہ ملک نہایت قریبی زمانہ تک ناواقف تھے۔ مغربی تمدن کو عروج صنعتی انقلاب کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زاید نہیں ہے اور اس کی وجہ سے مادی راحت و آسائش کے جو بلند معیار پیدا ہوئے ہیں ان کے رواج کی مدت زیادہ سے زیادہ اسّی پچاسی سال متعین کی جا سکتی ہے اور وہ بھی مغرب کے سب ملکوں اور طبقوں کے لئے نہیں بلکہ صرف چند رہنما ملکوں اور ان کے اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے لئے وہاں کے غربا کی حالت، مادی اشیا کی کثرت پیداوار کے باوجود اب بھی کچھ بہت زیادہ قابل تعریف نہیں ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ گذشتہ نصف صدی سے بلند معیاروں کو روز افزوں وسعت اور ہمہ گیری حاصل ہو رہی ہے۔ اس جدید تہذیب کی وہ خصوصیات جو اسے اپنی تمام پیشرو تہذیبوں سے ممتاز کرتی ہیں ہندوستانی تمدن کی قدامت کے مقابلہ میں بہت زیادہ حال کی چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں ایک طرح کی حقارت سی پائی جاتی ہے۔

(بسلسلہ صفحہ سابق)

کپڑے، لوہے اور فولاد کی چیزیں) دوائیں، عطر و خوشبوئیں، موم روغن اور رنگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایسی چیزیں بھی برآمد کی جاتی تھیں جنھیں ہندوستانی کپڑے کے معاوضہ میں ابتداءً چین سے درآمد اور بعد میں دوبارہ مشرق کی طرف برآمد کیا جاتا تھا مثلاً ریشم، چینی مٹی کی چیزیں اور گرم مسالے۔ پھر اشیاء غذا بھی جن میں چاول شامل تھے تھوڑی تھوڑی مقداروں میں قرب و جوار کی بندرگاہوں کو برآمد کی جاتی تھیں اور اس تمام برآمد کے معاوضہ میں ایک طرف تو ہندوستان میں چاندی اور سکے درآمد کئے جاتے تھے اور دوسری طرف فوجی ضرورت اور نمائش کے لئے ایران سے گھوڑے، مختلف دھاتیں (مثلاً ٹین، سیسہ اور تانبا) اور عیش و عشرت کے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

تمدن و تہذیب کا جب نام لیا جاتا ہے تو اس کے سنتے ہی ہندوستانیوں کی نگاہ کے سامنے زندگی کی چند نہایت خوشگوار، فرحت بخش اور دلفریب تصویریں گردش کرنے لگتی ہیں۔ دودھ اور مکھن کی افراط، غلہ کے لہلہاتے ہوئے کھیت، پھلوں سے لدے ہوئے باغ، خوش نما ترکاریاں، خوش رنگ پھول، خوش الحان پرند، مور اور ہرن شاداب اور سایہ دار درخت، دیہات کے سادہ اور خوش وضع مکانات، مندر اور پختہ تالاب، مسجدیں اور حوض، نہریں، کنوئیں اور باولیاں، ساون کی برسات کی لطف اندوزیاں جھولے اور گیت، دنگل اور کشتیاں، پوجا پاٹ بھجن اور کتھائیں، وعظ اور مولود، عید کی نمازیں، ہولی دیوالی، تہوار تقریب اور مہمانداری، عبیر و گلال، رنگ اور خوشبوئیں، پھول اور گجرے، حلوا پوری اور مٹھائیاں، بریانی، قورمہ اور شیرمال، یاترا تیرتھ اشنان اور عرس کے مقدس مقامات، دلکش وادیں اور کہسار دل، چشموں اور دریاؤں تک رسائی، بازاروں میلوں اور نمائشوں کی رنگینیاں اور دلچسپیاں، چہل پہل، مسرت اور شگفتگی، صحت اور زندہ دلی، مصنوعات کی گوناگوں بوقلمونی، ان کا حسن اور کمال، پتھر، مٹی، لکڑی، دھات، شیشہ اور بلور کی مورتیاں، ظروف اوزار، ہتھیار اور سامان، ان کی موزوں اور مناسب شکلیں، ان پر پھول بوٹے، نقش و نگار، قسم قسم کے سوتی اونی ریشمی کپڑے، ساڑیاں اور

(بقیہ صفحہ سابقہ) اشیار تجارت کی مندرجہ بالا فہرست کا مقابلہ جب اس فہرست سے کیا جاتا ہے جو مورلینڈ نے اپنی کتاب India at the death of Akbar کے ص۱۹۰ پر دی ہے تو دونوں میں بڑی حد تک بنیادی مشابہت نظر آتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں بھی ہندوستان کی معاشی زندگی کی تنظیم کم و بیش وہی تھی جو عہد قدیم میں پائی جاتی تھی۔

اسی سلسلہ میں راد ھا کمد مکرجی کی کتاب A History of Indian Shipping کے ص۹۲ و ص۱۴۶ کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں انھوں نے ان اشیار کو بیان کیا ہے جو ہندوستانی جہازوں میں لاد کر قدیم زمانہ میں فنیشیوں، یہودیوں، اسیریوں، یونانیوں، مصریوں اور رومیوں کو روانہ کی جایا کرتی تھیں۔

دھوتیاں، قالین، جانمازیں، ان کی بناوٹ کی دلفریبیاں، ان کی رنگ برنگ چھپائیاں، ان پر سونے چاندی کے زرق برق کام، کشیدہ اور کارچوب کی دیدہ زیب کارفرمائیاں، لباس اور پوشاک کا تنوع، تخت، چھپرکھٹ، کھٹولے، صوفے مسہریاں، گلاس کٹورے اور صراحیاں، عطردان اور گلاب پاش۔ چمڑے سینگ اور ہاتھی دانت کی خوش وضع چیزیں۔ سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی عالیشان مسجدیں، مقبرے قلعے اور محلات، ان کے کتبے۔ ان کی جالیاں، ان کی مینا کاری اور پچی کاری کے کام، مندر اور ان کی مورتیاں، فوارے، حمام اور ساون بھادوں، چمن اور روشیں۔ کافوری شمعیں اور شمعدان، مشعلیں اور آتش بازیاں، طبلہ، سارنگی ستار، نوبت نفیری، سنکھ، ہاتھی گھوڑے رتھ پالکیاں۔ راجہ مہاراجہ بادشاہ نواب، شہزادے راجکمار، بیگمیں اور شہزادیاں وزیر امیر سپہ سالار، پنڈت پروہت شاستری گرو سنیاسی، عالم صوفی، پیر فقیر، ساہوکار، تاجر، سوار پیادے۔ تاج پوشی۔ سالگرہ بیاہ اور برات کی تقریبیں۔ امن اور چین۔ رواداری، محبت اور وفاداری۔ ایمانداری نیکی اور پاکبازی، مروت خلوص اور باہمی امداد، ایثار اور قربانی، مذہبی پابندی، روحانی ترقی، علم وفلسفہ کا عروج۔ شاعری ڈراما اور ادب کی دوسری اصناف کا کمال ——— غرض کیسی کیسی تصویریں ہیں جو سنما کے فلم کی طرح نگاہ کے سامنے متحرک نظر آنے لگتی ہیں۔ ہمارے شاعر، ہمارے ادیب، ہمارے فلسفی، ہمارے سائنس داں، ہمارے سیاسیات اور معاشیات کے ماہر ——— سب پر "ہندوستانی تمدن وتہذیب" کے نام سے ایک شعری اور رومانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس اصطلاح کی یہی وہ افسانہ خیزیاں ہیں جو ہمارے ذہن پر ایک نشہ کی طرح چھا جاتی ہیں اور اکثر ہمارے ذہنی توازن کو بگاڑ دیتی ہیں۔ ہم اپنی موجودہ حالت کو بھول جاتے ہیں۔ ہم ایک دوسری ہی دنیا میں ہوتے ہیں جسے ہماری موجودہ پستی اور ذلت سے کوئی دور کا تعلق نہیں ہوتا۔ اس خود فریبی اور مدہوشی کے عالم میں ہمیں اپنی خراب اور بدنما چیزیں بھی حسن وخوبی کا شاہکار نظر آنے لگتی ہیں۔ ہم ہر چیز کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کسی چیز کو ذرا سی ٹھیس لگتی ہے تو ہمارا دل دکھنے لگتا ہے۔ اس کی مدافعت کے لئے ہم دل وجان لڑا دینا چاہتے ہیں۔ اگر اصلاح وترمیم کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر ہی نہیں آتا تو ہم چاہتے ہیں کہ تبدیلی کم سے کم کی جائے۔ جس کی زندگی کا

ایک خیالی مکمل خاکہ ہمارے سامنے ہوتا ہے اور حال کو اسی ماضی کی طرف واپس لے جانے کی سعی کی جاتی ہے اس بات کی خاص طور پر احتیاط کی جاتی ہے کہ کوئی ایسی اصلاح اور ترقی نہ ہو جو ماضی کے اس مکمل معیار سے علیحدہ کرنے والی ہو اور جس سے روایتی نظام معاشرت میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہو جائے۔ اجازت صرف اس بات کی ہے کہ ادھر اُدھر جہاں جہاں ضرورت ہو سہارا اور ٹیک لگادی جائے تاکہ ہمارے یہ دلفریب آثار قدیمہ جوں کے توں باقی رہ سکیں۔ موجودہ عمارت کو گرا کر نئی عمارت کے تعمیر کرنے کے خیال سے، ہمارے دل میں جس قسم کی نفرت، بیزاری اور ہیبت طاری ہوتی ہے اس کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اسے ہم گناہ عظیم، زبردست غداری اور دغا بازی، انتہائی ناعاقبت اندیشی اور کم ظرفی، نادانی اور جہل، چھچھورے پن، مغربی نقالی اور کورانہ تقلید سے تعبیر کرتے ہیں۔ مغرب اور مشرق کے خیالی مقابلہ میں مغرب کو ہمیشہ شکست اور مشرق کو ہمیشہ فتح حاصل ہوتی ہے۔ مغرب کی تمام چیزیں سطحی اور ملمع کاری معلوم ہوتی ہیں۔ مشرق کے گہرے اور بنیادی حقائق پر مبنی نظر آتی ہیں۔ مغرب کی چیزیں آنی اور فانی۔ متلون اور ناپائدار، بدنما اور غیر شعری، معصیت اور شیطنت سے لبریز، مشرق کی دائم وقائم، مستقل اور مستحکم، خوش نما اور وجد آفریں، معصوم اور ملکوتی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ جذبات اور کیفیات ہیں جو "ہندوستانی تمدن و تہذیب" کے نام سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن محض جذبہ پرستی اور مرثیہ خوانی سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شعریت اور رومانیت سے علیحدہ ہٹ کر علمی تحقیقات کی روشنی میں "ہندوستانی تمدن و تہذیب" کے اس قدیم اور روایتی تخیل اور اس کی موجودہ عملی یادگاروں کا تجزیہ اور جن معاشی اور معاشرتی اداروں پر یہ قائم ہیں ان پر آزادانہ تنقید و تبصرہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کس حد تک یہ نظام اپنی موجودہ اصلاح شدہ حالت میں نئے زمانہ کی ضرورتوں یا مطالبوں کے پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

معاشی ترقی کی مختلف منزلیں

(از ایڈیٹر)

معاشی ارتقا کا علم ترقی کی چند منزلوں کو متعین کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان منزلوں میں سے ہر منزل کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہونا چاہیئے کہ اس میں انسان کی قوتوں میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اضافہ نظر آئے اور قوائے فطرت پر اس کا تسلط پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا جائے اور اس کا اظہار اس طرح پر ہو کہ انسان کو دولت حاصل کرنے میں پہلے کے مقابلہ میں کم محنت کرنا پڑے یہی وہ طریقہ ہے جس سے معاشی ترقی کو یقینی طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔

معاشی زندگی کی ترقی کی راہیں بہت سی ہیں اس لئے اس کی منزلیں بھی مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان منزلوں کو متعین کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان میں تین قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں یا تو لوگوں نے ضمنی باتوں کو اصلی سمجھ لیا ہے یا ان کی توجیہات اس قدر ناقص و نامکمل ہیں کہ وہ بے کار ہو گئی ہیں یا اس قدر عام ہیں کہ بہت ناکافی اور مبہم بن گئی ہیں۔ مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔

(۱) پہلی قسم کی غلطی کی مثال تو وہ ہے جس میں معاشی زندگی کی ترقی کو تین دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بارٹر کا دور۔ زر کا دور اور اعتبار کا دور۔ پہلے دور میں لوگ اپنی زاید اشیا کا مبادلہ زر کے ذریعہ کرتے تھے، دوسرے میں تجارت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے زر کی ایجاد ہوئی اور تیسرے میں زر کی رسد میں اعتبار کو رواج دے کر اضافہ کیا گیا۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں لیکن یہ سب ظاہری باتیں ہیں ان سے گہرائی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ علت کیا ہے اور معلول کیا ہے۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ تبدیلیاں کیوں واقع ہوئیں اور نہ ان سے صنعتی تنظیم کی ان بنیادی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے جن کی یہ تبدیلیاں ظاہری شکلیں ہیں۔ اسی ڈھنگ کی ایک اور دوسری تقسیم ہے جس میں معاشی زندگی کی ترقی کو حیوانی، نباتی اور معدنی منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دور کے بارے میں

بیان کیا جاتا ہے کہ انسان جانوروں کے تعاقب کے آسرے پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دوسرے دور میں زمین کے پھلوں پر اور تیسرے میں سائنس حیوانی اور نباتی غذا کی جگہ برابر کیمیاوی اشیا مہیا کر رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ بیان صحیح بھی ہو تو بھی اس سے معاشی تنظیم کے بنیادی حقائق کا اظہار نہیں ہوتا۔

(۲) دوسری قسم کی توجیہات میں وہ تمام ادھوری باتیں یا بیانات شامل ہیں جو ہرچند بذات خود صحیح ہیں لیکن نامکمل ہیں۔ مثلاً مین کا وہ مشہور قانون جس میں اس نے بیان کیا ہے کہ دنیا نے رواج کی عملداری سے شروع کیا اور معاہدہ کی عملداری کی طرف ترقی کی یا اسپنسر کا قانون کہ دنیا نے عسکری معاشرت سے صنعتی معاشرت کی طرف ترقی کی۔ اسی نوعیت کا ایک اور بیان ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دنیا تین منزلوں سے گذری ہے ابتدائی منزل غلامی کی تھی دوسری سرف ڈم یعنی بیگاری کی اور تیسری آزاد مزدوروں کی۔ یا یہ کہ دنیا نے مشترکہ ملکیت سے ملکیت ذاتی کی طرف ترقی کی دوامی نظام سے ایک دہاتی نظام کی طرف یا رسم ورواج سے مقابلہ کی طرف ترقی کی ہے۔ یہ سب بیانات صحیح ہو سکتے ہیں اور ایک محدود مقصد کے لئے مفید بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن معاشی ترقی کی اندرونی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ان کی اہمیت بہت کم ہے۔

(۳) تیسری قسم کی توجیہات کی نمایاں مثال وہ ہے جس میں معاشی زندگی کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی شکاری، گلہ بانی، زراعتی، تجارتی اور صنعتی ادوار۔ مگر یہ بیان غیر صحیح اور مبہم ہے۔ نہ صرف یہ کہ شکار کو پہلی منزل قرار دینا غلط ہے بلکہ منازل کی جو ترتیب قرار دی گئی ہے وہ لازمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بیان اس قدر وسیع ہے کہ اس سے موجودہ معاشی حالات کی توضیح نہیں ہوتی۔ روم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تین منزلیں طے کر لی تھیں لیکن رومیوں کے آخری دور کی تہذیب بعض بنیادی اعتبارات کی بنا پر جدید تہذیب سے مختلف تھی۔ معاشی تاریخ کی ایسی توجیہہ جو رومی سلطنت اور سلطنت برطانیہ کو ایک ہی قبیلہ کا سمجھے اس قدر وسیع النظری پر مبنی ہے کہ اس کا کوئی عملی فایدہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح کی ایک اور تقسیم وہ ہے جس میں دنیا کی تاریخ کو عہد حجر، عہد برونز (Bronze) اور عہد آہن و فولاد میں تقسیم کیا گیا ہے آہنی عہد میں اس قدر مختلف قسم کی تہذیبیں شامل ہیں کہ اس تقسیم کو محض آثاری مقاصد کے لئے مفید قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ تمام توجیہات غلط یا ناقص ہیں لیکن جدید توجیہات کو بیان کرنے سے پہلے یہ اچھا ہے کہ جو دو تقسیمیں سب سے آخر میں بیان کی گئی ہیں ان کو ذرا تفصل کے ساتھ بیان کر دیا جائے کیونکہ جہاں تک معاشرت انسانی کی ابتدائی منازل کا تعلق ہے یہ تقسیمیں اگر ان کو صحیح طریقہ پر بیان کیا جائے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

ابتدائی اوزار یا صنعت کے طریقے

(۱) ابتدا میں ایک طویل زمانہ تک انسان بندروں کی طرح جنگلی پھلوں، جڑوں اور بوٹیوں پر زندگی بسر کرتا رہا۔ وہ بیس سے پچاس آدمیوں تک کے گروہ بنا کر ادھر ادھر گھوما کرتا تھا جیسا آج بھی آسٹریلیشیا کے بعض آدمی کرتے ہیں اور موسم اور فصلی حالات کے مطابق کبھی تو اسے کھانے کے لئے خوب مل جاتا تھا اور کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تھی۔ جہاں تک غذا کی رسد کا تعلق ہے ہر گروہ بالکل آزاد ہوتا تھا۔ مگر ابتدائی انسان کی غذا جیسا کہ اس کے دانتوں اور جبڑوں کی ساخت سے ظاہر ہوتا ہے صرف نباتی نہیں ہوتی تھی بلکہ حیوانی بھی ہوتی تھی۔ جب جغرافی حالات کی وجہ سے اس کا موقع ہوتا تھا تو وہ اپنی غذا کی رسد میں ماہی گیری کے ذریعہ اضافہ کرتا تھا اور اکثر صورت میں وہ مردم خوری کو بھی جائز سمجھتا تھا اور یہ مردم خوری صرف دشمنوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اپنے گروہ کے بڈھے اور بے کار آدمیوں کو بھی کھا لیا جایا کرتا تھا۔

(۲) جڑوں کی تلاش کے دور کے بعد تو نہیں کہنا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے بعض حصوں میں جہاں شکار کی کثرت تھی شکاری دور بھی شروع ہو گیا۔ لیکن اس کے لئے اوزاروں میں تھوڑی بہت ترقی لازمی ہے۔ انسان اور اس کے شکار میں امتیاز ہتھیاروں اور اوزاروں کی بنا پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ تہذیب کی تاریخ کو بڑی حد تک اوزاروں کی ترقی کی تاریخ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں اوزاروں اور ہتھیاروں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہتھیار ہی ایک اوزار تھا جس سے مدافعت اور حملہ دونوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ابتدائی اوزاروں میں ایسی چیزیں شامل تھیں جو نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں مثلاً لکڑی کے ڈنڈے، جانوروں کی ہڈیاں، ہاتھی دانت اور دانت، پتھر کے ٹکڑے۔

(۳) ان ابتدائی اوزاروں کے اجتماع سے ترقی کی راہ میں اور بھی بڑی سہولتیں پیدا ہونے لگیں۔

ان سے ابتدائی ڈنڈے اور پھینکنے والے اوزار ترقی پاکر زیادہ موثر ہتھیار بن گئے۔ مثلاً ڈنڈے میں چقماق کا پتھر لگانا۔ یا دندانے دار دانتوں کو گھاس یا چمڑے کے تسموں یا آنتوں کے ذریعہ لکڑی سے باندھنا انسانی ایجادو اختراع کی بڑی زبردست کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ ہڈی اور پتھر کا زمانہ بے شمار نسلوں تک چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ یہ اوزار صرف جنگ کے لئے ہی نہیں بلکہ محنت کے بچانے کے لئے بھی مفید نظر آنے لگے یا بالفاظ دیگر ہتھیار کے ساتھ اوزار بھی پیدا ہوگئے۔ اس تبدیلی میں غالباً سب سے زبردست حصہ آگ کے استعمال کا حاصل ہے۔ جس چیز سے وحشی مخلوق کو دہشت ہوتی تھی وہ انسان کی خادم بن گئی۔ ابتدا میں اتفاقی آگ لگ جانے سے آگ کو حاصل کیا گیا لیکن بعد میں اس کی نہایت احتیاط کے ساتھ حفاظت کی گئی اور اس کو تقدیس کا جامہ پہنا دیا گیا۔ بعض صورتوں میں تو آگ کو مذہب کی بنیاد بنا دیا گیا۔ اگرچہ آج بھی ہمیں بہت سے ایسے وحشی لوگ ملتے ہیں جو رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں لیکن زیادہ سہل طریقہ یہ تھا کہ ہمیشہ روشن شعلہ سے آگ کو جلایا جائے۔ آج بھی پارسیوں اور کیتھالک گرجے میں نہ بجھنے والی روشنی کی رسم میں اُس رواج کی جھلک نظر آتی ہے جسے کسی زمانہ میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

(۴) آگ کا استعمال صرف گرمی حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ غذا کے بہتر طریقہ پر پکانے اور محفوظ رکھنے کے لئے بھی کیا جاتا تھا اور اس طرح آدمی کا انحصار تمام تر اپنے قریبی ماحول پر باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے بعد سے اگرچہ آدمیوں پر ماحول کا اثر ضرور پڑتا تھا لیکن انسان کو ماحول کے بدلنے کا موقع روز بروز زیادہ حاصل ہونے لگا۔ لیکن آگ کی سب سے زبردست خدمت یہ تھی کہ اس کی وجہ سے اوزاروں میں ترقی ہونے لگی۔ اور جب دھاتوں کا رواج شروع ہوا تو اس کے فائدے اور بھی نمایاں ہونے لگے۔ لیکن لکڑی اور پتھر کے اوزاروں میں بھی اس سے بڑی ترقی ہوئی۔ یہ ترقی اس قدر آہستہ آہستہ ہوئی کہ عہد حجر قدیم سے عہد حجر جدید تک پہنچنے کے لئے انسانوں کو بے شمار صدیوں کی مدت صرف کرنا پڑی۔ چقماق کے اوزار ہمیں ایک لاکھ سال پہلے تک کے ملتے ہیں۔ اس درمیان میں انسان نے ہڈیوں اور پتھروں کو اس طرح تیز کرنا، سوراخ کرنا، کاٹنا

ہموار کرنا اور پالش کرنا سیکھ لیا تھا کہ ان سے وہ تیز چاقو، جیولیں، ہتھوڑے، چکی کے پاٹ، چھرے وآرے بنا سکتا تھا - ان سب کے بنانے میں وہ اپنے جسم کے مختلف حصوں کی نقل کیا کرتا تھا۔ ارے کو دانتوں کی ایک ترقی یافتہ شکل سمجھنا چاہئے۔ ہتھوڑے کو کلہ کی، تسلہ کو چلّو کی، کٹورے تو مڑی ہوئی انگلی کی، جیولین کو پھیلے ہوئے بازو کی چاقو کو تیز ناخون کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابتدائی برتنوں کی ترقی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جانوروں کے سینگوں نے ترقی پاکر چونچ دار گلاس کی شکل اختیار کر لی لکڑی کے کھوکھلے برتنوں نے آرام دہ ٹوکریوں کی اور تو مڑیوں سے صراحیاں بن گئیں۔ تاہم گل سازی کی ایجاد کو بعض لوگ اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ انسانی تہذیب میں اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہوگیا۔ غرضکہ ہتھیار، اوزار اور برتن انسانی نسل کی ترقی کے مظاہر ہیں اور یہی انسان کی ذہنی ترقی کے ظاہری شواہد ہیں اور انھی پر معاشی ترقی کی بنیاد قایم ہے۔

(۵) اگر صرف اوزاروں کی ترقی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پتھر کے عہد کے بعد دھات کا غلبہ شروع ہوا۔ پگھلانے کے لئے آگ کی استعمال سے واقفیت ضروری تھی اس کے بغیر دھات کا عہد شروع نہیں ہو سکتا تھا۔ آثار قدیم کے ماہروں کا کچھ عرصہ پہلے یہ خیال تھا کہ دنیا میں ہر جگہ لوہے کے عہد سے پہلے تانبے اور برونز کے عہد کا دور دورہ رہا۔ لیکن یہ بات صرف مشروط طریقہ پر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ بعض ملکوں میں ہمیں برونز کا عہد بالکل نظر نہیں آتا۔ کیونکہ وہاں برونز کے بنانے کے لئے جو عناصر ضروری ہیں یعنی ٹین اور تانبا ان میں سے کوئی ایک غائب پایا جاتا ہے۔ مگر جن تہذیبوں نے بحر روم کے گرد ترقی پائی ان میں پہلے تانبے نے اور بعد میں برونز نے ابتدائی اور بھدے اوزاروں کی جگہ لینا شروع کر دی یہاں تک کہ کچھ صدیوں بعد دھات کے حاصل کرنے کے طریقوں کی ترقی سے لوہے کے زیادہ نفیس اوزار بنائے جاسکے اور لوہے کا عہد شروع ہوا۔ ان کے شروع ہونے کے بعد سے قدرت پر انسان کا تسلط یقینی طور پر قائم ہوگیا۔

تہذیب کے ابتدائی مدارج سے آہستہ آہستہ ترقی | یہ ظاہر ہے کہ دھات کے ہتھیار اور اوزار شکاریوں

اور ماہی گیروں دونوں کے لئے بہت مفید ہو سکتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جن شکاری قوموں کی تہذیب زیادہ ترقی یافتہ تھی وہ ادنیٰ درجہ کے لوہے کے استعمال سے واقف تھیں۔ لیکن شکاری تہذیب کا جاری رہنا یا اس کا بعد کی منزل میں منتقل ہو جانا دراصل ہتھیاروں کی نوعیت پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اس کا فیصلہ طبعی حالات اور زمین اور آبادی کے باہمی تعلقات کی بنا پر ہوتا ہے بعض حالات میں جب شکار کی رسد گھٹنا شروع ہوئی تو یہ دریافت کیا گیا اور ابتدا میں یہ محض اتفاقی بات تھی کہ مختلف جانوروں کو شکار کے بعد فوراً کھا جانے کے مقابلہ میں ان کو محفوظ رکھنے اور ان کی غور و پرداخت کرنے سے غذا کی زیادہ یقینی رسد فراہم کی جا سکتی ہے۔ جانوروں کا پالتو بنانا ایک بڑا زبردست انکشاف تھا اور ان کی تعداد کے اضافہ سے جو پہلے غذا کے لئے، پھر نقل و حمل کے لئے اور آخیر میں کپڑوں کی حفاظت اور تفریح کے لئے کیا گیا گلہ بانی کی منزل کا آغاز ہوا۔ ہر چند لوگ اسے نئی چراگاہوں کی تلاش میں برابر منتقل ہونے کی وجہ سے خانہ بدوش منزل سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس اصطلاح کا انتخاب صحیح نہیں ہے اس لئے کہ شکاری عہد کے مقابلہ میں گلہ بانی کے عہد میں خانہ بدوشی نسبتاً کم تھی۔ جانوروں کے پالتو بنانے کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی رسد مستقل ہو گئی اگرچہ یہ رسد مصنوعی ہوا کرتی تھی یا کم از کم اس کا انحصار آدمی کی عاقبت اندیشی اور فکر و نگہداشت پر ہونے لگا تھا۔ مردم خوری غائب ہو گئی اور قحط سالیاں بھی کم ہو گئیں۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی رقبہ پر زیادہ آبادی کے گذر بسر کا امکان پیدا ہو گیا، پھر اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ مویشیوں پر قبضہ حاصل کرنا ایک پسندیدہ چیز بن گئی اور ملکیت ذاتی بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گئی اور اس کے ساتھ دولت کی تقسیم میں عدم مساوات اور معاشرتی طبقے بھی پیدا ہونے لگے۔

مگر یہ سمجھنا کہ ہر جگہ شکاریوں کے بعد گلہ بان پیدا ہوئے صحیح نہیں ہے۔ اس کی اول وجہ یہ ہے کہ جو جانور پالتو بنائے جا سکتے ہیں وہ ہر جگہ نہیں ملتے تھے۔ امریکہ کے براعظم میں جہاں صرف الاما .... پایا جاتا تھا گلہ بانی کی زندگی کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے بڑے وسیع قطعات زمین ایسے تھے جو چراگاہوں کے لئے

ناموزوں تھے۔ شکاری زندگی سے گلہ بانی کی زندگی میں انتقال ایشیا اور شمالی افریقہ کے انھی میدانوں میں نظر آتا ہے جہاں موسمی حالات اس کے لئے موافق تھے۔

اسی طرح یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر جگہ گلہ بانوں کے بعد کسان پیدا ہوئے۔ کیونکہ ایک قسم کی زراعت تو شکاری اور ماہی گیری کے عہد میں بھی ملی جلی نظر آتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جڑوں کے کھودنے اور ابتدائی زراعت میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ جب غالباً محض اتفاقیہ طور پر، یہ معلوم کیا گیا کہ بیج از خود اپنی تعداد میں اضافہ کر لیتے ہیں اور نیز یہ کہ انگلی کے مقابلہ میں لکڑی کھودنے کے لئے زیادہ موزوں ہے تو سمجھئے اس وقت سے زمین کی کاشت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس طرح انسان نے عاقبت اندیشی کی بنا پر جانوروں کی تعداد بڑھانے کے لئے انھیں حفاظت کے ساتھ رکھنا شروع کیا اسی طرح اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس نے پودوں کی بھی حفاظت کرنا شروع کر دی۔ اگر گلہ بانی کو جنگلی جانوروں کے پالتو بنانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو زراعت کو بھی جنگلی پودوں کے گھریلو بنانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ابتدا میں شکاریوں کے خیمہ کے قریب محض عارضی طور پر زمین کے ایک مختصر ٹکڑے پر کاشت کی جاتی تھی اس لئے بعض لوگوں نے مثلاً مارگن نے اس نظام کو باغبانی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ دوسرے لوگوں نے ابتدائی اوزاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے پھاوڑے کی کاشت سے نامزد کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں اصطلاحیں صحیح نہیں۔ باغبانی کی اصطلاح تو اس لئے صحیح نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس کا اشارہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی کاشت کی طرف کیا جاتا ہے اور دوسری اصطلاح اس لئے موزوں نہیں ہے کہ پھاوڑے کا استعمال زراعت کے کاموں کے لئے آج بھی ہر جگہ کیا جاتا ہے۔

لیکن ایک بات بہر حال یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ ابتدائی کاشت کا کام شکاریوں کی بیویاں اور بیٹیاں ایک ضمنی اور اضافی کام کی حیثیت سے کیا کرتی تھیں۔ زراعت کو اہمیت بہت بعد کے زمانہ میں حاصل ہوئی اور جب تک شکار کی رسد عملاً بالکل معدوم نہیں ہو گئی اس وقت

تک زراعت کو ایک ایسے پیشہ کی حیثیت سے جس پر بیش تر انحصار کیا جائے شروع نہیں کیا گیا اور شکاریوں کی آوارہ گردی کسان کی اقامت گزینی کی جگہ نہیں لے سکی۔ پھر یہ بات صرف شکاری منزل کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ گلہ بانی کی منزل کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جو جدید تحقیقاتیں حال میں ہوئی ہیں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جانوروں کو پالتو بنانے کا کام شکاریوں نے انجام نہیں دیا تھا بلکہ ابتدائی کسانوں نے انجام دیا تھا اس لئے گلہ بانی کی زندگی کو زراعت کی ہی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے۔ اور اس بنا پر تفصیلات کی عدم موجودگی میں تاریخی تقدم اور تاخر کا صحیح فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

اور یہی بات بعد کی تجارتی اور صنعتی منزلوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تجارتی منزل لازمی طور پر زراعتی منزل کے بعد آئے بلکہ اکثر اس سے پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً ساحلی علاقوں کی بہت سی قوموں میں ماہی گیری اور تجارت کی منزلیں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور درمیان میں زراعت کی منزل واقع نہیں ہوتی۔ زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں کی مثال کے طور پر ہم وینس کو پیش کر سکتے ہیں جہاں تجارتی منزل کا ارتقا گلہ بانی کی منزل سے ہوا اور یہاں درمیان میں صنعتی منزل واقع نہیں ہوئی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی ترقی کی یہ قدیم تقسیم نہ صرف بذات خود غیر صحیح ہے بلکہ زراعت کے اختیار کرنے کے بعد سے جو بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کی توضیح کے لئے بھی مفید نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک دوسری قسم کی تفریق کو تلاش کرنا ہوگا۔

اگر ہم معاشی حالات کو پیدائش اور صرف دولت کے تعلقات کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں کیونکہ یہی بنیادی معاشی حقائق ہیں تو ہمیں دنیا کی تاریخ کو تین بڑی منزلوں میں تقسیم کرنا پڑے گا جن کے نام علی الترتیب کافی بالذات معیشت، تجارتی معیشت اور سرمایہ دارانہ یا صنعتی معیشت ہوں گے۔ ایک دوسرے نقطہ نگاہ سے ان کے نام عزلت گزیں معیشت، مقامی یا دیہی معیشت اور قومی معیشت بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ اب ہم انہی کے بارے میں بحث شروع کرتے ہیں۔

کافی بالذات یا عزلت گزیں معیشت | اس اصطلاح سے مراد ایک ایسا معاشی نظام ہے جہاں گھر کی تمام ضرورتیں گھر والوں کی محنت سے ہی پوری ہو جاتی ہوں اور گھر کے لوگوں کی محنت سے جو کچھ پیدا کیا جاتا ہو وہ سب کا سب گھر کے لوگوں کے ہی صرف میں آجاتا ہو مثلاً ایک اوسط درجہ کے گھر میں غذا اور لباس کے لئے جس کچے مال کی ضرورت ہوتی ہو اسے خود ہی پیدا کیا جائے۔ رہنے کے لئے خود ہی مکان بنا لیا جائے اور جس قدر مصنوعہ اشیاء کی گھر کے صرف کے لئے ضرورت ہو وہ بھی گھر کے اندر ہی بنائی جائیں۔ جو تھوڑی بہت تقسیم عمل پائی جائے وہ گھر کے لوگوں تک محدود ہو اور یہ تقسیم عمل محض اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ گھر کے لوگوں کی ضرورتوں میں اضافہ ہو گیا ہو۔ گھر چاہے چھوٹا ہو یا بڑا اپنی جگہ پر ایک مستقل واحد حیثیت رکھتا ہو اور اپنے ہی جیسے کسی دوسرے واحد وجود سے اس کے کوئی تعلقات عام طور پر قائم نہ رہتے ہوں غرضکہ کافی بالذات ہونا اس کی معاشی خصوصیت ہو اور اس میں عزلت گزینی یا دوسروں سے بے تعلقی کی صفت پائی جاتی ہو۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس طرح کی کافی بالذات معیشتوں کی مختلف مثالیں نظر آتی ہیں کہیں تو تنظیم صرف ایک خاندان تک محدود ہوتی ہے کہیں خاندان سے نسبتاً بڑی جماعت پر یہ تنظیم حاوی ہوتی ہے۔ کہیں اس کی بنیاد غلاموں کی محنت پر قائم ہوتی ہے اور کہیں آزاد مزدوروں کی محنت پر۔ معاشرت کی ابتدا میں یعنی جڑوں کے کھودنے اور شکار پر گذر کرنے والے عہد میں تنظیم کی یہ شکل ہمہ گیر ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح گلہ بانی اور زراعتی منزلوں کی ابتدا میں بھی یہ تنظیم ہر جگہ ملتی تھی۔ زیادہ ترقی یافتہ جماعتوں میں جو لوگ سرحدی زندگی بسر کرتے ہیں ان میں بھی یہ تنظیم پائی جاتی ہے۔ سلطنت متحدہ امریکہ کے ایسے جنگلوں میں جو آبادی سے دور ہوتے ہیں جو خاندانی زندگی پائی جاتی ہے وہ اس اعتبار سے تاریخ کے ابتدائی گروہوں کی زندگی سے مشابہ ہے۔ یونان میں بھی یہ چیز پائی جاتی تھی کیونکہ وہاں زمینداری کا نام (oikos) تھا جس کے معنی خاندان کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح رومیوں کے Familia میں بھی اسی کا نمونہ نظر آتا ہے کیونکہ Familia کی اصطلاح روم کے شہریوں کی تمام املاک پر حاوی سمجھی جاتی تھی اور اس میں ان کے بیوی بچے غلام زمین اور ان کی تمام دوسری املاک شامل ہوتی تھیں۔

اسی طرح عہد وسطےٰ کے Manor اور امریکہ کی پلانٹیشنس میں بھی جہاں غلاموں سے کام کرایا جاتا تھا یہی تنظیم نظر آتی تھی۔ روس کے میر Mir اور ہندوستان کے دیہاتوں میں بھی اسی چیز کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔

غرضکہ تاریخ میں اس تنظیم کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں اور جہاں کہیں بھی انہیں دیکھا جاتا ہے وہاں ان کی نمایاں خصوصیت ہر جگہ یہی نظر آتی ہے کہ وہ کافی بالذات ہوتی ہیں یعنی اپنے گھر میں ہی ضرورت کی تمام چیزوں کو پیدا اور صرف کیا جاتا ہے۔ اس تنظیم کے لئے غلامی کا پایا جانا لازمی نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی تنظیم ایسی جگہوں میں بھی نظر آتی ہے جہاں غلامی کا رواج نہیں تھا مثلاً عہد وسطےٰ کے جاگیردارانہ نظام میں جہاں بیگار تو لی جاتی تھی لیکن غلامی موجود نہیں تھی یا ابتدائی عہد کے آزاد لوگوں میں یا موجودہ زمانہ کے ان آزاد لوگوں میں جن کی زندگی ابتدائی عہد کے آزاد لوگوں سے مشابہ ہے اسی قسم کی معاشی تنظیم پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے لئے مطلق العنان اقتدار کا قائم ہونا بھی لازمی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ چیز روس کی جمہوری Mir میں بھی نظر آتی ہے اور امریکہ کی اماراتی پلانٹیشنس میں بھی۔ شکلیں اس کی چاہے جس قدر مختلف ہوں لیکن اصل اس کی ایک ہی ہے۔ زمیندار چاہے وہ ایک شخص واحد ہو یا کئی اشخاص یا جماعت بہر حال جائیداد کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی ریاست میں ہر قسم کی ضرورت کی چیزیں مہیا ہو سکتی ہیں اور باہر کی دنیا کی وہ محتاج نہیں ہوتیں۔ پیدائش دولت کا تمام کام جماعت کے اندر ہی کیا جاتا ہے اور دولت کے پیدا کرنے اور صرف کرنے والوں میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ گروہ کے تمام افراد کی ضرورتیں گروہ کی محنت سے ہی پوری ہو جاتی ہیں اور وہ کسی دوسرے معاشی گروہ پر انحصار نہیں کرتے۔ جس طرح دولت کے پیدا کرنے میں آزاد ہوتے ہیں اسی طرح دولت کے صرف کرنے میں بھی آزاد ہوتے ہیں۔

لیکن کچھ عرصہ بعد وہ گھرانے جنھیں بعض خاص چیزوں کے پیدا کرنے میں کوئی طبعی یا اکتسابی سہولت حاصل ہوتی ہے ضرورت سے زاید چیزیں پیدا کرنے لگتے ہیں اور دوسرے گروہوں کے

ساتھ ان کی تجارت شروع کر دیتے ہیں۔ ابتدا میں چیزوں کا انتقال صرف یک طرفہ ہوتا ہے اور تعلقات میں شگفتگی اور خوشگواری پیدا کرنے کے لئے چیزوں کو باہم منتقل کیا جاتا ہے لیکن بعد میں چیزوں کے دینے کے بعد معاوضہ کی بھی توقع کی جانے لگتی ہے اور اس طرح بارٹر ترقی پانا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن ابتدا میں ایک طویل مدت تک بارٹر کا وجود نظر نہیں آتا کیونکہ جہاں معیشت کافی بالذات ہوگی وہاں بارٹر کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ ان لوگوں کو اشیا کا مبادلہ اس بنا پر کہ یہ ایک غیر طبعی فعل ہے معیوب نظر آئے گا۔ آدم اسمتھ کا یہ خیال کہ انسان میں تجارت کا رجحان Human tendency; to Trade: فطری ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ چیز انسانی معاشرت کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ معنوی اعتبار سے Trade کے معنی چالاکی سے کام لینے کے ہیں جیسے بارٹر کے اصلی معنی (Fr. Barater [illegible]) دھوکہ دینے کے ہیں۔ جب مبادلہ میں ترقی ہو جاتی ہے تو پھر اس وقت سودے مقررہ قاعدوں اور رواجوں کے مطابق کئے جانے لگتے ہیں اور ان میں مذہبی تقدس کے عنصر کو شامل کیا جاتا ہے۔

لیکن گروہوں کے مابین محض مبادلہ کے پیدا ہو جانے سے معاشی زندگی کی تنظیم میں تبدیلی کا پیدا ہو جانا لازمی نہیں ہے کیونکہ جب تک اشیاء کی کثیر مقدار گھر پر ہی پیدا اور صرف کی جاتی رہے گی اس وقت تک کافی بالذات معیشت باقی رہے گی مثلاً یونانی تہذیب کی آخری صدیوں میں بہت سے زمینداروں کی ریاستوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ اشیا خام اور بعض وقت تعیشات کو شہروں میں فروخت کرنے کے لئے پیدا کرنے لگتے تھے اور شہروں میں تجارت کا خوب فروغ ہو گیا تھا۔ اسی طرح روم میں اس کی خوشحالی کے عروج کے زمانہ میں بڑی بڑی زمینداریوں میں صرف کوئی ایک قسم کی چیز برآمد کے لئے پیدا کی جاتی تھی مثلاً شراب یا تیل یا گیہوں اور اس برآمد کے کام کو بڑی بڑی کمپنیاں انجام دیا کرتی تھیں۔ اسی طرح امریکہ کی پلانٹیشنس میں ایک واحد شے، مثلاً تمباکو یا کپاس یا شکر کو برآمد کے لئے پیدا کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے شہروں میں اس کی تجارت ہوتی تھی اور یہی شے کسی خاص پلانٹیشنس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہوا

کرتی تھی۔ لیکن ان تمام صورتوں میں یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی کہ پیدا کی ہوئی اشیا کی بیشتر تعداد گھر پر ہی صرف ہو جاتی تھی۔ گروہوں کے درمیان تجارت ضرور پائی جاتی تھی لیکن خود ایک گروہ کے اندر تجارت بہت کم ہوتی تھی اور اگرچہ گروہوں کے مابین جو تجارت ہوتی تھی اس کی رقم خاصی کثیر ہوتی تھی لیکن اس سے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ اور جس طرح امریکہ کے جنوبی علاقوں کی تہذیب کی نمایاں خصوصیات کا مطالعہ پلانٹیشنس میں ہی کیا جا سکتا ہے اور جس طرح روس کی معاشی زندگی کی نمایندگی میر Mir سے ہوتی تھی۔ اسی طرح روم کی جمہوریت کی تعمیر میں اہمیت تجارتی کمپنیوں کو حاصل نہیں تھی بلکہ زمینداروں کی ریاستوں کو حاصل تھی۔ اور ان میں کافی بالذات معیشت کا رواج تھا اس سے ثابت ہوا کہ اس حالت میں بھی جب بازار کے لئے زاید پیداوار پیدا کی جانے لگتی ہے یہ ہو سکتا ہے کہ گروہ کے اندر جو لوگ شامل ہوں وہ تقریباً تمامتر اپنے گروہ کی محنت سے ہی اپنی ضرورت کی تمام چیزیں حاصل کرتے ہوں۔

مگر داخلی اور خارجی تجارتی تعلقات کی ترقی سے معاشی گروہ کافی بالذات نہیں رہتے اور معاشی زندگی کی دوسری منزل آہستہ آہستہ نمودار ہونے لگتی ہے۔

تجارتی معیشت اس منزل کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ پیدائش کے بعد صرف دولت کا کام براہ راست شروع نہیں کیا جاتا بلکہ درمیان میں مبادلہ کی ایک کڑی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور صرف کرنے والوں کی ضرورتیں بیشتر تجارت کے وسیلہ سے پوری ہوتی ہیں۔ تجارت کی اہمیت کا یہ سبب نہیں ہوتا کہ مختلف کافی بالذات گروہوں میں مبادلہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ یہ چیز تو جیسا ہم ابھی دیکھ چکے ہیں خانگی یا عزلت گزیں معیشت کے آخری دور میں بھی شروع ہو گئی تھی بلکہ اس کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ اس میں خود گروہ کے اندر تجارت شروع ہو جاتی ہے۔ خاندان کے افراد اب پہلے کی طرح اپنی ضرورت کی چیزیں خود ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ ان چیزوں کو پیدا کرتے ہیں جن کی ضرورت دوسروں کو ہوتی ہے۔ اب دولت کے پیدا کرنے والوں اور دولت کے صرف کرنے والوں کے گروہ الگ بن جاتے ہیں۔ اور لوگ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو صرف نہیں کرتے

بلکہ ان چیزوں کو صرف کرتے ہیں جو انھیں تجارت سے حاصل ہوتی ہیں یا بالفاظ دیگر کافی بالذات معیشت کی جگہ تجارتی معیشت پیدا ہو جاتی ہے۔

معاشی زندگی کا دائرہ گو پہلے سے بڑا ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے پہلے کی طرح مقامی ہی رہتا ہے اور تجارت وصنعت بیشتر دیہات کے اندر ہی محدود رہتی ہیں۔ اس منزل کا مشاہدہ نہایت صاف طور پر عہد وسطےٰ کی تاریخ کے مطالعہ کے دوران میں کیا جاسکتا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں تجارت کو بہت ترقی ہوئی جس کا خاص سبب یہ تھا کہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے تجارت کی نئی راہیں کھل گئیں۔ اس سے پہلے کی صدیوں میں جن میلوں اور منڈیوں کی ابتدا چھوٹے پیمانہ پر ہوئی تھی انھوں نے ان صدیوں کے دوران میں مستقل قصبوں اور شہروں کی شکل اختیار کرلی۔ عہد وسطےٰ کے شہروں کو صرف پتھر اور چونے کی فصیلیں ہی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی تھیں بلکہ تجارت کے اجارہ کی وجہ سے بھی تعلقات کے قائم ہونے میں سخت معاشی رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ صرف شہر کے رہنے والے جنھیں برگس کہا جاتا تھا آزادی کے ساتھ خرید فروخت کرسکتے تھے صرف انھی کو تجارت کی بہت سی مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ اس معاشی تفریق سے وہ سیاسی آزادی پیدا ہوئی تھی جو ابتدائی جماعتی زندگی کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔ دیہی معیشت کے نام سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ معاشی دائرہ موضع گاؤں یا قصبہ ہوا کرتا تھا بلکہ اس میں گاؤں یا قصبہ کا ملحقہ علاقہ بھی شامل ہوتا ہے۔ ان ملحقہ زمینوں یا جایدادوں سے وہ خام اشیا ملتی تھیں جنھیں قصبوں میں مصنوعہ شکل دی جاتی تھی۔

پھر اس پرانے دائرہ کے ٹوٹ جانے سے صنعت کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کی منزل میں زراعت اور صنعت میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ کسان بڑھئی کا کام بھی خود ہی کرلیتا تھا کسان کی بیوی گھاس چارہ اکٹھا کرتی اور گھر کے کپڑے لتے سیتی تھی۔ جب جایدادیں اتنی بڑی ہوگئیں کہ ان میں مختلف قسم کے صنعتی کام کرنے والوں کے طبقے الگ الگ بن گئے اس وقت بھی وہ سب کے سب زمیندار کی نگرانی میں رہتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں گاؤں کے کاریگر کی ایک آزاد اور مستقل حیثیت ہوگئی تھی

گو ابھی تک بہت سے دستکاروں کے پاس ایک چھوٹا سا باغ یا کیاری کا ٹکڑا ہوا کرتا تھا۔ اس میں خاص طور پر لائق توجہ بات یہ ہے کہ اب کاریگر اپنے پیشہ کی ضرورت کی چیزوں کو خود پیدا نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں خریدنے لگے تھے کسان خام اشیاء پیدا کرتے تھے اور دیہات کے دستکار اُن کی مصنوعہ چیزیں بناتے تھے اور دونوں طبقوں کے لئے تجارت ترقی و خوش حالی کا باعث تھی۔

پھر ایک اور مفہوم کی بنا پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نئی صنعت تجارت پر مبنی تھی۔ دست کار اپنی خام اشیاء کو نہ صرف یہ کہ خود ہی چھوٹی مقدار میں خریدتا تھا بلکہ اپنی مصنوعہ اشیاء کو بھی اپنی مستقل دوکان یا میلہ کی عارضی دوکان میں خود ہی فروخت کیا کرتا تھا۔ کاریگر کا زیادہ اہم کام دراصل تجارت ہی تھا۔ اور اس کی کامیابی میں تجارت کو بھی اتنا ہی دخل تھا جتنا اس کی صنعتی مہارت کو۔ دستکاروں نے ایک مستقل طبقہ کی حیثیت آہستہ آہستہ اختیار کی اور اسی طرح بڑے تاجروں کے ہاتھ میں تجارت آہستہ آہستہ ہی پہنچی۔ ایک طویل زمانہ تک تجارت مقامی منڈیوں اور میلوں میں خوردہ فروشی تک محدود رہی اور اس وقت بھی جب چند اشیاء کی تجارت بڑے پیمانہ پر شروع کی گئی موجودہ عہد کی ترقی یافتہ تجارت کے طریقوں کا کہیں نام و نشان ہی نہیں پایا جاتا تھا۔

تجارت اور کاریگری کی اہمیت کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آزادی اور مساوات کے احساس میں بھی ترقی ہوتی رہی اس اعتبار سے عہد وسطےٰ کے شہروں اور قصبوں کو جمہوریت کی جائے پیدائش کہا جا سکتا ہے۔ لیکن تجارت و صنعت کو اقتدار حاصل کرنے میں بڑی مدت لگ گئی۔ ابتدا میں اٹلی میں کچھ عارضی فتوحات حاصل ہوئیں لیکن بلجیم اور ہالینڈ میں سب سے پہلے انھیں مستقل اور پائدار فتح حاصل ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ جدید جمہوریتوں کی ابتدائی مثالیں بلجیم اور ہالینڈ میں ہی ملتی ہیں۔

اس معاشی منزل کی ترقی کے آخری دور میں دولت بڑے پیمانہ پر اکٹھی کی جانے لگی۔ یا تو یہ دولت تجارت اور تھوک فروشی سے حاصل کی جاتی تھی یا زمین سے۔ جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ

سیٹھ اور جگت سیٹھ بھی ہوا کرتے تھے۔ اگر ہم دولت کے اس اجتماع کو سرمایہ کا اصطلاحی نام دیں تو ہمیں اس زمانہ میں زراعتی سرمایہ اور تجارتی سرمایہ تو ملے گا لیکن صنعتی سرمایہ نہیں ملے گا۔ جو دولت زمین سے حاصل کی جاتی تھی اسے دوبارہ زمین میں نہیں لگایا جاتا تھا بلکہ زمیندار لٹ سے اپنے صرف میں لے آتے تھے۔ اور جو دولت تجارت سے حاصل کی جاتی تھی اس سے گاڑیاں اور جہاز اسی وقت تک لامحدود تعداد میں بنائے جا سکتے تھے جب تک منتقل کرنے کے لئے اشیاء ابھی کثیر تعداد میں موجود ہوتیں۔ لیکن چونکہ یہ اشیاء ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں اس لئے ان کے اضافہ کی رفتار بہت سست تھی۔ اس لئے اس منزل کی معاشی تہذیب کا انحصار دیہات کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں پر ہی رہا اور تجارتی اور زراعتی دولت کی وابستگی چھوٹے کاریگروں اور دیہی معیشت کے ساتھ باقی رہی۔

یہ صحیح ہے کہ اس منزل کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں تھیں بعض جگہ زراعتی خوش حالی اور دولت کا اثر غالب تھا اور زمینداروں کا طبقہ با اقتدار تھا۔ دوسری جگہوں میں مثلاً ہنسا کے شہروں میں تھوک تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں نظر آتی تھیں اور تجارتی خاندانوں کا طبقہ امرا میں شمار کیا جاتا تھا ان کے علاوہ اور دوسری جگہوں میں صنعت کے مرکز بھی ملتے ہیں اور کاریگروں کی پنچایت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ مگر ان سب صورتوں میں چھوٹے تاجر، چھوٹے کاریگر اور مقامی معیشت یکساں طور پر ہر جگہ ملتے ہیں۔ بڑا زمیندار اپنی پیداوار ملحقہ گاؤں کی منڈی میں فروخت کرتا تھا اور غذا کے علاوہ باقی تمام صرف کی چیزیں وہیں سے حاصل کرتا تھا۔ ملک التجاروں کی تجارت دور دراز ملکوں سے بھی ہوتی تھی لیکن ان کی تجارت کا بھی بیشتر حصہ مقامی ہوا کرتا تھا۔ اور قومی اور بین الاقوامی میلوں کی تجارت صرف چند خاص اشیاء تک محدود ہوا کرتی تھی۔ کاریگر جو چیزیں بناتے تھے ان میں سے اکثر مقامی منڈی کے لئے اور لوگوں کی فرمائش پر بنائی جاتی تھیں دیہات یا قصبہ کو واحدہ کی حیثیت حاصل تھی اور پردیسی وہ شخص کہلاتا تھا جو دوسرے قصبہ سے آتا تھا اور اس کے لئے دوسرے ملک کا ہونا لازمی نہ تھا۔

معاشی زندگی کی یہ منزل یورپ میں کئی صدیوں تک چلتی رہی۔ لیکن بعد میں بہت سے اسباب کے مل جانے سے ابتدا میں اس میں ترمیم ہوئی اور بعد میں یہ بالکل ختم ہو گئی۔ ان میں۔ سے نمایاں سبب

نئی دنیا کی دریافت اور مشرق کے سفر کے لئے نئے سمندری راستوں کا انکشاف تھا جس سے دولت کا ذخیرہ بہت بڑھ گیا۔ امریکہ میں بے انتہا قیمتی دھاتوں کا پتہ لگنے اور مشرقی اور مغربی تجارت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہونے سے دولت کا ذخیرہ خوب بڑھ گیا اور اسے صنعت کی پیداوار حاصل کرنے کے لئے بڑے پیمانہ پر لگایا جانے لگا جس سے آہستہ آہستہ معاشی زندگی کی تمام نوعیت ہی بدل گئی جب دولت کے اس ذخیرہ کو صنعت میں لگایا گیا تو اس سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے صنعتی سرمایہ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے اور اس صنعتی سرمایہ نے تیسری منزل کو پیدا کر دیا۔

صنعتی یا سرمایہ دارانہ معیشت | صنعت کے کاروبار میں بڑے پیمانہ پر سرمایہ کا لگایا جانا اس منزل کی امتیازی خصوصیت ہے۔ سرمایہ کے ساتھ سرمایہ دار یعنی سرمایہ کا مالک بھی پیدا ہوا جو مزدوروں کا آجر اور صنعتی کاروبار کا نگراں اور منتظم ہوتا ہے۔ عزلت پسند معیشت کی منزل میں ہم نے دیکھا تھا کہ تمام معاشی کاروبار میں ایک وحدت پائی جاتی تھی۔ مقامی اور دستکاری کی منزل میں یہ وحدت صرف دولت کی پیدائش کے کام میں باقی رہ گئی تھی سرمایہ داری کی منزل میں دولت کی پیدائش کا کام بھی منقسم ہو گیا۔ ابتدا میں یعنی سترھویں اور اٹھارویں صدی کے انگلستان میں سرمایہ دار پیدائش دولت کے صرف ابتدائی اور آخری کاموں پر قبضہ کرتا ہے اور باقی تمام کاموں کو آزاد کاریگروں کے ہاتھ میں رہنے دیتا ہے۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد سرمایہ دار کام کرنے کی جگہ پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔ اور سب سے آخر میں پیدائش دولت کے اوزار اور ذرائع پر بھی اس کی ملکیت قائم ہو جاتی ہے۔ کارگاہ فیکٹری میں بدل جاتی ہے، اوزار مشین کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور کاریگر فیکٹری کے دست و بازو یا پرزے بن جاتے ہیں۔ اس دوران میں پیدائش دولت کے مختلف کاموں کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہر جداگانہ منزل ایک مختلف سرمایہ دار کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کا انحصار فیکٹری کے مالکوں کے مختلف طبقوں پر ہونے لگتا ہے۔ غرضکہ خام اشیاء اور مشین اور فیکٹری کی قیمت نیز مصنوعہ اشیاء کو خریدار تک لیجانے کے کاموں کے لئے ہر قدم پر سرمایہ داروں کے مختلف طبقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخر میں سرمایہ کی قوت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بعض صنعتوں میں اشتراک کا

عمل شروع ہو جاتا ہے اور وہی سرمایہ دار ایک گروہ میں شامل ہو کر صنعت کے تمام کاموں کی از ابتدا تا انتہا، خام اشیاء کے نکلنے سے لے کر مصرف کے پاس آخری طور پر پہنچانے تک نگرانی کرنے لگتے ہیں اور اس طرح صنعتی معاشرت اپنی موجودہ پیچیدہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اب دولت کو چھوٹی مقداروں میں فرمائش پر پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ بڑے بڑے ذخیرے اکٹھے کئے جاتے ہیں تاکہ انھیں اس وقت فروخت کیا جائے جب بازار تیز ہو یا بڑے بڑے کارخانے کھڑے کئے جاتے ہیں تاکہ ان بڑی فرمائشوں کو پورا کیا جا سکے جن کے پیدا ہونے کی توقع کی جاتی ہے پرانے نظام کی سست رفتاری کی جگہ جس میں رسم ورواج کو اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی سخت ترین مسابقت شروع ہو جاتی ہے جس کا اثر صنعتی معاشرت کے ہر کونہ اور گوشہ میں محسوس کیا جاتا ہے۔ بارٹر کا آخری نشان مٹ جاتا ہے اور تمام مبادلوں میں زر ہی ایک کڑی کا کام انجام دیتا ہے ابتدا میں اعتبار کے معنی یہ ہوا کرتے تھے کہ جس شخص پر اعتبار ہوا اس کی ضرورت کے وقت ذاتی تعلقات کی بنا پر مدد کر دی جائے۔ اب اعتبار پیدائش اور مبادلہ دولت کا ایک لازمی عنصر بن جاتا ہے۔ سرمایہ کو نفع بخش طریقہ پر لگانے کی خواہش محنت کی کفایت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے نئی مشینوں کی ایجاد ہوتی ہے۔ پیداوار کے بہت زیادہ سستے ہو جانے کی وجہ سے وہ چیزیں جن کا شمار تعیشات میں تھا ضروریات بن جاتی ہیں اور لوگوں کی قوت صرف میں اضافہ ہو جاتا ہے ضرورتوں کے اضافہ سے نئی صنعتیں پیدا ہوتی ہیں اور آخر میں مزدوروں کو زیادہ اجرت پر نئے کام ملنے لگتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرمایہ کی طاقت بڑھنے کے اور جماعت کے مختلف صنعتی طبقوں میں جدا ہو جانے کی وجہ سے نئے اور مشکل مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ منزل کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی واحدہ کی جگہ قوم لے لیتی ہے۔ اب پیدائش اور صرف دولت گاؤں اور شہر کے حدود کے اندر نہیں رہتی بلکہ جو چیز ایک ضلع میں پیدا کی جاتی ہے وہ دوسرے ضلع میں صرف کی جاتی ہے۔ مقامی دیہی اور شہری معیشت وسیع ہو کر قومی معیشت بن جاتی ہے۔ وسیع تر معاشی مفاد کے لئے وسیع تر اور مضبوط تر سیاسی واحدوں کے بنانے کی ضرورت پیش

آتی ہے۔ چنانچہ چھوٹی چھوٹی جاگیردارانہ ریاستیں غائب ہو جاتی ہیں اور جدید قومی ریاستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب ایک شہر کے مقابلہ کے لئے دوسرا شہر کھڑا نہیں ہوتا۔ شہریت کا احساس محض ایک شہر کے ساتھ وابستہ نہیں رہتا بلکہ پوری قومی ریاست کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اور پردیسی دوسرے گاؤں کے آدمی کو نہیں کہتے۔ بلکہ دوسری قوم کے آدمی کو کہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ارتقا کے ابتدائی مدارج میں قومیں اسی طرح ایک دوسرے کی مخالفت کرتی تھیں جیسے پہلے شہر اور قصبات کیا کرتے تھے اور اس سخت قومی مقابلہ سے بہت کچھ بھلائی پیدا ہوتی ہے اگرچہ اس بھلائی میں برائی کی بھی خاصی آمیزش ہوتی ہے۔

حال کے زمانہ میں سرمایہ دارانہ طریقوں کی ترقی ذرائع نقل و حمل اور خبر رسانی کی اصلاح اور جب یہ اسپیکولیشن یا تخمین کی نشو و نما سے اکثر اشیاء کے لئے ایک عالمگیر منڈی پیدا ہو گئی ہے اور تجارت میں جو ذرا سا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا اثر فوراً ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچ جاتا ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب معیشت قومی نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ہر چند اس کے آثار پائے جاتے ہیں کہ آخر میں ایک بین الاقوامی معیشت پیدا ہو جائے گی مگر جہاں تک موجودہ حقائق کا تعلق ہے یہ بات کسی طرح نہیں بھلانا چاہئے کہ معیشت ابھی تک قومی منزل پر ہی ہے۔ اور ہمہ گیر اور بین الاقوامی معیشت کی طرف جو ترقی بھی ہو رہی ہے وہ بہت آہستہ آہستہ ہو رہی ہے۔

سرمایہ دارانہ منزل کو صنعتی منزل کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس منزل میں لوگوں کا خاص پیشہ صنعت و حرفت ہی ہوتا ہے۔ پہلی منزل میں تقریباً پورے طور پر زراعت ہی لوگوں کا ذریعہ معاش ہوا کرتی تھی دوسری منزل میں خوش حالی کا انحصار تجارت پر ہوا کرتا تھا۔ لیکن صنعتی منزل میں زراعت اور تجارت دونوں غیر اہم ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ صحیح ہے کہ زمین ہی تمام پیداواروں کا منبع اور مخرج ہوتی ہے لیکن پیداوار کی بیشتر مقدار اب زمین کے کام سے کئی منزل دور ہوتی ہے۔ دولت کی پیدائش کے معنی آج کل مصنوعہ اور تکمیل شدہ اشیاء کے ہو گئے ہیں۔ اسی طرح تجارت کو اب بھی اہمیت حاصل ہے

لیکن تجارت اب زیادہ تر صنعت کی ملازمہ اور سہیلی ہے زراعت کی نہیں۔ بڑی بڑی جایدادیں اور دولت آج کل صنعت سے پیدا کی جاتی ہیں زراعت اور تجارت سے نہیں۔ ساہوکار زمینداروں اور جاگیرداروں کے رقیب کی حیثیت سے ہی نمودار نہیں ہوتے بلکہ اب وہ صنعت کے نہایت گہرے رفیق اور دمساز بن گئے ہیں۔ پہلی معاشی منزل میں عام طور پر امیر آدمی جاگیردار یا پلانٹیشن کے مالک ہوا کرتے تھے دوسری منزل میں ملک التجار ہوا کرتے تھے جیسے میڈیسی اور فگر لیکن تیسری منزل میں کارنگی اور راک فیلر ہونے لگے ہیں زراعت اور تجارت کی صورت بھی سرمایہ اور مشین کے استعمال کی وجہ سے بالکل بدل گئی ہے۔ خوش حالی اور دولت کی فراوانی، تمدن، تہذیب اور اقتدار کی وسعت اور ہمہ گیری آج کل صنعتی قوموں میں پائی جاتی ہے۔ زراعتی قوموں میں نہیں۔

بعض ملک مثلاً چین تجارتی عزلت نشینی کی وجہ سے اس تحریک سے الگ رہے چنانچہ چین ابھی تک معیشت دیہی کی منزل پر ہے۔ یہی حال ہندوستان کا ہے۔ لیکن دوسرے ملک مثلاً جاپان چالیس پچاس سال قبل اس نئی تحریک میں شامل ہو گئے اور ان میں آج بھی نہایت تیزی سے تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح یورپ اور امریکہ کے پس ماندہ علاقے بھی اس تحریک سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ قدیم عہد میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ دوسری منزل عرصہ تک پیدا نہیں ہوئی۔ اور جہاں تجارت نے بڑے پیمانہ پر ترقی پائی اور شہری مرکزوں کو فروغ ہوا وہاں بھی صنعت چھوٹی دستکاری کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے علاوہ غلامی کے موجود ہونے اور تجارت میں کسی ایسے انقلاب نہ ہونے کی وجہ سے جو عہد وسطےٰ کے ختم ہونے کے بعد واقع ہوا یونان اور روم میں سرمایہ دارانہ عہد شروع نہ ہو سکا۔ قدیم عہد میں سرمایہ زیادہ تر تجارتی سرمایہ ہوا کرتا تھا، برخلاف اس کے جدید عہد میں سرمایہ بیشتر صنعتی سرمایہ ہوتا ہے۔

اسلام میں ملکیت ذاتی پر پابندیاں

(از آنریبل مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم)

(مشیر حسین صاحب قدوائی مرحوم کی ایک تازہ تصنیف "پین اسلامزم اور بالشوزم" کے نام سے شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسلام اور اشتراکیت میں مشابہت دکھلانے کی کوشش کی ہے اور ایک عام چیلنج دیا ہے کہ:۔

"جو تعلیم یافتہ اور سوچنے والا کمیونسٹ چاہے میرے پاس آئے اور مجھے بتائے کہ وہ کن وجوہ سے اپنے آپ کو پین اسلامسٹ نہیں سمجھتا میں انھیں وجوہ کو سامنے رکھ کر اُسے قایل کردوں گا کہ اسی حد تک اُس کا کمیونزم ناقص اور ادنیٰ درجہ کا ہے اور سوسائٹی کے لئے بصورت مجموعی یا سوسائٹی کے اجزائے ترکیبی کے لئے نقصان کا موجب ہے۔

" اسی طرح جو مسلمان چاہے میرے پاس آئے اور مجھے بتائے کہ کن وجوہ سے وہ کمیونزم کے اصول یا اصولوں کو پسند نہیں کرتا (مجھے کمیونزم کے ان متعلقات سے بحث نہیں ہے جو اُس کے ساتھ غیر ضروری طور پر اور ناسمجھی کی بنا پر وابستہ کردئے گئے ہیں) اور میں اس کو اس بات کا یقین دلا دوں گا کہ اسی حد تک اس نے اسلام کو نہیں سمجھا یا اس کا علم اسلام اور اس کی روح کے بارے میں ناقص ہے"

قدوائی صاحب کے نزدیک پین اسلامزم اور بالشوزم میں خاص فرق صرف یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد خدا کے عقیدہ پر قائم ہے لیکن بالشویکوں نے کارل مارکس کے پیرو ہونے کی حیثیت سے غیر ضروری طور پر اور ناسمجھی کی بنا پر ایک خلاف خدا اور خلاف مذہب پالیسی کو اختیار کرلیا ہے اور یہ غالبًا اس وجہ سے ہے کہ ان بے چاروں کے سامنے ان کے کلیسا نے خدا کا صحیح تصور پیش نہیں کیا تھا۔

عام مشابہتوں کے علاوہ جن خاص مشابہتوں کا قدوائی صاحب نے تذکرہ فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) اسلام اور بالشوزم دونوں کا مقصد عالمگیر انقلاب ہے۔

(۲) دونوں نے خاص حقوق اور مراعات کو تسلیم نہیں کیا۔

(۳) دونوں رنگ اور نسل پر ناز کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

(۴) دونوں سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔

(۵) دونوں نے محنت اور کام کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

(۶) دونوں نے زمینداری کی مخالفت کی ہے۔

(۷) دونوں نے انسانی مساوات کو قائم کیا ہے۔

(۸) دونوں نے بین الاقوامیت کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

(۹) دونوں نے افراد کو ترقی کے لئے مساوی مواقع دئے ہیں۔

(۱۰) دونوں نے علم و تعلیم کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

(۱۱) دونوں نے عورتوں کو آزاد کیا ہے اور

(۱۲) دونوں نے ملکیت ذاتی کی تنسیخ کی ہے۔

یوں تو قدوائی صاحب کی پوری بحث نہایت دلچسپ اور مطالعہ کی مستحق ہے لیکن گنجائش کی قلت کی وجہ سے یہاں صرف ان خیالات کا اقتباس پیش کیا جائے گا جن کا اظہار قدوائی صاحب نے "ملکیت ذاتی کی تنسیخ" کے عنوان کے ماتحت فرمایا ہے قدوائی صاحب کی تائید یا مخالفت میں اگر کوئی اور بزرگ اپنے خیالات کا اظہار فرمانا چاہیں گے تو ہم نہایت خوشی کے ساتھ انھیں اپنے رسالہ میں شایع کریں گے (ایڈیٹر)

مختصر الفاظ میں مسلمانوں میں ملکیت ذاتی کی جو صورت ہے اُسے حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا جاسکتا ہے :-

(۱) اگر کوئی شخص سچا مسلمان ہے اور اُس نصب العین کی لفظاً اور معناً پیروی کرنا چاہتا ہے جو اسلام نے مقرر کیا ہے اور جس کا نمونہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک میں اور دوسرے مسلمان اولیاء اللہ کی زندگی میں نظر آتا ہے تو ایسا شخص بہت زیادہ چیزیں اپنی ذاتی ملکیت میں نہیں رکھے گا حتیٰ کہ امین بننے کے لئے بھی وہ مال کو اپنے پاس رکھنا گوارا نہ کرے گا۔

رسُول اللہ صلعم نے ایک شخص کی ملکیت کی جو حد مقرر کی ہے وہ ایک حدیث میں موجود ہے یعنی رہنے کے لئے مکان، پہننے کے لئے کچھ کپڑے اور کھانے اور پانی کی ضروری مقدار۔ ملکیت ذاتی کی بس یہ حد ہے اس سے زیادہ نہیں۔

(۲) لیکن جو لوگ اس درجہ تک نہ پہنچ سکیں اور جن میں طبعی طور پر مال اور ملکیت کی محبت کا غلبہ ہو تو اسلام اس ملکیت سے تعرض نہیں کرے گا بشرطیکہ یہ اسلام کی روح کے خلاف نہ ہو یعنی اس دولت اور ملکیت کو صرف ذاتی آرام اور سکون کے لئے استعمال نہ کیا جائے بلکہ جماعت کے فایدہ کے لئے استعمال کیا جائے۔

ریاست اس پر زکوٰۃ اور دوسرے محاصل عاید کرے گی اور دولت کے مالک سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ چند مقررہ جماعتی خدمات کے لئے اپنی دولت اور ملکیت کو صرف کرے۔

(۳) اگر کوئی شخص مندرجہ بالا اسلامی احکامات کی پیروی کرتا ہے تو اس کے پاس ترکہ اور وراثت کے لئے بہت کم ملکیت باقی رہے گی۔ لیکن اگر باقی رہی تو پھر قانون وراثت کا عمل شروع ہو جائے گا اور اس کے ذریعہ سے ملکیت منصفانہ طریقہ پر منقسم ہو جائے گی اور بڑی بڑی جاگیریں، سود خوار سرمایہ دار اور کروڑپتی پیدا نہ ہو سکیں گے۔ اگر متوفی مخیر اور بنی نوع انسان کا بہی خواہ اور ہمدرد تھا تو وہ خود ہی خیراتی مقاصد کے لئے اپنی جایداد کو وقف کر جائے گا اور اگر وقف کے ساتھ اپنے خاندان کے تعلق کو بھی باقی رکھنا چاہے گا تو اُسے وقف علی الاولاد کر دے گا۔

غرضکہ اس طرح اسلام ملکیت ذاتی پر بغیر جبریہ قبضہ کئے اور انسانوں کو ان کے قدرتی رجحانات سے روکے ہوئے اس مقصد کو حاصل کر لیتا ہے جسے بالشوک ملکیت ذاتی کو جماعتی ملکیت بنا کر

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اب مندرجہ بالا اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

اسلام نے نظری طور پر ملکیت کو جڑ سے اس طرح کاٹا کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا مالک خدا کو قرار دے دیا۔ قرآن کہتا ہے "جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے سب خدا کی ملکیت میں ہے" سورۂ ۲ آیت ۲۵۵۔

"اللہ کی ملکیت" کے معنی اسلام کی اصطلاح میں ہیں" اجتماعی طور پر تمام بنی نوع انسان کی ملکیت"

اسلام کے اولین ایام میں ابوذر غفاریؓ نے کنز (یعنی دولت اور ملکیت) کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا اور آج بھی راسخ العقیدہ مسلمان صرف اس بنا پر کہ ہر چیز کا خدا مالک ہے وضو کے پانی کو بھی ضایع نہیں کرتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ چونکہ پانی ان کا نہیں ہے بلکہ خدا کا ہے اس لئے قیامت کے دن انھیں اس کا بھی حساب دینا پڑے گا۔ پانی ان کی امانت میں مناسب استعمال کے لئے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کا مکان یا زمین یا کپڑے بھی دراصل اس کے نہیں ہیں یہ سب چیزیں خدا کی امانت ہیں اور ان کا صرف غلط طریقہ پر نہ ہونا چاہئے۔ انسان کو ہر چیز کا جو اس کے سپرد کی گئی ہے حساب دینا ہوگا اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ جب کسی آدمی کو کسی چیز کا امین یا متولی بنایا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری کتنی سخت ہو جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو چیز وقتی طور پر کسی کو سپرد کی گئی ہے اُسے جہاں تک ہو سکے خدا کی راہ میں یعنی بنی نوع انسان کی بہبودی اور عام فایدہ کے لئے صرف کرنا چاہئے۔

لیکن رسول اللہؐ کے سامنے سب سے مشکل یہ کام تھا کہ اپنی قوم کے دل سے ملکیت کی اس محبت کو نکالیں جو ان کے اندر راسخ ہو چکی تھی تاکہ ہر شخص اس مال کو جو اس کے قبضہ میں خدا کی طرف سے امانت کے طور پر رکھا گیا تھا صحیح طور پر صرف کر سکے چنانچہ خداوند کریم نے ان کی رہنمائی قرآن کی مندرجہ ذیل آیتیں نازل کرکے فرمائی:۔

"دولت اور بیٹے اس دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور ہمیشہ باقی رہنے والے کام باقیات الصالحات

تیرے رب کے نزدیک ثواب اور امید کے لحاظ سے بہتر ہیں۔ (سورہ ۱۸ آیت ۴۶)

" بیویاں، بچے، سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور اچھی نسل کے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی یہ میں دنیاوی زندگی کا سامان اور اللہ کے پاس انجام کی خوبی ہے" (سورہ ۳ آیت ۱۴)

" اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھارے جوڑے اور تمھارے رشتہ دار اور تمھاری تجارت جس کے مندے پڑ جانے کا تمھیں ڈر رہتا ہے اور تمھارے مکانات جن سے تمھیں خوشی ہوتی ہے تمھیں تمھارے خدا سے اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ عزیز ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو جب خدا اپنا حکم نازل کرے اور خدا حدود سے تجاوز کر جانے والے لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ (سورہ ۹ آیت ۲۴)

اس پر امن تبلیغ اور ترغیب کا وہی نتیجہ تھا جو بالشوزم نے روس میں بہت زیادہ قوت کے استعمال کے بعد اور لوگوں کو بہت تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کر کے حاصل کیا۔

ابتدائی مسلمانوں میں ملکیت اور دولت کا جادو ختم ہو گیا تھا اور لوگوں کے دلوں سے ملکیت ذاتی کی محبت کم ہو گئی تھی دولت سے نہ تو طاقت ملتی تھی نہ وقار اور نہ آرام کیونکہ سب لوگ سادہ اور سخت زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ مدینہ میں رسول اللہؐ کی زندگی میں ہی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جن کے پاس کسی قسم کی کوئی ملکیت نہیں تھی۔ یہ لوگ اصحاب صفّہ کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے اور تعلیم یا دوسرے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ یہ باری باری سے دوسرے مسلمانوں کے مہمان رہتے تھے اور لوگ ان کے لئے غذا اور لباس فراہم کرنا اپنی عزت اور سعادت سمجھتے تھے۔ ملک کے نہایت مغرور اور دولتمند لوگ ان کی توقیر اور عظمت کرتے تھے۔

مسلمانوں میں دولت پر قبضہ کرنے یا جمع کرنے سے نہ کسی کو عزت ملتی تھی نہ مرتبہ، نہ استحقاق بلکہ اس کے برعکس ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ:۔

" جو لوگ اپنے مال کو رات اور دن کھلے طور پر اور پوشیدہ طور پر صرف کرتے ہیں انھیں ان کے خدا کی طرف سے اس کا انعام ملے گا اور انھیں کسی قسم کا خوف نہ ہوگا اور نہ انھیں کسی قسم کا رنج ہوگا" (سورہ ۲ آیت ۲۷۴)

جن لوگوں کے پاس مال تھا انھیں حکم دیا گیا تھا کہ " اپنا مال باوجود اس کی محبت کے اپنے رشتہ داروں کو، یتیموں کو، ضرورتمند لوگوں کو مسافروں کو اور ان لوگوں کو جو اُسے مانگیں اور قیدیوں کو رہا کرنے کے لئے دیدو۔ (سورہ ۲ آیت ۱۷۹)

رسُول اللہ صلعم کی یہ تعلیمات بے اثر ثابت نہیں ہوئیں۔ ان کے پیروؤں کے دل پر ان کا پورا اثر ہوا اور وہ لوگ ان کی ہدایت اور احکامات کی لفظاً اور معناً پیروی کرتے تھے۔

رسُول اللہ صلعم کے چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ نے اپنا سب مال عوام کے فایدہ کے لئے دے دیا۔ کچھ اور صحابی تھے جنھوں نے اپنا نصف مال اسی طرح دے دیا یہاں تک کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو دوسرے مسلمان کی خاطر طلاق دے دی۔

اور ایسے آدمی بہت کم تھے جو ایسی حالت میں جب ان کے ساتھیوں کی زندگی کی احتیاجات پوری نہ ہوتی ہوں دولت پر قبضہ کرنے سے نہ شرماتے ہوں۔ دولت اور ملکیت سے ذمہ داری اور بوجھ بڑھ جاتا تھا۔

قرآن نے نہایت شد و مد کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کی جو " دولت کو جمع کرتے ہیں اور اور پھر تالے میں بند کر کے رکھتے ہیں (سورہ ۷۰ آیت ۸)

اس نے ان لوگوں کو برکت دی جن کے مال کا ایک مناسب حصہ ان لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو سوال کرتے ہیں یا جو محروم ہوتے ہیں۔ (سورہ ۷۰ آیت ۲۴ اور ۲۵)

رسُول اللہ صلعم نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ وہ خود اور ان کے قریبی اور عزیز ترین رشتہ دار سب سے پہلے ان باتوں کی پیروی کریں جن کی وہ تلقین کرتے تھے۔ جو احکامات ان کو جاری کرنا ہوتے تھے سب سے پہلے وہ ان سے اپنے خاندان کے افراد کو مطلع فرماتے تھے۔

رسُول اللہ صلعم جو کچھ ان کے پاس دن میں ہوتا تھا شام کو اُسے دے ڈالتے تھے یہاں تک کہ شام کے کھانے تک کے لئے ان کے پاس کچھ باقی نہیں بچتا تھا۔

اسلام میں ہر چیز خدا کی ملکیت ہے۔

آج سے تیرہ سو صدی قبل اس لاثانی مصلح نے یہ صاف اور واضح طور پر تلا دیا تھا کہ:۔

"انسان کی اولاد کو اس سے زیادہ کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اُسے رہنے کے لئے گھر اپنی برہنگی کو چھپانے کے لئے ایک کپڑے کا ٹکڑا اور کھانے کے لئے روٹی کا ٹکڑا اور تھوڑا پانی مل جائے"

(ترمذی میں بروایت عثمانؓ)

تقسیم دولت کے بارے میں رسُول اللہ صلعم نے مندرجہ ذیل قاعدہ بنا دیا:۔

"جس شخص کے پاس لادنے والے جانور زیادہ ہوں اُسے انھیں ان لوگوں کو دے دینا چاہیئے جن کے پاس بالکل نہ ہوں اور جس کے پاس کھانے کا سامان زیادہ ہو اُسے اس کو دیدینا چاہیئے جس کے پاس بالکل نہ ہو"

"رسُول اللہ صلعم نے اور کئی دوسری چیزوں کا ذکر کیا جس کی بنا پر ہم لوگوں نے (جو وہاں موجود تھے) یہ محسوس کیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو کسی زاید چیز کے رکھنے کا حق نہیں ہے"

(مسلم اور ابوداؤد میں ابوسعیدؓ کی روایت سے)

زاید سے کیا مراد ہے اس کا تعین اُس حدیث سے ہوجاتا ہے جسے اوپر درج کیا جاچکا ہے اور جس کے ذریعہ سے نجی اور ذاتی ملکیت کو رہنے کے مکان، پہننے کے لئے کچھ کپڑے اور روزانہ کھانے کے لئے کچھ خوراک تک محدود کردیا گیا ہے۔ اس طرح مال کی ملکیت کو نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی ختم کردیا گیا تھا۔ اسلام میں انفرادی ملکیت کی گنجائش اُس سے بھی کم تھی جتنی بالشوکوں کے یہاں ہے۔

ملکیت کو محدود کرنے کے علاوہ اسلام نے اپنے وراثت کے منصفانہ قوانین کی رو سے نہ صرف بڑی بڑی جاگیروں یا کروڑ پتیوں کی نسل کو جاری رہنے سے روکا بلکہ ایک ہی خاندان کے لوگوں میں تقسیم دولت کو نہایت صحیح بنیادوں پر قائم کردیا۔ اسلام کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کا وقف علی الاولاد کا قانون ہے جس کے ذریعہ اپنی اولاد کے وراثت کے حق پر بھی پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ والدین جس جایداد کو منفعت عامہ یا خیرات کے لئے

وقف کر دیتے ہیں اس کی مکمل ملکیت سے ان کی اولاد محروم ہو جاتی ہے اگرچہ ان کے لئے اتنی کافی آمدنی باقی رہتی ہے جس سے وہ مصیبت یا افلاس کا شکار نہیں ہو سکتے۔ وہ اس جایداد کو محض متولی کی حیثیت سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس کو تعیشات میں ضایع نہیں کر سکتے۔

اسی طرح اسلام نے ملکیت ذاتی پر اور بھی گوناگوں پابندیاں لگادی ہیں۔

جب ابوذر غفاریؓ نے قرآن کی آیتوں کی تفسیر اس طرح پر کی کہ اس سے ملکیت ذاتی کی تنسیخ ہوتی تھی تو یہ سوال اٹھا تھا کہ اور آج بھی علما اس سوال کو اُٹھاتے ہیں کہ اگر اسلام ملکیت ذاتی کو ختم کرنا چاہتا تھا تو اس نے وراثت اور زکوٰۃ کے قوانین اور سرمایہ داری کے خلاف دوسرے قاعدوں اور پابندیوں کو کیوں بنایا۔

جو لوگ اس لاثانی مصلح کے ذہن اور طریقوں کو جانتے ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں ہے۔

ان کا مقصد تو یہ تھا کہ تمام مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو تمام زمانوں اور مقاموں اور معاشرتوں کے لئے چاہے وہ ترقی کی کسی منزل پر کیوں نہ ہوں رفع کر دیں۔ انھیں رحمتہ اللعالمین بناکر بھیجا گیا تھا۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ قدرت نے ہر انسان کے اندر جو نیکی رکھی ہے اس سے ہر امکانی فایدہ معاشرت کی بہبودی کے لئے حاصل کریں۔

ہم جانتے ہیں کہ فطرت نے دنیا کا کارخانہ کچھ اس نہج پر بنایا ہے کہ اس نے انسان کے اندر جسمانی آرام، دولت، ملکیت اور اضافہ نسل کی محبت کو بھی رکھ دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دولت اور ملکیت کے ساتھ آرام و عافیت کی زندگی، انسانوں کے کاموں اور ان کی محنتوں کے لئے آج ایک بہت بڑی محرک بن گئی ہے۔ انسانی نسل کی توسیع کے لئے قدرت نے عورت اور مرد کے اندر اولاد کی محبت کو رکھ دیا ہے۔ جانوروں میں بھی نہ صرف اپنے بلکہ غیروں کے چھوٹے بچوں کے ساتھ اُنس اور الفت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان کے جذبات اس لحاظ سے بھی دوسری مخلوقات سے مختلف ہیں۔ جانوروں میں تو محبت اور الفت بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن

انسان کی محبت اپنی اولاد کے ساتھ زندگی بھر قایم رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جب وہ موجود نہ ہو، اور مر جائے جب بھی ان کے آرام و آسائش کے لئے کچھ انتظام باقی رہے۔

ان حقایق کی موجودگی میں اسلام نے یہ چاہا کہ ایک طرف تو کام کے ان ارادی اور قدرتی محرکات کو زبردستی ختم نہ کیا جائے جیسا کہ بالشویک ان کو انسانی جبلت اور قدرتی جذبات کے خلاف ختم کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اُس نے چاہا کہ معاشرت اور ریاست کو ان جبلّی خواہشات کے خراب اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔

ہمیں اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ انسان فطرتاً بدی کی طرف رجحان لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان کو جس ذات نے پیدا کیا اور ترقی دی ہے وہ بُرائی سے پاک ہے۔ اُس نے بنی نوع انسان میں بھی بُرائی کو پیدا نہیں کیا۔ آدمی اپنی قوتوں، اہلیتوں اور جبلّتوں کا غلط استعمال کر کے اپنے لئے بدی کو خود پیدا کرتا ہے۔ چونکہ خدا نے انسان کو ایک حد تک آزاد پیدا کیا اس لئے صحیح راستہ پر چلانے کے لئے بھی خدا اپنی مرضی کو انسان پر ہمیشہ عاید نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے انسان کو اس حق سے محروم نہیں کیا کہ وہ اپنی اچھی صفات کو بھی اگر وہ چاہے تو غلط طریقہ پر استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کو ایک مشین کا پُرزہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ قرآن کہتا ہے

"خدا نے تمہیں اپنی ذہانت کو استعمال کرنے کی تلقین کی ہے (سورہ ۶[۵۷])

انسان کے اندر بہت سے جذبات ہیں۔ اگر ان کا استعمال مناسب طریقہ پر کیا جائے تو یہ فایدہ مند ہوتے ہیں نہیں تو ان سے جماعت کو بلکہ بعض وقت خود افراد کو نقصان پہنچتا ہے بعض وقت ہم کی عقل بھی اُسے گمراہ کرتی ہے۔

انسان اپنی خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اگر اُسے دولت سے محبت ہوتی ہے تو وہ اپنی تمام دماغی قوتوں کو اور تمام جسمانی قوتوں کو اس کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ وہ جس

---

۵۷ یہ حوالہ قدوائی صاحب نے صحیح نہیں دیا ہے۔ ایڈیٹر

پیشہ کو بھی اختیار کرتا ہے اس میں دوسروں سے سبقت لے جانے کے لئے اپنی پوری دماغی قوت کو صرف کرتا ہے۔ وہ خطرے برداشت کرنے کے لئے قربانیاں کرنے کے لئے بھی تیار رہتا ہے۔ فرض کیجئے حالات ناسازگار نہیں ہیں اور وہ اپنے کام اور پیشہ میں کامیاب ہوتا ہے۔ فرض کیجئے وہ اپنے پیشہ میں مہارت پیدا کر لیتا ہے اور اپنے دماغ کے ذریعہ دولت پیدا کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ماہرانہ مشورہ کے لئے معاوضہ طلب کرتا ہے اور آرام اور خوشی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ جماعت کو نقصان نہیں پہنچاتا تو اسلام اس کو اس بات کی اجازت دے گا۔ بالشوکوں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایسا نہیں کرنے دیں گے اگرچہ وہ غیرملکی ماہروں کو زیادہ اجرتیں اس وقت بھی دیتے ہیں[۵۲] لیکن جب وہ اُسے بند کریں گے تو نہ صرف فرد کو نقصان پہنچائیں گے بلکہ جماعت کو بھی نقصان پہنچائیں گے کیونکہ اس کے بعد لوگوں میں ماہر بننے کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہے گا۔

فرض کیجئے ایک آدمی کو دولت سے محبت ہے وہ اس کے لئے اپنے دماغ سے کام لے کر ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جو جماعت کے لئے بھی مفید ہے اور بازار میں فروخت بھی خوب ہوتی ہے۔ اسلام اُسے اس وجہ سے ملامت نہیں کرے گا کہ اُسے اپنی کتاب کے دام اچھے مل رہے ہیں۔ لیکن اسلام اس سے اس بات کی توقع کرے گا کہ جو روپیہ اس نے اپنے دماغ اور قلم سے پیدا کیا ہے اس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ اسلام اس سے کہے گا کہ دولت کا صحیح مالک خدا ہے اور کتاب کا مصنف صرف اس کا متولی ہے۔ اس کی زندگی کے ہر لمحہ میں ناسازگار حالات پیدا ہو سکتے تھے اور وہ کام کی تکمیل اور کامیابی میں مزاحم ہو سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لئے اُسے اس تحفظ کے لئے خدا کا ممنون ہونا چاہیئے اور مستحقوں کو اپنی دولت میں شریک کرنا چاہیئے۔ اُسے زکوٰۃ بھی ادا کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسلام دوسرے قوانین کے ذریعہ سے جو سرمایہ داری کے خلاف ہیں اُسے سرمایہ دار نہیں بننے دے گا۔ ایسا شخص ہر ایک سے بلکہ کل جماعت سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنی

---

۵۲ لیکن اب تو بالشوک ملکی ماہر مزدوروں کو بھی زیادہ اجرتیں دینے لگے ہیں۔ ایڈیٹر

پیدا کی ہوئی دولت کا مالک وہ خود ہے لیکن خدا سے وہ ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ خدا نے اُس کو اعلیٰ دماغ عطا کیا اور خدا نے ہی اُس کے لئے حالات کو سازگار رکھا۔

یا فرض کیجئے کہ ایک آدمی کو اپنے خاندان یا اولاد سے جو محبت ہے وہ اس کے لئے کام یا پیشہ کو بہترین طریقہ پر کرنے کی محرک ہے۔ اسلام اس محرک کو ختم نہیں کرے گا۔ اُس نے وراثت کے منصفانہ قوانین بنادئے ہیں جن کے ذریعہ سے اس کا خاندان اور اس کی اولاد اُن چیزوں سے فایدہ اٹھا سکے گی جو وہ ان کے لئے ترکہ میں چھوڑ جائے گا اور اس طرح وہ افلاس اور محرومی سے بچ سکیں گے اور اس کے نام کو اُس کے بعد جاری رکھیں گے۔

اسلام کی بہترین سعی اس بات کی طرف رہی ہے کہ ایک شخص کی آزادی پر صرف اتنی ہی پابندی لگائی جائے جو جماعت کے مفاد کے لئے اور خود اس کے مفاد کے لئے قطعی طور پر ناگزیر ہے اور انسان کے لئے بہترین کوشش کرنے کی جو ترغیبات ہیں وہ باقی رہیں۔ اسی بنا پر اسلام کے قوانین غیر تغیر پذیر نہیں ہیں۔ جبر کے استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکا اسلام نے پرہیز کیا ہے۔ اُس نے کوشش کی کہ ہر شخص اچھے کام اپنی مرضی، عادت کی قوت یا طبعی رجحان کی وجہ سے کرے۔ اسی لئے اس نے اچھے کاموں کے طبعی محرکات کو ختم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ چند اچھی پابندیوں کے بعد ترکہ اور وراثت کی اجازت دی گئی۔ اور مرنے کے بعد ایک شخص کی جایداد کو جبراً ضبط نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے ایسے قاعدے اور قانون بنائے جن سے ایمانداری اور جایز طور پر دولت حاصل کی جائے اور جب اس دولت کو ترکہ میں چھوڑا جائے تو بھی اُس سے جماعت کو فایدہ پہنچتا رہے۔ وقف علی الاولاد کے ذریعہ باپ کی محنت کی کمائی ہوئی دولت کو اُس کے بیٹے بھی ضایع نہیں کر سکتے۔ وہ پابند ہو جاتے ہیں کہ اُسے اپنی مرضی یا موج یا ذاتی تعیش کے لئے خرچ نہ کریں بلکہ عام بہبود کے لئے صرف کریں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ خاندانی نام یا شہرت کے باقی رہنے کا بھی اس کے ذریعہ بندوبست ہو جاتا ہے۔

اسلام کا خاص مقصد یہ رہا ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جو سرمایہ داری کے خلاف ہوں جن سے دولت تقسیم ہو سکے، سب کو مساوی مواقع مل سکیں اور ایک غیر طبقہ وارانہ جماعت وجود میں

آسکے اور تمام دنیا میں ایک واحد برادری قائم ہو سکے ۔

اگر اسلام کے تمام قوانین کی لفظاً اور معناً پیروی کی جائے تو ملکیت ذاتی کی تمام خرابیاں رفع ہو جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک شخص اپنی دولت کو خدا کی امانت سمجھے تو ذاتی ملکیت یا خدا کی راہ میں صرف کرنے کی پوری آزادی جماعت کے لئے نقصان رساں ہونے کی جگہ ایک نعمت اور برکت ثابت ہوگی ۔ اگر آدمی اپنی دولت کو ایک وقف سمجھ کر استعمال کرے اور یہ خیال رکھے ایک سمیع و بصیر اور رحمان و رحیم خدا نے اُسے یہ دولت عطا کی ہے تو یہ بات جماعت کے لئے اس سے زیادہ مفید ثابت ہوگی کہ ایک آدمی بالکل غریب رہے اور صرف اتنا ہی جمع کرے جو صرف اس کو ذاتی طور پر زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے ۔

بالشوک جانتے ہیں کہ ان کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ افراد کو بالکل آزادی نہیں دیتے یہ ایک مطلق العنان آمریت قائم کر دیتے ہیں چاہے یہ آمریت مزدوروں کے طبقہ کی ہی کیوں نہ ہو ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بالشوزم افراد کو غلام بنا دیتا ہے چاہے یہ غلامی جماعت ہی کی کیوں نہ ہو ۔ بالشوزم میں ہر موقع پر ایک شخص کو دوسرے اشخاص کے سخت احکام کی اطاعت کرنا پڑتی ہے یہ کرو یہ نہ کرو۔ اس حکم دینے والی اور حکومت کرنے والی جماعت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صرف چند افسروں اور عاملوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے ۔ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے یہ چند اشخاص کی حکومت ہو جاتی ہے بلکہ چند افراد کی بھی نہیں صرف ایک فرد واحد یعنی آمر مطلق کی حکومت ہو کر رہ جاتی ہے ۔

اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا مسلمانوں کے لئے کسی شخص یا کسی گروہ یا طبقہ کی آمریت نہیں رکھی گئی ہے ۔ کوئی مسلم کسی دوسرے شخص یا کسی گروہ اور طبقہ کا غلام نہیں ہے ۔ وہ ایک اور صرف ایک آمر مطلق کا غلام ہے لیکن وہ انسان نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو عقل و فہم سے بالاتر ہے ۔ ہر شخص چاہے وہ کتنا ہی طاقتور اور ذی اقتدار کیوں نہ ہو حتیٰ کہ رسولوں میں برگزیدہ ترین رسول بھی سب اس کے غلام ہیں ۔ لیکن اس غلامی اور دوسری غلامیوں میں فرق ہے ۔ یہ غلامی اس کی ہے جو بے نظیر اور بے مثال ہے ۔ جو ایک لامحدود ابدی اور ازلی وجود کا مالک ہے جس کی نہ کوئی شکل ہے نہ جگہ جس کے

نہ اولاد ہے نہ اس کے مشابہ کوئی چیز ہے۔ جو ہمارے نہایت پوشیدہ خیالات کا رازدار ہے جو علیم و بصیر ہے۔ جو اپنی قدرت کے لزوم کی وجہ سے موجود رہتا ہے اور اپنی ذات میں سے اپنی تمام اخلاقی اور دماغی قوتوں کو حاصل کرتا ہے۔

اسلام میں صرف اسی وجود کو حکم دینے کا حق حاصل ہے۔ وہی صرف انسان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ لا غالب الا اللہ وہی خطا اور قصور سے پاک اور منزہ ہے۔ انسانوں کی اکثریت بھی ہمیشہ صحیح راستہ پر نہیں ہوتی۔ بعض وقت صرف ایک آدمی رہ راست پر ہوتا ہے۔ ایسے مواقع لینن کی زندگی میں بھی پیدا ہوئے۔ اس لئے ایک آدمی کسی ایسے دوسرے آدمی کی اطاعت کیوں قبول کرے جس کے متعلق امکان ہے کہ وہ غلطی پر ہو؟ آدمی کیوں اس وجود کے احکام کی اطاعت نہ کرے جس کے متعلق یقین ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ یہ جاننے کے بعد کہ کوئی......... انسان یا انسانوں کا گروہ یا ان کی اکثریت یا ان کی پوری تعداد غلطی سے مبرا اور منزہ نہیں ہے کون ایسا شخص ہے جو خدا کے سامنے سر نہیں جھکائے گا؟ کون ایسا شخص ہے جو دوسروں کا فرماں بردار غلام بننے کی جگہ یہ نہ چاہے گا کہ اپنے ضمیر خیال اور عمل کی آزادی کو قائم رکھے؟

انہی مصلحتوں کے پیش نظر اسلام نے نجی ملکیت میں کچھ لچک رکھی ہے تاکہ ہر آدمی کی آزادی اور اس کا اختیار تمیزی باقی رہے۔ نیز یہ کہ کام کے لئے جو اس کے قدرتی محرکات ہیں جہاں تک وہ پسندیدہ اور فطری ہیں وہ بھی باقی رہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام نے ملکیت ذاتی کی تنسیخ کی ہوتی تو قرآن میں وراثت کے قوانین درج نہ کئے جاتے ان کی توجہ میں اس بات کی طرف مبذول کراؤں گا کہ خدا کا ایک نام الوارث بھی ہے اور قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ "انت خیر الوارثین

کہ تو بہترین وارث ہے۔ اور وہ سوال کرتا ہے" اور تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ تم خدا کی راہ میں نہ خرچ کرو؟ درآنحالیکہ اللہ ہی تو آسمان اور زمین کا وارث ہے (سورہ ۵۷ آیت ۱۰)۔

اس سے ثابت ہوا کہ قانون وراثت کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے نجی اور ذاتی ملکیت کی تنسیخ نہیں ہوتی۔ ہر سچا مسلمان اس بات کو زیادہ پسند کرے گا کہ وراثت کے قوانین کو نظر انداز کر دے اور

اپنے مال اور دولت کو خیر الوارثین کی وراثت میں دے دئے۔

یہ سمجھنا غلطی ہے کہ بالشوکوں نے تمام نجی اور ذاتی ملکیت کو ختم کردیا ہے ...... نجی ملکیت سے بالشوک کا خاص مطلب "ذرایع پیدائش دولت" سے ہے۔ "اشترکیوں کے اعلان حقوق" میں یہ لکھا گیا ہے کہ "کمیونزم جماعت کی پیداوار پر قبضہ کرنے کی طاقت سے کسی شخص کو محروم نہیں کرتا" جس کا مفہوم یہ ہے کہ نجی ملکیت کی بعض شکلوں کو جائز طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے مثلاً کپڑے، مکان، باغ، چھوٹا کھیت، لیکن صرف ذاتی استعمال کے لئے تجارت یا نفع کے لئے نہیں۔

بالشوزم درمیانی طبقہ کے ان لوگوں کا جو جایداد کے مالک ہوتے ہیں دشمن ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو کہتا ہے کہ "درمیانی طبقہ کے جایداد کے مالکوں کو بلاشبہ راستے سے صاف کردینا چاہئے"۔

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ہر قسم کا ترکہ روس میں ختم نہیں کیا گیا ہے۔ پابندیاں لگادی گئی ہیں جیسی اسلامی قانون کے ماتحت لگائی گئی ہیں اگرچہ پیمانہ اور طریقہ مختلف ہے۔ روس میں اور دوسرے کئی یورپ کے ملکوں میں ایک شخص کے مرنے کے بعد حکومت کی طرف سے "محاصل موت" یا "محاصل ترکہ" لگائے جاتے ہیں۔

بہرحال، موجودہ زمانہ میں روس میں تجربہ جاری ہے۔ اور یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ صنعتی جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اگر بالشوکوں کو فتح ہوئی تو اشتمالیت تمام دنیا پر چھا جائے گی اور ملکیت ذاتی آج جس طرح آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اس حیثیت سے غائب ہوجائے گی۔ اگر انھیں ناکامی ہوئی تو کسی نہ کسی شکل میں ملکیت ذاتی کا رواج روس میں بھی ہوجائے گی۔

ہم نے حالات سے جو کچھ اندازہ کیا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالشوک از خود اس سمجھوتہ کو اختیار کریں گے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ نصب العین تو یہ باقی رہے گا کہ ملکیت ذاتی کو قطعی طور پر ختم کردیا جائے لیکن ایسے ذرایع بھی اختیار کئے جائیں گے جن سے ذاتی محرکات اور بچوں اور خاندان کی محبت کے طبعی میلانات وغیرہ کو اظہار کا موقع مل سکے گا۔

نقشے کے مطابق شہر بسانا

(محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات جامعہ)

ہندوستان کے شہر آج کل جس انداز سے بسے ہوئے ہیں انھیں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہمارے دیس میں سمجھ بوجھ اور سگھڑ پن کا بڑا کال ہے۔ اپنی سینکڑوں ہزاروں ضرورتوں کو بھینٹ چڑھا کر جو پونجی اکٹھی کی جاتی ہے وہ اس ملک میں دو ہی کاموں پر خرچ کی جاتی ہے ایک بیاہ شادی پر اور دوسرے گھر بنانے پر۔ اس لئے گھر بنانے کے لئے روپیہ کی کمی نہیں ہوتی۔ روپیہ خوب دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے۔ مکانوں کو الگ الگ دیکھا جائے تو سارے مکان بُرے بھی نہیں ہوتے لیکن جس طرح تنگ گنجان اور پیچ در پیچ گلی کوچوں میں مکانات بکھرے ہوتے ہیں اور گھر کے گندے پانی کی نکاسی اور کوڑے کرکٹ اور میلے کے پھینکنے کا خراب انتظام ہوتا ہے اس کی وجہ سے ہمارے شہر بالکل دوزخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو شہروں کا حال ہے وہی قصبوں اور دیہاتوں کا بھی ہے۔ گنتی کے چند بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں کی سول لائنوں اور چھاونیوں کو چھوڑ کر جہاں کچھ رونق اور صفائی نظر آتی ہے باقی ہر جگہ مکان دوکانیں سڑکیں گلیاں کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے ایک دوسرے سے ملائی جاتی ہیں کہ کہاں سر ہے کہاں پیر کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ شہر ایک بھول بھلیاں بن جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رہنے والوں کے دماغوں میں بڑی الجھی ہوئی گانٹھیں پڑی ہوئی ہیں جن کا سلجھانا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص لوبھ اور لالچ کے جال میں پھنسا ہوا نظر آتا ہے۔ صرف اپنا آرام سوچتا ہے دوسرے کی بے آرامی کی اسے بالکل فکر نہیں ہوتی۔ پھر اپنا آرام سوچنے میں بھی عقل و تمیز سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ نہایت مورکھ پن سے تجویزیں اور منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنا فایدہ ہو یا نہ ہو دوسروں کے نقصان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ جہاں موقع دیکھا زمین پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے ایک چبوترہ نکال دیا یا ایک چھجا یا چھتا سنوار یا یا پرنالہ، موری یا نالی

کھلوادی۔ گھر کے کوڑے کا انبار لگا دیا۔ پھر اس کی وجہ سے بیماری یا وبا پھیلے، تباہی اور موت آئے انھیں اس سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ لوگ اپنے مکان کو اچھا اور بڑا اور دوسرے کے مکان کو خراب اور چھوٹا دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ایک اچھے مکان کی سوبھا اور رونق دوسرے اچھے مکان سے بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ لیکن نفسانفسی، آپا دھاپی، تجھے مجھ سے کیا اور مجھے تجھ سے کیا کا جو نقشہ ہمارے دیس کے شہروں میں نظر آتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ جب تک شہر کی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام ہمارے ہاتھوں میں نہ تھا اس وقت تک تو خیر اس بات کے لئے عذر موجود تھا اور ہم اپنی صفائی میں کہ سکتے تھے کہ ہمیں مل جل کر کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے بننے اور ان میں ہمارے بااختیار نمایندوں کے پہنچ جانے سے یہ عذر بھی جاتا رہا ہے اور اب دنیا کی نگاہ میں ہم خود ہی مجرم بن گئے ہیں اس میں شک نہیں ہندوستان کی غریبی اور افلاس سے بھی شہروں میں ویرانی، اوداسی اور بے رونقی پیدا ہوتی ہے لیکن پھر بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ آج کل تو ہم موری کے کیڑے کی طرح کیچڑ میں لوٹ رہے ہیں اور اپنی اس حالت میں مگن ہیں۔ ہمارے دل میں اس حالت کے بدلنے کی امنگ اور چاہ پیدا ہونا چاہیئے۔ اس لئے آج کی بات چیت میں میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شہر اور دیہات کو کس طرح بارونق اور آرام دہ بنایا جا سکتا ہے کس طرح ان میں ایک امتیازی وصف اور سب شہروں سے جدا ایک خاص رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس میں میونسپلٹیاں ڈسٹرکٹ بورڈ مکان بنانے والی کمپنیاں اور افراد کس طرح باہم مل جل کر کام کر سکتے ہیں۔

نقشہ کے مطابق شہر بنانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ شہر بالکل نیا بسایا جائے اور دوسری یہ ہے کہ جو شہر موجود ہے اسی میں توسیع، ترمیم اور اصلاح کی جائے۔ سرے سے بالکل نیا شہر بسانے کا موقع تو بہت کم ملتا ہے۔ البتہ پرانے شہروں میں ترمیم، اصلاح اور توسیع کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ جہاں سول لائن اور چھاونیاں بنانے کا موقع ہو وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ پرانے شہر سے ذرا ہٹ کر بالکل ایک نئی آبادی بسائی جائے اس طرح جو

لوگ شہر کو ترقی دینا چاہتے ہیں ان کے لئے نئے شہر کے بسانے کی تمام سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر دونوں کام ساتھ ساتھ چلیں یعنی ایک طرف پرانے شہر کی صفائی، رونق اور خوبصورتی بڑھائی جائے اور دوسری طرف سول لائن کو نئے نمونہ کا بنایا جائے اور دونوں ایک دوسرے سے قریب آتے جائیں تو کچھ دنوں میں دونوں کے مل جانے سے سارے شہر کی رونق اور دلکشی بڑھ جائے گی بعض ایسے بھی آدمی ہیں جن کے خیال میں اس صورت میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرانے شہر کے پاس نئے شہر کے بسانے سے پرانے شہر کے اور زیادہ ویران ہو جانے کا ڈر ہے۔ سب اچھے مکان اور خوش حال اور تمیز دار لوگ نئے شہر میں جا بسیں گے اور صرف برے مکان غریب اور بدسلیقہ آدمی پرانے شہر میں رہ جائیں گے۔ یہ اعتراض ہے بہت وزنی لیکن اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں جگہوں کا انتظام ایک ہی میونسپلٹی کے ہاتھ میں رہے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ پرانی جگہ کے رہنے والوں کے نمائندے اپنے ساتھ ناانصافی نہ ہونے دیں گے۔ اور ایسی تدبیریں اختیار کرتے رہیں گے جن سے لوگ اپنے آبائی مکانوں کو چھوڑ کر نہ جانے پائیں گے۔

شہر کی ترقی کے لئے منصوبے دو طرح کے بنائے جاتے ہیں۔ ایک کو ہم باقاعدہ منصوبہ کہہ سکتے ہیں اور دوسرے کو بے قاعدہ منصوبہ۔ باقاعدہ منصوبہ میں تو ہر چیز ترتیب سے رکھی جاتی ہے سڑکیں چوخانے کی شکل کی ہوتی ہیں چوراہے، چوک، فٹ پاتھ، سڑک کے کنارے کے درخت، نالیاں، روشنی کے کھمبے، رہنے کے مکان، سرکاری عمارتیں، دوکانیں سب قرینے اور ترتیب سے مناسب جگہ پر رکھے جاتے ہیں۔ ہر چیز کا ایک مقررہ نمونہ ہوتا ہے جس کی پابندی کی جاتی ہے۔ لیکن بے قاعدہ منصوبہ میں چیزوں کو ایک ہی طرح کے نمونہ کے مطابق نہیں بنایا جاتا بلکہ اس میں خاصا تنوع اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ منصوبوں کے اس فرق کی وجہ سے دو الگ الگ مسلک پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے طریقہ اور قاعدہ کو ہی اچھا سمجھتا ہے۔ لیکن پرانے شہر کو ترقی دینے کے لئے باقاعدہ منصوبہ کے اختیار کرنے میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

اس لئے یہاں تو بے قاعدہ منصوبہ پر عمل کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نئے شہر کے بسانے میں باقاعدہ منصوبوں پر عمل سہل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی بہت سے آدمی باقاعدہ اور بے قاعدہ منصوبوں کے میل کو ہی زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

ان ابتدائی باتوں کو سمجھنے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ منصوبہ کے مطابق شہر بنانے کے لئے کن کن چیزوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ اس ضمن میں سات خاص باتیں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ میں ہر ایک کے بارے میں مختصر طور پر کچھ باتیں بیان کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے جس شہر کو نقشہ کے مطابق بنانا ہے اس کا جائزہ یا سروے کرنا ضروری ہے۔ اس سروے میں سب سے پہلی بات جو دیکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ شہر کی ترقی کا رجحان کس طرف ہے اور اس کی ضروریات کیا کیا ہیں۔ اس کا محل و توع کیسا ہے۔ تجارتی مرکز ہے یا صنعتی مرکز۔ صوبہ ریاست کی راج دھانی ہے یا تعلیم اور تیرتھ کی جگہ یا سمندر کے کنارے واقع ہے یا پہاڑ کی چوٹی پر وغیرہ وغیرہ۔ اگر پرانے شہر کو ترقی دینا ہے تو اس کی تمام موجودہ عمارتوں اور سڑکوں نالیوں اور پانی کے حاصل کرنے کے ذریعوں، کھلی جگہوں اور آمد و رفت کے مرکزوں، بازاروں اور دفتروں وغیرہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ زمین کے مالکوں سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ نیز عمارت بنانے کا جو سامان مقامی طور پر آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے اس کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ غرضکہ ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ منصوبہ بنانے والے کے پاس موجود ہونا چاہیئے۔

(۲) دوسری بات جس کی طرف شہر کا نقشہ بناتے وقت دھیان رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ شہر کے حدود یا اس تک پہنچنے کے راستے کیسے ہیں۔ بہت سے شہروں میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ دیہات اور شہر کو تقسیم کرنے والی کوئی حد فاصل نہیں ہوتی اور شہر کے کنارے کے مکان اکثر بہت خراب اور گندے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر کے کنارے پر کھیتوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ بھی ویران سا نظر آتا ہے اور اس میں خاک اڑتی دکھلائی دیتی ہے جس سے شہر میں داخل ہونے والے شخص کے دل پر شہر کے بارے میں پہلا اثر بہت خراب پڑتا ہے پرانے زمانہ میں شہر پناہ اور

فصیلوں کے ذریعہ شہر اور دیہات کا فرق قائم رہتا تھا۔ لیکن اب ریلوں کا رواج ہوگیا ہے۔ اس لئے شہر میں داخل ہونے کا راستہ زیادہ تر ریلوے اسٹیشن بن گئے ہیں۔ اب ایک اجنبی نووارد کے دل پر ریلوے اسٹیشن کی شکل و صورت اور اس کے قریب کے مکانوں کی حالت کا اثر سب سے پہلے پڑتا ہے۔ اس لئے کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ ریلوے اسٹیشن کے باہر خوبصورت چوک سا بنادیا جائے اور اس چوک کے آگے ایسے دل لبھانے والے پارک ہوں جن میں سے گذر کر لوگ شہر میں داخل ہوسکیں۔ سڑک کے ذریعہ شہر میں داخل ہونے والوں کے لئے بھی پارک میں سے ہوکر گذرنا دلچسپی اور دلبستگی کا باعث ہوگا اور اس طرح شہر و دیہات میں فرق و امتیاز قائم ہو جائے گا۔

(۳) تیسری چیز جو نقشہ بنانے والے کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے وہ شہر کے مرکز اور چوک ہیں۔ شہر کی خوبصورتی کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ ایسی عمارتیں یا مکان جن میں مرکز بننے کی اہلیت ہے مناسب جگہ پر رکھے جائیں۔ مثلاً میونسپل ہال اور دوسری سرکاری عمارتیں، لائبریری، مسجد، مندر، تھیٹر، مارکٹ، کونسل چیمبر، کلاک ٹاور، فوارے، اسٹیچو، گھاٹ، یونیورسٹی، کالج اور اسکول کی عمارتیں، ڈاکخانہ، تحصیل تھانہ، پارک ریس کورس بندرگاہیں وغیرہ وغیرہ ان سب میں مرکز بننے کی اہلیت ہے۔ شہر کو اس طرح ترتیب دینا چاہیئے کہ یہ سب نمایاں جگہ پر رہیں اور شہر کی رونق اور خوبصورتی کو بڑھائیں۔

(۴) چوتھی بات جو شہر کا نقشہ بنانے والے کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے وہ شارع عام اور یعنی خاص خاص سڑکوں کی ترتیب اور ان کی دیکھ بھال ہے۔ سڑکوں کا سب سے پہلا کام تو آمد و رفت کی سہولت پیدا کرنا ہے۔ ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے عمارتیں بنانے کے لئے عمدہ جگہیں نکل آتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی قسم کی سڑکوں سے یہ دونوں کام پورے ہو جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ جو سڑکیں آمد و رفت کے لئے بہت مناسب ہیں ان پر مکان خوبصورت وضع کے نہ بن سکیں اور جن سڑکوں پر مکان خوبصورت بن سکتے ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ آمد و رفت کے لئے اچھی نہ ہوں۔ اس لئے کبھی ایک سہولت کو قربان کرنا پڑے گا اور کبھی دوسری کو۔ آمد و رفت کی

سہولت اس میں ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کم سے کم فاصلہ طے کرنا پڑے اور آدمی تیزی کے ساتھ دوسری جگہ تک پہنچ جائے۔ شارع عام تین طرح کے بنائے جاتے ہیں۔ ایک تو چوخانہ کی شکل کے راستے ہوتے ہیں جن میں سڑکیں ہر جگہ زاویہ قائمہ یعنی رایٹ انیگل بناتی ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لئے اکثر ایک سڑک کی جگہ دو یا دو سے زاید سڑکوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس شکل کو رفع کرنے کے لئے سڑکوں کی دوسری قسم پیدا ہوئی ہے جس میں ان چوخانے والی سڑکوں کے ساتھ کچھ ایسی سڑکیں بنادی جاتی ہیں جو انھیں درمیان سے کاٹتی ہوئی گذرتی ہیں۔ ان کے علاوہ سڑکوں کی تیسری قسم وہ ہے جس میں سڑکیں خاص خاص مرکزوں کے چاروں طرف مکڑی کے جالے کی طرح بنادی جاتی ہیں۔ سڑکوں کی تقسیم کے بعد دوسری قابل لحاظ چیز سڑکوں کی ساخت ہے۔ اچھی بنی ہوئی سڑک سے طبیعت میں شگفتگی اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے کنارے کے درخت اور روشنی کے کھمبے لگانے اور نالیاں نکالنے میں بھی اگر سلیقہ سے کام لیا جائے تو سڑک کے حسن میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۵) پانچویں بات جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ اس بات کا فیصلہ ہے کہ عمارتیں کہاں کہاں کس ترتیب کے ساتھ بنائی جائیں اور آباد علاقوں کی سڑکیں کس طرح نکالی جائیں۔ شارع عام کا تعین کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ اسی کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے نقشہ بنانے والے کو شہر کی سب عمارتوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ خاص خاص عمارتوں مثلاً مسجدوں، مندروں، لائبریریوں، ہوٹلوں، مدرسوں، مارکیٹوں، سرکاری دفتروں وغیرہ کی بابت پہلے سے طے کر لینا چاہئے کہ ان کے لئے کون سی جگہ موزوں ہوگی۔ باقی مکانوں کے محل وقوع کے بارے میں بھی ایک عام خاکہ بنالینا چاہئے۔

(۶) چھٹی بات جو سوچنے کے لائق ہے وہ مکانوں کے قطعات کا فیصلہ ہے۔ نیا شہر بساتے وقت تو زمین کو قطعات میں شروع سے تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ان پر ترتیب کے ساتھ مکان بن سکتے ہیں۔ لیکن جہاں پہلے سے مکان بنے ہوئے ہوں وہاں بھی مکان بنانے والوں کو اس بات کا پابند

کیا جا سکتا ہے کہ مکان کے آگے پیچھے یا درمیان میں کچھ مقررہ جگہ ضرور خالی رکھیں اور مکان کی تعمیر میں چند اصولوں کا خیال رکھیں۔ پانی کی بہم رسانی اور نکاسی اور زمین دوز نالیوں کے ذریعہ میلے کی صفائی وغیرہ کی ضرورتوں کو بھی پہلے سے ہی سوچ لینا ضروری ہے۔

ساتویں بات جو سوچنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ مختلف وضع کے جو مکان اور عمارتیں بنیں ان میں انفرادی تنوع کے ساتھ ساتھ باہمی ہم آہنگی قائم رہے۔ کوئی مکان انمل اور بے جوڑ نہ ہو۔

اوپر جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر پوری طرح میونسپلٹیاں ہی دھیان دے سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ پر الگ رہ کر اس کام کو نہیں کر سکتا۔ کوآپریٹیو سوسائٹی اور مکان بنانے والی کمپنیاں بھی میونسپلٹی سے مل کر اس کام کو خوب ترقی دے سکتی ہیں۔ ہندوستان کی اکثر میونسپلٹیوں میں شہر کو ترقی دینے کے لئے قانون بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کام کی رفتار بہت سست ہے۔ جب ہم ہندوستان کے شہروں کا دنیا کے دوسرے شہروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو شرم سے گردن جھکا لینا پڑتی ہے۔ چند شہروں کو چھوڑ کر باقی سب شہروں کی حالت بہت خراب ہے۔ اس میں ہماری غریبی اور افلاس کو بھی بڑا دخل ہے لیکن زیادہ تر قابل الزام ہمارے وہ میونسپل ممبر ہیں جو اپنے فرض کو ٹھیک طرح نہیں سمجھتے اور اسے پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے ۔

(محمد عاقل صاحب ایم۔اے، استاد معاشیات جامعہ)

جب ۱۸۶۶ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ میں اس تجویز پر بحث ہو رہی تھی کہ انگلستان میں رائے دینے کے حق کو عام کر دیا جائے تو رابرٹ لو نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے ایک بات کہی تھی جو بعد میں بہت مشہور ہوئی تھی۔ بات یہ تھی Educate your masters یعنی "اپنے مالکوں کو تعلیم دو" اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں کو حاکموں کے چننے، حکومت کی پالیسیاں بنانے اور بگاڑنے، حکومت کے عہدہ داروں کو مقرر اور برطرف کرنے کا اختیار دے رہے ہو۔ پہلے ان میں اچھے اور برے، کھوٹے اور کھرے، فایدہ اور نقصان کے پرکھنے کی قابلیت پیدا کرو۔ ان میں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرو ــــ بعد میں انھیں سیاسی اختیارات سپرد کرنا۔

"اپنے مالکوں کو تعلیم دو" اس جملہ کو دو طرح سے کہا جا سکتا ہے ایک صورت تو یہ ہے کہ اس میں طنز اور طعنہ کو شامل کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس میں ہمدردی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے گویا کہنے والا انتہائی حقارت اور تمسخر کے ساتھ بے پڑھے لوگوں کی برائیاں گن گن کر سنا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پوچھتا جاتا ہے "کیوں صاحب! کیا ایسے ہی لوگوں کو رائے کا حق دوگے کیا انھیں کو اپنا آقا، حاکم اور سردار بناؤگے۔ کیا ایسے ہی کاٹھ کے الوؤں، لٹھ گنواروں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور سونپوگے" اور دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک نہایت دکھ بھرے دل کے ساتھ یہ جملہ زبان سے نکالا جائے غریب جاہلوں کی پستی اور گمراہی میں پوری طرح شرکت کی جائے۔ ان کی ذہنی اور اخلاقی سطح بلند کرنے کی نہایت سچائی اور غمگساری کے ساتھ تمنا کی جائے۔ اس لئے اس جملہ کے ان دونوں پہلوؤں پر ہمیں نظر کرنا چاہئے اس جملہ میں جو ٹھٹھول اور طعنہ کا پہلو ہے وہ ضرور برا لگتا ہے۔

لیکن اس کے کڑوے پن میں جس انمول نصیحت کا امرت رس ہے اُسے ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اُسے تو ہمیں اپنے دل میں پوری طرح جگہ دینا چاہیئے۔

ہم ہندوستان میں پنچایتی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن حکومت کا کام بڑی ہشیاری، مہارت اور ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ اسے ہر جاہل اور ناسمجھ آدمی اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا۔ اگر پنچایتی حکومت کا کام اچھی طرح چلانا ہے تو حکومت کے عہدہ داروں اور ان کے چننے والوں دونوں میں تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی اس ضرورت سے انکار کرنے والا میرے خیال میں شاید ہی کوئی ہو اس لئے اس کے بارے میں تو کچھ کہنا فضول ہے البتہ جس سوال پر بحث کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم کس طرح کی دی جائے؟

میں بلا کسی لانبی تمہید کے شروع میں ہی تعلیم کے بارے میں جو میرا نصب العین ہے اسے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں پنچایتی حکومت کی کامیابی کے لئے تمام شہریوں میں چار چیزیں پیدا کرنا ضروری ہیں:۔ اول، اپنے حقوق و فرائض کا احساس، دوسرے معاملہ کے ہر پہلو کو سوچنے کی قابلیت، تیسرے آزاد فیصلہ کی قوت اور چوتھے کیرکٹر کی پختگی۔ جب تک یہ چاروں خوبیاں شہریوں میں پیدا نہیں کی جائینگی وہ کبھی بھی کسی پنچایت کے مفید رکن نہیں بن سکیں گے۔

پنچایتی نظام میں ہر معاملہ میں ہر شخص سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کو رائے دینے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انھیں آزادی ہوتی ہے کہ چاہیں تو رائے دیں چاہیں نہ دیں۔ اس لئے سب سے پہلی ضرورت تو اس بات کی ہے کہ لوگوں میں رائے دینے کا شوق پیدا کیا جائے۔ وہ اس بات کو اپنا اخلاقی فرض سمجھیں کہ ہر سیاسی مسئلہ سے انھیں دلچسپی لینا چاہیئے اس کے بعد دوسری چیز جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو مسائل زیر غور ہیں ان کے بارے میں جتنی ضروری معلومات ہیں انھیں حاصل کریں۔ ان کی موافقت اور مخالفت میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے اُسے خود سوچیں دوسروں سے اس کے بابت بحث و مباحثہ کریں۔ پھر تیسری بات یہ ہے کہ خوب سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنی ایک آزاد رائے قائم کریں اور جب ایک بات کو طے کرلیں تو آخیر تک

اس پر ایمانداری کے ساتھ جمے رہیں۔ ان کے کیرکٹر میں اتنی پختگی ہونی چاہئے کہ لالچ یا خوف سے اس رائے کو بدل نہ ڈالیں۔ جن آدمیوں کو حکومت کے عہدوں کے لئے چنیں پہلے انھیں خوب آزماکر دیکھیں جانچیں تولیں اور پرکھیں۔ جب وہ ہر طرح اہل ثابت ہوں تو پھر ان پر پوری طرح بھروسہ کریں۔ اگر ضرورت ایسی آجائے کہ حکومت کا بوجھ انھیں خود اپنے کاندھے پر اٹھانا پڑے تو اپنی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام کو ہاتھ میں لیں اور کوشش کے ساتھ اس کو انجام تک پہنچائیں۔

اگر ان تعلیمی مقاصد کو جو ابھی بیان کئے گئے ہیں صحیح مان لیا جائے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی تعلیم پھیلانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ کیا محض پڑھنا لکھنا جان لینے سے اس قسم کی اہلیت پیدا ہوسکتی ہے؟ یا اس کے لئے کسی اخلاقی تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے کتابی تعلیم اور اخلاقی تربیت دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ کتابی تعلیم تو اس لئے ضروری ہے کہ جب تک ایک شہری کو اپنے ملک کے جغرافیائی حالات، آب و ہوا، آبادی، صنعت، تجارت اور زراعت، مذہبوں، زبانوں، رہنے سہنے کے طریقوں، تمناؤں اور حوصلوں کا علم نہ ہو، اسے آمدنی اور خرچ، نفع اور نقصان کا حساب کرنا نہ آتا ہو تو وہ حکومت کی بہت سی پالیسیوں کو نہ سمجھ سکے گا اور اس لئے ان کے بارے میں اپنی کوئی معقول رائے بھی نہیں دے سکے گا۔ اس کے پاس اتنا علم ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے دماغ پر زور ڈال کر بڑی بڑی باتوں کا تھوڑا بہت اندازہ کرسکے۔ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو وہ اپنا فرض ٹھیک طریقہ پر انجام نہ دے سکے گا۔ اس سلسلہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جن باتوں کا سیکھنا میں نے ابھی ابھی ضروری بیان کیا ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جنھیں آدمی ذاتی طور پر سفر کرکے یا کاروبار میں شریک ہوکے کتاب سے زیادہ اچھا سیکھ سکتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن اس قسم کے موقعے سب لوگوں کو نہیں ملتے۔ اور جنھیں ملتے ہیں وہ بھی خاصی عمر گذر جانے کے بعد ان سے فایدہ اٹھاسکتے ہیں۔ اور پھر بھی جہاں تک پرانے زمانہ کی باتوں، تجربوں اور مشاہدوں کا تعلق ہے ان کا پتہ انھیں نہیں ملتا۔ اس لئے کتابوں کے پڑھنے کی ضرورت تو سب کے لئے باقی

رہتی ہے۔ کتابوں میں لاکھوں آدمیوں کے سینکڑوں سالوں کے تجربے اور مشاہدے لکھے ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک و قوم کا ایک نہایت بیش قیمت سرمایہ ہوتی ہیں۔ لیکن کتابوں کی اس تعریف سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ محض ان کا پڑھ لینا اور یاد کر لینا کافی ہے۔ نہیں اس سے کچھ اور زیادہ کی بھی ضرورت ہے۔ بعض وقت دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض عالموں کے مقابلے میں جاہل لوگ معاملات کے بارے میں زیادہ صحیح اور مناسب فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ عالم بے عمل بس کتاب کی پڑھی ہوئی باتیں جانتے ہیں اور انھیں زندگی کا کوئی ذاتی تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہوتا۔ یا محض اپنی ذات میں کھوئے ہوئے رہنے کی وجہ سے ان میں سب کے لئے کام کرنے کی عادت اور سب کا فائدہ سوچنے کی قابلیت نہیں ہوتی یا خیال پرستی کی وجہ سے دنیا کی حقیقتوں کو بھول جاتے ہیں یا پھر کیرکٹر میں اتنی پختگی نہیں ہوتی، عقیدہ میں اتنی مضبوطی نہیں ہوتی کہ جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کے لئے پوری قربانی اور کوشش کر سکیں۔ اپنے اور دوسروں کے حقوق کے حاصل کرنے کے لئے معقولیت سے لڑ سکیں اور اپنے فرائض اچھی طرح ادا کریں اور دوسروں کو ان کے فرائض کے ادائگی کے لئے آمادہ کر سکیں۔

اس تمام بیان سے ظاہر ہوا کہ شہری حقوق اور فرائض کو پورا کرنے کے لئے کتابی تعلیم اور اخلاقی تربیت دونوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اخلاقی تربیت کی کیا صورت نکالی جائے؟ اخلاقی تربیت صرف عمل سے ہی ممکن ہے۔ ابتدائی مدرسہ سے اگر بچوں کو پنچایتی طریقہ پر کام کرنے کی مشق کرائی جائے۔ ہر کام پنچایتی مشورہ سے ہو بچوں میں سے عہدہ دار منتخب کئے جائیں جو بچوں کو ہی جواب دہ ہوں غرضکہ بچوں کی پنچایتی دنیا کو اگر بڑوں کی پنچایتی دنیا کا ایک عکس بنا دیا جائے تو یہ تربیت بچپن سے ہی شروع کر دی جا سکتی ہے اور اگر محلہ محلہ، گاؤں گاؤں ہر ہر پیشہ کی پنچایتیں ہوں تو تمام معاملات کا فیصلہ پنچوں کی رائے سے ہو تو پنچایتی نظام کا یہ عملی تجربہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان چھوٹی چھوٹی پنچایتوں میں جو تجربہ حاصل ہوگا اس سے شہریوں کو وہ اخلاقی تربیت مل جائیگی جس کی اعلیٰ عہدوں میں خوبی کے ساتھ کام کرنے کے لئے ضرورت ہے۔

لیکن تعلیم کے جو مقاصد ابھی میں نے بیان کئے انھیں سن کر بہت سے لوگوں کے دل میں شاید

یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ تو بالکل شیخ چلّی کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اسے عملی شکل دینا بالکل ممکن نہیں ہے۔ حکومت کے کاروبار آج کل اس قدر پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ ہر شہری کے لئے ان کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ صرف بڑے بڑے ماہر اور تعلیم یافتہ لوگ انھیں سمجھ سکتے ہیں اور انھیں صحیح طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ تمام شہریوں کی سمجھ میں یہ سب معاملات جب ہی آسکتے ہیں جب انھیں تعلیم بہت اونچے درجے تک دلائی جائے۔ آج کل ہر حکومت کے قبضہ میں بہت بڑا رقبہ ہوتا ہے جس کی آب وہوا، پیداوار، مذہب، زبانیں، تمدن، پیشے، رہنے سہنے کے طریقے، خواہشیں اور ضرورتیں، مواقع اور امکانات بہت مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ پھر دنیا کے سارے ملکوں کے باہمی تعلقات بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک ملک کے موسمی تغیرات، سیاسی، تجارتی، صنعتی اور زراعتی تبدیلیوں کا اثر فوراً دوسرے ملک قبول کرتے ہیں۔ باہر کے مال پر محصول، فوج کا خرچ، سرکاری قرضے، مزدوروں کے ساتھ رعایت، سکہ اور شرح مبادلہ کی پالیسی غرضکہ ملک کی ہر قسم کی پالیسیوں کا اثر دوسرے سب ملکوں پر پڑتا ہے۔ اس لئے پالیسیوں کے بناتے وقت بڑی ہشیاری، بیدار مغزی اور علم کی وسعت سے کام لینا ضروری ہے ورنہ نہایت سخت سیاسی پیچیدگیوں کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ ان سب باتوں کو سمجھنے کے لئے بڑے وسیع علم کی ضرورت ہے جسے ایک ملک کے صرف چند آدمی ہی سیکھ سکتے ہیں باقی لوگوں کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے۔ بظاہر یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ جہاں یہ مشکلیں پیدا ہوئی ہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے حل بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ سائنس اور ایجادوں کی ترقی نے جہاں حکومت کے فرائض کو پیچیدہ بنا دیا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ عام لوگوں کی تعلیم کے لئے بھی ہزاروں سہولتیں پیدا کردی ہیں چھاپہ کی ایجاد، اخبار، کتب خانہ، ڈاک خانے، ریلیں، بحری جہاز، تار گھر، ٹیلیفون، ہوائی جہاز، میجک لنٹرن، سنما، ریڈیو، ٹیلی وژن، سوسائٹی کلب، عجائب گھر سینکڑوں قسم کی نمائشیں غرضکہ ہزاروں ایسے ذرائع پیدا ہوگئے ہیں جن سے تعلیم کو وسیع اور ہمہ گیر بنایا جاسکتا ہے۔ اب عمر کے صرف ابتدائی سالوں تک تعلیم کو محدود رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہر بلکہ اب ہر شہری اپنی روزی بھی کما سکتا ہے، اپنے خاندانی اور دوسرے معاشرتی فرائض بھی انجام

دے سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا علم بھی بڑھا سکتا ہے اور اپنی پوری عمر ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی بسر کر سکتا ہے۔ ہر روز وہ آنکھوں سے دیکھ کر کانوں سے سن کر گھر بیٹھے بیٹھے تمام دنیا کی سیر بھی کر سکتا ہے۔ ماضی اس کے لئے زندہ کیا جا سکتا ہے مستقبل اس کے لئے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ آسان بنا کر اسے سمجھایا جا سکتا ہے اور اس طرح وہ اپنی نجی ترقی اور ذاتی تکمیل کے کام کو جاری رکھ سکتا ہے اور ایک مثالی ریاست کا ایک مثالی شہری بن سکتا ہے۔ پرانے زمانہ میں جن پابندیوں میں ہم زندگی گذارتے تھے ان کے جاری رکھنے کی اب کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ ہمارے لئے ترقی کے نئے نئے راستے کھلتے جا رہے ہیں۔ جدید حکومتوں میں جہاں شہریوں کے فرائض بڑھے ہیں وہاں ان فرائض کو پورا کرنے کے لئے سہولتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ ہمیں شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم ان سے پوری طرح فایدہ اٹھانا نہیں جانتے اس لئے تعلیم کا جو مقصد اور طریقہ میں نے تبلایا اسے ناقابل عمل نہیں کہا جا سکتا۔ اگر لوگوں میں ہمت ہو تو آسانی سے اسے عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

لیکن میں نے تعلیم کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا مقصد بس لوگوں کو سیاسی حیثیت سے ایک اچھا شہری بنانا ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ان کی مذہبی زندگی، معاشی زندگی، جمالیاتی زندگی، علمی اور تحقیقاتی زندگی ـــــ ان سب کو جنھیں ہر نظام تعلیم میں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور جن پر ہر شخص کی تہذیب و تکمیل کا بہت بڑی حد تک انحصار ہے ان سب کو آپ نے نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ نے انسان کو سیاسی حیوان سمجھ کر بس اس کی اس سیاسی حیوانیت تک اپنی توجہ کو محدود رکھا ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی تعلیم کا نصب العین بہت ناقص ہے۔

میں یہ بات مانتا ہوں کہ میں نے سیاست کو انسانی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ طریقہ میں نے مجبوری سے اختیار کیا ہے اس زمانہ کے واقعات کا کچھ ایسا ہی تقاضا ہے۔ اس میں شک نہیں انیسویں صدی میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہی حکومت اچھی ہے جو اپنی رعایا کی زندگی

سے کم سے کم تعلق رکھے۔ اس کا کام بس اتنا ہے کہ باہر کے حملوں اور ملک کے اندر کے بلووں سے اپنی پرجا کی حفاظت کرے اور کچھ عدالت کے فرائض بھی انجام دیتی رہے۔ اس کے بعد حکومت کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ افراد کی روزی حاصل کرنے کی کوششوں، ان کی تمدنی وابستگیوں، ان کی ذہنی تعلیم، ان کے جمالی ذوق کی تربیت، ان کے مذہبی معتقدات سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں۔ ہر شخص کو ان معاملات میں انفرادی آزادی ملنا چاہئے۔ یہ خیالات تھے جو انیسویں صدی کے پہلے حصہ میں لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ امید کی جاتی تھی کہ جب افراد کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا اور انھیں اپنے ذاتی مفاد کے مطابق ترقی کرنے کی پوری آزادی دی جائے گی تو ہر شخص کی ترقی سے کل جماعت کی ترقی از خود پیدا ہو جائے گی۔ لیکن بعد کے تجربے اور مشاہدے نے اس امید کو غلط ثابت کر دیا۔ معاشی زندگی میں امیر اور غریب کے دو مخالف طبقے بنتے چلے گئے۔ مزدوروں نے اپنی انفرادی آزادی سے فایدہ یا تو خود نہیں اٹھایا یا اپنی غریبی کی مجبوریوں کی وجہ سے وہ فایدہ اٹھا نہ سکے بہر حال ان کی حمایت میں حکومت کو حفاظتی قانون بنانا پڑے اور معاشی زندگی میں حکومت کی یہ دخل اندازی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے پھر عام تعلیم کے بارے میں بھی قانون بنائے گئے اور تعلیمی قوانین کے حلقہ میں رفتہ رفتہ ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم کی نگرانی بھی شامل کر لی گئی۔ اس کے علاوہ مکانوں کی تعمیر، حفظان صحت، سڑکوں، نہروں، ریلوں کی تعمیر، کتب خانوں، پکچر گیلریوں، آرٹ میوزم، عجائب گھر وغیرہ کے قیام اور پریس اور دوسرے وسائل نشر و اشاعت کی سنسر شپ کے ذریعہ حکومت نے ادب اور جمالیات کے مختلف شعبوں پر بھی اپنی نگرانی قائم کرنا شروع کر دی ہے۔ ہمہ گیر حکومت کا نصب العین ترقی پا رہا ہے اور لوگ ہر قسم کی بھلائی کو حکومت کی معرفت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہر کام کے لئے اجتماعی کوشش کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی زندگی نے اس زمانہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے اور افراد کی زندگی کی تعمیر و تہذیب میں حکومت کے وسائل سے کام لینا نہایت ضروری خیال کیا جانے لگا ہے میں نے جس نظام تعلیم کو پیش کیا اس میں سیاسی

زندگی کو اہمیت ، زمانہ کے اسی رجحان کو دیکھ کر دی گئی ہے۔ اگر شہریوں میں اپنے سیاسی فرائض کو صحیح طریقہ پر انجام دینے کی اہلیت پیدا ہو جائے تو وہ اپنی زندگی کے اور دوسرے مقاصد کو بھی خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے،

تعلیم اور کھیل

(جناب عروج الحسن صاحب استاد جامعہ تعلیمی مرکز ملا)

تعلیم اور تربیت کا مفہوم جیسا کہ بعض اوقات غلطی سے سمجھا جاتا ہے واحد نہیں ہے۔ تعلیم اُس کام کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے ہم کو کسی خاص علم، فن یا کسی خاص پیشے میں واقفیت یا لیاقت حاصل ہوتی ہے اور تربیت وہ شے ہے جس سے مختلف قوائے انسانی نشوونما پاتے اور ترقی کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ورزش یا کھیل کے قاعدے جانتا ہو تو ہم کہیں گے کہ اس نے ایک فن کی تعلیم پائی ہے لیکن باوجود اس واقفیت کے وہ ورزش بھی کرتا ہو یا کھیلتا بھی ہو تو اس وقت ہم کہیں گے کہ اس نے تربیت بھی پائی ہے۔ تعلیم اور تربیت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر تعلیم ہوئی اور ہم کو اپنے علم سے کام لینا نہ آیا یعنی تربیت نہ ہوئی تو وہ علم فایدہ مند نہ ہوگا۔

تربیت کی تین قسمیں ہیں۔ تربیت جسمانی۔ تربیت عقلی۔ اور تربیت اخلاقی۔ یہاں پر چونکہ میں تربیت جسمانی کی اہمیت دکھانا چاہتا ہوں اس لئے اس مضمون میں اسی پر بحث کروں گا۔

تربیت جسمانی سے یہ مراد ہے کہ ہمارے تمام اعضا اور قوائے جسمانی اپنا معمولی کام بخوبی انجام دینے کے لائق ہو جائیں۔ اس میں دو اغراض شامل ہیں۔

۱۔ جسم کی طاقت اور چستی کو ترقی دینا۔ ان دونوں اغراض کا ماحصل یہ ہے کہ طلبہ عقلی اور اخلاقی تربیت کے لئے تیار ہو جائیں۔ جسمانی تربیت عقلی اور اخلاقی تربیت سے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ بیمار اور کمزور آدمی کسی کام پر استقلال کے ساتھ محنت نہیں کر سکتا اور نہ اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک انجام دے سکتا ہے۔

چونکہ ہم کو طلبہ کی تربیت کرنی مقصود ہے، اس لئے عقل اور اخلاق کی تربیت کے علاوہ جسمانی تربیت بھی معلم کا فرض ہے۔ پس اس کو ایسے اسباب اور وسائل بہم پہنچانے چاہئیں جن سے

طلبہ کی جسمانی صحت بنی رہے۔

طلبہ کی صحت قائم رکھنے کے لئے جسمانی ریاضت بہت ضروری ہے جسمانی ریاضت میں علاوہ ورزش وغیرہ کے مختلف جسمانی کھیل بھی لازم ہیں۔ اسی بنا پر یہ بات خاص طور پر اہم ہوتی جاتی ہے کہ بچوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ جو محنت ان کو درپیش ہے اس کے لئے محض عقلی قابلیت ہی نہیں بلکہ اُس محنت سے جو سخت تکان اور ضعف ہوتا ہے اس کے برداشت کرنے کے لئے جسمانی قوت بھی پیدا ہو جائے۔ کھیل کود کے کام جن کی طرف نظر تاً رغبت ہوتی ہے جسمانی بہبودی کی غرض سے طلبہ کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ جو شخص اس کو نظر انداز کرتا ہے وہ ان وسائل کو روکتا ہے جو جسمانی نشوونما کے لئے خدا تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں۔

کثرت مطالعہ کے آفت ناک نتائج ہر جگہ نظر آتے ہیں مختلف قسم کی بیماریاں اس سے پیدا ہوتی ہیں رفتہ رفتہ دماغ و جسم کمزور ہونے لگتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مدرسوں اور کالجوں میں زیادہ تر وہی طلبہ بیمار ہوتے ہیں جو کثرت مطالعہ کے عادی ہو چکے ہیں لیکن جو جسمانی کسرت کرتے رہتے ہیں وہ ان مصیبتوں سے بچے رہتے ہیں۔ اس چیز کا سارا بار والدین اور اساتذہ پر ہے جو بچوں کے لئے پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کا انتظام نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ والدین کھیل کود کو آوارگی سمجھ کر اپنے بچوں کو اس میں شریک ہونے سے روکتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ہے کہ کھیل کود میں سوائے وقت ضائع ہونے کے اور کوئی تعلیمی فائدہ نہیں ہے۔

بڑوں کی برابر بچے محنت نہیں برداشت کر سکتے نہ جسمانی اور نہ دماغی۔ جب کہ بڑوں کو زائد از اعتدال محنت سے جو اُن سے لی جاتی ہے۔ صریحاً اتنی تکلیف پہنچتی ہے۔ تو پھر اس عقلی محنت کی وجہ سے جو بچوں کو بھی بسا اوقات بڑوں کی برابر کرنی پڑتی ہے۔ بچوں کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم مدرسہ کی اس تربیت کی جانچ پڑتال کرتے ہیں جس پر اکثر زور دیا جاتا ہے تو تعجب اس بات کا نہیں کہ وہ نہایت مضر ہے۔ بلکہ اُس بات کا ہے کہ بچے اس کی

برداشت ہی کیوں کر کر سکتے ہیں۔ جس کے نتائج ضعف، زرد روئی۔ افسردہ دلی اور عام صحت کی خرابی ہوتے ہیں۔ دماغی ورزش عرصہ دراز تک کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی ورزش کم کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف جسمانی افعال کی ابتری ہے بلکہ جسمانی ساخت کی بے قاعدگی بھی ہے۔

جن بچوں کا رنگ اسکول میں داخل ہونے کے وقت سرخ و سفید ہوتا ہے تھوڑے ہی عرصے میں اُن کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور وہ اکثر مریض رہتے ہیں۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ تعلیم ختم کرنے سے پہلے ہی طلبہ مضمحل ہو جاتے ہیں اور تعلیم چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اگر مدارس کی موجودہ حالت پر غور کیا جائے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مدرسے بہت کم ہیں جن میں متوسط درجہ کے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ محنت نہ کرنی پڑتی ہو۔ زیادہ تر مدارس کا نصاب اس قدر سخت اور بے قاعدہ ہے کہ طلبہ کو امتحان پاس کرنے کے لئے نہایت سخت محنت کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے ان کے جسمانی نظام پر نہایت مضر اثر پڑتا ہے۔

اکثر والدین اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے بچے کو کتابی تعلیم دی جائے۔ اور بچے کی عقل کو زبردستی ترقی دینا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو جسمانی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے یا آخر کار بچہ غبی ہو جاتا ہے یا قبل از وقت اجل کا شکار ہو جاتا ہے۔

دماغ ابتدائی عمر میں جثہ کے لحاظ سے نسبتاً بڑا مگر ساخت کے لحاظ سے نامکمل ہوتا ہے اور اگر ناواجب مستعدی کے ساتھ دماغ سے کام لیا جائے تو جس قدر ترقی اس عمر کے مناسب حال ہونی چاہیئے اُس سے زیادہ ترقی تو ہو جاتی ہے مگر آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس درجہ اس کا قد اور طاقت بصورت دیگر پہنچ سکتے تھے اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ قبل از وقت نمو پانے والے بچے اور جوان جو ایک خاص عرصے تک تمام مشکلات پر غالب آتے تھے اُن کی ترقی لبا اوقات یکایک رُک جانے اور اُن کے والدین کی بڑی بڑی امیدوں کے خاک میں مل جانے کی ایک وجہ بلکہ خاص وجہ یہی ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ حصول علم ہی سب کچھ ہے اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ ضروری بات علم کا انضباط ہے۔

جو معلم اپنے شاگردوں کے ذہنوں کو ترقی دینے کے شوق میں اُن کے جسموں سے غفلت کرتے ہیں ان کو یہ بات یاد نہیں کہ دنیا کی کامیابی بہ نسبت معلومات کے جسمانی قوت پر زیادہ منحصر ہے اور جو تدبیر علم کو دماغ میں ٹھونس لینے کے سبب جسمانی قوت کو زائل کرتی ہے۔ وہ آپ اپنی ناکامی کا باعث ہے۔ مضبوط ارادہ اور نہ تھکنے والی مستعدی جو حیوانی طاقت کی افراط کا نتیجہ ہیں۔ یہ دونوں باتیں تعلیم کے بڑے بڑے نقصانوں کا بہت کچھ معاوضہ کر سکتی ہیں اور جب اس طاقت کے ساتھ اس کافی روانی تعلیم کو شامل کر لیا جائے جو صحت کو قربان کئے بغیر حاصل ہو سکے تو اُن لوگوں پر جن کو کثرت مطالعہ نے ضعیف کر دیا ہے یقیناً بآسانی فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر دولت کے ساتھ لگاتار بیماریاں لگی رہیں تو دولت کے حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ عزت و امتیاز کی کیا وقعت ہے اگر اس کے ساتھ مراق بھی پیدا ہو جائے۔

جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ تعلیم دی جائے بلکہ جتنی اعلیٰ تعلیم دی جائے اتنی ہی بہتر ہے۔ بشرطیکہ کوئی جسمانی نقصان نہ ہو۔

آجکل بچوں کی جسمانی تعلیم میں زیادہ تر چار نقص پائے جاتے ہیں۔

(۱) بچوں کو ناکافی خوراک دی جاتی ہے۔

(۲) ناکافی لباس پہنایا جاتا ہے۔

(۳) ناکافی ورزش کرائی جاتی ہے۔

(۴) عقلی محنت بہت زیادہ لی جاتی ہے۔

دماغی تعلیم کے ساتھ جسمانی تعلیم دینا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جسمانی تعلیم جس قدر جماعت سے باہر دی جا سکتی ہے اتنی جماعت میں نہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جماعت محض دماغی تعلیم کے لئے ہے۔ جماعت کے کمرہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ روشنی کافی آتی ہو۔ صاف ہوا کا بہ آسانی گذر ہو۔ لیکن یہ کافی نہ ہوگا جب تک کہ کسی قسم کی جسمانی ورزش بھی نہ ہو۔ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر اس کی ضرورت لازمی ہے۔

۱۔ ایک حالت میں دماغی محنت کرنے کے بعد آرام کرنا۔

۲۔ دماغ پر زور دینے کے بعد جسم کو حرکت دینا تاکہ خون کی روانی تمام جسم میں ہو سکے۔

۳۔ کھلی ہوا میں سانس لینا اور اعضا کو حرکت دینا تاکہ سینہ بڑھ سکے اور پھیپھڑوں اور دل کی حرکت میں اضافہ ہو۔

۴۔ جسم محنت کرنے کا عادی ہو۔

۵۔ اپنے چہرے اور جسم سے دوسروں پر اثر ڈال سکے۔

اگر مناسب ورزش کی جائے تو ہمارے جسم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بڑھے۔ مدارس میں ورزش کا انتظام لازمی ہے، اس سے نہ صرف جسمانی قوت ترقی کرتی ہے بلکہ طالب علم میں مستقل مزاجی۔ صبر۔ لطافت۔ اور قوت بیان پیدا ہوتی ہے۔

ایک مقرر جو محض اپنی زبان سے کام لیتا ہے وہ اپنی تقریر کا دوسروں پر اتنا اثر نہیں ڈال سکتا جتنا کہ وہ مقرر جو اپنی وجاہت اور اعضا کی حرکت سے دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہے۔

اسکول کے اوقات میں طلبہ کی جسمانی ورزش کے لئے ایک وقت ضرور مقرر ہونا چاہیئے۔ ۵۰ منٹ دماغی محنت کرنے کے بعد اگر دس منٹ جسمانی ورزش کرائی جائے تو طالب علموں میں زیادہ علم۔ زیادہ عقل۔ خوش مزاجی۔ اور خوبصورت جسم پیدا ہوں گے بمقابلہ ان طلبہ کے جو متواتر کئی گھنٹے دماغی کام کرتے ہیں۔

طلبہ کے کھیل میں معلم کو شریک ہونا کم از کم موجود ہونا ضروری ہے اس کی موجودگی سے دو فایدے ہوتے ہیں۔ برائیوں کو دبانا اور خوبیوں کو ابھارنا۔ کھیل کے میدان میں بچے کی طبعی۔ عقلی۔ اور اخلاقی قوتیں کام کرتی ہیں۔ جو معلم بچے کی ان خصوصیات کو نہیں پہچانتا وہ بچے پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔ بجائے اس کے کہ بچے کی ان قوتوں کو روکا جائے یہ بہتر ہے کہ اس کو صحیح رستے پر لگا دیا جائے۔ اور جو خامیاں ہوں ان کی اصلاح کی جائے۔ میرے اس مضمون کا یہ مقصد نہیں ہے کہ کسی خاص کھیل کی طرف توجہ دلائی جائے بلکہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ کتابی تعلیم کے ساتھ

نی تعلیم لازمی ہے اور ایک اچھے طالب علم کے لئے تندرست ہونا ضروری ہے تو ہر وہ کھیل جس سے
نی نشو نما ہو اور ساتھ ہی ساتھ عقلی اور اخلاقی تعلیم بھی ہوتی ہو بچوں کو کھلانا ضروری ہے، جسمانی نشو نما
منی صرف یہ نہیں کہ جسم موٹا ہو یا انسان مزدور کی طرح بھاری بوجھ اٹھا سکے بلکہ جسم میں چستی اور پھرتی
اور آسانی سے کسی بیماری کو قبول نہ کر سکے۔ اس قسم کے بھی بہت سے کھیل ہیں جس میں جسمانی
ماکم اور دماغی نشو نما زیادہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ان کو اعتدال کے ساتھ کھیلا جائے۔ اس سلسلے
میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ اکثر کھیل ایسے ہیں جن کے ذریعے ہر مضمون کی تعلیم دی جا سکتی ہے بشرطیکہ
ہ دبھی دلچسپی لیتا ہو اور بچوں کو یہ سکھائے کہ کھیل سے نہ صرف جسمانی اور تفریحی فائدہ ہے بلکہ
ن بھی سدھر جاتے ہیں، اتحاد عمل۔ احساس فرض۔ ضبط نفس اور ایثار کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں میں اُن ذمہ دار ہستیوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کے ہاتھ میں
نسلوں کی باگ ڈور ہے کہ وہ اس قسم کی سہولتیں پیدا کر دیں جن سے مدارس اور نہ صرف مدارس میں
ردں پر بھی علاوہ عقلی اور اخلاقی تعلیم کے جسمانی تعلیم بھی دی جا سکے اور نہ صرف سہولتیں ہی پیدا کریں
دبھی دلچسپی لیں اور اگر کوئی شخص اس قسم کی چیزیں جاری کرنا چاہے تو اس کی امداد کریں۔ اس
لہ میں میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کرتا ہوں۔

۱. ہر شعبہ تعلیم میں ایک ایسا استاد ہونا چاہئے جو طلبہ کو مختلف جسمانی ورزشیں کرا سکے اور کھیل کھلا سکے۔

۲. روزانہ تعلیمی اوقات میں ایک وقت ایسا مقرر کر دیا جائے جس میں طلبہ کو ورزش کرائی جائے
ں کھلائے جائیں۔

۳. ہر سال انعامی مقابلے ہوا کریں۔

۴. والدین پر اس کی اہمیت ظاہر کی جائے کہ گھر پر بھی بچے کے لئے کھیل اور ورزش کا معقول
م ازبس ضروری ہے۔

۵. ہر مہینے ایک میڈیکل افیسر تمام طلبہ کا معائنہ کیا کرے۔

اُردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات پر ایک نظر

جناب احمد علی صاحب علوی متعلم جامعہ

(بہ سلسلہ ماہ اکتوبر)

سر سید نے ۱۸۸۴ء سے جو نیا چولا بدلا اور جس نے ان کے بعض ساتھیوں اور دیگر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور رؤسا و جاگیرداروں پر بہت اثر ڈالا۔ اس سے نوجوانوں پر بھی کچھ کچھ اثر پڑا اور وہ چنگاری جو سلگ چکی تھی پھر افسردہ ہو چلی یہ نیا اثر کہاں سے آیا تو اس کے متعلق ہم کچھ اوپر بیان کر چکے ہیں اب ذرا اس کی اور تشریح و تفصیل کر دینا چاہتے ہیں اگر آپ سر سید کے ماحول کا مطالعہ کریں اور اسوقت کی انگریزی حکومت کی پالیسی پر غور کریں تو شاید آسانی سے معلوم ہو جائیگا کہ قدامت پسند انگریزوں نے کانگریس کے وجود کو ایک خطرہ محسوس کیا اور لبرل حضرات کو ایک طرف سمجھایا دوسری طرف ہندوستان میں بعض آدمیوں کو آلہ کار بنایا۔ مسٹر بیک علی گڈھ کالج میں اسی مقصد کے ماتحت کام کرتے رہے انھوں نے سر سید پر غلبہ حاصل کر لیا۔ سر سید بدلے تو تھے یورپ سے واپسی ہی پر مگر انکے گرد جو نورتن جمع تھے انھوں نے کچھ کچھ ان کو سنبھالا۔ مگر بیک صاحب کے آنے کے بعد وہ اثر کم ہو چلا۔ پھر کانگریس کے قیام سے سر سید کو مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے متعلق خطرات پیدا کئے گئے۔ اس شدید حملے کے دفاع کی کوشش سر سید کے بعض ساتھیوں نے کی مگر ایک طرف گورنمنٹ نے سبز باغ دکھائے۔ مسلمانوں کی تباہی کے خطرات پیش کئے اور دوسری طرف بڑھاپا اور خانگی مصائب۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سر سید بدلے اور بالکل بدل گئے۔ وہی شخص جو کل انگریز و ہندوستانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا تھا اور اس کے لئے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کر کے مولویوں سے بگاڑ پیدا کر چکا تھا۔ آج انگریزوں کے تفوق کا علی الاعلان منادی تھا مگر اتفاقات کہئے یا خوش نصیبی کہ کانگریس کے قیام نے ہندوستان میں عمل کی ایک تازہ روح پھونکی اور چند مسلمان رہنما بھی اس سے متاثر ہوئے۔ نوجوانوں میں بھی جان

آگئی اور ان کے دل کی کھیتی جس پر نا امیدی کا پالا پڑ چکا تھا اس آفتاب کی کرنوں سے پھر ہری ہوئی۔
سجاد حسین کا اخبار بہت مقبول تھا ایک طرف اس نے دوسری طرف بعض دوسرے اخباروں نے جنھیں سر سید سے اختلاف تھا شور مچایا۔ مولانا شبلی جو سر سید کے ساتھی تھے وہ بھی اس پر تیار نہ ہوئے اگرچہ تھوڑے عرصہ تک انھوں نے علی الاعلان مخالفت نہ کی مگر ۱۸۹۸ء میں سر سید کے انتقال کے فوراً ہی بعد قلم اٹھایا، لکھا اور بہت جوش کے ساتھ لکھا، دلیل کے ساتھ لکھا اور بڑے درد کے ساتھ لکھا۔

"وہ پر زور دست و قلم جس نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا تھا اور اس وقت لکھا تھا جبکہ کورٹ مارشل کے ہیبتناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں وہ انصاف پرست جس نے بنگالیوں کی تعریف میں کہا تھا .... کہ بنگالی ایسی قوم ہیں جن پر ہم واجبی طور پر فخر کر سکتے ہیں اور یہ صرف انھی کی بدولت ہے کہ علم، آزادی اور حب الوطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی .... حالات گرد و پیش نے اُسے ایسا مجبور کر دیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالٹیکس سے روک دیا یہ کیوں ہوا، کن اسباب سے ہوا۔ کس چیز نے دفعتہً یہ اختلاف پیدا کر دیا ان سوالات کا جواب دینا آج غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ آج اجتہاد و تقلید سے آزادی کا زمانہ ہے۔"

(مضامین شبلی) مسلم گزٹ لکھنؤ ۱۸۹۸ء

۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۰۱ء میں اردو ہندی کے جھگڑے نے اور ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے مسئلے نے ہندو اور مسلمان کے درمیان منافرت کو اور شدید کرنا شروع کر دیا۔ مسٹر بیک نے مسلمانوں کو کافی تیار کر ہی دیا تھا اس لئے خوب زوروں سے ایک دوسرے کے خلاف قلم چلا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور اس کے قیام کا مقصد ہندوؤں کے خلاف متحدہ محاذ جنگ قائم کرنا تھا۔ ۱۹۱۱ء تک یہ خلیج نہ پاٹی جا سکی۔ مولانا حسرت اور محمد علی مرحوم نے جو نوجوانوں کے سردار تھے بہت کوشش کی کہ یہ اختلافات

ختم ہوں مگر آغاخاں صاحب کا وجود بھلا اتحاد کیوں کر پیدا ہونے دیتا۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ ہوئی اور اب مسلمانوں کی ہر جماعت کو احساس ہوا کہ لارڈ کرزن نے انھیں صرف بیوقوف بنا کر ہندوؤں سے لڑا دیا تھا تاکہ اختلاف سے فائدہ حاصل کرے اور آسانی سے حکومت چل سکے۔ مسلمانوں کو یہ بھی احساس ہوا کہ گورنمنٹ برطانیہ وفادار کے ساتھ نہیں بلکہ قوی کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے اس لئے مسلمانوں کی پالیسی بدلنا شروع ہوئی۔ نواب وقار الملک بہادر کے قلم تک سے یہ سطریں نکلیں۔

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپ خانہ کی تھی جو مسلمانوں کی مردہ لاشوں پر سے گذر گیا بدون اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں جان بھی ہے اور ان کو اس سے کچھ تکلیف محسوس ہوگی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" (وقار حیات ص ۶۹۹)۔

۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی مرحوم نے اپنا اخبار کامریڈ نکالا اور ۱۹۱۳ء سے اُردو میں ہمدرد کا اجرا ہوا۔ اس درمیان میں مولانا شبلی مرحوم کا قلم برابر سیاسی بیداری پیدا کرتا رہا۔ مولانا نے علی گڈھ سے علیحدگی پر ایک اخبار مسلم گزٹ نکالا تھا جو برابر سیاسی رہنمائی کرتا رہا انگریزوں کی سیاست "لڑاؤ اور حکومت کرو" کو وہ خوب سمجھ چکے تھے اور اتحاد کی تلقین اور آزادی کا حصول انکا موضوع قلم تھا۔ ۱۹۱۲ء میں جب کہ اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہو رہی تھی ان کے قلم سے حسب ذیل سطور نکلیں۔

" حالت یہ ہے کہ رعایا میں سے دو قوموں کی باہمی نزاع اور چارہ جوئی کا نام پالٹکس ہے اگر یہ پالٹکس ہے تو سرکاری عدالتیں اور ہائی کورٹ سیاست گاہ اعظم ہیں .... پالٹکس کا خط وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ انتظام حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہئے یعنی پالٹکس نام ہے گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی مطالبہ حیات کا نہ کہ رعایا کے باہمی تنازعات کا۔"

(مضمون مولانا شبلی) مسلم گزٹ ۹ ۱۰/۶ ۱۹۱۲

ماحول کے ان اثرات نے اردو ادب پر بہت سے اثرات مرتب کئے اخبارات کے علاوہ رسائل نے بھی سیاسی مباحث پر تنقیدیں لکھیں۔ ناول اور ڈرامے میں بھی عام لوگوں کے کیرکٹر اور جذبات، سماج

کے مظالم کے خلاف آنے لگے۔ علامہ شبلیؔ، اقبالؔ، اور چکبستؔ تو قومی اور سیاسی شاعری کے پیشرو تھے ہی اور اُردو شاعری میں ایک نئے باب اور نئی زندگی کے مناظر کی تصویر کشی کر رہے تھے۔ غزل گو شعرا نے بھی سیاسی اور قومی جذبات کی جھلک دکھانا شروع کی اور عملی زندگی کی تلقین کی۔ مولانا شبلی نے بہت سی قومی نظمیں لکھی ہیں مسلم لیگ کا نصب العین "سوٹ ایبل" سلف گورنمنٹ، تھا اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

چہرہ یہ ہے جو سیلف گورنمنٹ کا نقاب ہر دیدہ دراسیرِ طلسمِ مجاز ہے

سمجھے نہ یہ کہ "سوٹ ایبل" کی جو شرط ہے تمہیدِ سجدہ ہائے جبینِ نیاز ہے

سمجھے نہ لوگ یہ کہ یہی لفظ پُر فریب اس ملک میں طلسمِ غلامی کا راز ہے

چکبستؔ کی قومی نظمیں فنی خوبیوں کے لحاظ سے تو ضرور بہت خوب ہیں مگر جوش و ولولہ کے لحاظ سے زیادہ بہتر نہیں اقبال نے ۱۹۰۵ء سے قبل ہی قومی شاعری شروع کی تھی مگر تھوڑے عرصہ بعد ماحول نے انھیں اور زیادہ متاثر کیا۔ تھے تو وہ نوجوان ہی مگر قدرت نے انھیں دل و دماغ صرف شاعری کا نہیں بلکہ فلسفی، مفکر اور رہنما کا دیا تھا اس لئے انھوں نے اپنی شاعری سے حقیقی شاعری کا کام لیا۔ اور بڑی پرجوش نظمیں لکھیں۔ انکی نظموں نے عام طور پر تمام ہندوستانیوں میں اور خاص کر مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی، نئے ولولہ اور جوش کے ساتھ اچھوتی اور باعزت زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا کی۔ اقبال کی شاعری میں فطرت نے قوموں اور حکومتوں کو زیر و زبر کر دینے کی قوت ودیعت کی ہے۔ اس زمانے میں انکی شاعری نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکایا۔ راہ عمل دکھائی اور حیات تازہ بخشی۔ انکے دل میں درد تھا اور سوز، ایک کرب و بیچینی۔ اس لئے انھوں نے بچے اور نوجوان، جوان اور بوڑھے سب کو وہ درد بھرا دل دکھایا اور تڑپانے کی کوشش کی۔ انکی صدائے درد یقیناً تمام ہندی قوم کو بسمل بنانے کے لئے کافی ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

مدعے گم گشتگی کے مٹا آشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جسکے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں　　اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

ہندوستان کی تصویر جوان کی آنکھوں نے دیکھی اس سے ان کے قلب پر کیا گذر رہی تھی اور دل پکڑ کر سنئے۔

عطا مجھکو بیاں ایسا ہوا رنگیں بیانوں میں　　کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا　　لکھا کلک ازل نے مجھکو تیرے نوحہ خوانوں میں

سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جسکو　　وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے　　تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے　　دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو　　تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے

جو ہے راہ عمل پر گامزن محبوب فطرت ہے

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری　　اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

اس دور کے دوسرے نوجوان شعرا نے بھی سیاسی نظمیں لکھی ہیں مگر نہ تو انمیں ادبی خوبیاں ہیں اور نہ فنی۔ البتہ جوش و جذبہ سب کے یہاں یکساں ہے اور کافی۔

مولانا محمد علی مرحوم جو انگریزی زبان کے بے مثل ادیب اور سحر طراز مقرر بھی تھے۔ انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں میں بولا بھی بہت اور لکھا بھی کافی۔ موجودہ دور میں سیاسی بیداری پیدا کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم محمد علی (روحی فدا) کی شخصیتیں بہت نمایاں ہیں مگر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۹ء تک نظربندی کے زمانے میں انکی شاعری خوب چمکی۔ مذہبی جوش نے اس میں نئی روح پیدا کردی۔ قید و بند کی حالت میں ان کے جذبات نے اشعار کی صورت اختیار کی۔ غالباً غزل گو شعرا میں وہ اپنے جوش، جنون، شورش اور سرگرمی کے لحاظ سے ممتاز تر کہے جا سکتے ہیں اس لئے ان کے

چند شعر حاضر ہیں۔

مصائب کے بعد راحتیں لازمی ہیں اس خیال کو کتنے بہتر طریقے سے پیش فرماتے ہیں۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ۔۔۔ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سلطان جابر کے خلاف جنگ کا جذبہ کتنا قوی کتنی بہادری کے جذبے کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو ۔۔۔ خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

چند شعر اور سن لیجئے۔ دیکھئے کتنی سچی، سادہ اور صحیح تعلیم ہے اور کتنے جوش اور ولولہ کے ساتھ۔

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ۔۔۔ ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست ۔۔۔ قلبِ مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر ۔۔۔ کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی ۔۔۔ اس دورِ اعتدال میں دار و رسن کہاں

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا ۔۔۔ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

۱۹۱۱ء سے الہلال اور ۱۹۱۳ء سے ہمدرد نے اتحاد و اتفاق کا پیغام بہت جوش اور سرگرمی کے ساتھ پہنچانا شروع کیا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں ہوئے اور دونوں جماعتوں میں اتحاد ہو گیا۔ جنگِ عظیم کے سلسلے میں بہت سے رہنما نظر بند کر دئے گئے تھے۔ ان وجوہ سے سارے ملک میں ایک بیداری کی لہر دوڑی۔ سیاسی جلسے بہت بڑی تعداد میں ہونے لگے اور بعض نوجوان قومی رہنماؤں نے سخت سے سخت تقریریں کیں۔ جنگِ عظیم میں ترکوں کی شرکت، اور شوکت علی، محمد علی اور حسرت موہانی کی نظر بندیوں نے عوام میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اس کا اثر ملکی ادب پر پڑنا ناگزیر تھا۔

(۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۹ء)

اُردو ادب نے بھی اسکا اثر قبول کیا نثر پر کم اثر پڑا۔ شاعری پر زیادہ اور وجہ ظاہر ہے شاعر حساس تر ہوتا ہی ہے۔ اس زمانے کے سیاسی رجحانات کافی ترقی پذیر ہیں۔ خلافت کے مسئلہ نے تو ایک قیامت ہی برپا کر دی تھی۔ لوگوں نے علانیہ گورنمنٹ کو برا کہنا شروع کر دیا ہر اخبار کچھ نہ کچھ روزانہ برطانیہ کی شان میں لکھ مارتا تھا۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند نمونے تقریر اور تحریر سے اس زمانے کے بھی پیش کر دئے جائیں۔

"ہم تلوار اٹھائیں گے۔ بشرطیکہ عدم تعاون ناکام رہے۔ پھر ہم ایک دفعہ عدم تشدد اور عدم تعاون کے نظام سے اپنی وفاداری' تائید اور حمائت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس وقت تک دشمنانِ اسلام کے خلاف ہتھیار اٹھانے' اور تشدد کی جنگ کرنے کو ملتوی کرتے ہیں جب تک عدم تعاون ناکام نہ رہ جائے" (تقاریر مولانا محمد علی ص۱۵ حصہ دوم)۔

اس سے زیادہ تند و تیز۔ اس سے بڑھکر سخت لہجہ ابوالکلام صاحب کا تھا۔

"آج میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں نے سپاہیوں کو برگشتہ کیا ہے میں نے انگریزی فوج کو برگشتہ کرنے کی کوشش کی ہے میں نے سیکڑوں سپاہیوں سے کہا ہے کہ انگریزی فوج میں رہنا۔ نوکری کرانا۔ بھرتی کرانا حرام ہے۔ آج بھی ہر سپاہی سے کہتا ہوں۔ میں کلکتہ میں پولیس کے ستر آدمیوں کو علیحدہ کرا چکا ہوں۔ میں نے سپاہیوں سے کہا ہے اور آج بھی میری یہی کوشش ہے اور ہوگی کہ میں ایک ایک سپاہی کے کان تک پہنچا دوں کہ ایک مسلمان کا کورٹ مارشل کی گولی کھانا زیادہ بہتر ہے لیکن ایک منٹ کے لئے بھی یونین جیک کے سامنے گردن جھکانا بہت برا" (خطبہ ابوالکلام ص۳۲)

اب ملک کا ماحول یہ تھا اور یہ تھی مسلمان رہنماؤں کی تحریر و تقریر مگر پھر بھی تعجب ہے کہ ہمارے نثر نویسوں پر بہت کم اثر پڑا اور ابتک ان کا ماحول مختلف ہے۔ خیر اس کا ذکر پھر ہوگا۔ اس زمانے کی ایک اور تحریر پیش کی جاتی ہے۔

"(ہمارے یہاں کے) " وبائی امراض کی اصلی وجہ ہندستان کا ہمہ گیر افلاس ہے جو سلطنت برطانیہ کی شہنشاہیت کا نتیجہ ہے۔ جب تک اس شاہنشاہیت کا خاتمہ

نہ ہو جائے۔ ہندوستان کا افلاس رفع نہیں ہو سکتا اور جب تک افلاس سے فارغ البالی نصیب نہ ہو جائے مختلف امراض کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ لہٰذا پلیگ کے انسداد کے لئے چوہوں کے مارنے کے ساتھ ساتھ ان چوہوں سے بھی نجات حاصل کرنا چاہیئے جو ہندوستان کے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور غریب ہندوستان کی مالی، اقتصادی، تباہی بربادی کا باعث ہو رہے ہیں اس بربادی کا علاج حکومت ہند کا محکمۂ حفظان صحت نہیں کر سکتا بلکہ خود ہندوستانی ہی کر سکتے ہیں۔ کاش تمام ہندوستانی متفقہ طور پر اس عالمگیر مالی اور اقتصادی پلیگ کا جلد سے جلد انسداد کر دیں، پھر دیکھیئے گا کہ پلیگ کے چوہے خود بخود بھاگ جائیں گے اور ہندوستان کو آرام و چین کے دن نصیب ہوں گے۔"

(ہماری غربت اور افلاس کا دردناک افسانہ ص۲)۔

جنگ آزادی کے التوا کے بعد سارے ملک میں ایک بار پھر اتحاد و اتفاق کے بجائے نفاق و عناد کی کوشش کرائی گئی سوامی شردھانند جی کی تحریک شدھی اور سنگھٹن اور مسلمانوں کی تحریک تنظیم نے زور پکڑا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی ایک آگ سارے ہندوستان میں لگ گئی۔ خود مسلمانوں میں حجاز کے مسئلے نے دو فریق کر دئے مگر ان حالات کے ساتھ ساتھ اشتراکیت اور عالمگیر انسانیت کی تحریک نے بھی جنم لیا۔ جس نے رفتہ رفتہ حالات کو بدلنا شروع کیا۔ عوام میں زندگی کا احساس اب اور قوی تر ہونے لگا۔ اخبارات اور رسائل اس پر مجبور تھے کہ عوام کی مرضی کے مطابق چھپیں۔ منشی پریم نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں ملکی مسائل پر لکھنا شروع کیا اور یقیناً انھوں نے ملک کے ہر طبقے کے خیالات اور جذبات کی مناسب اور صحیح مصوری کی۔ پھر بھی دوسرے ادیبوں پر اثر کم پڑا۔ ہاں البتہ نوجوانوں نے اور خاصکر سوشلسٹ خیال کے نوجوانوں نے بہت کوشش کی۔ اور کامیاب بھی ہوئے۔ انگارے اور شعلے سی کتابیں لکھی جانے لگیں اور اس دور کے مزدور، کسان، طالب علم، متوسط، امرا اور کارخانے داروں وغیرہ ہر قسم اور ہر جماعت کے لوگوں کے حالات، خیالات کی سچی تصویر کشی کی گئی۔ موجودہ دور کے بالکل نوجوان افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری، احمد علی، شاہد لطیف، جعفری جیسے لکھنے والے پیدا ہونے شروع ہوئے مگر ان لوگوں نے سماج

(۱۹۲۶ء تا ۳۶ء)

کی دکھتی ہوئی رگ کو تیز نشتر سے بہت گہرا چیرا ہے جو شاید بہت عرصہ تک لوگوں کو خوف زدہ رکھے گی ہمارا خیال ہے کہ سماج کا یہ گندہ اور تاریک ترین رخ پیش کرنا شاید ہمارے نوجوانوں کو صحیح راہ سے ہٹا دے گا اور ہمارے پختہ اور آزمودہ کار ادیبوں کو بھی کنارہ کشی پر مجبور کر دیگا۔ اس لئے ان کی یہ جدوجہد جہاں جوش عمل اور دلی کرب کا اظہار کر رہی ہے وہاں ایک نقصان بھی پہنچا کر رہے گی۔ ہمارے پرانے لکھنے والوں کے جرائم کی سزا ہمارے نوجوان لکھنے والوں کو عموماً اور سارے سماج اور ساری جنتا کو خصوصاً دینا بڑا ظلم ہے اور کسی طرح مناسب نہیں ہمارے ترقی پسند مصنفین کو چاہئے کہ قدم سنبھال کر اٹھائیں تاکہ ایسا نہو کہ گذشتہ کاہلی اور سستی کے بدلے یہ تیز قدمی اور بے جانے بوجھے اور تیرہ و تار راستے پر لمبے لمبے ڈگ کسی کھائی یا گڈھے میں نہ گرادیں اور بفرض محال آپ کہیں کہ راستہ جانا بوجھا اور صاف ہے تو بھی پیر رپٹ جانے اور پھسل کر گر پڑنے کا خطرہ تو پھر بھی رہے گا۔

ہمارے نوجوان ادیبوں میں اختر حسین رائے پوری صاحب بہت سمجھ بوجھ کر لکھنے والے ہیں وہ ادب پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کی تنقیدیں اگر ایک طرف صحیح ادب کی طرف راہ نمائی کرتی ہیں تو دوسری طرف سیاسی و معاشی معاملات میں بھی وہ ہمارے ادیبوں کے لئے اچھا نمونہ ہیں۔ ان کا یہ مقولہ اوپر بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اور اب پھر سنایا جاتا ہے۔

> "ادب، ماضی، حال اور مستقبل میں تعلق پیدا کرتا ہے، رنگ و نسل، ملک اور قوم کا رشتہ توڑ کر انسانی وحدت کا سبق دیتا ہے۔ (ادب اور[۵۱] زندگی از اختر صاحب اردو ۱۹۳۵ء)

جنگ عظیم کے بعد ترکوں کے مصائب نے ایک طرف اور دوسری طرف ہماری ملکی جنگ آزادی نے ہمارے شعرا میں بہت سے سچے شاعر پیدا کر دئے اور اگرچہ ان میں سے بہت بڑی تعداد ایسی ہی جو زبان اور فن کے لحاظ سے قابل تعریف نہیں ہیں پھر بھی خیال اور جذبہ کے لحاظ سے وہ ہمارے پرانے

---

۵۱ اس مقالہ میں اختر صاحب کے مضمون "ادب اور زندگی" سے کافی مدد لی گئی ہے۔ علوی

کاملین فن اور ماہرین زبان، قصیدہ اور غزل گو شعرا سے بہت بلند ہیں. شعر و ادب زبان اور فن کے نہیں بلکہ ماحول کی سادہ اور اصلی مصوری کے مظہر ہیں۔ آرزو اور حسرت کی شاعری اور جوش و ساغر کی شاعری میں یہی فرق ہے۔ عشق اور بھوک ممکن ہے کہ گذشتہ زمانے میں ایک ساتھ جاری رہ سکتے ہوں مگر اب وہ زمانہ کہاں اب تو زمانہ روٹی اور کپڑے کے عشق کا ہے۔ ترک اور مغبچہ محبوب و معشوق تھے ضرور مگر اب انکی محبت و الفت صرف کہانی ہے اور بس۔

موجودہ دور کے سیاسی رجحان والے شعرا میں علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، سیماب، جوش، ساغر، رئیس صدیقی، احسان بن دانش اور افسر میرٹھی خاص سے ممتاز ہیں۔

غالباً یہ حقیقت ہے اور اسکے بیان کرنے میں ہمیں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اقبال کی شاعری اور پیام ایک آزاد اور مسلمان قوم کے لئے " روشن ہدایت " ہے اور انکی شاعری میں وہ تمام خوبیاں، اچھائیاں، رفعت و بلندی پائی جاتی ہے جو ایک قوم کی کایا پلٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ وہ غالباً سب سے بڑے فلاسفر اور مفکر ہیں جنھوں نے اپنے فلسفہ اور ارفع ترین " مذہبی " فلسفہ کو شعر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ بڑے مفکر اور بڑے شاعر ہیں۔ غالباً دنیا نے اتنا بڑا شاعر فلاسفر ابتک نہیں پیدا کیا ہے اور نہ صدیوں تک اس کی امید۔

لیکن ان کی موجودہ شاعری عام لوگوں کے لئے بہت خشک ہے اور نرا فلسفہ، مگر پھر بھی اصحاب فہم کی روح کی تازگی اور بصیرت کی تیزی کے لئے کافی و شافی ہے اب ہم ان کے چند شعر جن کا تعلق ہندوستانی مسلمان سے ہے پیش کریں گے۔

وہ اپنے مخاطب " مرد مومن " سے ارشاد فرماتے ہیں۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج بن نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت " لہو ترنگ " ہے غافل نہ " جل ترنگ "

ہندی مسلمان آج تقدیر پر بھروسہ کرکے اپنے ہاتھ پاؤں چلانا بھول گیا ہے۔ اس حرکت پر

تنبیہ ہوتی ہے۔

اس قرآں میں ہو اب ترک جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!

"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

ہمارے بعض علمائے کرام اور مفتیانِ شرعِ متین کبھی کبھی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولو الامر منکم کی

تفسیر فرماتے ہوئے اولو الامر کے معنے صرف بادشاہ فرماتے ہیں اور ہمارے آقائے ولی نعمت انگریز بہادر

کی اطاعت کا حکم عنایت ہوتا ہے علامہ اقبال اس مسئلے پر انکے اجتہاد کے متعلق فرماتے ہیں۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق!

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں — آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق!

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

ہندی مسلمان کا تخیل اسلام کے لئے کیا ہے۔ وہ اسلام کو کیا سمجھتا ہے اس کے متعلق اشارہ

کرتے ہوئے راہ عمل بھی معین فرماتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ صحیح چیز کیا ہے۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو — آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد!

اے مرد خدا تجھکو وہ حاصل نہیں قوت — جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید — جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد!

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

غلامی نے ہمارے مذہبی رہنماؤں کو کس راستے پر دھکیل دیا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے راہ نمائی

فرماتے ہیں:۔

سخت باریک ہیں امراضِ امم کے اسباب　　کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شبیری میں غلاموں کے شیوخ اور امام　　دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید　　قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

جوش ملیح آبادی موجودہ دور کے بڑے پرجوش شاعر ہیں انکے پیام میں واقعیت، سرجوشی و سرگرمی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے ان کی نظموں میں سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

موجودہ حکومت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

تو نے شاعر سے یہ اے غاصب حکومت کیا کہا　　تو نہ مانے گا مجھے تو قتل کر دوں گی تجھے
قتل سے کیا ڈر جاؤں گا اتنا سمجھتی ہے ذلیل　　جا، اور ایسی سوقیانہ قسم کی دھمکی نہ دے

ایک جگہ موجودہ استعماری حکومت کو ان الفاظ میں تنبیہ کرتے ہیں۔

ڈر اس وقت سے اے دشمنانِ امن و آسائش　　بنالیں جب حکم خونریز تلواروں کو ہم اپنی
کہ ان کا فیصلہ کچھ اس قدر دو ٹوک ہوتا ہے　　کہ دو ٹکڑوں میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی

ہندوستان کے آرام پسندوں اور تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھ جانے والوں کو ہوش میں لانے کے لئے شاعر کہتا ہے۔

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی، ندا کیا آرہی ہے آسماں سے　　کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

شاعر اپنے اور ہندوستانی نوجوان کے جذبات کا اظہار اس نعرۂ انقلاب سے کرتا ہے۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب　　میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

ایک نظم میں اپنے لڑکے کو کچھ نصیحتیں کی ہیں اسی کا ایک شعر ہے

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کیلئے　　سر کٹانا ہند کے آزاد کرنے کے لئے

نوجوان شاعر نظامی اپنے ساتھیوں میں اپنے جوش، جذبۂ وطنیت، مادر وطن کی محبت کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ مگر ان کی شاعری میں قوتِ بیان و جدتِ ادا کی کمی ہے اور فنی و ادبی لحاظ سے بھی کمزوریاں بہت ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کا جذبہ سچا ہے اور ان کا پیام ملک کے لئے "رحمت و برکت" ہے

نوجوانوں کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ تم کون ہو؟ کیا تھے؟ اور کیا ہو گئے؟

اے جوانو، نوجوانو　　توڑ دو بندِ غلامی

خوش جمالو، نونہالو　　پھینک دو سر سے بارِ غلامی

اے حسین و علیؓ کے سپوتو　　اے محمدؐ کے شہزدر بیٹو

نسل سے بادشاہوں کی تم ہو

پھر بھی ہو یادگارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو

ابھیمنو کی اولاد تھے تم　　عہدِ ماضی کی روداد تھے تم

یاد ہے پہلے آزاد تھے تم

اب ہو اک یادگارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو

یہ تمھاری چھلکتی جوانی　　اور یہ لعنت جاودانی

یہ سراسیگی و سرگردانی

یہ دلِ داغدارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو

اس غلام آسماں کو اُلٹ دو　　ارضِ ہندوستاں کو اُلٹ دو

ہو سکے تو جہاں کو اُلٹ دو

کیوں ہے باقی، دیارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو

آن ظاہرا اہلِ وفا کی　　شان ظاہر ہو دستِ خدا کی

ہے جہاں قبر اہلِ وفا کی

اب وہاں ہو مزارِ غلامی

اے جوانو، نوجوانو

شاعر اپنے وطن سے وفاداری وجاں نثاری کا عہد کرتا ہے، آئندہ ہونے والے انقلاب کی بھیانک اور وہشتناک تصویر اس کے سامنے ہے مگر پورے جوش وولولہ کے ساتھ مادر وطن پر قربان ہو جانے کا عہد کرتا ہے۔ کاش ہم اور آپ سب مل کر یہ عہد کریں اور استقلالی وپامردی کے ساتھ اس پر قایم رہیں۔

جب مجھے بیڑوں سے عریاں کرکے باندھا جائیگا　　گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا

جب دہکتی آگ پر مجھکو لٹایا جائے گا

اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا

گولیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی جب مجھے　　اور تنہا چھوڑ جائے گا مرا مرکب مجھے

اور سنگینوں پہ چاہیں گے اُٹھانا سب مجھے

اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

مرتے مرتے اک تماشائے وفا بن جاؤں گا

خون سے رنگین ہو جائے گی جب تیری بہار　　سامنے ہونگی مرے جب سرد نعشیں بار بار

جب مرے بازو پہ سر آگر کریں گے بار بار

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

اور دشمن کی صفوں پر بجلیاں برساؤں گا

حکم آخر قتلگہ میں جب سنایا جائے گا　　جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا

جب یکایک تختۂ خونی اٹھایا جائے گا

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

گذشتہ صفحات میں ایک اجمالی خاکہ اور ایک دھندلی سی تصویر اردو ادب اور اس کے سیاسی رجحانات کی پیش کی گئی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ مطالعہ کی کمی، قوت بیان کے نہونے اور وقت کی تنگی نے اسے بہت تشنہ رکھا ہے۔ اس کے لئے معذرت چاہتے ہوئے اور اپنی کوتاہ نظری، کم علمی اور بے بصیرتی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا جاتا ہے کہ آپ حضرات خود غور و فکر فرمائیں اور اس مسئلہ پر قلم اٹھا کر ہماری اور ہمارے ادب کی صحیح اور سچی راہ نمائی کریں۔

آخر میں ہم پھر ادب جدید کی ضرورت کی طرف آپ کے خیالات کا رخ پھیرنا چاہتے ہیں اور اسی سلسلے میں گذشتہ ادب پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند باتیں اور عرض کرنے کی جسارت و جرارت کرتے ہیں۔

ہمارا گذشتہ ادب عام ملکی احول کے اثرات سے بہت کم اثر پذیر ہوا ہے اور اسی بنا پر وہ زندگی کی حقیقتوں سے ناشنا اور بالکل خالی ہے۔ وہ زندگی کے مصائب اور تکلیفات کے دفاع کے متعلق راہ نمائی کرنے سے بالکل معذور ہے کیونکہ وہ توسرے سے ہی ناواقف اور بیگانہ ہے کہ زندگی اور اسکی حقیقت کیا ہے۔

ادب دراصل انسانیت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کا سب سے پہلا اور سب سے آخری اور بلند تر مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ اس کائنات، اس تباہ حال دنیا سے وطن اور رنگ و نسل کے اختلافات کو مٹا کر نیست و نابود کر دے۔ اور ایک ایسی جماعت انسانی پیدا کرے جو صرف نظریۂ انسانیت کی داعی ہو اور جسکا مرکزی تصور ساری دنیا کو ایک ہی قسم کا آدمی بنانا ہو۔ اور اگر کوئی جماعت ان خیالات کی دنیا میں موجود ہے اور اسکا عملی کام بھی جاری ہے تو ہمارے ادب کو بھی اس جماعت کا ترجمان بن کر دنیا میں امن و آسائش کی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

آج تک ہمارا ادب زندگی کو بے کار، فانی اور بے ثبات کہتا آیا ہے۔ انسان کی عاجزی، کمزوری ولاچاری کا مرثیہ خواں رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اس بزدلی و نامردی کو چھوڑ دے، اس کمزوری سے ہٹے اور پورے زور و شور، پوری آن بان اور پورے جوش و ولولہ کے ساتھ پکار اٹھے کہ زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے، انسان عاجز اور لاچار نہیں اگر عمل کی قوتیں استعمال کی جائیں اور بالکل

صحیح طریقے سے استعمال کی جائیں تو وہی اس دنیا کا بنانے و بگاڑنے والا، کارساز حقیقی اور مالک اصلی ہے۔ قیامت اور محشر کے معنے صرف یہ ہیں اور انکی حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ روح الاجتماع داور محشر بنکر ظلم واستبداد سے بازپرس کرے اور پھر ان کو جہنم کا راستہ دکھلادے۔ اور پھر ایک نئی جنت ایک تروتازہ وشاداب بہشت کی تخلیق اس اجڑی دنیا میں کی جائے۔ یہ جنت ہر انسان کو ہر طرح کی جسمانی، ذہنی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچاسکے گی اور ہر شخص برابر فائدہ اٹھا سکے گا۔

انسانیت اور ادب کی راہیں الگ الگ نہیں ہیں دونوں کی نجات کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ روشن وصاف مسلک کیا ہے۔ ہمارے ایک ادیب نے کہا ہے۔

"وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور اپنے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کی ارتقا میں حائل ہوں"۔

غالباً اس موقعہ پر بیجا نہ ہوگا اگر چند جملے اُردو زبان کے متعلق بھی عرض کردیئے جائیں۔ زبان اور مذہب دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے نہ کہ صرف مسلمانوں کی تو آپ کا فرض ہے کہ اسے قومی زبان بنانے کے لئے اس میں ہر قسم کے جذبات و خیالات ادا کیجئے۔ قومی زبان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وسیع ہو۔ اس میں ہر فرقہ، ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگوں کے جذبات پائے جاتے ہوں۔ صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اُردو میں مسلمان کے خیالات، ہندوؤں کے افکار، عیسائیوں، سکھوں، بودھوں اور پارسیوں کے جذبات بھی ہونے چاہئیں۔ مذہب پر ایمان رکھنے والوں اور لامذہبوں دونوں کو اپنے اپنے خیالات، اپنی اپنی باتیں لکھنے کا برابر حق ہونا چاہئے۔ ہر فن، ہر صنف اور ہر علم کے متعلق ہر شخص کو لکھنے کا حق ہونا چاہئے۔ ہر نقطۂ خیال اور ہر زاویۂ فکر کو پیش کرنے کی اجازت ملنا چاہئے۔ کیونکہ وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم یا ملک کی زبان نہیں کہی جا سکتی کہ جس کے حسن وقبح، اچھائی وبُرائی کا فیصلہ ساری قوم، تمام جنتا اور سارے لوگ نہیں بلکہ صرف مذہبی جماعت والے کریں۔

رفتار عالم

ممالک غیر

دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا دوست ہو جائے تو اسے خوشی اور اطمینان اور ایک طرح کا سہارا ہو جاتا ہے۔ اور دشمنی اندیشے اور خوف پیدا کرتی ہے میونچ کانفرنس نے جہاں ایک تماشہ ختم کیا ہے وہاں ایک نیا تماشہ شروع کر دیا جنمیں دوستی قائم ہوئی تھی ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے۔ اور جنکی عداوت نے یورپ کو جنگ اور تباہی کی بھیانک صورت دکھائی تھی آپ ہی آپ گہرے دوست بن گئے جرمنی اور چیکوسلواکیا میں اب میل ملاپ اور عہد و پیمان ہو رہے ہیں اور جنگ کا وہ طوفان جو وسطی یورپ میں برپا ہوا تھا اب دوستی کی ہواؤں پر اڑ کر مغربی یورپ پر چھا رہا ہے۔

ستمبر کے آخر میں جب برطانیہ مجبور ہو کر یا صاف صاف کہئے کہ جرمن ہوائی جہازوں کی بمباری سے بچنے کیلئے جنگ کی تدبیریں کرنے لگا تب فوراً معلوم ہو گیا کہ جنگ کی تیاری کی جو دھوم مچائی گئی تھی وہ سب دکھاوا تھا اور اگر کسی دشمن نے واقعی حملہ کر دیا ہوتا تو اسکی روک تھام نہ کی جا سکتی اس بات نے انگریزوں کی خودداری کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ اور اگر جرمنی سے سمجھوتا ہو جانے کی ہر طرف خوشیاں منائی گئیں تو سب کے دلوں میں یہ ڈر بھی پیدا ہو گیا کہ یہ خوشی صرف امن کے خواہشمندوں کی نہ تھی بلکہ ایسے لوگوں کی جو ایک بڑے خطرے سے بال بال بچے تھے۔

یہ احساس کہ وہ کمزور ہے اور دشمنوں سے ڈرتی ہے ہر زندہ قوم کو اپنی طاقت بڑھانے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں میونچ کی گفتگو کے بعد ہی سے جنگ کی تیاری کے اور زیادہ چرچے ہونے لگے ہیں۔ بحری اور ہوائی جہاز بنانے کا کام زیادہ تیزی سے کیا جانے لگا ہے۔ اور ہوائی حملوں سے بچنے کی زیادہ معقول اور کارگر تدبیریں کی جانے لگیں۔ ایسی فضا میں ہٹلر کی خواہش کا کون خیال کر سکتا تھا کہ چار ریاستوں کا اتحاد جس کی طرح میونچ میں ڈالی گئی تھی ایک حقیقت بن جائے اور انگلستان

فرانس جرمنی اٹلی مل کر کوئی ایسا معاہدہ کرلیں کہ جس سے وہ روپیہ جو جنگ کے سامان پر صرف کیا جارہا ہے زیادہ مفید کاموں میں لگایا جاسکے۔ اب وہی انگریز جو جرمنی کے ہمدرد تھے محسوس کر رہے ہیں کہ اگر جرمنی کی طاقت بہت زیادہ نہیں بڑھ گئی ہے تو انگلستان کی اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہئے۔ چیکوسلواکیا کی رام کہانی سب بھول گئے اب انھیں اپنی سلامتی کی فکر ہے اور اسکا عام طور پر اندیشہ کیا جارہا ہے کہ لڑنے کے بجائے انسانیت سے بیٹھ کر اور دوستانہ طریقے پر مطالبے پیش کرنے اور منظور کرانے کا جو سبق مسٹر چمبرلین نے ہر ہٹلر کو میونخ میں پڑھایا تھا۔ وہ کہیں انھوں نے یاد نہ کرلیا ہو۔ اور اب کہیں کہ آؤ بیٹھیں۔ اور جرمنی کی نوآبادیوں کی واپسی کے معاملے کو انسانیت سے طے کرلیں۔

برطانیہ میں اب جرمنی کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے اور مسٹر ونسن چرچل کی طرح کے لوگ جو جرمنی کے پیدائشی دشمن ہیں اور بہت سے ایسے بھی جو جرمن کے دوست نہیں تھے۔ مگر چیکوسلواکیا کی خاطر لڑنے پر تیار نہیں تھے اب صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ جرمن کی طاقت کا اس طرح بڑھ جانا انگلستان اور سارے یورپ کے لئے ایک بڑا زبردست خطرہ ہے۔ اور ہر ہٹلر کے انداز میں وہ باتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوست کے آپ ہی آپ بگڑ جانے پر کی جاتی ہیں وہ پوچھ رہے ہیں کہ میونخ کی گفتگو کے بعد جنگ کی تیاری کے کیا معنی اب تو ہمیں اس حماقت سے باز آجانا چاہئیے وہ کھلم کھلا کہہ چکے ہیں کہ مسٹر ایڈن اور ڈف کی تقریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ میں ایک پارٹی ہے جو جرمن سے لڑنا چاہتی ہے اگر مسٹر چمبرلین نے اسے قابو میں نہ رکھا اور برطانیہ کی سیاست اسی کے حوالے کردی تو اس کا انجام برا ہوگا پھر تو یہ برطانیہ اور جرمنی کی دوستی قائم نہ رہ سکے گی اور نوآبادیوں کا مسئلہ کسی معقول طریقے پر طے نہ ہوسکے گا۔ بہرحال جرمنی اب برطانوی مدبروں کی نصیحتیں سننے اور ان سے سیاست کا سبق لینے پر تیار نہیں۔ ہر ہٹلر کی ان باتوں کو جرمن اخبار اس طرح دہراتے ہیں کہ وہ مطلب ظاہر ہو جائے جسے بیان کرنا ہٹلر فی الحال مناسب نہیں سمجھتا۔ مشرقی اور جنوب مشرقی افریقہ کی سابق جرمن نوآبادیوں کے واپس دینے کے خلاف جو مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اسکے بارے میں جرمن اخبار لکھ رہے ہیں۔ کہ انھیں روک دینا چاہئیے اس لئے کہ وہ پہلے ہی سے ایسا تعصب پیدا

کر رہے ہیں جسکی وجہ سے جرمنی کو اس کا حق دینے کا مسئلہ طے نہ ہو سکے گا' اس کے علاوہ ہٹلر کے حوصلہ مند پیر و اور مشیر اسے یقین دلا رہے ہیں کہ وہ جرمنی کی سابق نو آبادیوں کو اس کے سامنے تحفے کے طور پر پیش کریں گے۔ اور بعض کو تو کامیابی کا اتنا یقین ہے بڑے دن کے تحفوں کے ساتھ یہ پیش کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

موقع شناس انگریز ابتک جرمنی کے ہمدرد اس وجہ سے تھے کہ صلح نامہ ورسائی میں جرمنی کے ساتھ ایسی زیادتیاں کی گئیں ہیں جن کا اثر مٹائے بغیر یورپ کو امن نصیب نہیں ہو سکتا لیکن دوسرے کی زیادتیوں اور اپنی زیادتیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انگلستان نے فرانس کی یورپی سیاست کی جڑ کاٹ دی اور بہانہ یہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یورپ جنگ کی آفتوں سے بچ نہ سکے گا۔ اب جو جرمنی نے چیکوسلواکیا کو اس طرح اڑا دیا ہے جس طرح پہاڑوں میں رستہ بنانے والے بڑی بڑی چٹانوں کو بارود سے اڑا دیتے ہیں اور چیکوسلواکیا کو اپنی سیاست میں اس طرح لگا لیا ہے جیسے چٹانوں کے ٹکڑوں سے سڑک کے پشتے بنتے ہیں۔ اب جو اس نے ہنگری بلغاریہ ترکی کو اپنی سیاست اور تجارت کے کل پرزے بنا دیا ہے۔ بحر اڈریاٹک کی تجارت میں حصہ دار ہو گیا ہے اور عراق اور ایران تک بڑھ کر بحر روم کے مشرقی حصے کو گھیر رہا ہے اب جرمنی کا مطالبہ ہے کہ مشرقی افریقہ میں اسکی نو آبادیاں تعمیل واپس دے دی جائیں۔ اس نے برطانیہ کے دل کے اور ہی تاروں کو چھیڑ دیا ہے اور اس کے مزاج پر اور ہی اثر ڈالا ہے۔ بلقان اور ترکی میں انگریزی تجارت کو کوئی خاص دخل نہ تھا اور نہ اب ہے لیکن جرمنی کا اس راستے کے دونوں طرف مورچے قائم کر لینا جو انگلستان سے ہندوستان آتا ہے۔ عرب مصر، شام اور عراق میں جہاں انگریزی تجارت اور سیاست سیاہ اور سفید کی مالک تھی۔ برابر کا حق مانگنا اور اس حق کو حاصل کرنے کے لئے کافی طاقت پیدا کر لینا۔ یہ تو ایسے تحسین ہیں جو برطانیہ کو جرمنی سے یقیناً خفا کر دیں گے اور دوستی کے طور طریق کو زیادہ دیر تک نبھانا دشوار ہو جائیگا۔ ۲۰ اکتوبر کو سر سموئل ہور نے ایک تقریر میں یقین دلایا تھا کہ ہر شلر واقعی امن پسند ہیں اور ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ اپنے وعدے پورے نہیں کرتے۔ اس لئے کہ جب سے انھوں نے انگلستان سے گفتگو میں طے کر لیا۔ کہ

جرمنی کے جنگی جہازوں کی انگلستان کے بیڑوں سے ۳۵ فی صدی نسبت رہے گی تب سے اُنھوں نے جہازوں کی تیاری میں اسکا خیال رکھا اب بھی اگر انکے اور برطانیہ کے درمیان کچھ طے پایا تو ان کے وعدوں پر اعتبار کیا جاسکتا ہے سر سموئل ہور اس جماعت کے جو ہر ہٹلر کی حامی اور سرپرست ہے ایک بہت ممتاز رکن ہیں۔ اور انکی تقریر کا مقصد غالباً صرف ان تقریروں کا اثر دور کرنا تھا جو مسٹر چرچل نے حال ہی میں کی ہیں۔ اس لئے کہ اگر ہٹلر نے اس کا مطالبہ کیا کہ جیسے بحری جہازوں میں جرمنی کے ۳۵ اور انگلستان کے ۱۰۰ کی نسبت منظور کی گئی ہے ویسے ہی ہوائی جہازوں میں انگلستان کے ۳۵ جرمنی کے ۱۰۰ کی نسبت منظور کرلی جائے۔ تو سر سموئل ہور اپنی قوم کو اس پر راضی نہ کرسکیں گے۔ ہر ہٹلر یہ مطالبہ ضرور کریں گے کیونکہ انھیں اپنی بحری قوت کی کمی اس طرح پوری کرنی ہے۔ ورنہ انگلستان کا پلہ بھاری رہتا ہے اور سچی دوستی صرف برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے وہ اگر یہ مطالبہ کر بیٹھے تو دیکھئے گا کہ انگریز ہمدرد بغلیں جھانکتے ہوں گے سر سموئل ہور نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ جرمنی سے دوستی ہو جانے پر ہم جنگ کی تیاری اس لئے کر رہے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے بعد جو وزیر ہوں گے انکی پالیسی کیا ہوگی اگر سر سموئل ہور کو اپنے وارثوں کا اتنا خیال تھا تو انھیں جرمنی سے دوستی بھی نہ کرنی چاہئے تھی اس لئے کہ معلوم نہیں کہ اس کا برطانیہ کی سیاست پر کیا اثر ہو اور بعد کی وزارتیں اپنے آپ کو کن کھیڑوں میں مبتلا پائیں۔ اس طرح بات بنانے کا مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ہٹلر بدگمان نہ ہو جائیں اور انگلستان کمزور ہونے کے سبب اپنے کسی معاملے میں دبنے پر مجبور نہ ہو ایسے بہت سے معاملے نظر بھی آرہے ہیں۔

مسولینی نے برطانیہ کو خوش کرنے کی خاطر اور جنرل فرینکو نے چند ضروری اختیارات حاصل کرنے کی غرض سے ہسپانیہ سے قریب دس ہزار اٹلین سپاہی ملک کو واپس بھیج دئے ہیں لیکن برطانیہ کو ان اعداد پر اعتبار نہیں اور اب بھی اتنے اٹلین سپاہی موجود ہیں کہ مسولینی جب چاہے انگریزی سیاست اور تجارت کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ مالٹا کا جزیرہ جو اب تک بڑا مورچہ تھا اب اٹلی کے ہوائی جہازوں کی بدولت بے کار ہوگیا ہے جبرالٹر اٹلی اور جرمنی کے مورچوں میں گھرا ہوا ہے اس لئے انگریز مسولینی

اور فرینکو کی اس عنایت سے مطمئن نہ ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا برطانوی سیاست چاہتی تھی کہ ایک طرف مصر اور دوسری طرف فلسطین میں قدم جما کر نہر سوئز کو محفوظ کر لے سو وہ کام بھی بنتا نظر نہیں آتا۔ فلسطین کے معاملے میں مصریوں نے برطانوی سیاست کو سہارا دینے سے صاف انکار کر دیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ عرب کا عرب سے اور مسلمانوں کا مسلمانوں سے ایسا تعلق ہو گیا ہے جو آسانی سے توڑا نہیں جا سکتا اسکا ایک سبب تو مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی بیداری ہے۔ جسے سیاست اب تدبیر یا بندوق کی گولیوں سے دور نہیں کر سکتی۔ اور دوسرا خطرناک سبب یہ ہے کہ غیر قوموں نے یہاں کے معاملات سے دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ پہلے تو برطانیہ کی دولت ایسی تھی کہ غیر قوموں سے مدد مانگنا یا کسی غیر قوم کا مدد کرنا ناممکن سا تھا لیکن اب جب سے برطانیہ نے جرمن اور اٹلی کے ساتھ توپ کے بجائے زبان سے بات کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے برطانیہ کی ساکھ نہ جانے کیوں جاتی رہی ہے۔

کم از کم سننے میں تو یہی آیا ہے کہ جب سے حبش میں انگریزوں کی مرضی کے خلاف ہو جانے سے پھر ہسپانیہ میں اٹلی کی مداخلت اور اس سال مسٹر ایڈن کا استعفےٰ اور جیسا کہ چند غیر ذمہ دار لوگ بغیر سوچے سمجھے کہتے ہیں۔ برطانیہ کی اٹلی سے دوستی کی خواہش کرنے پر فلسطین کے عربوں کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ ویسے ہی سیونج کانفرنس نے عربوں کی بغاوت میں نئی جان ڈال دی ہے اس وقت چند بڑے شہروں کے سوا ہر جگہ باغیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے اور بڑے بڑے شہروں میں بھی فوج نہ ہو تو برطانوی قبضے کا نام و نشان بھی نہ رہے۔ عربوں نے ملک کو آزاد کرنے کے لئے جو کمیٹی قائم کی ہے اس کے صدر نے مسٹر وائزمان کو ایک تار دیا تھا کہ آپ نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ مشرق میں رہنے والے یہودیوں کے سر پر ایسی آفت لائیگا جس کی مثال آپ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ عرب یہودیوں کو فلسطین پر نہ قبضہ کرنے دیں گے اور نہ آبادی کی اکثریت بننے دیں گے چاہے اس کوشش میں ہر ایک عرب ہلاک ہو جائے واقعی عرب اس وقت اپنی کامیابیوں کی وجہ سے اتنے شوخ اور گستاخ ہو گئے ہیں کہ وہ برطانوی سیاست کو زبان سے نہیں بلکہ عمل سے ایسے چیلنج دے رہے ہیں اور معلوم

ہوتا ہے کہ ان کا خیال ہے یہودیوں کی طرح اور قوموں کا بھی ٹھکنے کے بعد مزاج ٹھیک ہوتا ہے برطانوی سیاست اس غلط فہمی کو دور کرنے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ جیسے اور جگہوں پر سرکشوں کی جھونپڑیوں پر بم پھینک کر انکی گوش مالی کی جاتی ہے ویسے ہی بیت المقدس اور دوسری چھوٹی بڑی بستیوں پر انگریزی فوج سرکشی کے آثار مٹا رہی ہے انگریزی اخبار کہتے ہیں کہ یہ سخت تدبیریں اس وقت تک کے لئے اٹھا رکھنی چاہئیں تھیں جب تک ہم چپ چاپ اپنا کام نہ نکال لیتے۔ عرب اور یہودیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے بدلے میں فیس کے طور پر کچھ وصول کرتے اور یہ کام سر پھوڑ کر نہیں کیا جاتا بہر حال اب صورت یہ ہے کہ مشرقی بحر روم میں بھی انگریزی سلطنت کی بنیاد کمزور ہو رہی ہے۔ اور ہر ہٹلر کی باتوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اسے ایک افسوسناک حالت نہیں بلکہ تماشہ سمجھتے ہیں خاص اس زمانہ میں جبکہ انھیں برطانیہ کا شکر گزار ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ انھیں سڈٹین علاقے بغیر خون بہائے واپس دلوا دئے انھوں نے یہ کہا کہ فلسطین کے مسئلوں کو پیدا کر کے پھر حل کرنا انگریزوں کی قسمت میں لکھا ہے۔ جو ایک بہت بے تکی بات ہے اس سے اور کچھ نہیں تو یہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ جس دوستی کا برطانیہ سے مطالبہ کر رہے ہیں وہ خود ان کے دل میں نہیں ہے برطانیہ کے مدبر کچھ ایسے بھولے نہیں کہ وہ ایسی بات کو نہ سمجھیں اور کیا تعجب ہے کہ جب نوآبادیوں کی واپسی کا مطالبہ پیش ہو وہ ہر ہٹلر کے غصے اور اکڑ فوں کو وہی تماشہ دکھانا چاہیں اور کہیں کہ ایسا تماشہ دکھانا ہٹلر کی قسمت میں لکھا ہے۔

م۔ م

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

تنقید و تبصرہ

باغی | جاذب دہلوی صاحب کی نظمیں اکثر مختلف رسائل میں چھپتی رہتی ہیں اور ایک آدھ نظم کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ اب ایوان ادب نے اُن کا نیا کلام "باغی" کے نام سے چھوٹی تقطیع پر شائع کیا ہے جس میں نظموں کو چار پانچ مختلف عنوانات کے تحت میں یکجا کیا گیا ہے۔

شاعر ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی کشمکش سے شدید طور پر متاثر معلوم ہوتا ہے اور اس اعتبار سے اُن کی نظموں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ اُن کے احساسات اور جذبات کی صحیح معنی میں آئینہ دار ہیں کچھ بے جا نہ ہوگا۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کی خواہش ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کہن کو شکست کر دیا جائے، قصر استبداد کی بنیادیں ڈھا دی جائیں اور فرقہ دارانہ جذبات کو یکسر ختم کر کے ہندوستان کی جملہ اقوام ایک متحدہ قوم بن کر رہیں۔ مذہب سے بھی شاعر بیزار معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُن کی جو نظمیں "مذہب اور اسکے اجارہ دار" کے تحت میں جمع کی گئی ہیں ان سب سے یہی پتہ چلتا ہے۔ اکثر جگہ مولویوں اور خدا کے خلاف اتنے تند لہجہ میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے کہ نظم کی متانت کا خون ہو کر رہ گیا ہے۔ مثلاً اپنی نظم "ایک مذہبی مناظرہ" میں لکھتے ہیں:۔

ہیں دونوں آخر پرانے پٹھے قلم اُٹھاتے ہیں تیرے سی   یہ اپنا پہلو بچا بچا کر وہ اپنا پہلو بدل بدل کر

پٹھے کا لفظ کس قدر سوقیانہ ہے اسی طرح ایک دوسری نظم "مولوی" میں قرآن اور خدا کے ساتھ جو تمسخر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:۔

ہیں گورنمنٹ کے مدح خواں ابھی کانگرس کے تھے ہم زباں
ہے "کلام پاک" کی ڈگڈگی یہ خدا کو جس پہ نچاتے ہیں

بعض جگہ فنی اسقام بھی نظر آ جاتے ہیں مثلاً ایک نظم "بھگتی" میں آپ نے خبط اور ضبط کا قافیہ وقت اور بھگت باندھا ہے جو ناجائز ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر مجموعی طور پر کتاب اچھی ہے،

طباعت و کتابت بھی دیدہ زیب ہے۔ (ح۔ ی)

سراج سخن | مرتبہ جناب عبدالقادر صاحب سروری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ چار مینار۔ حیدرآباد دکن۔ تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۱۲؍ طباعت و کتابت خوشنما۔

یہ کتاب سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی چوتھی کتاب ہے۔ اور اس میں سید شاہ سراج الدین اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مرتب جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد ہیں۔ کتاب کے شروع میں سروری صاحب نے سراج کے بارے میں نہایت تحقیق اور کاوش سے ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ "دکن کی اردو شاعری" کے عنوان سے ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے گذشتہ چار سو سال کے دکن کے اردو شاعروں کو سات دوروں میں تقسیم کر کے ان کے کلام کی خصوصیات پر ایک مختصر تبصرہ تحریر فرمایا ہے۔ جسے دیباچہ عمومی کے نام سے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

سراج اس تقسیم کے اعتبار سے چوتھے دور کے شاعر ہیں۔ ان کا زمانہ ایک عبوری زمانہ تھا جس میں قدیم رنگ کی شاعری ختم ہو رہی تھی اور نئے طرز کا آغاز ہو رہا تھا۔ میر تقی میرؔ، سراج سے دس سال چھوٹے تھے۔ جس وقت سراج کا دیوان مرتب ہوا ان کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ سروری صاحب اپنے مقدمہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "سراج اور میر تقی میر کی طبیعت میں ایک طرح کی مناسبت تھی، اور دونوں کی شاعری کا نمایاں وصف سوز و گداز ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میرؔ کے ہاں بعض مضامین اس طرح بندھے ہیں جس طرح سراج کے کلام میں باندھے گئے تھے۔ بعض جگہ تو مصرعوں کا توارد سا ہو گیا ہے"۔ اس سلسلہ میں سروری صاحب نے مندرجہ ذیل دو دو شعر دونوں کے پیش کئے ہیں:-

سراج	میر
خندہ دنداں نما لازم نہیں اے سحر حسن	مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشک آب دار
نہیں تو آب جاتی رہیگی ان میں موتی کی آب	مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

جس پھول نے ترے سیں کیا دعوی بہار | دعوی کیا تھا گل نے ترے رخ سو باغ میں
دہ پائمال آفت باد خزاں ہوا | سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

ان اشعار سے سراج کے کلام کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری دو سو سال قبل کی اُردو شاعری اور زبان کا نمونہ ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ کے ابتدائی ادوار کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہو گی۔ (م ۔ ع)

نورِ مشرق | از جناب مہرلال صاحب ضیا سونی ایم۔ اے فتح آبادی ناشر جیوتی پرشاد گپتا، گپتا پرنٹنگ ورکس اسپلینڈ روڈ۔ دہلی۔ تقطیع چھوٹی صفحات ۱۲۶ مجلد طباعت و کتابت خوشنما۔ قیمت عہ۔

یہ ضیا صاحب کی نظموں کا مجموعہ ہے جس کا تعارف جوش صاحب ملیح آبادی آزاد صاحب انصاری اور منتظر صاحب صدیقی اکبرآبادی نے فرمایا ہے۔ جوش صاحب نے اپنے تعارف میں تحریر فرمایا ہے کہ "ان کا کلام غزل گوئی کی غیر فطری سخن گی سے قطعاً پاک ہوتا ہے۔ .... ضیا صاحب نوجوان ہیں اور نومشق .... لیکن ان کی نظموں کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ اگر ان کی مشق اسی طرح جادہ صحیح پر گامزن رہی ...... تو وہ ہندوستان کے ممتاز شعرا میں سے شمار ہونے لگیں گے۔" آزاد صاحب تحریر فرماتے ہیں " یہ مجموعہ دور حاضر کی ترقی یافتہ شاعری کا ایک دلچسپ اور نظر نواز مجموعہ ہے ...... اگرچہ ابھی آپ کی شاعری پورے بلوغ کو نہیں پہنچی " ان بالغ نظر شعرا کی تنقید کے بعد کتاب کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

کتاب کے تین حصے کئے گئے ہیں۔ نظمیں، گیت اور سانیٹ (Sonnet) نظموں کے چند عنوانات طلوع سحر، انقلاب بہار، بوندوں کا ساز، خوبصورت ارادے وغیرہ ہیں۔ گیت کے عنوانات برہن کا گیت، من کا گیت، پی بن وغیرہ ہیں۔ سانیٹ ' اپنی سیرا سے، یاد، دھوکا وغیرہ ہیں نئے رنگ کی شاعری سے جن لوگوں کو لگاؤ ہے ان کے لئے یہ کتاب دلچسپ ہو گی۔ (م ۔ ع)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۶	دسمبر ۱۹۳۸ء	جلد ۳۰

فہرست مضامین

سالگرہ نمبر

تاسیس کی تقریب کے سلسلہ میں ہر سال جامعہ میں ایک جلسہ ۲۹ اکتوبر کو ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی جب یہ جلسہ حسب معمول منعقد کیا گیا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس موقع پر رسالہ جامعہ کا سالگرہ نمبر بھی نکلا کرے تو اچھا ہو اور ارادہ کیا گیا کہ اس کام کو اسی سال سے شروع بھی کر دیا جائے تاکہ روایت قائم ہو جائے اور آئندہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

اس ارادہ کو اچھی طرح پورا کرنے کے لئے جس بڑے پیمانہ کی تیاری کی ضرورت تھی وہ تو اس تھوڑے سے وقت میں ممکن نہیں تھی۔ بہرحال کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں گذشتہ پون سو سال کے عرصہ میں جو مختلف تعلیمی تحریکیں چلتی رہی ہیں ان کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ اس مجموعی تعلیمی تحریک میں جامعہ کی جو حیثیت یا اس کا جو درجہ ہے اس پر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

اس قسم کا جائزہ اگر ہر سال سالگرہ کے موقع پر لیا جائے گا تو نہ صرف ان حضرات کو جنھیں ملک کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی ہے اور جو جامعہ کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں موقع ملے گا کہ وہ زیادہ بہتر طریقہ پر اس کی کارگذاریوں اور خامیوں کا اندازہ کر سکیں بلکہ خود وہ لوگ بھی جو جامعہ کے تعلیمی کاموں میں پوری طرح منہمک ہیں اور اپنے محدود دائرہ عمل کو اپنی کائنات سمجھتے ہیں اپنے موجودہ کام کو زیادہ وسیع پس منظر میں دیکھ سکیں گے اور تناسب کے احساس کو قائم رکھ سکیں گے۔

اس سال کے تاسیسی جلسہ کی یہ ایک امتیازی خصوصیت تھی کہ جامعہ کے ہر شعبہ کے نگراں اور منتظم کو سال بھر کی کارگذاری کی روداد جلسہ کے سامنے پیش کرنا پڑی تھی۔ ان رپورٹوں کے ضروری اقتباسات غالباً "حلقہ ہمدردان جامعہ" کی طرف سے رسالہ "ہمدرد جامعہ" میں شائع کئے جائیں گے۔ ہمارے ناظرین کو

ان تفصیلات سے زیادہ دلچسپی نہ ہوگی۔ لیکن پروفیسر محمد مجیب صاحب نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی عدم موجودگی میں جو افتتاحی خطبہ پڑھ کر سنایا تھا وہ البتہ ہم اس رسالہ میں شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے "جامعہ ملیہ کیا ہے" کے عنوان سے جامعہ کے مقاصد اور کارناموں کی جو توضیح کی ہے وہ بھی اس میں شامل کر دی گئی ہے۔

دوسری تعلیمی تحریکوں کے سلسلہ میں دیو بند، علی گڑھ، ندوہ اور جامعہ عثمانیہ کے مقاصد اور علمی سرگرمیوں کا بھی کچھ حال درج کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس رسالہ کے مجموعی مطالعہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی جدید تعلیمی تحریکوں کا ایک مختصر خاکہ ذہن میں قائم ہو سکے گا۔ آئندہ سال خدا نے چاہا تو زیادہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیمی مسائل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

جامعہ ملیہ کیا ہے؟

(از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ)

جامعہ ملیہ اسلامیہ | یورپ اور امریکہ میں جہاں تعلیم کا ایک بندھا ٹکا نظام موجود ہے وہاں یہ بھی ہے کہ بعض لوگ نئے نئے تعلیمی تجربے کرتے ہیں۔ پرانے نظام کی خرابیوں اور کمزوریوں کی چھان بین کرتے ہیں اور ان کے سدھار نے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ سوسائٹی اور اس کی نائب یعنی حکومت ان لوگوں کی مدد کرتی ہے اور ان کی بتائی ہوئی تجویزوں پر غور کرتی ہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ پرانی تعلیم کے سربراہ کار ان تجویزوں کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ سب کہیں انسان کا قاعدہ ہے کہ اپنی غلطی کو بڑی مشکل سے مانتا ہے اور ایک ڈگر کو چھوڑ کر دوسری راہ پر بڑی دیر میں چلتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی پہلے تو لوگ نئے مدرسوں پر ہنستے ہیں مگر جب عام رائے انھیں پسند کرنے لگتی ہے تو پھر پرانے مدرسوں کو بھی آہستہ آہستہ اپنا طریقہ بدلنا پڑتا ہے۔ اب رہا ہمارا ہندوستان سو یہ تو یورپ سے کہیں بڑھ کر لکیر کا فقیر ہے۔ یہاں تو ہر نئی چیز کفر اور بغاوت سمجھی جاتی ہے۔ اب سے سوا سو سال پہلے جب انگریزی تعلیم رائج کی گئی تو ایک مدت تک اس کی مخالفت ہوتی رہی مگر اب وہی تعلیم دھرم بن گئی ہے اور اس سے ایک قدم ہٹنا بھی مہا پاپ ہو گیا ہے اسی لئے یہاں لوگوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ نئے تعلیمی تجربے کریں۔ پھر بھی تھوڑے دنوں سے کچھ سر پھرے لوگوں نے اس قسم کے تجربے شروع کئے ہیں جن میں سے ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ہے۔ آج میں آپ کو جامعہ ملیہ کا کچھ حال بتانا چاہتا ہوں۔ پہلے یہ سن لیجئے کہ ہمارے ملک کی موجودہ تعلیم میں وہ کونسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس نئے مدرسہ کی ضرورت سمجھی گئی۔ پھر یہ سنئے گا کہ یہ مدرسہ کیا ہے، کیا کرنا چاہتا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

یہ مشہور اور سچی بات ہے کہ موجودہ انگریزی تعلیم حکومت نے اپنی انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شروع کی تھی۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ دفتروں میں کام کرنے کے لئے انگریزی پڑھے

ہوئے لوگ مل جائیں۔ آگے چل کر اس تعلیم کا معیار بڑھ گیا۔ اور ہر قسم کے مفید علوم پڑھائے جانے لگے مگر کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ ملکی اور قومی ضرورتوں کا لحاظ رکھ کر تعلیم کا ایسا نصاب بنایا جائے جو ہماری زندگی اور ہماری تہذیب کے مناسب ہو۔ قومی تعلیم کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں انسانی تہذیب کی بہترین صفات اپنے خاص قومی رنگ میں پیدا کرے اور دوسرا کام یہ ہے کہ انھیں سوسائٹی کی خدمت کے لئے ہر قسم کے مفید پیشے سکھائے اور روزی کمانے کے قابل بنائے۔ پہلے کام کی طرف تو کبھی توجہ کی ہی نہیں گئی اور دوسرے کی طرف بھی بس اتنی کہ طالب علم نوکری کے لئے تیار کئے جائیں۔ غرض ہماری تعلیم تہذیبی تعلیم نہیں بلکہ صرف پیشے کی تعلیم ہے اور وہ بھی صرف ایک پیشے یعنی نوکری کی اس لئے ظاہر ہے کہ ادھوری اور چھچھوری تعلیم ہے۔ تعلیم اور تربیت کے طریقہ کو دیکھئے تو وہ بھی پرانا نکما طریقہ ہے جس میں استاد شاگردوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں سکھاتا بلکہ انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ تعلیم اس طرح ہوتی ہے کہ استاد کتاب کا سبق پڑھوا کر خود عبارت کا مطلب سمجھا دیتا ہے اور تربیت اس طرح کہ سزا یا تنبیہ کے ڈر سے بچہ شرارت سے باز رکھا جاتا ہے یعنی اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ استاد اس سے زیادہ شریر اور طاقتور ہے اور شرارت کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو طاقتور ہو۔ تعلیم کا سارا بوجھ حافظے پر پڑتا ہے جس سے ذہن میں سوچنے کی قوت نہیں پیدا ہوتی اور تربیت کا دار و مدار خوف پر ہے جس سے بچے ڈرپوک اور دبو بن جاتے ہیں اور سزا سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔ آزادی اور ذمہ داری کا احساس ان میں پیدا نہیں ہونے پاتا۔ سب سے بڑی خرابی موجودہ تعلیم کی یہ ہے کہ تعلیم کا ذریعہ اپنی زبان نہیں بلکہ غیر زبان ہے۔ اس ذہنی غلامی کی مثال انسانوں کی دنیا میں صرف ہندوستان میں اور حیوانوں کی دنیا میں صرف طوطے میں نظر آتی ہے۔

اس تعلیم نے سو برس میں ملک کی جو حالت کر دی ہے اس سے ممکن ہے کہ کچھ لوگ مطمئن ہوں مگر ملک کے چند بڑے رہنما اس قدر مایوس ہوئے کہ انھوں نے ایک نیا تجربہ مسلمانوں کو قومی تعلیم دینے کا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم جامعہ کو علی گڈھ سے دلی لے آئے۔

جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی آزادی اور ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت، خلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور معین کرنے کے لئے وہ دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا اور سنبھلنا، غلطی کرنا اور سیکھنا ہی انسانی ترقی کا راز ہے۔

جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھکر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں، تعلیم دے۔ علم محض روزی کے خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم کو زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لئے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ

میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقہ سے روزی کما سکیں مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا، اجرت کو خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے یعنی سوسائٹی میں اپنے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈھ لے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو۔ اور اسی کے ساتھ اتنا کما سکتا ہو کہ اس کی اور اس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

جامعہ کی عام تعلیم کی تین منزلیں ہیں۔ ابتدائی منزل چھ سال کی، ثانوی منزل چھ سال کی اور اعلیٰ یا سندی منزل دو سال کی۔ چار سال کی ثانوی تعلیم کے بعد جامعہ جونیر کا اور پھر دو سال کے بعد جامعہ سینیر کا امتحان ہوتا ہے۔ پہلا میٹریکولیشن کے اور دوسرا انٹرمیڈیٹ کے مساوی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد بی۔ اے کا امتحان ہوتا ہے اور کامیاب امیدواروں کو سند دی جاتی ہے۔ ابتدائی منزل کا نصاب جو کئی سال کے تجربے کے بعد بنایا گیا ہے شائع ہو چکا ہے اور ثانوی اور اعلیٰ منزل کا اب شائع ہونے والا ہے۔ یہاں نصاب کی تفصیل کی گنجائش نہیں مگر اس کے دیکھنے سے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے اہم اجزا تین ہیں: مذہب کی تعلیم، فطرت کا مطالعہ، اور انسانی زندگی کا مطالعہ۔ ایمان اور عقیدے عقل و فہم کی تربیت کے ساتھ ادب اور مصوری کے ذریعہ سے تخیل اور جذبات کی تربیت اور دستکاری کے ذریعہ سے ہاتھ اور نظر کی تربیت کی کوشش کی جاتی ہے۔ عملی اخلاقی تربیت اور جسمانی تربیت میں مدرسہ کے استاد، بورڈنگ ہاؤس کے اتالیق اور لڑکوں کے سرپرست مل کر کام کرتے ہیں۔ مدرسہ کی طرف سے لڑکوں کی تعلیم، صحت اور اخلاقی حالت کی رپورٹ ہر مہینے لڑکوں کے سرپرستوں کو بھیجی جاتی ہے اور خط و کتابت کے ذریعہ ان سے مشورہ ہوتا رہتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کنڈر گارٹن کلاس سے شروع ہوتی ہے جس میں مفید کھیلوں اور شغلوں کو حواس اور ذہن کی تربیت بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پروجکٹ میتھڈ یعنی منصوبی طریقے سے کام لیا جاتا ہے اور ثانوی منزل میں اسائن منٹ میتھڈ یعنی انفرادی طریقہ کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر تحریر میں تعلیم کے ان طریقوں کو سمجھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ تعلیم کے جدید

ترین طریقے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ نہ تو استاد علم کو زبردستی شاگردوں کے حلق میں ٹھونسے اور نہ گھول کر پلائے، بلکہ ان کے دل میں علم کی سچی بھوک پیدا کردے اور ان کے لئے غذا مہیا رکھے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا پیٹ بھر سکیں۔ استاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ طالب علم کو جاننے کا، جانے ہوئے کو سمجھنے کا اور سمجھے ہوئے کو برتنے کا شوق ہو جائے۔ اسی طرح جامعہ کی تربیت کا اصول یہ ہے کہ لڑکوں میں اخلاقی آزادی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک برادری کا رکن سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت کا بوجھ اٹھائیں تاکہ انھیں خود ہی قانون اور قاعدے کی ضرورت اور اس کی پابندی کی مصلحت محسوس ہو۔ اور استاد کو جبر کرنا یا سزا دینا نہ پڑے چنانچہ بورڈنگ ہاؤس کا سارا انتظام متعدد مانیٹروں کے سپرد ہے جنھیں طلبہ اپنی جماعت میں سے منتخب کرتے ہیں۔ یہ مانیٹر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد بدلے جاتے ہیں اور قریب قریب سب لڑکوں کو کسی نہ کسی حیثیت سے ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ رہنے سہنے کے طرز میں انتہائی سادگی اور کفایت جو صحت، صفائی اور سلیقے کے ساتھ نبھ سکے برتی جاتی ہے۔ جو لوگ جامعہ کے بورڈروں کی صاف ستھری زندگی دیکھتے ہیں اور پھر انھیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خرچ اور مدرسوں کے مقابلہ میں کتنا کم ہے تو حیران رہ جاتے ہیں۔ غریب ہندوستانیوں کو کم خرچ میں اچھی تعلیم دینے کا سوال ہمارے ملک کے تعلیمی مسئلے کا نچوڑ ہے مگر افسوس ہے کہ نہ ہمارا محکمہ تعلیم اس کی طرف توجہ کرتا ہے اور نہ وہ لال بجھکڑ جو ہماری تعلیم کی پہیلی کو بوجھنے کے لئے باہر سے بلائے جاتے ہیں۔ جامعہ ملیہ نے اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

جامعہ ملیہ میں اول سے آخر تک تعلیم کا ذریعہ سوائے انگریزی کے اور سب مضامین میں اُردو زبان ہے۔ غیر زبان میں تعلیم دینا طلبہ کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے ان کی دماغی قوتوں کا اور ان کے وقت کا اتنا خون ہوتا ہے کہ کم سے کم دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب حامیان تعلیم اور محبان وطن کو جامعہ ملیہ کا ساتھ دینا چاہئے۔

علم کی عام اشاعت کے لئے جامعہ نے اُردو اکاڈمی اور دارالاشاعت مکتبہ جامعہ کے نام سے

قائم کیا ہے جس نے ملک میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے اور ایک مطبع بھی بڑے پیمانے پر کھولا ہے جس کا کام بہت پسند کیا جاتا ہے۔

عام تعلیم کے بعد جامعہ اپنے طلبہ کے لئے مفید پیشوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے صرف اسکول کی تعلیم پائی ہے۔ نجاری جلد سازی ڈیری فارمنگ اور عمارتی صنعتوں یعنی صابن سازی وغیرہ سکھائی جاتی اور کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے تجارت اور اخبار نویسی کے مدرسے ہوں گے مگر جو خاص کام جامعہ اپنے سند یافتہ طالبعلموں سے لینا چاہتی ہے یہ ہے کہ وہ معلمی کی تربیت حاصل کر کے تعلیمی مجاہدوں کی حیثیت سے ملک میں ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور اشاعت کی کوشش کریں۔ ان سب کاموں کو شروع کرنے کے لئے دو چیزوں کا انتظار ہے۔ ایک تو سرمائے کی فراہمی کا اور دوسرے جامعہ کی عمارت کی تیاری کا جو دہلی کے قریب جامعہ نگر اوکھلے میں بن رہی ہے۔ اس عمارت کا ایک حصہ بن کر تیار ہو گیا ہے، اور جامعہ کا اقامتی ابتدائی مدرسہ اس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ باقی عمارت بھی خدا نے چاہا تو بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔

جامعہ کے تخیل اور اسکی موجودہ حالت کا یہ مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا خرچ کیوں کر چلتا ہے۔ کئی سال سے جامعہ کو بھوپال اور حیدرآباد سے معقول امداد ملتی ہے اور حال میں دلی کی میونسپلٹی نے بھی پانسو روپیہ ماہوار کی گرانٹ منظور کی ہے۔ مگر جامعہ کے اخراجات کا بہت بڑا حصہ ان چندوں سے پورا ہوتا ہے۔ جو حلقہ ہمدردان جامعہ کے ممبر عطا کرتے ہیں۔ اس حلقہ میں اب تک پانچ ہزار حامیان تعلیم شریک ہو چکے ہیں اور اس کے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہی حضرات جو اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے دیتے ہیں، جامعہ کے حقیقی سرپرست ہیں مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی عام ہمدردی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک وقوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانون قدرت اسے زندہ رکھے گا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکے گی۔

تقریب تاسیس

(ذیل میں وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو پروفیسر محمد مجیب صاحب نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تاسیس کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمائی تھی۔)

جامعہ نے جہاں کئی اور باتوں میں عام روش اور عام وضع کو چھوڑا ہے وہاں تاسیس کی تقریب منانے میں بھی انوکھا پن اختیار کیا ہے، ایسا پن کہ اس پر رعب اور شان کا فریب کھائے ہوئے لوگ مسکراتے ہیں، قاعدے اور ضابطے کے سیدھے رستے پر چلنے والے حیران ہوتے ہیں یا الجھتے ہیں، مگر سادگی اور خلوص، ایمانداری اور انکسار کے قدرداں کو اس میں کچھ نہ کچھ دل میں رکھنے اور ساتھ لیجانے کو ضرور نظر آجاتا ہے۔ میں اُن دنوں میں جامعہ میں نہ تھا جب اُسے سرکاری یونیورسٹیوں کے ڈھرے پر چلانے اور عام رواج کو برتنے کی کسی قدر کوشش کی جاتی تھی، جب اس کی فکر ہوتی تھی کہ تاسیس کے دن ملک کا کوئی آبرو دار شخص آکر تقریر کرے، سندیں تقسیم کرے اور سند کے ساتھ طالب علموں کو ایسی نصیحتیں بھی کرے جن پر عمل کئے بغیر تعلیم کی سند ایک ڈھکوسلا سمجھی جاتی ہے۔ جس سال میں آیا، تاسیس کے دن شکایت اور تنقید نے جشن منایا تھا، پھر کچھ دنوں یہ خیال رہا کہ اس تقریب کو جامعہ کی دولت اور اثر کا نہیں تو جامعہ کی ملنساری، مہمان نوازی اور ادبی ذوق کے اظہار کا ایک موقع بنانا چاہئے۔ لیکن تقریب کی صورت ہنگامے کی ہوتی یا خاموشی کی، محفل عام ہوتی یا خاص جامعہ والوں کی، ہم نے خدمت کا جو ارادہ کیا تھا اسے ہم کسی نئے پہلو سے دیکھتے اور تازہ شوق کے ساتھ دل سے لگاتے ضرور تھے۔ ہم نے اس دنیا کو جو خرچ اور آمدنی کو برابر رکھنا چاہتی ہے، اور حوصلے کو مالی استطاعت کی قینچی سے کترتے رہنا کامیابی کا راز سمجھتی ہے کبھی خوش کرنے کی فکر نہیں کی، ہم نے اپنی کارگزاری کو کبھی اعداد و شمار کے جوکھے میں بند نہیں کیا، ہم کبھی خود ایسے مطمئن نہ تھے کہ دوسروں کو مطمئن کریں، ہم نے اپنا کام خود ہی اپنے سر لیا تھا، ہم کس سے کہتے کہ دیکھئے جو کام ہمارے سپرد ہے وہ انجام پا رہا ہے،

جو روپیہ ہمیں ملتا ہے وہ حسب تخمینہ خرچ ہوا ہے۔ ہم تو بس یہ کرتے رہے کہ جو رستہ ہم نے طے کرلیا تھا اس کی لمبائی کو ناپیں، ہم نے جو ترقی کی تھی اس کا اندازہ کریں، اور وہ بھی صرف اس لئے کہ زیادہ امید اور حوصلے کے ساتھ آگے قدم بڑھائیں۔ ہمارے لئے مناسب بھی یہی تھا۔ ہماری ترقی کے معنی یہ تھے کہ جو مقصد ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا اسے خود زیادہ صاف دیکھ سکیں، جو ارادے اپنے دلوں میں رکھتے تھے انھیں زیادہ مضبوط پائیں، جو کام ہم کر رہے تھے اس سے اپنے آئندہ کاموں کو زیادہ ممکن اور قریب ہوتے دیکھیں۔ ہماری کارگذاری کا اگر ایک پہلو یہ تھا کہ ہم نے ایک معمول کی استقلال کے ساتھ پابندی کی اور دوسرا اور ہمارے دلوں کو زیادہ عزیز پہلو یہ تھا کہ ہم نے ایک نئے اور بہتر معمول کی طرح ڈالی، ہم نے اگر کچھ بنایا تھا تو اسے مٹا کر بہتر چیز بنانے کی دھن میں بھی لگے تھے۔ اور سب سے بڑی بات، جس میں سمجھئے کہ جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگذاری ہمارے دلوں کی کیفیت، ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کی جاسکتی، جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے، ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے، کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے، بہتے چشموں کا ایک جال سا ہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔

چشموں کو بہلانے کے لئے ایک بڑا چشمہ بھی چاہئے کہ جس کی روانی زمین کی ناہمواری کو اپنے بلون میں لیتی ہزاروں رکاوٹوں میں سے رستہ نکالتی چلی جائے۔ چشموں کا بہاؤ اسی کے زور سے ہوتا ہے، ان کے نغمے اسی کے گیت سے بنتے ہیں۔ یہ روانی، یہ زور، یہ نغمہ سرائی اسی کو نصیب ہوتی ہے کہ جسے خدا دے۔ اپنا کام وہی کر سکتا ہے، اپنی بات وہی کہہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی سال سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جامعہ کی تاسیس کے دن جامعہ کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہمارے شیخ الجامعہ کی زبانی بیان ہوا اور انھوں نے وہی کہا جو ان کے دل میں تھا۔ ان کی شخصیت نے ان کی باتوں کو ایک آئینہ بنا دیا کہ جس میں ہم اپنی اور جامعہ کی صورت دیکھتے تھے۔ مگر وہ صورت نہیں کہ جس کی تصویر کاغذ پر اتاری جاسکے، بلکہ وہ صورت جس کے رنگ تاریخ، مذہب، انسانی شخصیت کے رنگوں سے مل کر زندگی

پر اسی طرح چھا جاتے ہیں جیسے آسمان پر افق کے رنگ۔ جامعہ کی تاسیس کی تقریب سچ پوچھیے تو انھیں رنگوں کا پھوٹنا اور پھیلنا اور ہمارے کاروبار کا ان کی روشنی میں چمک اٹھنا تھا۔

اس سال ہم اپنی تاسیس اس شان سے منا نہیں سکتے۔ لیکن ہم اپنے بھائیوں کو اپنے کام کے پھیلاؤ کو دیکھا سکتے ہیں، ہمارے جو مختلف ادارے ہیں ان کے مقاصد کو جوڑ کر جامعہ کے بڑے مقصد کو آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ہمارے شعبوں کا مختصر سا حال آپ ان کارکنوں کی زبانی سنیں گے جس کے وہ اس وقت سپرد ہیں، میں آپ کو صرف اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ کام جسے ہم مشق اور تجربہ کہتے تھے اب آہستہ آہستہ نظیر اور سند بن رہا ہے، ہم کو اب یہ ذمہ داری پوری کرنا ہوگی کہ تعلیم کے جن طریقوں کو ہم آزما چکے ہیں ان میں مہارت پیدا کریں، تاکہ آئندہ ترقی کی بنیاد مضبوط رہے، ہمارا ہر کام اب اس سہولت اور صفائی سے ہونا چاہیے جو پختہ ارادے اور کامیاب شوق کی سچی علامت ہے۔ اب ہمارے لئے لازمی ہوگیا ہے کہ تفصیلی کاموں میں آپ اپنے چارہ ساز بنیں، ایک مرکزی قوت حاصل کرنے کے بجائے اپنے جوش اور شوق سے مرکز کو تقویت پہنچائیں اور اس اشتراک عمل کو قائم رکھتے ہوئے جو ہماری چھوٹی سی جماعت کا مایہ ناز ہے اپنے مخصوص کام کو جامعہ کے مجموعی کام اور مجموعی مقصد سے اس طرح ہم آہنگ کر دیں کہ جو کچھ ہونا چاہیے وہ آپ ہی ہو رہا ہے۔ ہمارا کام اب تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے، اس اعتبار سے نہیں کہ افراد کے ذمہ زیادہ کام ہو گیا ہے یا شعبوں کی تعداد زیادہ ہوتی جا رہی ہے بلکہ اس سبب سے کہ ہندوستان کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی سے وہ تعلق جو پہلے ہمارے دل اور ارادے تک محدود تھا اب ایک نیا روپ لے رہا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنے اندرونی کام کی طرف سے پورا اطمینان ہو، تاکہ ہم وہ مطالبے پورے کر سکیں جو ہماری قوم اس وقت ہم سے کر رہی ہے، اور جنھیں پورا کئے بغیر جامعہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ نہیں سکتی۔

آپ جانتے ہیں کہ عام جبری تعلیم کی ایک تجویز جامعہ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے جسے ہمارے شیخ الجامعہ نے تیار کیا اور جسے کئی صوبوں کی حکومتیں ان کے مشورے سے اپنی بساط اور ذہنیت کے مطابق عمل میں لانے والی ہیں۔ عام جبری تعلیم کے لئے اصول اور نصاب تجویز کرنا ایسا کام نہ تھا کہ جس سے

انکار کیا جائے، خصوصاً جب اس کی امید تھی کہ اس تجویز میں تعلیم کے بہترین طریقے پیش کئے جاسکیں گے اور گاندھی جی اپنی شخصیت کے پورے زور اور اثر کو اسے مقبول اور رائج کرنے میں صرف کریں گے۔ یہ تجویز بنیادی تعلیم کی ہے، اور خالص تعلیمی ہے، لیکن ایک طرف شخص اور مقام کی پرستش کے ایک پرانے میلان نے اسے وردھا اسکیم کا نام دیدیا ہے۔ دوسری طرف جائز بدگمانیوں اور ناز یبا خوف نے اسے اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ایک گہری تدبیر ٹھہرا کر اس کی اصل تعلیمی حیثیت کو بالکل مٹا دیا ہے۔ ایک صوبے کے وزیر تعلیم نے موقع کو غنیمت جان کر بنیادی تعلیم کی اس تجویز کو جو ہمارے شیخ الجامعہ نے مرتب کی تھی ودیا مندر کے نام سے دیہاتی اسکول قائم کرنے کی ایک تجویز سے ملادیا جو انھوں نے پہلے سے سوچ رکھی تھی، جسے تعلیم اور طریق تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا اور جس کا مقصد ہندوؤں کی مذہبیت سے فایدہ اٹھا کر اسکولوں کے لئے زمین اور عمارت حاصل کرنا تھا۔ ان تمام باتوں نے ایسی غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں کہ جنھیں دور کرنے میں ایک عرصہ لگے گا، جو شاید اسی وقت دور ہوسکیں جب اس سیاسی کشمکش اور معاشرتی اور اخلاقی مقابلے کی شدت کچھ کم ہو جو ایک مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ جب تک کہ ہندو مسلمان کی کشمکش زیادہ تر سیاسی تھی، جامعہ والے یہ کہ کر اس سے الگ رہ سکتے تھے کہ جامعہ کوئی سیاسی ادارہ نہیں، مسلمانوں کی ایک آزاد تعلیم گاہ ہے، اسے سیاسی جھگڑوں سے مطلب نہیں لیکن اس فریق سے اسے ہمدردی ضرور ہوگی جو ہندوستان کو برطانیہ کے قبضے سے چھڑانے کی جدوجہد کرے اور قوم میں آزادی اور خودداری کا چرچا کرے۔ اب مگر یہ کشمکش تہذیبی اور دینی ہوگئی ہے، یعنی اس کا میدان وہ خاص سرزمین ہے کہ جس میں جامعہ نے اپنا گھر بنایا ہے اور کاروبار کرتی ہے اور ہم بنیادی تعلیم کی تجویز اور اسے آزمانے اور رائج کرنے کی کوششوں کی بدولت اس ضد اور تعصب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں جو مسلمانوں کو ہندوؤں اور کانگرس سے پہلے بھی تھا مگر اب بہت بڑھ رہا ہے۔ ضد اور تعصب کی اس آگ کو بھڑکانے اور پھیلانے کے لئے اتنا ایندھن فراہم ہوتا رہتا ہے کہ وہ ہمارے بجھائے بجھ نہیں سکتی، اور اس کی لپیٹ سے بچنے کے لئے کوئی گوشۂ عافیت تلاش کرلینا جامعہ کے بنیادی مقاصد سے منہ پھیرنا ہوگا۔ لیکن اگر ہم ان غلط فہمیوں کو دور نہ کرسکے جو اس وقت پھیل رہی ہیں تو اس کا اندیشہ ہے کہ ملت اسلامی

سے ہمارا جو تعلق ہے وہ کمزور پڑ جائے گا اور جس خدمت کے لئے ہم نے جامعہ کو قائم رکھا ہے اسی کو ہم انجام نہ دے سکیں گے۔

اس وقت ہم پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارا کانگرس اور گاندھی جی سے جو اشتراک عمل ہے وہ وقت کی مصلحت اور مسلمانوں کی عام ذہنیت کو دیکھتے ہوئے ایک اسلامی ادارے کے لئے مناسب نہیں۔ لیکن تعلیمی اور تعمیری کاموں میں بھی اشتراک عمل سے پرہیز کرنا غلط اور خود ہمارے لئے مہلک ہوگا جب تک مسلمان ہندستان کی عام زندگی اور کاروبار سے اپنا حصہ کاٹ کر الگ نہ کرلیں، اور اس ربط ضبط کی گنجائش ہی نہ رہے جو پڑوس اور خدمت کا فرض اور سچے اسلامی اخلاق برتنے کا حوصلہ ہمارے لئے لازمی کر دیتا ہے۔ دوسری قسم کے اعتراضات یہ ہیں کہ وار دھا سکیم کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کو ساتھ تعلیم دینا لازمی ہوگا، انھیں ناچ گانا سکھایا جائے گا، اسلام کے صحیح اور سچے، مکمل اور بہترین مذہب ہونے کا عقیدہ چھوڑ کر ایسی رواداری برتنا سکھایا جائے گا جو ہر طرح کے عقیدوں کو ایک سطح پر لاکر ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہنے دیگا۔ یہ تمام اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے بنیادی تعلیم کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے اور جن کا تخیل کچھ ایسا بھڑک گیا ہے کہ اب وہ ہر چیز کو دیکھ کر بدکتا ہے۔ تیسرا اعتراض جو ہم پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے جامعہ میں تو دین کو تعلیم کا سنگ بنیاد بنایا ہے اور عام جبری تعلیم کی تجویز میں مذہب کو بالکل ہی نظر انداز کیا ہے۔ یہ وہ اعتراض ہے کہ جس کی طرف میں آپ کو خاص طور سے توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اصولاً یہ اعتراض غلط ہے۔ عام جبری تعلیم میں جس کا انتظام کسی حکومت کے ہاتھ میں ہو، دینی تعلیم ہوتا ہی نہ چاہیئے، ورنہ سیاسی مصلحت مذہبی عقیدوں کی صورت بگاڑ کر رکھدے گی۔ اس زمانے سے جب کہ ریاستیں تعلیم کا انتظام کرنے لگیں آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ مذہبی جماعتوں نے سرکاری اور دینی تعلیم کو الگ رکھا، اور اقلیتوں نے ہر جگہ اپنی بقا اور سلامتی کے لئے اصرار کیا کہ ان کے دین کی تعلیم خود ان کے ہاتھوں میں رہے اور ریاست کو اس کے انتظام میں ذرا بھی دخل نہ ہو۔ ہندستان کے مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ ان کی ملت کا الگ وجود قائم رہے، اور اس میں ایک اتحاد

موجودہ سیاسی تقسیم اور فرقہ بندی پر غالب آسکے، اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی دینی اور اخلاقی روایات، ان کی معاشرت اور ان کی تہذیب، جس میں اردو، فارسی اور عربی زبانیں بھی شامل ہیں، مخالف اثرات سے محفوظ رہ سکیں، تو انھیں اپنی دینی تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور بالکل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ حکومت سے کسی طرح کی رعایت یا سہولت کی درخواست کرنا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

لیکن اس طرح نصیحت کرنے سے کام نہیں بنتا۔ بنیادی تعلیم کے لئے جو عمر تجویز کی گئی ہے اسے دیکھئے تو شروع میں پورے دو سال ایسے ملتے ہیں کہ جن میں دین اور زبان کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ بنیادی تعلیم کے دوران میں بھی ہم یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں، اور ہمیں اس کا بھی انتظام کرنا چاہئے کہ بنیادی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارا طالب علموں سے مستقل تعلق رہے۔ عمر اور تعلیمی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے دینیات کا ایک مکمل نصاب بنانا اب خاص طور سے جامعہ والوں کا فرض ہو گیا ہے، اور ہم کو جلد سے جلد ایسا نصاب تیار کر کے اور تجربے سے اسے آزما کر ملت کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ بالغوں کی تعلیم بھی ایک ایسی خدمت ہے کہ جسے انجام دینے کی فکر کرنا ہمارے ذمے ہے، اور یہ کام بھی ہمیں پورے ذوق اور شوق سے شروع کر دینا چاہئے۔

جامعہ کی ابتدائی اور ثانوی مدرسے مجوزہ بنیادی تعلیم کے ادارے نہیں ہیں، ان کا نصاب بنیادی تعلیم کے نصاب سے الگ ہے اور رہے گا۔ ہمارے ذمہ اب جو کام ہے وہ یہ نہیں کہ نئی تجویز کے مطابق طریق تعلیم کو بدلیں، بلکہ نئے تعلیمی فرائض کو انجام دینے کا ارادہ کریں اور اس کی تدبیریں سوچیں۔ اس میں ہم اس تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو ہمیں جامعہ میں حاصل ہوا ہے، اور نئے کام کو پرانے کی توسیع کا سلسلہ سمجھ سکتے ہیں، جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے بھی۔ لیکن یہ نیا کام ہمارے پرانے کام سے بہت بڑا ہے، ان دونوں کی نسبت وہی ہے جو مدرسے اور زندگی کے بے پایاں میدان عمل کی۔ ہمیں جتنی مشق اور جتنے تجربے کی ضرورت تھی وہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں حاصل ہو گیا ہے، خدا کے فضل سے جامعہ کی اب ملک میں وہ حیثیت ہو گئی ہے کہ لوگ اب ہم سے پیش قدمی اور رہنمائی کی امید رکھتے ہیں،

اور اب ہمیں بغیر کسی جھجک اور خوف کے اس میدان میں قدم رکھنا چاہیئے جو ہماری ہمت اور ہمارے حوصلے کو للکار رہا ہے۔ میں نے اس وقت جو کچھ عرض کیا ہے وہ کچھ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ یہ کم و بیش جامعہ کے کارکنوں کے عام خیالات ہیں، اور میں نے یہ جانی بوجھی باتیں دہرائیں اس غرض سے ہیں کہ آج وہ خاص موقع ہے جب کہ جامعہ والوں کو اپنے خیالات کا سرمایہ جمع کرکے سوچنا چاہیئے کہ وہ اس میں سے کتنا کس کام میں لگائیں گے۔ زمانے نے جو نئی ذمہ داری ہم پر ڈالی ہے اس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، اس کے بعد اب ہماری برادری کے ہر فرد کو یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ اس میں کس طرح زیادہ سے زیادہ شرکت اور مدد کر سکتا ہے۔ ہماری پرانی ذمہ داری، کہ جامعہ کا ہر کام دیانت اور شوق کا نمونہ ہو ہم پر اس وقت بھی ہے اور خدا کرے ہم اس سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اب آئیے اپنے اپنے دل میں خدا کا نام لیں، اس کی قدرت کے سامنے اپنی مجبوری اور بےبسی کا اعتراف کریں اور ہمیں جو استعداد عطا ہوئی ہے اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کا تہیہ کرلیں۔

ادارۂ تعلیم و ترقی

جامعہ کے کارکن ایک عرصہ سے تعلیم بالغاں کے کام کو شروع کرنا چاہتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سال یکم اکتوبر سے اس کام کو شروع کر دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جو تعلیم بالغاں کے متعلق جملہ امور میں ان لوگوں کی رہنمائی اور مدد کرے گا جو نجی طور پر تعلیم بالغان کا کام کر رہے ہیں یا جن کو آئندہ اس کام کے لئے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارہ کا ناظم جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کو بنایا گیا ہے جو اپنی انتظامی اہلیت کا نہایت اچھا ثبوت "حلقہ ہمدردان جامعہ" کی تنظیم اور توسیع کے سلسلہ میں فراہم کر چکے ہیں۔ اس ادارہ کے مجوزہ مقاصد حسب ذیل ہیں۔ ابھی تک آخری طور پر منظور نہیں ہوئے ہیں اور ان میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہے:۔

۱۔ تعلیم بالغاں کے متعلق مواد فراہم کیا جائے اور مطالعہ و تحقیق کے بعد ضروری اور مفید معلومات کی اشاعت کی جائے۔

۲۔ بالغوں کی تعلیم کیلئے نصاب تعلیم تیار کیا جائے، مفید مطبوعات شایع کی جائیں اور ضروری تعلیمی سامان عام تعلیم کیلئے مہیا کیا جائے۔

۳۔ کارکن تیار کئے جائیں جو اپنے اپنے علاقوں میں تعلیم بالغاں کی تنظیم کریں۔

۴۔ قرول باغ اور اوکھلے میں تعلیم و ترقی کا تجربہ ادارہ کے زیر انتظام و نگرانی کیا جائے جو دوسری اسی طرح کی شہری اور دیہی بستیوں کے لئے نمونہ ہو۔

ان مقاصد کے پیش نظر کام کا ایک مفصل خاکہ بھی تیار کیا گیا ہے جس پر غور و خوض اور ابتدائی کارروائی ہو رہی ہے۔ فی الحال مجوزہ اسکیم یہ ہے کہ کچھ مقامی اعزازی کارکنوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے علاقہ کے ناخواندہ اور کم علم بالغوں کی ایک مقررہ کم سے کم تعداد کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنانے کا عہد کریں۔ ان کو آمادہ کرنے اور ان کو صحیح راہ بتانے کیلئے کچھ مستقل مہتمم مقرر کئے جائیں جن کے ذمہ تعلیم و ترقی کا ایک ایک حلقہ سپرد کر دیا جائے۔ ان مختلف حلقوں کے کام کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کیلئے تعلیم و ترقی کے مراکز اور ان کے نگراں مقرر کئے جائیں۔ ان تمام مرکزوں کی ہدایت اور رہنمائی کا آخری کام ادارہ کے صدر مقام سے ہوتا رہے۔ اس کے علاوہ ادارہ کی طرف سے مقررہ نصاب کی تکمیل کے لئے رسالے، کتابیں، پوسٹر، چارٹ، سلائیڈ وغیرہ شائع کئے جائیں اور کارکنوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا جائے جنہیں عملی تعلیم قرول باغ اور اوکھلے کے ان مدرسوں میں مل سکے گی جو ادارہ کے زیر انتظام ہوں گے۔

امید ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں اس کام کا کچھ ابتدائی نتیجہ ٹھوس شکل میں نظر آنے لگے گا۔

آزاد اسلامی اور قومی تعلیم

(شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم)

(ذیل میں ہم شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم و مغفور کے اس خطبہ صدارت سے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ افتتاح منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پڑھا گیا تھا)

اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے ہڈیاں گھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھکو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اُس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے ؎

شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد　　　حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی۔ کیونکہ زمانہ نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی، اور تدبر، اور ہوشمندی کے پودے نشو و نما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح و فلاح کے رستہ پر چل سکتا ہے۔

ہاں ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو، اور اغیار کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں، ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلاموں کو پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج

نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے۔ اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا' اس سے پیشتر کہ ہم ان کو اپنا استاد بناتے آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تو اس دن علما نے جمع ہوکر علم کا ماتم کیا کہ افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لئے پڑھا جائے گا۔ تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاح قومی کی اُمید رکھتے ہیں جس کی امداد اور انتظام میں بڑا قوی ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔

ہماری قوم کی سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ اُمت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بےخبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کردیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے۔ تو یوں سمجھو کہ وہ درسگاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائیگا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ اور جس کا تمامتر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

خداپرستی، مِلّت پروری، وطن دوستی

(ذیل میں ہم مولانا محمد علی کے ایک مضمون کو ہمدرد مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۲۵ء سے نقل کرتے ہیں مولانا محمد علی جامعہ کے بانیوں میں سے تھے اور اس درسگاہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ وہ اس کے اول شیخ الجامعہ تھے۔ اس لئے جامعہ کے نصب العین کی جو وضاحت انھوں نے فرمائی ہے اس کی یاد کو تازہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم اس انتخاب کے لئے جناب محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ کے ممنون ہیں ایڈیٹر)۔

کل کے "ہمدرد" میں سعید انصاری صاحب کا ایک مضمون "جامعہ ملیہ کی پانچویں سالگرہ" کے عنوان سے نکلا ہے گو لکھنے والے کی نیت نیک ہے، لیکن ان کے انداز بیان سے پڑھنے والوں میں بعض غلط فہمیاں پیدا ہونیکا اندیشہ ہے۔ جامعہ ملیہ کے مقصد کے متعلق مضمون نگار صاحب لکھتے ہیں کہ ارکان جامعہ میں ہمیشہ اختلاف و تناقض رہا جس کی وجہ سے جامعہ کا مقصد ایک "خواب پریشان" ہوگیا یہ غلط ہے جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص متعین مقصد ہے۔ اور وہ خود اس قدر جامع اور صاف ہے کہ اس کی تشریح و تاویل کی ضرورت نہیں۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست مسلمان۔ اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں رہا اس کا تعلیمی پروگرام اور اسکیم، وہ بھی بالکل متعین اور ایسی ہے جو اس مقصد کے لئے ممد اور معاون ثابت ہو۔ نباتات اور انسان، جمادات کی طرح غیر ذی روح نہیں ہیں، جن کا ارتقا خارجی ہوتا ہے۔ یعنی ترقی نہیں ہوتی محض ازدیاد یا بڑھوتری ممکن ہے۔ اور وہ اس طرح سے ایک پتھر پر دوسرا پتھر رکھدیا جائے یا دیوار کے ایک ردّے پر دوسرا ردّہ چڑھا دیا جائے۔ بلکہ خلاق عالم نے نباتات وحیوانات میں خود نمو کا انتظام فرمادیا ہے۔ اور داخلی ترقی کا سامان خود ان میں فراہم کر دیا ہے انسان کی ترقی گو تعلیم کے ذریعہ سے ہوتی ہے مگر یہ بھی خارجی چیز نہیں ہے گو افسوس ہے کہ بہت سے استادوں کا

عمل اسی طرح ہوتا ہے گویا وہ اسکول کے بچوں کو غیر ذی روح سمجھتے ہیں اور ان کو فقط سبق دینا اپنا فرض جانتے ہیں اس طرح تو یہی ہو سکتا ہے کہ مدرسوں سے نکل کر ایک طالب علم کی مثال وہی ہو کہ.

چار پائے بر و کتابے چند　　　　نہ محقق شود نہ دانشمند

یہ محض دنیوی تعلیم ہی کا حال نہیں ہے، بلکہ اخلاقی اور دینی تعلیم کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے۔ جہاں اتباع ارباب من دون اللہ کیا جائیگا، وہاں تقلید جامد کے سوا کچھ ممکن نہیں اور اسی لئے قرآن کریم نے شیخ سعدی سے بہت پہلے اسلام کی تعلیم کو جس کے معلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اور جس کا کورس کتاب اللہ تھی اور جس کا مدرسہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تھا اور جہاں تلامذہ کے عمل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ موجود تھا یہود کے احبار کی تعلیم سے ممیز کر دیا تھا اور صاف بتا دیا کہ تعلیم نہیں خارجی ازدیاد نہیں ہے، بلکہ داخلی ارتقا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝ ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۝ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ ؕ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ؕ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ؕ

جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا اور اپنے تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا کہ خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی، اس کی مثال مثل الحمار ہو جائے اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ انکو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جاوے۔ مسلمانوں کے مذہب کی مختصر اور جامع تعریف یہ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تعلیم کے دینے کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے۔

جس نے ع　　　از کلید دین درِ دنیا کشاد۔

اس لئے اسلام انسانوں کی اس تفریق کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ انکا صرف ایک حصہ دیندار ہو اور باقی دنیادار ہوں ایک حصہ تو سوائے مسجد کے پیش امام اور مدرسہ کے مولوی ہونے کے دوسرا کوئی کام نکر سکے، اور دوسرا دنیا کے دھندوں میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ دین سے بے بہرہ رہے اور یہ سمجھنے لگے کہ دین کو اس دنیا سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ وہ ایک دوسری دنیا سے علاقہ رکھتا ہے اور صرف اس دنیا کے ماہرین کے لئے مخصوص ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تباہی اسی تفریق کے باعث ہوئی ہے اور مسلمانوں ہی پر کیا موقوف ہے ہر قوم کی تباہی اس طرح ہوئی ہے اور ہوتی رہیگی حقیقتاً اسلام ہی وہ مذہب ہے جس میں کوئی "ہیرو کریسی" نہیں یعنی جس میں ماہرین دین کا ایک محدود اور متعین فرقہ جو اپنے متبعین سے بالکل ممیز اور الگ تھلگ رہنے والا ہو بالکل نہیں ہے۔ اس میں نہ کوئی "پریسٹ" یا پادری ہے، نہ مہنت اور برہمن ہے۔ اس میں نہ احبار ہیں نہ رہبان بلکہ سبھی ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور وہ رنگ "صبغۃ اللہ" ہے، ومن احسن من اللہ صبغۃ یہ تو اسلام کا نظریہ یا تھیوری ہے۔ لیکن آج کی صورت حال یا پریکٹس کو دیکھا جائے تو دنیاداروں کا امتیاز صاف نظر آتا ہے۔ علماء علوم دنیوی سے اکثر بے بہرہ ہیں اور دنیادار حقیقت دین سے ناواقف اور غافل۔ ایک جماعت سوائے مدارس میں درس دینے اور مسجدوں میں پیش امامی کرنے کے دوسرا پیشہ نہیں رکھتی اور دوسری جماعت قرآن کریم کے موٹے موٹے اصولوں سے بھی ناواقف ہے مگر روٹی کمانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ پہلے تو "جامعہ" اور "ملیہ" ہے یعنی اس میں علوم دین و دنیا دونوں پڑھائے جاتے ہیں اور وہ نہ تو دیوبند اور مدرسہ نظامیہ وغیرہ کے طرز پر صرف علوم دینی کی تعلیم دیتی ہے نہ انگریزی کالجوں کی طرح صرف علوم دنیوی پر اکتفا کرتی ہے پھر یہ جامعہ، جامعہ اسلامیہ ہے، یعنی اس کی تعلیم اسلام کی تعلیم ہے۔ گو دیگر مذاہب کے پیروؤں کے لئے اس کا دروازہ بند نہیں ہے۔ وہ اسلام کو صحیح تفسیر حیات سمجھتی ہے، اور اسلام کے اصولوں کی اس لئے تعلیم دیتی ہے کہ وہ اسرار زندگی سے انسان کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی لئے نصاب جامعہ میں سب سے خاص بات جو رکھی گئی ہے وہ یہ کہ عربی لازمی ہو اور نثر کا تمام تر کورس

قرآن کریم ہو۔ تاکہ طالب علم اس قدر عربی سیکھ لے کہ قرآن کریم اور حدیث نبوی کو کم از کم اس طرح سمجھ سکے جس طرح ایک امی عرب رسول کریم کے زمانہ میں سمجھ سکتا تھا۔ تاکہ اسے اپنی مذہبی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا دستگیر نہونا پڑے، گو علماء نے مفسرین و محدثین کی مدد سے مستفید تو بہرحال ہونا چاہیئے۔ اسلام ہمیشہ سے اگر کسی چیز میں غلو رکھتا ہے تو وہ مسئلہ توحید ہے اور ارباب من دون اللہ کی اتباع سے ہر انسان کو بچانا چاہتا ہے، لیکن اس اتباع سے بچنا اسی وقت آسان ہوسکتا ہے جبکہ لوگ کسی مذہب کے متبع اس "کتاب" یا "صحیفۂ آسمانی" کی زبان سے واقف ہوں اور اسکو سمجھ کر پڑھنے کے لئے کسی مخصوص جماعت کی دست نگر نہوں وہ شُدر اپنے مذہب سے کیا واقف ہوگا جس کے کان میں اگر وید کے ایک اشلوک کی آواز بھی آگئی تو سیسہ پگھلا کر کانوں میں ڈاٹ لگانیکا حکم ہے وہ نصرانی نصرانیت کو کس طرح سمجھ سکتے تھے جن کی مادری زبان لاطینی نہ تھی انکے پاس بائیبل صرف لاطینی ترجمہ میں تھی جن مسلمانوں کی مادری زبان عربی ہے۔ وہ پھر بھی "ارباب من دون اللہ" کے اتباع سے بہت کچھ بچ سکتے ہیں مگر ہندوستان ترکی افغانستان وغیرہ کے مسلمان جو عربی زبان سے ناآشنا ہیں ان کے لئے تقلید جامد سے چھٹکارا مشکل ہے تاوقتیکہ کم از کم "تعلیم یافتہ" جماعت (گو ہر انسان اور بالخصوص ہر مسلمان کو "تعلیمیافتہ" ہونا چاہیئے) عربی زبان اتنی نہ جان لے جتنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان عرب امیوں اور بدوی قبائل کو آتی تھی جو دو چار دن آنحضرت کی خدمت میں رہ کر سچے اور پکے مسلمان بن کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

اس غرض سے ہر ہندوستانی تعلیم یافتہ مسلمان قرآن و حدیث خود سمجھنے کے قابل ہوجائے عربی زبان شروع ہی سے جامعہ ملیہ میں لازمی قرار دی گئی ہے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلمان علماء سے بے نیاز ہو جائیں بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ نہ اس تقلید جامد کے پابند رہیں جو اب تک ہوتی آئی ہے نہ یہ سمجھتے رہیں کہ مذہب صرف چند فقہی مسائل کا نام ہے۔ باقی رہا علم دین میں کمال حاصل کرنا وہ یقیناً ایک جماعت مخصوص طور پر حاصل کرے گی اور اس لحاظ سے دقیق اور باریک مسائل کے لئے علماء کی ضرورت ہرصورت میں باقی رہیگی غرض اس طرح جامعہ مسلمان طلبا کو ان کے دین سے آگاہ کرتی ہے تاکہ وہ دنیا کو

صحیح طور سے برت سکیں۔ پھر دوسری طرف مسلمان کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے ملّا ہوتے تھے یا سرکاری دفاتر کے کلرک۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہو۔ ادب اور تاریخ فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ سے وہ سارے عالم کو اپنی جولانگاہ بنا سکیں۔ لیکن اگر اجانب اور کفار کی حکومت ان کے لئے دنیا کے اور راستے بھی بند کردے یا وہ ان راستوں میں ایسی حکومت کے دست اندازی کے باعث اکل حلال اور باعزت طریقوں سے حصول رزق سے مایوس ہو جائیں تو تب بھی "اکل سحت" سے محترز رہ سکیں اور قوت "لایموت" کے لئے دست سوال دراز نہ کریں۔ حکومت کے طرز عمل نے ۱۹۲۰ء میں جبکہ جامعہ کا آغاز ہوا مسلمانوں اور دیگر غیر متمدن اہل ہند کو نان کوآپریشن پر مجبور کر دیا تھا اور اس طرح حکومت کے مناصب اور متعدد پیشوں میں روزی حاصل کرنے سے انھیں محروم ہونا پڑا تھا لیکن اس وقت بھی ایک بہت تھوڑی جماعت نے نان کوآپریشن پر عمل کیا تھا گو نان کوآپریشن کی قایل اس سے کہیں بڑی جماعت تھی جو نان کوآپریشن پر عمل نہیں کرتے تھے۔ مگر ویسے اس کے قائل تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ؎

ہمنے یہ مانا رہیں دلی میں پر کھائیں گے کیا؟ (غالب)

اکتسویں دن جو تنخواہ ملتی ہے اس کے بغیر گذر نہیں۔ اس طرح مسلمان حکومت کے دست نگر ہو گئے تھے اور بظاہر "اکل سحت" پر مجبور تھے اس تلخ تجربہ نے جامعہ کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے تہیہ کیا کہ طلبار کو اکل حلال اور باعزت طریقوں سے حصول رزق کے لئے کوئی نہ کوئی دستکاری ایسی سکھائی جائے جس سے وہ اپنی روزی پیدا کر سکیں طلبا نے مذہبی تعلیم حاصل کرلی۔ ذہنی اور دماغی نشو ونما بھی ہو گیا ساتھ ہی ساتھ یہ خیال پیش نظر رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی روزی خالص دماغی کام کے ذریعہ ہی سے کمانے پر مجبور نہ ہوں کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کر سکیں جس میں محض جسمانی محنت سے روزی کمائی جا سکے اور جس میں بڑے سرمایہ کی بھی حاجت نہو۔ مثلاً نجاری۔ قفل سازی۔ پارچہ بافی وغیرہ ان پیشوں کے کرنیوالے عام طور پر جاہل ہوتے ہیں جو اپنے کاموں میں سالہا سال کی مشق کے بعد بھی

کوئی جدت یا تنوع نہیں پیدا کر سکتے۔ جامعہ کے طلبا کو ایسا بنانا مقصود نہ تھا بلکہ تعلیم یافتہ نجار اور قفل ساز پیدا کرنا مقصود تھا تاکہ وہ اپنے فن میں اجتہاد اور کمال بھی پیدا کر سکیں اور اگر ضرورت پیش آجائے تو اس ذریعہ سے کافی روزی حاصل کریں۔ یورپ کے نجار اور اسی طرح کے دوسرے پیشہ ور ہندوستان کے دماغی پیشہ وروں سے کہیں زیادہ پیدا کرتے ہیں مگر جامعہ میں فقط نجاری وغیرہ کی تعلیم اصلی مقصد نہ تھا۔ بلکہ دماغی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس قسم کی دستکاری سے بھی آشنا اور واقف کرانا مقصود تھا چنانچہ جامعہ میں جدید علوم و فنون اور سائنس کا رواج دینا بھی ضروری تھا ہم نے دیکھا کہ ہمارے عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء دنیا سے ناواقف محض ہوتے ہیں ان میں سے اکثر تو ایک زمانہ میں یہ بھی نہ جانتے تھے کہ ریفٹ کہاں ہے؟ ایک زمانہ میں مسلمان فرانس میں کہاں تک دوڑاتے ہوئے چلے گئے تھے۔ موصل میں کون قوم آباد ہے۔ روشنی۔ گرمی وغیرہ کے کیا خواص ہیں؟ ان وجوہ کی بنا پر ہم نے جامعہ میں جدید علوم کا زیادہ سے زیادہ رواج دیا تاکہ یہاں کے فارغ شدہ طلباء دنیا کے جغرافیائی معاشی اور سیاسی حالات سے بخوبی واقف ہوں اور سائنس کا علم بھی حاصل کریں۔

یہ تعلیم کا وہ خاکہ تھا جو ایک جامعہ اور جامعہ اسلامیہ کے شایان شان تھا۔ لیکن ابھی لفظ نیشنل کا ذکر نہیں آیا ہے حالانکہ یاد رکھنا چاہئے کہ جامعہ اسلامیہ ایک نیشنل یونیورسٹی ہونیکا بھی دعوی کرتی ہے ہم ہندوستان کے مسلمان۔ مسلمان ضرور ہیں مگر ہندوستانی بھی ہیں اس میں صرف مسلمان ہی آباد نہیں ہیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ان کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آباد ہیں اور ان کے ہمسایہ اور پڑوسی ہیں اور انھیں کی کثرت ہے جامعہ کے بانیوں پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ اس ملک کی آزادی کے لئے (اور ایک مسلمان کے لئے آزاد ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ وہ سوائے خدا کے کسی کا عبد و غلام نہیں ہو سکتا) مسلمانان ہندوستان کا اپنے ہمسایہ بھائیوں کے ساتھ اتحاد و ارتباط قائم کرنا اور قائم رکھنا لازمی و لابدی ہے اس لئے ایک طرف تو جامعہ نے اپنا دروازہ ہر اس ہندوستانی کے لئے کھول دیا جس کو جامعہ کی فضا میں رہنے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تعصب نہو۔ دوسرے جامعہ کے ہر طالب علم کے دل میں خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ملک کی محبت اور اغیار و اجانب کی غلامی سے نفرت

پیدا کرنا جامعہ نے پہلے ہی دن سے اپنا وظیفہ سمجھا اور جامعہ کی فضا کو غلو اور تعصب سے پاک وصاف رکھا اس لئے حقیقی معنوں میں جامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور نیشنل مسلم یونیورسٹی ہے۔ امید ہے کہ اس طول طویل اور واضح تحریر کے بعد جامعہ کے مقاصد کے متعلق کسی کو کوئی شبہ باقی نہ رہیگا اور کم از کم جامعہ کے کسی طالب علم یا استاد کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے گا کہ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔ جامعہ ابتک بھی ایک خواب ہے مگر یہ وہ خواب ہے جس کی تعبیر خود تفسیر حیات ہے اور اس خواب کو عالم خواب و خیال سے نکالکر عالم عمل میں لانا اور اس خواب کی تعبیر کرنا کارکنان جامعہ کا اور مسلمانان ہندوستان کا فرض ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ خواب صحیح معنوں میں تفسیر حیات ہے یا نہیں۔ اگر یہ واقعی تفسیر حیات ہے تو پھر ملک و قوم کا فرض ہے کہ وہ اس کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس لئے کہ اس کے تفسیر حیات ثابت ہو جانے کے بعد جو تعلیم کسی اور نوعیت کی ملک و قوم میں جاری ہے اس نے لاکھ علمی جامہ پہن لیا ہو پھر بھی وہ اضغاث احلام میں داخل ہے۔ اور دماغی سوء ہضم کے نتیجہ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

مضمون نگار نے اپنے مضمون میں جامعہ کی تبلیغی جماعت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جامعہ نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس کے بعد جامعہ بجائے ایک سیاسی جماعت کے ایک خاص تعلیمی درسگاہ ہو گئی مضمون نگار کو یہ سمجھنے میں ہی غلطی ہوئی۔ جامعہ نے اپنی پالیسی کبھی نہیں بدلی البتہ وقت کے تقاضے سے اپنے پروگرام میں تھوڑے عرصہ کے لئے ضرور تبدیلی کی تھی۔ اسلام عملی زندگی کا سبق دینے کے لئے آیا ہے اس لئے اسلامی درسگاہیں دنیا سے الگ تھلگ علمی راہبوں کی گوشہ نشین جماعتیں نہیں ہیں۔ جنگ بدر میں پندرہ پندرہ برس کے لڑکے شریک کر لئے گئے تھے اور بعض نے جو کوتاہ قد تھے اس خوف سے کہ کہیں ان کو چھوڑ نہ دیا جائے اچک اچک کر اور اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر اپنے کو ۱۴،۱۳ قسمت آزماؤں کی فوج میں شریک کرایا تھا۔ یہ تو اسلام کی جنگ کا حال تھا جنگ عمومی نے کفار کی جنگ کا حال سب پر آشکارا کر دیا تھا۔ درسگاہیں اجڑ گئیں تھیں یا یوں کہئے کہ معسکر کی فوجی بارکیں بن گئی تھیں اور بجائے اس کے کہ نوجوان جمعیت خاطر اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے معمولی درس میں مشغول رہیں' اہل قلم سے اہل سیف

بن گئے تھے یہ ان لوگوں کا طریقہ عمل تھا جو جوع الارض کے مرض میں مبتلا ہو کر دوسروں کی آزادی سلب کرنیکا بیڑہ اٹھا چکے تھے یا زیادہ سے زیادہ اپنے ملک کی آزادی کو خطرہ میں دیکھ کر لڑائی کی آگ میں کود پڑے تھے جب کفار کا یہ حال ہو تو مسلمانوں کی درسگاہ ایسے موقع پر بھی الصلح خیر کہکر جنگ سے گریز کر سکتی تھی یہاں تو غالب کے گئے گذرے زمانہ میں بھی اہل قلم کا یہ حال تھا کہ وہ میدان شعرگوئی میں اپنی تگ وتاز کے متعلق لکھتے تھے کہ ؎

چوں رفت سپہبدی زرم چنگ بہ شعر شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

جس قوم کا مذہب اور آزادی دونوں خطرہ میں ہو' اس کے نوجوان کیوں کر مدرسوں میں بیٹھ کر فعل فعلا فعلو فعلت کے صیغے گردانتے - اس وقت کی یہ حالت تھی کہ ع

آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں

جس طرح جنگ عمومی میں یہی نہیں کہ ہر ملک کے حربی مدارس کے طلبہ بلکہ تمام طلبہ معمولی درس کو چھوڑ کر تین تین چار چار مہینے فوجی تعلیم پاکر یلغاریں کرکے منزل میدان جنگ میں پہنچ گئے اسی طرح ہم نے بھی ہفتہ دو ہفتہ تبلیغی درس دیکر جامعہ کے طلبہ کو میدان جنگ میں بھیجدیا تھا۔ اور امید تھی کہ ایک دو برس میں سوراج لے کر انھیں انکی چھوڑی ہوئی کتابوں کی طرف بھیجدیا جائے گا تاکہ قول وفعل دونوں کا درس حاصل کرنے کے بعد وہ پہلے سے کہیں بہتر طریقہ پر فعل فعلا فعلوا فعلت کے صیغے گردانیں۔

امید ہے کہ اس کے بعد جامعہ کی پالیسی کے متعلق کسی کو غلط فہمی نہو گی۔ آج بھی اگر میدان بدر کی فوج درکار ہوگی تو ہمیں یقین ہے کہ جامعہ کے طلبہ اچک اچک کر اور پنجوں پر کھڑے ہوکر ۳۱۴ نبرد آزماؤں کی فہرست میں داخل ہونے کے لئے ۱۹۲۱ء کی طرح بےچین وبیقرار ہوں گے۔ یاد رہے کہ یہ جبری بھرتی نہ تھی بلکہ متطوعین کی مانگ تھی ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم (اور جو خوش دلی سے نیک کام کرے تو اللہ قدردان ہے اور اسکی نیت کو جانتا ہے) مضمون نگار کے مضمون میں ایک اور بات ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ آخر زمانہ میں جامعہ کے ضعف کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "سب سے بڑی جو مصیبت آئی وہ اسکی مالی حالت کا سقیم ہونا تھا۔ خلافت کمیٹی جو اسکی سب سے

بڑی معاون و مددگار تھی ۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ روکنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے خلافت کمیٹی نے کبھی بھی اپنا ہاتھ نہ روکا ۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اب خلافت کمیٹی کے ہاتھ ہی میں کچھ نہ تھا ۔ مولنا شوکت علی اور میں دونوں جامعہ کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے مارچ ۱۹۲۴ء میں برہما جا رہے تھے لیکن قضائے الٰہی سے چھٹکارا نہیں، آمنہ کا ۱۱ مارچ کو انتقال ہوگیا اس پر بھی میں اور نیز میری اہلیہ ایک ہفتہ کے اندر ہی برہما جانے کیلئے تیار ہوگئے ۔ مگر جس دن آمنہ کا انتقال ہوا اسی دن مولنا شوکت علی خود ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوگئے اور والدہ تو دو دن پہلے سے مرض الموت میں مبتلا ہو چکی تھیں ۔ برہما کے سفر کو ملتوی کرنا پڑا اور جامعہ کے لئے روپیہ فراہم نہو سکا البتہ مولنا شوکت علی اب پھر برہما جا رہے ہیں اور ہمیں اپنے برہما کے مسلمانوں سے پوری امید ہے کہ وہ دور افتادہ بھائی ہماری مدد کریں گے اور ہماری اس خواب کو جسکی تعبیر مسلمانوں کے لئے تفسیر حیات ہے عملی جامہ پہنائیں گے ۔

دین، حرفہ، سادگی اور مادری زبان

(ذیل میں ہم مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کی اس تحریر کو بجنسہ پیش کرتے ہیں جسے ایک سپاسنامہ کی شکل میں مرحوم نے غازی امان اللہ خاں کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعارف کرنے کے لئے پیش فرمایا تھا۔ ایڈیٹر)۔

ہفت سال می گزرد کہ ملت ایں بنیاد جامعہ را نہادہ تا غایت امروزہ تعلیم راکہ در ہندوستان رواج دارد واز سر بگرداند و پیش ملت چیزے برنہد کہ اورا دریں راہ بمنزل مقصود برساند بر ضمیر اعلیحضرت پوشیدہ نیست کہ ما مسلماناں دریں دور حاضر احتیاج داریم کہ دستے را بدامن تعلیم عصری و دستے دیگر را بدامن تعلیم مذہبی بر زنیم تا نوجواناں ما کہ تعلیم را بحد تکمیل رسانیدہ از مدارس بیروں برآئید حظے از دنیا و نصیبے از دین داشتہ باشند و نیز می بینیم کہ مقصد نوجوانان ما کہ پیرامون تعلیم می گردند بجز جا کری کہ در سلک آں محدودے چند از ایشاں منسلک می شوند چیزے دیگر نمی باشد پس کسانیکہ از حلقہ خدمت بیروں می باشند کارے از دست ایشاں برنمی آید کہ چیزے دیگر را در مدارس یاد نگرفتہ و بہمیں سبب می بینیم کہ بقیہ عمر ایشاں رائیگاں می رود و نیز دائرہ اقتصادیات ما مسلماناں ہر کجا کہ می بینیم بسیار تنگ است؛ ازیں جہت ما ہاں احتیاج داریم کہ نوجوانانِ ما تا آنکہ در تعلیم گاہ باشند چیزے درآنجا بیاموزند کہ کفایت شعاری و میانہ روی از دست خود گاہے نہ دہند و ہم کل اختلاف نیست کہ علوم را در غیر زبان مادری خویش یاد گرفتن کارے است کہ آسائش تواں شمرد پس برائے ما ناگزیر آمد کہ وسیلۂ تعلیم اُردو را قرار دہیم ہمیں امور را پیش نظر خود نہادہ ما مسلمانان یک درسگاہ ملی را بنا نہادہ ایم کہ از یک جہت تعلیم حاضرہ از جہت دیگر تعلیم مذہب دادن شیوہ و شعار خود قرار دادہ است و ہم ایں تعلیم گاہ کسے را نمی گزارد کہ صنعتے از صنعتہا را یاد نہ گیرد تا چوں قدم ازاں بیروں نہد با صنعتے از صنائع آشنا باشد و بتواند کہ بر دست و بازوئے خویش اعتماد کردہ چیزے برائے خود خانہ خود مہیا سازد و نیز ما متعلمین را نمی گزاریم کہ خود گرفتہ

اسراف باشند بلکہ سعی می کنیم کہ سادگی و جفاکشی عادت و خصلت ایشاں باشد و ہم آنچہ از علوم عصریہ در جامعہ درس دادہ می شود ما ہمہ اینہارا در زبان اُردو درس میدہیم تا بر دماغ متعلمین در راہ دانفہام و تفہیم بارے نباشد کہ نتوانش تحمل کرد۔

(ترجمہ) سات سال ہوئے مسلم قوم نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ موجودہ رائج الوقت تعلیم کو بدل کر ایک ایسی تعلیم کو قوم کے سامنے پیش کیا جائے جس سے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ اعلیحضرت پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آج کل ہم مسلمانوں کے لئے علوم دین کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی بھی ضرورت ہے تاکہ جب ہمارے نوجوان تعلیم سے فارغ ہوکر مدرسہ سے نکلیں تو دنیا کا بھی لطف اٹھا سکیں اور دین کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوں۔ اس کے علاوہ چونکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر نوجوان محض نوکری حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور چونکہ ان میں سے صرف چند ہی اشخاص نوکری کے سلسلہ سے لگ سکتے ہیں اور جو ملازمت کے حلقہ سے باہر رہ جاتے ہیں ان میں کسی دوسرے کام کی اہلیت نہیں ہوتی اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی باقی زندگی رائیگاں جاتی ہے۔ مزید براں چونکہ مسلمانوں کی معاشی حالت بھی خراب ہے اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے طلبہ جب تک درسگاہوں میں رہیں اور تعلیم حاصل کرتے رہیں تب سے کفایت شعاری اور میانہ روی ان کی عادت بن جائے۔ نیز چونکہ اس بارے میں بھی کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ علوم کو سوائے مادری زبان کے کسی اور دوسری زبان میں سکھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے واسطے یہ ناگزیر ہوا کہ زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ ان امور کو سامنے رکھ کر ہم مسلمانوں نے اس درسگاہ کی بنیاد ڈالی تھی جہاں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اس کے علاوہ طلبہ کو کوئی نہ کوئی صنعت بھی سکھائی جاتی ہے تاکہ تعلیم سے فراغت کے وقت وہ کسی نہ کسی صنعت سے بھی آشنا ہوں اور اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرکے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے کچھ کما سکیں۔ اس درسگاہ میں یہ بات بھی خاص طور پر ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ طلبہ میں اسراف کی عادت پیدا نہ ہو اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان میں جفاکشی اور سادگی کی خصلتیں پیدا ہو جائیں اور علوم جدیدہ کی جتنی کچھ تعلیم بھی جامعہ میں دی جاتی ہے وہ سب اُردو زبان میں دی جاتی ہے تاکہ ہمارے طلبہ کے ذہن پر مطالب کے سمجھنے میں کوئی ایسا بوجھ نہ پڑے جسے وہ اٹھا نہ سکیں۔"

وقار الملک اور جامعہ اسلامیہ

(نواب وقار الملک مرحوم)

(ذیل میں ہم نواب وقار الملک مرحوم کے ایک مضمون سے کچھ اقتباسات درج کر رہے ہیں

یہ مضمون انہوں نے دہرہ دون میں یکم اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اس وقت تحریر فرمایا تھا جب

سکریٹری آف اسٹیٹ نے الحاق وغیرہ کی ان شرائط کے خلاف جس کے ساتھ مسلمان

مسلم یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے قطعی فیصلہ دے دیا تھا)

چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے یونیورسٹی ملنے میں دقت پیش آ رہی ہے لہذا میری رائے یہ ہے کہ

اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہئے یعنی ابتک جو یہ خیال تھا کہ علیگڈھ کالج ترقی کر کے

مسلم یونیورسٹی بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعہ سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام

کر سکیں گے۔ اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہئے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے ایک علیحدہ

جامعہ اسلامیہ (قومی دار العلوم) خود قائم کریں۔

جامعہ اسلامیہ کو تمام مسلمانان ہند کے دوسرے گروہوں کے واسطے جو سرکاری ملازمتوں

کے خواستگار نہیں ہیں ان کی تعلیمی ضروریات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے جس کے ذریعہ سے تمام

ضروری علوم و فنون کی تعلیم قوم میں شائع ہو سکے۔ امیدواران ملازمت کے علاوہ دوسرے گروہ جنکو سرکاری

ملازمت کی ضرورت نہیں اور جن کی تعلیم کا اہتمام اس طرح پر درکار ہوگا حسب ذیل ہیں:۔

(الف) مسلمان لڑکیوں کی تعلیم جن کو سرکاری ملازمت سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے بڑے بڑے مسلمان امرا۔ زمینداران تعلقہ داران جو اپنی

اولاد کو سرکاری ملازمت کے واسطے تعلیم دلانا نہیں چاہتے بلکہ اپنا ایک لائق تعلیم یافتہ اور پابند

مذہب جانشین پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

(ج) بڑے بڑے تاجر، دوکاندار اور کارخانہ دار جو اپنی اولاد کی تعلیم اس غرض سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنے کارخانوں کو عمدہ قابلیت کے ساتھ چلاسکیں اور اپنے اخلاق و پابندی مذہب کے ذریعہ سے قوم میں ہر دلعزیزی پیدا کریں اور قوم کا زر اُن کے دل میں ہو۔

(د) علما و مشائخ جو اپنے بیٹوں کو عمدہ تعلیم کے ساتھ اپنی ہی صفات سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں۔

(ہ) یونانی اطبّا جو اپنے بیٹوں کو اُس وقت کی بہ نسبت آئندہ اپنی جگہ زیادہ ممتاز حیثیت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور جن کی خواہش ہے کہ زمانہ حال کی تعلیم سے مستفید ہو کر وہ اپنے فن کو ترقی دیں اور دیندار جانشین ثابت ہوں اور جو رونق اور برکت پشتہا پشت سے اُن کے گھر میں چلی آتی ہے وہ بدستور قائم رہے۔

(و) وہ لاکھوں شریف نادار طلبا جو زمانہ حال کی سرکاری تعلیم کے سخت گراں مصارف برداشت نہیں کر سکتے اور جن کو اس بات کی ضرورت ہے کہ بقدر ضرورت دینی تعلیم کے علاوہ ان کو اور کوئی ارزاں تعلیم دی جائے جس سے وہ اپنی روزی عزت اور آزادی کے ساتھ پیدا کر سکیں۔

(ز) باقی تمام وہ لوگ جو مختلف پیشوں اور حرفتوں اور خانگی ملازمتوں کے ذریعہ سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ کوئی مسلمان بغیر اسقدر تعلیم کے باقی نہ رہے جو اپنے نماز روزہ وغیرہ ارکان اسلام کی واقفیت کے علاوہ اپنی مادری زبان میں کسی قدر نوشت و خواند اور بہت معمولی قسم کا حساب اور مختصر سا جغرافیہ نہ جانتا ہو۔

ان سب گروہوں کے واسطے علیٰ قدر مدارج و ضرورت انگریزی زبان کی تعلیم کا اہتمام درکار ہوگا اور مشرقی علوم و فنون کی تعلیم کا شعبہ علیحدہ قائم کرنا ہوگا جس میں یونانی طب کو بھی داخل سمجھنا چاہئے۔

دینیات کے اعتبار سے جامعہ اسلامیہ میں ہر قسم کی تعلیم کا انتظام موجود ہو جس سے ایسے روشن ضمیر مفسر، محدث، فقیہ، ادیب اور متکلمین پیدا ہو سکیں جو ایک طرف علوم جدیدہ کے حملوں سے اسلام کی پوری حفاظت کریں اور دوسری طرف اسلام کی خوبیوں اور صداقتوں کا سکہ غیر

مذاہب کے لوگوں کے دلوں پر بٹھائیں اور اشاعتِ اسلام کا کام دیں اور فیضانِ صحبت سے طلبار کے دلوں میں نورِ ایمان و اسلام کو پیدا کریں اور ترقی دیں۔

آج جس قسم کی تعلیم دی جاری ہے اس سے قوم میں وہ زندگی عود نہیں کرسکتی جس کی ضرورت ہے وہ زندگی اگر عود کرسکتی ہے تو جامعہ اسلامیہ کے اس جدید اسکیم ہی کے ذریعہ سے انشاء اللہ تعالیٰ عود کرے گی۔ الغرض سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ لٹریچر کے سوا باقی جن علوم کی تعلیم اس وقت انگریزی میں ہوتی ہے وہ سب ہماری اپنی مادری زبان اُردو کے ذریعہ سے دی جائے۔ یاد رکھئے کہ کسی ملک نے غیر زبان میں تعلیم پاکر ترقی نہیں کی اور نہ کوئی ملک آیندہ صرف کسی غیر زبان کے ذریعہ سے علوم میں ترقی کرسکے گا۔

میرے دوست محمد عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بی اے کی طرف سے جو ہمارے ایم اے او کالج کے ایک قابلِ فخر اور کامیاب اولڈ بوائے ہیں اور جو اب تکمیلِ تعلیم کی غرض سے یورپ گئے ہوئے ہیں اور بیرسٹری کی سند لے کر اب جرمنی میں علوم کی تکمیل کر رہے ہیں مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن پر ایک نہایت قابلِ قدر اور مبسوط رائے ۱۱ و ۱۲ اگست گذشتہ کے اجلاس کانسٹی ٹیوشن کمیٹی منعقدہ لکھنؤ میں پیش ہوئی تھی۔ اس میں وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ایک سفر کے اثنا میں ایک جرمن عالم اُن کے ہمسفر تھے انہوں نے ہندوستان کے تعلیمی ترقی کا ذکر بجنوری صاحب سے دریافت کیا کہ یہ تعلیم کس زبان میں دی جاتی ہے۔ جواب میں یہ معلوم کرکے کہ انگریزی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ انہوں نے بہت زور کے ساتھ کہا کہ "یاد رکھو ہزار برس میں بھی ہندوستان تعلیم یافتہ نہیں ہو سکتا اور کبھی عام طور پر تعلیم نہیں پا سکتا جب تک کہ خاص اپنی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام نہ کیا جائے گا"۔ یہ سچ ہے کہ آج ہمارے پاس نہ تمام علوم کی اپنی زبان میں کتابیں ہیں نہ ایسے پروفیسر ہیں جو اردو میں ان میں سے اکثر علوم کی تعلیم دے سکیں لیکن دُنیا کا یہ مسلم مقولہ ہے کہ جہاں جس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ چیز ضرور بہم پہنچ جاتی ہے۔ کتابوں اور استادوں کے بہم پہونچنے میں دیر ہوگی لیکن رفتہ رفتہ ضرور اس میں کامیابی ہوگی۔ ابتدائی تعلیم کے لئے آج بھی کتابیں اور استاد موجود ہیں۔ اور اشتہارات دینے سے غالبًا ہم ایسے لوگوں

کی خدمات حاصل کر سکیں گے جو ہمارے لئے مطلوب کتابیں اردو زبان میں مرتب کر سکیں نیز جب ہم اتنا بڑا کام اختیار کرنے کو ہوں گے تو ہمارے لئے لازم ہوگا کہ اپنے نوجوانوں کو مالی مدد دے کر انگلستان۔ فرانس۔ جرمن اور دیگر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجیں جن کا کام یہ ہوگا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی مادری زبان میں کتابیں لکھیں اور اس زبان میں قوم کے بچوں کو تعلیم دیں۔

ہمارے وہ بچے جو آیندہ ملازمت کا طوق اپنی گردن میں ڈالنے والے نہیں ہیں وہ کیوں ریاضیات انگریزی میں پڑھیں۔ کیوں جغرافیہ انگریزی میں حفظ یاد کریں۔ کیوں تاریخ انگریزی میں پڑھنے کی زحمت برداشت کریں۔ سائنس کے غریب آلات ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ان کا استعمال صرف یوروپ ہی کی زبانوں کے ذریعے سے سکھایا جا سکتا ہے۔ وہ بسر و چشم موجود ہیں کہ مسلمان ان کا استعمال اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے سیکھیں اور طلباء کی عمریں جو غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے ان علوم کے حاصل کرنے میں برباد اور تندرستیاں قربان ہوتی ہیں اُن کو اس سے بچایا جاوے۔

ضروریات زمانہ کے لحاظ سے جس قسم کی ورزشیں اور حفظ صحت کے اصول انگریزی درسگاہوں میں اس وقت ضروری سمجھے گئے ہیں وہ ان جدید درسگاہوں میں بھی جہاں اپنی مادری زبان میں تعلیم ہوگی داخل ہونے چاہیں اعلیٰ تربیت، عمدہ سے عمدہ ڈسپلن دونوں قسم کی درسگاہوں سے یکساں متعلق ہوں گے اور کفایت شعاری کی تعلیم کے لئے دونوں قسم کے طالب علموں میں کوشش ہونی چاہئے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابھی ایک عرصہ تک عملاً زیادہ اثر اس کوشش کا دوسری اسکیم کے طلباء پر پڑے گا۔ وہ جہاں تک ممکن ہے بہت زیادہ کفایت شعاری کے خوگر بنائے جا سکیں گے جن کی تعلیم بہت ارزاں ہوگی۔ کفایت شعاری سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی تندرستی اور اپنی عزت (نہ کہ فرضی عزت) محفوظ رکھنے کے ساتھ ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کیا جائے۔

میں اوپر ہی کہہ چکا ہوں کہ تعلیم السنہ کے لحاظ سے کم از کم انگریزی زبان کی تعلیم اپنے

جدید مدارس میں بھی ہم کو لازمی طور سے داخل کرنی ہوگی۔ چھوٹے مدارس میں کم مقدار میں اور اس کے بعد جیسے جیسے مدارج تعلیم ترقی کرتے جاتے ہیں انگلش زبان کی تعلیم بھی ان درسگاہوں میں ترقی کرتی رہے گی۔ یہاں تک کہ علیگڈھ کالج کے طلبار جہاں تک انگریزی تعلیم حاصل کر سکتے ہوں اردو زبان کے طلبا کے واسطے بھی سکنڈ لینگ وچ کے طور پر اسی قدر انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام درکار ہوگا اور خصوصاً دولتمند لوگوں کے واسطے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہئے۔ اس کے بعد پھر اُن طلبار کے ذاتی شوق پر منحصر ہوگا کہ اگر ان میں سے کوئی چاہتا ہے کہ کسی اور ملک کی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرے تو جامعہ اسلامیہ کا کام ہوگا کہ اپنے ہونہار طلبار کے اس کام میں مدد کرے اور ان کو موقعہ دے کہ وہ دوسرے ملکوں میں جا کر اس ملک کی زبان اور دیگر علوم و فنون کو جہاں تک اُن سے ممکن ہو حاصل کریں اور ہندوستان واپس آکر جو کچھ انہوں نے وہاں حاصل کیا ہے اس کی مدد سے اپنی مادری زبان میں اپنی قوم کے واسطے مواد بہم پہونچائیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی جامعہ اسلامیہ کی خاص توجہ کا مستحق ہوگا ہم نے لڑکوں کے واسطے اگرچہ ابھی بہت کچھ تو نہیں کیا لیکن جو کچھ بھی کیا ہے لڑکیوں کے واسطے اس کا سولواں حصہ بھی ہم نہیں کر سکے اور یہ ہم ایک ایسے فرض کو ادا کرنے سے غفلت کر رہے ہیں جس کے بدون قوم ہرگز ترقی نہیں کر سکتی ہمارے مذہب نے تو ہمیں سب کچھ بتا دیا تھا اس نے صاف کہا کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کلِ مسلم و مسلمۃ اس نے حصولِ علم کی کوششوں کے متعلق مرد اور عورت میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا مگر افسوس ہے کہ ہم اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں بہت کچھ قاصر رہے ہیں خدا ان چند افرادِ قوم پر اپنی رحمت نازل کرے جنہوں نے اس فرضِ کفایہ کو اب تک تھوڑا بہت انجام دیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ جامعہ اسلامیہ کی توجہ سے آئندہ لڑکیوں کی تعلیم کا نظام ہم کو بہت کچھ درست کرنا ہوگا۔

مذکورہ بالا مقاصد اور ان کی قیمتی اغراض کے لحاظ سے جامعہ اسلامیہ کو اپنا سلسلہ انتظام تمام ہندوستان میں قائم کرنا ہوگا۔ بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مدارس چھوٹے قصبوں میں چھوٹے مدارس اور ان کے ساتھ جہاں جیسی ضرورت ہے بورڈنگ ہاؤس قائم کئے جائیں اور ایک تعداد قرار دیجائے

کہ جس آبادی میں فلاں تعداد تک مسلمان آباد ہوں وہاں ضرور کوئی نہ کوئی اس قسم کی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا جائے یا جہاں اس تعداد سے بھی کم مسلمان رہتے ہوں لیکن وہ اپنے مدرسہ کے واسطے مناسب مالی مدد دینے پر تیار ہوں وہاں اُنکو بھی محروم نہ رکھا جاوے بلکہ آگے چلکر ہم کو ایک گاؤں میں جہاں کوئی مسلمان آباد ہو یہ دیکھنا ہوگا کہ ارکانِ اسلام کی تعلیم کا انتظام وہاں موجود ہو مُردوں کے تجہیز و تکفین میں وہاں کے رہنے والوں کو کوئی تکلیف باقی نہ رہے اور غیر مذہب کے منادیوں سے بھی ان کی حفاظت کا ضروری انتظام کرنا ہوگا۔

جامعہ اسلامیہ میں ہر صوبہ اور ہر ضلع سے ان لوگوں کو ممبری کے لئے منتخب کرنا چاہئے جو اِن کاموں میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ ہم اپنے انتظامات میں بالکل آزاد ہوں گے نصابِ تعلیم ہمارا ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ پروفیسروں اور ممتحنوں کے تقرر میں ہم پوری طرح آزاد ہوں گے جس کو چاہیں مقرر کریں جسکو چاہیں نہ کریں۔ تنخواہوں کی تعداد۔ اخراجات کے اقسام۔ خلاصہ یہ کہ تمام بجٹ اور تمام انتظام پر خود ہمارا قابو ہوگا۔

یہ خیال کہ جو لوگ گورنمنٹ وغیرہ کی ملازمت کے امیدوار نہیں ہیں انکی تعلیم کا انتظام یونیورسٹیوں اور سررشتۂ ہائے تعلیم کے دائروں سے باہر ہونا چاہئے محض اسی مایوسی کیوجہ سے پیدا نہیں ہوا ہے جو ہم کو حال میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ہوئی ہے بلکہ لکھنؤ کے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۳ء میں بھی میری ہی تحریک سے ایک کافی مباحثہ کے بعد یہ ریزولیوشن پاس ہوا تھا اسکے بعد رزولیوشن کیلئے جگہ خالی ہی ایک مختلف مانع اور خاصکر مالی دشواریوں کیوجہ سے اس رزولیوشن کی تعمیل نہ ہوسکی کل امر مرہون باوقاتہا خدا کے علم میں اُس کے لئے شاید یہی وقت موزوں تھا۔ وہی مسبب الاسباب ہے اور یہ شاید اسی کا کرشمہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے جب ہم کو ایسی یونیورسٹی حاصل کرنے میں مایوسی ہوئی جس کی تمنا میں ہم چالیس برس سے کوشش کرتے چلے آتے تھے تو اُس نے یہ فحوائے ومن بعدما قنطو وینشر رحمتہ ہمارے دل میں ایک ایسی جامعہ اسلامیہ کا خیال پیدا کیا جسکو ہم اپنے ہر ایک درد کی دوا کہہ سکتے ہیں۔

اب رہا ایسی مکمل اسکیم کا مرتب کرنا جو اس جدید تجویز کے کلیات اور جزئیات پر حاوی ہو اور یہ کہ کام شروع کیونکر کیا جائے اور ابتداء امر میں کہاں کہاں اور کس کس قسم کی درسگاہیں قائم کی جائیں اور ان کی

ضروریات کا بہم پہونچانا اور مداخل و مخارج کا انتظام وغیرہ وغیرہ یہ سب وہ امور ہیں جن کے تصفیہ کی غرض سے اوّل ایک بڑی مجلس مشورت کی ضرورت ہوگی جس میں علاوہ کل موجودہ ٹرسٹیاں علیگڈھ کالج اور دیگر قومی درسگاہوں کی تعلیمی جماعتوں کے منظم ممبروں کے ہر ایک صوبہ کے قائم مقام کافی تعداد میں شامل ہوں اور وہ طے کریں کہ کارروائی کا طریقہ کیا ہوگا۔ جامعہ اسلامیہ کا یہ پہلا اجلاس بمقام علی گڈھ منعقد ہونا چاہیے جو جامعہ اسلامیہ کا بھی ہیڈکوارٹر ہو اور وہی مرکز ہوگا جامعہ اسلامیہ کے مرکزی جماعت انتظامیہ کا اور یہی اجلاس تجویز کرے گا کہ جامعہ اسلامیہ کا قانون کیونکر بنایا جائے اور یہ بھی محتاج بیان نہیں ہے کہ جامعہ اسلامیہ کی سنٹرل کمیٹی (مرکزی جماعتِ انتظامیہ) کے تحت لامحالہ ہر ایک صوبہ میں ایک جداگانہ کمیٹی انھیں اغراض کی تکمیل کے واسطے قائم کرنی ہوگی جو اپنی ماتحت اور بہت سی کمیٹیاں اضلاع اور مقامات میں پیدا کرے گی۔

یہ میں کسی دوسری جگہ کہہ چکا ہوں کہ کام کرنے والے اگر آنریری طور سے نہ مل سکیں تو ضرور لائق آدمیوں کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کرنی چاہئیں اور ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ جو فیلنگ اس جدید اسکیم کے شروع ہونے سے قوم میں پھیلے گی اُس سے نوجوانانِ قوم میں ایثار کا بھی مادہ خاص طور پر پیدا ہوگا اور اگر ہم کو تنخواہ ہی کے ذریعہ سے کام کرنے والوں کو بہم پہنچانا ہوگا تو اُمید ہے کہ قوم میں سے جابجا اکثر نوجوان آگے بڑھیں گے اور وہ تھوڑے معاوضہ میں ایسی خدمات انجام دینے کیلئے تیار ہوں گے جن کا معاوضہ دوسری صورت میں بہت زیادہ دینا پڑتا۔ میں اس کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں کہ جو لوگ روپیہ سے کسی کام میں مدد کرسکتے ہیں وہ تو اپنی جیب میں ہاتھ نہ ڈالیں اور صرف نوجوان تعلیم یافتوں کو یہ وعظ سنا دیا جاوے کہ ان کو ایثار سے کام لینا چاہیے نوجوان یا تو مفت کام انجام دیں یا بہت قلیل معاوضہ قبول کریں اور اب بھی میں یہی کہونگا کہ تعلیم یافتہ نوجوان میں ایثار کا مادہ پیدا کرنے کی غرض سے اول ذی مقدور لوگوں کو اس کام میں مالی مدد دینی چاہیے اس سے بعد نوجوان تعلیم یافتوں پر ایثار کے وعظ کا اثر ہوسکتا ہے ایسے موقعہ پر میں یہ بھی صاف کہوں گا کہ علیگڈھ کالج سے اگر ایثار کا مادہ کم پیدا ہوا ہے تو اس کے خاص وجوہ ہیں۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ علی گڈھ کالج میں ایسی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے محض اپنی قومی کالج

کی خاطر اُس قدر تنخواہ پر جو اُن کو کالج سے مل سکتی تھی قناعت کی اور گورنمنٹ کی بڑی بڑی تنخواہوں کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ بعض دفعہ اُن سے انکار کیا اور جبکہ ہماری یہ جدید تجویز جس کا نشو و نما تمام قومی روح کی بنیاد پر ہوگا اور جہاں صبح شام اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ایثار ہی کی آوازیں کان میں ہونچیں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم میں ایثار کا مادّہ پیدا ہو۔ اسلام کی وہ تاریخیں جو مسلمانوں کی قلم کی لکھی ہوئی ہوں گی اپنی مادری زبان میں جب طلباء پڑھیں گے اور ان میں پیشوایانِ اسلام کی مثالیں ان کی نظر سے گذریں گی تو ہم کو اپنی قوم میں ایثار کا مادہ پیدا کرنے کی غرض سے کسی بیرونی مثال اور نمونہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اسلام کی تاریخ سے بہتر مسلمانوں کے دل پر اثر کرنے والا کوئی مضمون یا لکچر ابنائے کفایت شعاری اخوت ہمدردی اخلاص صداقت، شجاعت اور دوسرے بہادرانہ اوصاف پیدا کرنے کی غرض سے نہیں ہو سکتا۔ مگر ساتھ ہی اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ جو لوگ ایثار سے کام لیں قوم کی طرف سے اُن کی قدر اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ آج میرے سامنے ایسی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص نے دنیاوی دولت پر نہایت بہادری کے ساتھ لات ماردی ہے اور اپنی زندگی کا مقصد اس نے یہی قرار دیا ہے کہ اپنی تعلیم کو ترقی دے اور اس سے قوم کو نفع پہونچائے لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ کہ جن کا فرض تھا کہ اس کی قدر کرتے وہ باتیں کرتے ہیں جن سے ان نوجوان بہادروں کا حوصلہ پست ہو با ایں ہمہ کس قدر قابلِ قدر ہیں وہ بہادر کہ تمام ناقدریوں کی برداشت کرتے ہیں اور وہ بہادر اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہیں۔ برخلاف اس کے جامعہ اسلامیہ کے زمانہ میں جب ایسے قومی بہادروں کی قوم اور ہر ایسے شخص کی طرف سے جس کا یہ فرض ہو کہ وہ اپنے نوجوانوں کی قدر کرے ان کی حوصلہ افزائی کی جاوے گی تو یہ امر آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ان کے ایثار کا مادّہ پھر ایک دفعہ مسلمانوں کے سامنے سلف صالح کا نمونہ پیش کردے گا۔ مسلمانوں میں سے ابھی تک یہ مادہ فنا نہیں ہوا ہے۔ بازار میں جنس موجود ہے مگر افسوس کہ خریدار موجود نہیں ہیں۔

لیکن یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ شیخ چلی کے منصوبوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا اگر اس پر عمل کرنے کی غرض سے جامعہ اسلامیہ کے ہاتھ میں کافی روپیہ نہ ہو۔ یہ ۲۵۔ ۳۰ لاکھ روپیہ جو اس وقت

جمع ہوئے ہیں وہ اتنے بڑے انتظام کے واسطے ناکافی ہیں بلکہ حقیقت میں یہ موجودہ رقم اس یونیورسٹی کو ترقی دینے کی غرض سے بھی کافی نہ تھی جس کی حصول کے لئے ہم اب تک ناکام کوشش کرتے رہے ہیں۔ یقیناً اس کے واسطے بھی ملک کو اور بہت زیادہ ایثار سے کام لینا پڑے گا پھر ایک ایسی کم استطاعت قوم سے جیسے کہ ہماری قوم ہے ظاہرا موجودہ رقم کا جمع ہونا بھی بدون ہمارے بڑے بڑے لوگوں کی فیاضی اور کوشش کے ممکن نہیں تھا لیکن تعلیم کا جو پروگرام اوپر بیان کیا گیا ہے اگر وہ شروع کر دیا گیا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے اثر سے ایک عام جوش قوم میں پیدا ہوگا اور دنیا دیکھ لے گی کہ اس مفلس قوم کی جیبوں سے آئندہ کس قدر روپیہ میسر ہو سکے گا۔ مسلم یونیورسٹی کے نام سے جو چندہ مانگا گیا اس کے مانگنے والوں کی آواز میں اس کے دسویں حصہ کی بھی قوت نہیں تھی جتنا کہ اس جدید اسکیم کے واسطے روپیہ مانگنے والوں کی آواز میں ہوگی۔ یونیورسٹی کے مقاصد قوم کو سمجھانے میں بہت سی مشکلیں پیش آتی تھیں مگر یہ جدید اسکیم اس قدر عام فہم اور ہر دلعزیز ہوگی کہ اس کے واسطے دو لفظ کہنے اور دامن پھیلا دینا بالکل کفایت کرے گا۔ بجائے اس کے کہ لمبی لمبی اسپیچیں کی جائیں اور رسالے شائع کئے جائیں صرف یہی ایک آواز کہ ہماری تعلیم آئندہ ہماری مادری زبان میں ہوگی اور ابتدا سے لیکر انتہا تک اس کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک اور عالم سے لیکر جاہل تک کے دل میں بجلی کی طرح اثر کرے گی اور اگر خدا کو منظور ہے تو جو ناکامی آل انڈیا مسلم یونیورسٹی کے حاصل کرنے میں ہم کو اس وقت ہوئی ہے یہی ناکامی اصل کامیابی کا ذریعہ ہو جائے گی۔

۵ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا ہے اور اس وقت ہم خدا کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ہم کو ایک غلط راستہ سے نجات دے کر صراط مستقیم پر قائم کر دیا۔

حضور سکریٹری آف سٹیٹ کی طرف سے اس پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ ابتداء سے کالج کا منشا مسلم یونیورسٹی سے ایک ایسی یونیورسٹی تھا جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے نمونہ پر ہو اور اس سے وہ اسکیم مراد ہے جس کو سید محمود صاحب مرحوم نے ۱۸۷۳ء میں مرتب کیا تھا اور اسی کو سر سید صاحب کی اسکیم کہا جاتا ہے) اور اس سے حضور ممدوح یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ

مقامی یونیورسٹیاں ہیں نہ کہ الحاقی اسی طرح مجوزہ یونیورسٹی کو بھی ہونا چاہئے لیکن حقیقت یہ ہے
اور جب اس مسئلہ پر غائر نگاہ سے توجہ کی جاوے گی تو صاف معلوم ہوگا کہ بانی کالج کا منشا جو کیمبرج
یا آکسفورڈ کے نمونہ پر ایسی یونیورسٹی قائم کرنے سے تھا اس سے خاص مقصد یہ تھا کہ اسمیں رزیڈینشل سسٹم
ہو اور وہ اپنے اندرونی انتظامات میں گورنمنٹ کی مداخلت سے بالکل آزاد ہو جسکو بانی کالج نے صاف صاف لفظوں میں ظاہر کر دیا ہے
ذیل میں جناب سید محمود صاحب کی اسکیم ۱۸۷۳ء کی دفعہ ۸ بجنسہ درج کر دینا مناسب سمجھتا ہوں
دفعہ ۸۔ بیان امر اول۔ بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگران حال رہے اور کسی قسم کی مداخلت گورنمنٹ اس دارالعلوم میں ہونی چاہئے۔
جب تک اس قدر روپیہ یا جائداد جس کی آمدنی ضروری اخراجات دارالعلوم کو کافی ہو جمع نہ ہو جاوے
اس وقت تک اس قسم کی شے کے تمام کرنے کا خیال دل سے بالکل نکال ڈالنا چاہئے۔ جب تک کہ ہم اپنی
حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسی کہ تعلیم) گورنمنٹ پر بھروسہ کریں گے تو
درحقیقت اس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے سب سے عمدہ مدارس
تعلیم علوم کے یوروپ میں بھی بالکلیہ یا قریب اس کے گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے
علیحدہ ہیں اور یہ بات اُن ملکوں میں ہے جہاں کی گورنمنٹ اسی قوم کی ہے جس کی تعلیم منظور ہے۔ پس یہ دلیل
ہندوستان میں کس قدر زیادہ قوی ہو جاتی ہے یہاں کی گورنمنٹ قریباً کل کی کل مرکب ہے ان لوگوں سے
جن کی زبان اور مذہب اور خیالات ہم سے مختلف ہیں۔ اس بیان سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ میں ان تینوں
چیزوں کے کچھ برخلاف کہنا چاہتا ہوں یا ان میں اور اپنے میں مجھکو کچھ مقابلہ کرنا منظور ہے بلکہ صرف دلیل
کے قوی کرنے کے لئے کہتا ہوں کہ یہ بات قریباً غیر ممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہماری حاجتوں کو جو تعلیم و تربیت
سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے اور ان کا کامل طور سے بندوبست کر سکے حد سے حد جو ایک تربیت یافتہ
اور روشن ضمیر گورنمنٹ سے ہو سکتا ہے وہ اس شے کا حاصل کرنا ہے جو اب بھی ہم کو حاصل ہے یعنی دل
بڑھانا اور مربی ہونا اگر ہمارے دارالعلوم سے عمدہ تعلیم پانی مقصود ہے تو انگریزی گورنمنٹ خود بخود ہمارے
دارالعلوم کے مربی ہوگی اور اگر کچھ روپیہ کی مدد گورنمنٹ ہم کو دے گی تو ہم کو گورنمنٹ کی نگرانی کرنے پر
کچھ عذر نہ ہوگا بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو۔ گورنمنٹ کے مربیانہ اور فیاضانہ رویے سے ہم

اپنی تدبیر کو بہ نسبت اس کے جو گورنمنٹ موجودہ حالات میں کر سکتی ہے بہت زیادہ آسانی او
کامیابی سے انجام کو پہنچا سکتے ہیں اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ کمیٹی اس امر کے منظور کرنے میں کچھ
بھی تامل نہ کرے گی جس کو میں سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں "

علی گڑھ - ندوۃ العلما - جامعہ عثمانیہ

(جناب عبداللطیف صاحب اعظمی متعلم جامعہ)

اصلاح تعلیم کی تحریک، اپنے ادبار وانحطاط کے احساس اور دوسری قوموں کے عروج وترقی کے انفعالی اثر کا نتیجہ ہے۔ جب لوگوں نے اپنی پستی کو محسوس کیا، اور دوسروں کی ترقی کو دیکھا، تو ابھرنے اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ترقی کی جب فکر ہوئی تو اپنے نقائص پر نظر پڑی، انھوں نے سوچا کہ نقائص کا دور کرنا ہی، درحقیقت ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے، اس لئے اسی کی اصلاح مقدم قرار پائی، اس طرح اصلاح تعلیم کی تحریک کی بنیاد پڑی۔

ہندوستان میں اصلاح تعلیم کی تحریک کو شروع ہوئے، کچھ زائد نصف صدی ہوتی ہے، مگر عالم اسلامی کے دوسرے حصوں میں اس کی بنیاد اٹھارویں صدی کے اوائل میں پڑ چکی تھی، نامناسب نہ ہوگا، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے، ہندوستان سے نکل کر، عالم اسلام کے بعض حصوں کی تعلیمی تحریکوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل کا زمانہ وہ زمانہ تھا، جبکہ صرف ہندوستان ہی نہیں، بلکہ پورا عالم اسلام خواب غفلت میں سرشار اور صید ادبار وتنزل میں اسیر تھا، غرض وہ تمام علامات جو کسی قوم کے مٹنے اور فنا ہونے کی ہو سکتی ہیں، طاری تھیں۔ لوگ اسی حالت میں تھے کہ مغرب کا سیاسی وتمدنی عروج واقتدار کا سیلاب آیا اور اس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی رو میں لے لیا۔ عوام سوتے رہے مگر چند ذکی الحس اور صاحب فکر اٹھے، دوسروں کو جگا یا، خطرات سے آگاہ کیا۔

ان اطبا نے امت مرحومہ کے امراض کی تشخیص کی اور ان کے علاج کے لئے نسخے لکھے، ان نسخوں میں حالات، ماحول اور تشخیص کے لحاظ سے فرق تھا، مگر سب کا مقصد ایک تھا وہ یہ کہ کھویا ہوا عروج وعزت حاصل کی جائے اور ذہنی ومادی ترقیوں کے لئے وسائل پیدا کئے جائیں۔ ان

نسخوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ان میں سے ایک نسخہ وہ ہے جس کی بنیاد مغربی تہذیب و تمدن کے اختیار و تقلید پر ہے یعنی یہ کہ ادبار تنزل سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ ترقی یافتہ قوم کی تہذیب و تمدن کو اختیار کیا جائے، ان کے علوم و فنون کو سیکھا جائے اور اس راہ میں جو مشکلات و موانع پیش آئیں، انھیں دور کیا جائے۔ اس نسخہ کے طبیب حاذق ٹیونس کے مشہور مفکر شیخ محمد بیرم تھے، انھوں نے اپنی وزارت کے زمانہ میں اسی تخیل کے مطابق متعدد مدارس قائم کئے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جامع زیتونی میں جو ازہر کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، فرانسیسی زبان اور جدید علوم داخل کئے۔ آجکل مصر و ٹرکی کے تمام رہنما اسی نسخہ پر عمل کر رہے ہیں۔

۲۔ دوسرا نسخہ وہ تھا جس کی بنیاد مذہب پر تھی، اس میں اصلاح مذہب کو ترقی کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا اور اصلاح مذہب کے لئے تعلیم کی اصلاح ہی کامیابی کا ذریعہ تھی، اس نسخہ کے لکھنے والے سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ (رحمہا اللہ) تھے۔ اس تحریک کو مولانا ابوالکلام آزاد نے "اصلاح دینی" کا لقب دیا ہے۔ اس کے لکھنے والوں نے دیکھا کہ بظاہر امراض بہت سے نظر آتے ہیں مگر یہ شاخیں ہیں کسی اور جڑ کی، یہ جڑ کیا ہے؟ دین کا اپنی اصلی شکل و صورت میں باقی نہ رہنا۔ تشخیص کے بعد سوال تھا طریق علاج کا۔ ان لوگوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ دین میں اس وقت رخنہ پیدا ہوا، جب صحیح علما باقی نہ رہے، علما کا زوال، دین کے زوال کا سبب بنا، اس لئے سب سے پہلے صحیح علما پیدا کرنے کی فکر ہوئی، جو قوم کی اصلاح و تجدید کے فرائض کو با حسن انجام دے سکیں۔ صحیح معنی میں علما پیدا کرنے کے لئے صحیح اور حقیقی تعلیم کی ضرورت تھی، اس لئے اس وقت کے تمام مصلحین نے طریق اور نصاب تعلیم کی اصلاح پر زور دیا۔

شیخ محمد عبدہ، جو گذشتہ صدی کے مجددین و مصلحین میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، چاہتے تھے کہ ایک ایسا دارالعلوم قایم کیا جائے، جس کا نصاب تعلیم فضول کتابوں اور غیر مفید مباحث سے یکسر پاک ہو اور جدید حالات و جدید ضروریات کے مطابق ہو۔ انھوں نے ۱۳۰۴ھ میں لائحۃ الاصلاح والتعلیم الدینی کے نام سے ایک مبسوط اور مفصل اسکیم لکھکر بذریعہ شیخ الاسلام، سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کی تھی، اس میں

نہایت تفصیل سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا تھا کہ دولت عثمانیہ آخری اسلامی حکومت ہے اس لئے وہ تمام مسلمانان عالم کی اصلاح حالت کے لئے ذمہ دار ہے اس اصلاح کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کی صحیح و حقیقی دعوت و اصلاح کے وسائل پیدا کئے جائیں اور وہ ممکن نہیں، جب تک تعلیم دینی کی اصلاح و تجدید نہ ہو۔

تمہید کے بعد اس میں تعلیم کے تین درجے قرار دئے تھے۔ ابتدائی، اوسط، اعلیٰ۔

ابتدائی تعلیم عامۂ مسلمین کے لئے ہونی چاہیئے اور اس کے لئے ایک جامع وسہل الفہم نصاب عقائد و فقہ اور تاریخ اسلام و سیرت نبوی و صحابہ کا ہونا چاہیئے، جو یکسر تعلیم قرآنی سے ماخوذ اور لاحاصل مباحث خلاف و جدال سے معرا ہو۔

تعلیم درمیانی اس طبقہ خواص و متوسطین کے لئے ہونی چاہیئے جو مختلف ملکی و اجنبی زبانوں اور علوم و فنون جدیدہ کو حاصل کرکے مختلف مشاغل معاش و ملازمت میں مشغول ہوں۔ ان کے لئے ایک دوسرا نصاب ہونا چاہیئے جو پہلے سے وسیع تر ہو مگر تمام کتاب و سنت سے ماخوذ، اور صرف عقائد، فقہ سادہ وسہل اور تاریخ دینی و مدنی اسلام پر مشتمل ہو، البتہ ایک کتاب اس میں ایسی بھی ہونی چاہیئے جو علوم اسلامیہ و مذاہب اسلام کی تاریخ سے پوری واقفیت پیدا کرائے۔

آخری درجہ عالیٰ ان لوگوں کے لئے ہو جو قوم کے لئے مرشد و معلم اور داعی و رہبر ہوں۔ ان کے لئے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے جامع و اصلاح یافتہ نصاب تعلیم کی ضرورت ہے۔

نیز انھوں نے لکھا تھا کہ "مشکلات شدید اور کام اہم اور نازک ہے لیکن ساتھ ہی نتیجہ، فوز و فلاح ہے اس کے سوا تمام ابواب عمل مسدود ہیں۔ پس ناگزیر ہے کہ تعلیم دینی کے نظام میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جائے طریق تعلیم بھی ہمارا بہت کچھ محتاج اصلاح ہے، اساتذہ کو کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئیے ہمارا قدیم املا جو ٹھیک ٹھیک آج کل کی یونیورسٹیوں کا طریق تدریس ہے، پھر جاری کیا جائے" آخر میں انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ سب سے پہلے ایک مرکزی اسلامی یونیورسٹی قسطنطنیہ میں قائم کی جائے اور شیخ الاسلام کے زیر اہتمام ہو اور تمام ممالک عثمانیہ اور دوسرے اسلامی ممالک مثلاً ہندوستان، جاوا اور چین میں

اس کی شاخیں قائم کی جائیں اور تمام مدارس اور یونیورسٹیاں اپنے مرکز سے ملحق ہوں۔[۹]

ٹھیک یہی دونوں تحریکیں ہندوستان میں بھی شروع ہوئیں۔ معلوم نہیں عالم اسلامی کی گونج تھی یا اسباب و علل کی یکسانیت کی وجہ سے نتیجہ و معلول میں بھی یکسانیت تھی بہر حال دونوں ہی بالکل یکساں۔ (۱) پہلی تحریک علی گڑھ کی ہے جس کے بانی و مبانی سر سید ہیں (۲) اور دوسری ندوۃ العلماء کی۔ پہلے تحریک علی گڑھ کو لیجئے۔

تحریک علی گڑھ | سر سید ہمارے تعلیمی ہراول کے پہلے جنرل ہیں۔ انھوں نے ہماری تعلیمی کشتی کی اس وقت ناخدائی کی، جب وہ ساحل سے کوسوں دور اور سخت طوفانوں میں گھری ہوئی تھی۔ لوگوں کے قلم و دل آزاد ہیں، وہ سر سید کے متعلق جو چاہیں لکھیں، لیکن ان حالات میں، جن میں سر سید نے قوم کی بقا و حیات کے لئے انگریزی تعلیم و تمدن کو ضروری سمجھا اور انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم کو، ہندوستان کی دوسری تعلیموں پر ترجیح دی، اگر ہمارے نقادوں کو اس زمانہ کے مسئلہ تعلیم کو حل کرنا ہو تو یقین ہے کہ ان کے قلم کی سیاہی خشک اور زبان میں لکنت پیدا ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سر سید نے جس تعلیم اور طریق تعلیم کو مسلمانوں میں رواج دیا اور ان کی حیات و بقا کے لئے ضروری سمجھا، وہ نہ تو ہندوستان کی تمدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور نہ قومی زندگی کی اصل ضرورتوں اور روزمرہ کی احتیاجوں کو پورا کرتا ہے لیکن اگر اس زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نظام تعلیم کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، سر سید کو جس وادی سے گذرنا پڑا ہے، وہ چاروں طرف سے، کانٹوں سے گھری ہوئی تھی، اس لئے یہ کہنا کہ ان کا دامن کہیں الجھا نہیں، بہت بڑی جسارت ہوگی مگر اسے طے کر لینے پر تحسین نہ کرنا بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔

سر سید کی تعلیمی خدمات کی ابتدا مرادآباد میں ایک فارسی مدرسہ کے قیام سے ہوتی ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی فارسی اور اردو وغیرہ کی تعلیم کے متعلق ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے حکومت سے سفارش کی کہ "گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا لے

---

۹ شیخ محمد عبدہ کی پوری اسکیم الہلال ۱۱ر فروری ۱۹۱۳ء سے ماخوذ ہے البتہ کہیں کہیں مشکل عربی الفاظ کو آسان الفاظ میں بدل دیا گیا ہے۔

اور صرف انگریزی اسکول جاری رکھے"۔ مگر مشکل یہ تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا، عیسائی ہو جانے کے مرادف ہے چنانچہ ۱۸۳۵ء میں جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو جاری کرنا چاہا تو مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی اور اس کے حاصل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان حالات کو دیکھ کر، سرسید نے ضروری سمجھا کہ انگریزی اسکول اور کالج قائم کرنے سے قبل، مسلمانوں کے دل میں انگریزی زبان و علوم کی اہمیت اور اس کی علمیت جاگزیں کی جائے۔ اور انگریزی سے علمی اور تاریخی کتابیں اردو میں منتقل کر کے، ان کے دل میں مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت بٹھائی جائے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، انھوں نے متعدد مقامات پر سوسائٹیاں قائم کیں۔ ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں ایک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا اور اس میں انگریزی کے علاوہ، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ سرسید نے بنیاد رکھتے وقت ایک مبسوط تقریر کی تھی۔ تقریر نہایت موثر اور ان کے جذبات کی پوری آئینہ دار ہے۔ انھوں نے آخر میں فرمایا تھا کہ

"اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی ہے تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں، جس طرف تو چاہتا ہے، پھیر لیتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دل کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا، جو صرف ہمارے ہی لئے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد بھی بہت سی نسلیں آنے والی ہیں۔ ان کے لئے ایک روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا۔ اے خدا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے۔ تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے۔ تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اسکو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے، اسی طرح بخیر اسکا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اس تحریر سے تعلیم کے متعلق سرسید کے خیالات کا اندازہ نہیں ہوتا مگر ان کی نیت کا خلوص اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی خواہش ہر ہر لفظ سے ٹپک رہی ہے۔

سرسید انگریزی تعلیم اور جدید طریق تربیت پر بہت زور دیتے تھے مگر خود ان کے ذہن میں اس کا کوئی واضح خاکہ موجود نہیں تھا، ابھی تک انھوں نے جو اسکول قائم کئے تھے، ان میں انگریزی محض برائے نام تھی جو ان کے عزائم کے لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ انھوں نے سوچا کہ کسی دارالعلوم یا یونیورسٹی قائم کرنے سے قبل، یورپ جاکر بچشم خود، وہاں کے نظام تعلیم اور طریق تربیت کو دیکھا جائے اور اس کے مطابق ہندوستان میں کوئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں اس غرض سے یورپ روانہ ہوئے۔ جب انگلستان پہنچے تو وہاں کی دنیا ہی الگ نظر آئی۔ گئے تھے محض نظام تعلیم اور طریق تربیت کے مطالعہ کے لئے مگر وہاں کی ترقی اور ہما ہمی کو دیکھ کر حریص طبیعت بے چین ہوگئی۔ دل نے چاہا کہ اگر یہ جنت ہندوستان میں منتقل نہیں ہوسکتی تو ایسی ہی وہاں کیوں نہ قائم کی جائے۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

> "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں۔ پوچھا کہ کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔"

قیام کے طول کے ساتھ دل کی بےچینی بڑھتی گئی، جب سیل جذبات پر قابو نہ رہا تو تحریر کی صورت میں بہہ نکلے مگر سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا کہ لوگوں کا غم و غصہ اور مشتعل ہوگیا۔

۱۷ ماہ کے بعد انگلستان سے واپس آئے، آتے ہی کالج کے قائم کرنے کی فکر میں لگ گئے، مشکلات پہاڑ کی طرح سدراہ ہوئیں، مگر سرسید کی طبیعت کوہ کنی میں، فرہاد سے بھی بازی لے گئی۔ بالآخر انھوں نے تمام ناسازگار حالات پر قابو حاصل کرلیا اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڈھ میں کالج کی بنیاد رکھی۔

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم

اب سر سید کی ذمہ داریاں اور ان کے مشاغل بہت زیادہ ہو گئے تھے، ملازمت کے ساتھ انھیں انجام دینا مشکل تھا، اس لئے ملازمت سے پنشن لے لی اور کلی طور پر کالج کے ہو کر رہ گئے، انھوں نے کالج کو ترقی دینے اور مسلمانوں میں انگریزی کی اشاعت کرنے کے لئے جان توڑ کوششیں کیں ایک منٹ بھی توقف اور غفلت میں ضائع نہیں کیا اور کرتے بھی تو کیونکر

اہل رہ عشق ست و کج گشتن ندارد بازگشت

جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست

گو سر سید یورپ سے بہت زیادہ مرعوب تھے، اس کی ہر چیز کی تقلید کو ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ مغربی علوم و فنون میں پوری دستگاہ رکھیں بلکہ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ مغربی معاشرت اختیار کر لی جائے۔ اس پر انھوں نے اپنی متعدد تقریروں اور تحریروں میں زور دیا اور اس کی مخالفت پر بہت تاسف ظاہر کیا۔ لیکن اس غلو کے باوجود وہ مذہبی اور اسلامی تعلیم کو نصاب تعلیم کا ضروری جز سمجھتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اگر ایک طرف اسلامی علوم و معارف میں بہترین دستگاہ رکھتے ہوں تو دوسری طرف مغربی علوم اور مغربی لٹریچر سے بھی بخوبی واقف ہوں، اگر ایک طرف قرآن و حدیث کے عالم ہوں، اور مسلمانوں کی امامت و قیادت کی اہمیت رکھتے ہوں تو دوسری طرف بیرسٹری اور ججی وغیرہ کی بھی صلاحیت ہو، غرض وہ ایک ایسا دارالعلوم یا یونیورسٹی چاہتے تھے جس کے گریجوئٹس

درکف جام شریعت، درکف سندان عشق

کی مکمل تفسیر ہوں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں مدرستہ العلوم کے طالب علموں کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

" یاد رکھو، سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم، ہماری قوم ہے اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم و اسلام)

کے نمونے ہوں گے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔"

۱۸۸۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی گئی تو اس کے منجملہ اور مقاصد کے یہ مقاصد بھی بہت اہمیت رکھتے تھے۔

۱۔ انگریزی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں، ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۲۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام بطور خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اسکو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔ وغیرہ

۱۸۹۴ء میں اہل پنجاب نے، جالندھر میں سرسید کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا تھا، اس کے جواب میں سرسید نے ایک تقریر کی تھی، جس سے ان کے نظریہ تعلیم کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، اس تقریر کا قدرے طویل ٹکڑا کسی اور مناسب جگہ آئیگا، اس کے چند فقرے یہاں ملاحظہ ہوں۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ :-

"فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔"

سرسید مغربی تعلیم کے نتائج و اثرات سے بے خبر نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ اس کی اشاعت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات جگہ لے لیں گے۔ مذہبی عقائد کی دیواریں متزلزل ہو جائیں گی، لوگوں میں دہریت، نیچریت اور لامذہبیت کا رجحان ترقی کر جائیگا۔ اس کے انسداد کے لئے ان کی سمجھ میں، اس کے سوا کچھ بھی نہ آیا کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں، جن میں نقلاً نہیں بلکہ عقلاً اس قسم کے شبہات اور اعتراضات کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق، انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی جو امت میں ایک جدید فتنہ کی باعث ہوئی، مگر ان کی نیت قطعی صاف تھی، اسلام اور مسلمانوں کو اس سیلاب سے بچانے کے لئے جو مغرب سے آرہا تھا اور جس کے لانے میں خود بھی معاون تھے، اس کے علاوہ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی کہ اس قسم کی ایک تفسیر لکھی جائے۔ اس کے متعلق ان کی ایک طویل تقریر کی

چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں گا، اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائیگی، میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصل مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی گئی ہیں۔

میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ سے ان سیاہ دھبوں کو چھڑانے کا وعدہ کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں۔ یہ منصب اور ہی غرض دوسرے مقدس و باعلم لوگوں کا ہے مگر جبکہ میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں، جنکی نسبت میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک ہو سکے، صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار رہوں گا۔"

سرسید نے مذہبی تعلیم کی حمایت کی اور اسے نصاب تعلیم میں داخل کیا مگر عربی زبان کو نصاب میں قطعی جگہ نہیں دی گئی۔ غالباً ۱۹۰۴ء میں "احیاء علوم عربیہ" کے نام سے علی گڈھ کالج میں ایک تحریک شروع کی گئی، یہ ایک انگریزی پروفیسر کی مرہون منت تھی اس لئے لوگ سمجھتے تھے کہ حکومت کے ایما سے شروع کی گئی ہے۔ نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کہکر ٹال دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دیجائے؛ مگر کسی صاحب نے اسکی مخالفت میں ' ریڈیکل کے فرضی نام سے علی گڈھ منتھلی میں ایک مضمون لکھا اور ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ عربی علوم و فنون اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے۔ ان مخالفتوں کی وجہ سے یہ تحریک سرسبز و شاداب نہ ہوسکی۔

بہر حال سرسید نے مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی معارف کی تعلیم کو بھی ضروری جز قرار دیا تھا مگر لوگوں کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ۔ سرسید بھی معمولی دل و دماغ کے آدمی نہیں تھے ۔ ان کے ارادوں میں ذرا بھی تنزلزل پیدا نہیں ہوا، مایوسیاں گھیر لیتی تھیں مگر کوشش برابر جاری تھی۔

چوں دمبدم عنایت توفیق ممکن ست

در تنگ نائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

سرسید گو حکومت کے بڑے ہی خواہ اور خیر خواہ تھے مگر یونیورسٹی میں اسکی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ ہماری تعلیم بیرونی اثرات سے بالکل آزاد ہو، جالندھر کی جس تقریر کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ۔

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کیسی ہے، ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں، جو ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہے، اسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں ۔ اے دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی، جبکہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف تچر بناتی ہے۔ اے دوستو! میں بھی انھیں میں سے ہوں کیونکہ مجھکو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم تعلیمی کمیٹی میں پیش کی تھی، اس میں بھی تصریح تھی کہ "بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے، اُسکی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہئے۔" مگر ظاہر ہے، اُس زمانہ میں اس قسم کے خواب کی تعبیر مشکل بلکہ ناممکن تھی ۔ وہ تو وہ زمانہ تھا کہ جس سے حکومت کی

نگاہ پھر گئی، اس سے ساری فضا ئی پھر جاتی تھی۔ ندوہ جب قائم ہوا تھا تو علما۔ اور امرا، دونوں کی طرف سے اس کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا، مگر بعض وجوہ سے یکایک صوبہ کے حاکم اعلیٰ (سرانٹونی میگڈانل) کو سیاسی بدگمانیاں ہوگئیں، اس کی نظر بدلنی تھی کہ، مولانا ابوالکلام کے الفاظ میں "یکایک ندوہ کا عروج محاق میں آگیا، بربادی دنیا کے تمام سامان ایک ایک کرکے فراہم ہوگئے جس قدر امرا، وارباب دل ندوہ کے ساتھ تھے اور دارالعلوم کے لئے روپیہ دینا چاہتے تھے، ان کے لئے صرف اس قدر علم ہی کافی تھا کہ صوبہ کا حاکم اعلیٰ ندوہ کو اچھا نہیں سمجھتا، انھوں نے معاً انکار و تبرا شروع کردیا۔"

جس سے اس نے پھیری آنکھیں، رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہئے

اور بالآخر اس کی حالت اسوقت سنبھلی، جبکہ حکومت کے شکوک اور سوءظن کو دور کیا گیا اور نہ صرف دور کیا گیا بلکہ حکومت کی اعانت بھی قبول کی گئی اور اس کی عمارت کا سنگ بنیاد، لفٹننٹ گورنر کے ہاتھوں رکھا گیا۔ وہ زمانہ اور تھا کہ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج رہا تھا اور عام تعلیم کے لئے ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں مگر حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ آج کے حالات اس زمانہ سے بالکل مختلف ہیں، آجکل خیالات کی آزادی میں بہت ترقی ہوگئی ہے، اور حکومت کے نفوذ و اثر میں بہت کچھ کمی ہوگئی ہے مگر پھر بھی کسی آزاد ادارہ کا چلانا، مشکلات و موانع کی بہت وسیع خلیج کو عبور کرنا ہے، سرسید نے جس تعلیم کی خواہش ظاہر کی تھی "اپنی تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو"، اسی کے مطابق جامعہ کی تاسیس عمل میں آئی ہے مگر اسے کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑرہا ہے اس کا اندازہ اس تعلیم گاہ کے چلانے والے ہی کرسکتے ہیں۔

سرسید اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سخت مخالف تھے، وہ کچھ اس لئے مخالف نہیں تھے، کہ انھیں خدانخواستہ اُردو سے کوئی بغض تھا یا وہ اُردو کی ترقی کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ اُردو کی ترقی کے دل و جان سے خواہاں تھے، اس کے لئے انھوں نے بہت سی کوششیں بھی کی تھیں مگر اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے اس لئے مخالف تھے کہ اسے وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مانع سمجھتے تھے، وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے جیسا کہ

بہت سے لوگ سرسید پر اعتراض کرتے وقت کہتے ہیں کہ تھوڑی بہت انگریزی پڑھ کر کسی دفتر میں چند روپوں کی ملازمت کرلی جائے۔ اسے وہ بہت حقیر چیز سمجھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ، بیرسٹری، انجنیری اور ڈاکٹری کی سندیں حاصل کریں، ہائی کورٹ کے جج ہوں، کونسل قانونی کے ممبر ہوں، یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے فراغت کے بعد انگلستان جائیں اور آکسفورڈ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کریں۔ جونگ تجارت وغیرہ کی لائن اختیار کرنا چاہیں، وہ ہندوستان ہی میں محدود نہ رہیں بلکہ ہندوستان سے نکلکر دوسرے ممالک میں جائیں اور بڑی بڑی کمپنیاں قائم کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ذریعہ تعلیم اردو ہو گی تو نہ تو ہم ان صیغوں اور محکموں میں جا سکیں گے اور نہ فاتح قوم کی سی ترقی کر سکیں گے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ۱۸۶۸ء میں جس وقت پنجاب یونیورسٹی میں اور پھر ۱۸۹۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کو ترقی دینے اور اردو میں مغربی علوم کی تعلیم دینے کی تجویز ہوئی تو سرسید نے سخت مخالفت کی اور اس کی مخالفت میں متعدد مضامین لکھے۔

سرسید نے اپنے مضامین میں ذیل کی چیزوں پر خاص طور پر زور دیا تھا۔

"قومی ترقی اور حکومت دو نوماں جائی بہنیں ہیں، پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی نحمند قوم کے علوم و زبان حاصل کرے اپنے نحمندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی ان شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرے جن میں ان نحمندوں نے کاملیت حاصل کی ہے، سوشل عادات اور علمی و عملی خیالات، اس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں ...."

گورنمنٹ نے ہمارے لئے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ، گو اس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے، بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجنیری کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو، جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت

کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے[۵۱] جانے دو مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں، ہندوستان کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے ہم کو سمجھنا چاہئے کہ ان حقوق کو واجبی طور پر حاصل کرنے کے لئے ہم کو کیا کرنا چاہئے؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی .... معمولی معمولی عہدے بھی جیسے وکالت منصفی و سب ججی ہے[۵۲] بغیر انگریزی کی کافی لیاقت کے ہم کو میسر نہیں آسکتے۔

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہئے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں، ہم بساطی کی سی دوکانداری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی "محمڈن اینڈ سنز کمپنی" کے نام سے کوٹھیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، ڈبلن میں، بروزلز میں، سینٹ پیٹرسبرگ میں، برلن میں، وائینا میں، قسطنطنیہ میں، بیکین میں، واشنگٹن میں اور دنیا اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں، جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو پھر کیا ہمارے مردہ علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا، صاف ایسی تدبیریں کرتا ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے۔"

ان تحریروں کا کیا اثر ہوا؟ اسے علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں سنئے:-

"پنجاب یونیورسٹی پر ان کے (سرسید) تین پر زور آرٹیکل، قلعہ شکن توپیں تھیں، جن کے

---

۵۱ یہ غالباً اشارہ ہے اس کی طرف کہ انڈین سول سروس میں یونیورسٹی کی کسی ڈگری کی شرط نہیں تھی جسے سرسید پسند نہیں کرتے تھے۔

۵۲ آج جن عہدوں کو قابل فخر اور مطمح زندگی سمجھا جاتا ہے، وہ سرسید کے نزدیک معمولی عہدے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی یہ الزام صحیح ہوگا کہ سرسید انگریزی تعلیم سے محض دفتروں کے لئے کلرک چاہتے تھے؟

صدمہ نے مشرقی تعلیم کو ہلکا چور کر دیا ' الہ آباد یونیورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ
اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی ' تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس زور کے
لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے "

سرسید نے اس کی مخالفت میں نہ صرف پرزور مضامین لکھے بلکہ انگریزی حکومت کی پروا نہ کر کے بتلا دیا
کہ وہ اپنی راہ کے روڑے کے ہٹانے میں دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے ۔ انھوں نے کہا کہ " اگر
ایسا ہوا (یعنی ان یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کو روکا گیا) تو ہم کو کیا کرنا چاہیئے ؟ ہماری رائے میں اس کا جواب
صاف ہے ' استقلال ' استقلال ' استقلال ' ہمت ' ہمت ' ہمت ' کوشش ' کوشش ' کوشش
ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے ' اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے
کی کوشش کرنی چاہیئے ' اور اگر ہم میں سلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دیا جائے کہ بلاشبہ
گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے ' مگر لوگوں کی رایوں پر نہیں " خط کشیدہ عبارت کو پھر پڑھیئے
اور دیکھئے کہ اس میں حکومت وقت کو کس قدر دھمکی دی گئی ہے ۔

معلوم نہیں سرسید کی یہی رائے آخر وقت تک باقی رہی یا مرور ایام کے بعد کچھ تبدیلی ہوئی یا کم از کم
شدت میں تخفیف ہوئی ؟ مولانا حالی اس پر صرف اس قدر روشنی ڈالتے ہیں کہ

" ۴۰ برس کے تجربہ سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی
تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی ' فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو "

سرسید اعلیٰ تعلیم کی راہ میں ٹکنکل ایجوکیشن کو بھی مانع سمجھتے تھے ' اس لئے اس کے بھی مخالف تھے '
انھوں نے اپنے مضامین میں اس کی مخالفت کی اور لکھا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات کے لحاظ سے ابھی ٹکنکل
ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے ۔ دماغی اور تہذیبی تعلیم سب پر مقدم ہے ' جب اس کی ضرورت نہ رہیگی
تو کسی اور تعلیم کا انتظام کیا جائے ۔

سرسید تعلیم سے زیادہ تربیت کو ضروری سمجھتے تھے ' وہ کہتے تھے کہ انسان چاہے کتنی ہی اعلیٰ ڈگری
حاصل کر لے لیکن جب تک تربیت نہ ہو محض بیکار ہے ' وہ کہتے تھے کہ میں بہت سے ایسے لوگوں سے

واقف ہوں کہ جنھوں نے انگریزی کی خاصی تعلیم حاصل کی ہے مگر خانساماں جیسی ذلیل ملازمتیں کر رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھیں اچھی تربیت اور عمدہ سوسائٹی میسر نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہوسٹل سسٹم (اقامتی زندگی) کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

یہ ہے، سرسید کی تحریک اصلاح تعلیم کی تاریخ جسے ہم نے اعتراض کرنے کے بجائے، سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ ان سے بہت سی لغزشیں ہوئیں مگر اسے بھولنا نہ چاہیے کہ انھوں نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت بھی انجام دی ہے۔ محض برائیوں کو گننا اور اچھائیوں کو نظر انداز کردینا، انصاف نہیں ہے۔ بلکہ صلحا کا طریقہ یہ ہے کہ اچھائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور برائیوں سے اغماض کرتے ہیں۔ کیا یہی طریقہ ہمارے لئے مناسب نہیں ؟

تحریک ندوۃ العلماء سرسید کی تحریک کی اہمیت اور اسکی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سرسیّد کے غیر معمولی دل و دماغ اور ان کا بے پایاں صبر و استقلال، مسلمانوں کے بہت آڑے وقت میں کام آیا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تحریک قوم کے مرض کا پورا علاج نہ تھی اس سے صرف قوم کا معاشی مسئلہ اور بعض دوسرے معمولی مسائل حل ہو سکتے تھے، جو جدید تمدن نے پیدا کردئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ قوم کے حل طلب مسائل اس سے کہیں زیادہ تھے۔

اس تحریک میں سب سے بڑا نقص یا کمی یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کا انتظام بہت کم تھا، ضرورت تھی ایسے لوگوں کی جو جدید علوم کے ساتھ مذہبی اور اسلامی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہوں، اور علی گڈھ کالج یا کوئی انگریزی کالج ایسے تعلیم یافتہ کو پیدا کرنے سے بالکل قاصر تھا، چنانچہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:-

> "شاید کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے؟

کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟"

اس لئے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلما کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی، اس کے قیام میں مولانا شبلی نعمانی اور دوسرے علما اکابر شریک تھے۔ مولانا حالیؔ کا بیان ہے کہ ندوہ کی تحریک پر بھی سرسید کی تحریر و تقریر کا انفعالی اثر ہے، علما نے طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے اصلاح کے سلسلہ میں جو تقریریں کیں، وہ درحقیقت سرسید کی تقریروں کی گونج ہے۔ ان کی اصل تحریر ملاحظہ ہو:۔

"اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں، ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے، ان کی اصلاح کئے بغیر نہ رہیگا، چنانچہ ندوۃ العلما اسی غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلہ درس کی زمانہ حال کی ضرورت کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلمار کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا.........

پہلے جو ہمارے علما علوم جدیدہ کے پڑھنے سے اس لئے منع کرتے تھے، کہ ان سے اصول اسلام میں شبہات پیدا ہوں گے اور الحاد و دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اس کے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سرسید کہتے چلے آتے ہیں"

ممکن ہے بخیال مولانا حالی، ندوہ کی تاسیس و قیام میں سرسید کی جد و جہد کا انفعالی اثر ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ گذشتہ صدی کے انقلابی رجحان اور اصلاح کا نتیجہ ہو جسے ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں مگر اس کے منصہ شہود پر آنے میں سب سے زیادہ دخل زمانہ کو ہے، جس کی طرف مولانا حالیؔ نے بھی اپنی تحریر میں اشارہ کیا ہے۔

ندوۃ العلمار کے قیام کا خیال ابتدائے ۱۳۱۰ھ میں اس وقت ہوا جب مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے وقت بہت سے مشہور علمار جمع تھے۔ اس وقت علمار کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔

تکفیر بازی اور مناظروں سے متجاوز ہو کر، مقدمہ بازی کی نوبت آگئی تھی، اس لئے علما نے ایک ایسی انجمن کے قیام کی ضرورت محسوس کی جو علما کو ان چیزوں سے روکے۔ چنانچہ اس وقت قیام انجمن پر جو تقریریں کی گئیں، ان کا حصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے زیادہ ہوتے جاتے ہیں، مذہبی مقدمات کے عدالتوں میں دائر ہونے سے توہین اسلام ہوتی ہے، علما میں مخالفت کو روزافزوں ترقی ہے اور سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ جیسے مفسر، محدث، فقیہہ، فلسفی متکلم، ادیب، شاعر اور مورخ پہلے زمانہ کے علما تھے، اب اس پایہ اور قابلیت کے علما کے وجود سے زمانہ خالی ہوتا جاتا ہے اور ان سب خرابیوں کا انسداد اس وقت ہو سکتا ہے، جب کی ایک باضابطہ مجلس ہو۔

شوال ۱۳۱۱ھ مطابق اپریل ۱۸۹۴ء میں ندوہ کا پہلا اجلاس کانپور میں ہوا۔ اس میں ندوہ کے مقاصد اور طریق کار کی تعئین ہوئی۔ اہم مقاصد صرف دو قرار پائے۔ (۱) اصلاح طریق تعیلم (۲) رفع نزاع باہمی۔ ان مقاصد کی ان الفاظ میں تشریح کی گئی تھی۔

غرض اول۔ چونکہ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ جو طلبہ علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں، وہ امور انتظامی دنیا اور معیشت سے محض ناواقف ہوتے ہیں اور بوجہ زیادہ عمر صرف ہو جانے کے کچھ اور کر بھی نہیں سکتے اس لئے

وہ بے موقع طور سے اہل دنیا کے محتاج ہوتے ہیں اور عام کی نظروں میں بے رقعت اور بیکار ٹہرتے ہیں۔ اور علوم دینیہ سے بھی جیسی کہ واقفیت ہونی چاہئے نہیں رکھتے جو علوم دینی اس وقت کے مناسب اور دین کے معین ہیں، ان سے وہ ناواقف رہتے ہیں۔ یہ انجمن سب باتوں پر غور کرکے اولاً سلسلۂ تعلیم کو درست کرے اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں جاری ہونے کی کوشش کرے اور جو امور ان طلبا کی تہذیب و اخلاق اور ترقی علم میں مفید سمجھے، حتی الوسع ان کے اجرا میں سعی کرے۔

غرض دوم۔ اس وقت ہمارے علما کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا بڑا فساد برپا ہوتا ہے جس سے علمار اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کے مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے۔ یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پائے۔ اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعہ طے ہو جایا کرے۔" (روداد ندوہ بابت سال اول ص ۲۳)

غرض اول میں خط کشیدہ عبارت سے، اس زمانہ کے فارغ التحصیل طلبہ پر ایک خفیف سی روشنی پڑتی ہے۔ گنجائش کم ہے اس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، بالغ نظر اس سے پوری کیفیت و حالت کا اندازہ کرلیں گی۔ البتہ اس وقت کے نصاب تعلیم پر ہم قدرے تفصیل سے گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔ اس وقت جو نصاب تعلیم عربی مدارس میں رائج تھا اسے درس نظامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ نصاب اب بھی بہت سے عربی مدارس میں رائج ہے، مگر اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں، لیکن اسے بھی درس نظامیہ ہی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی اصل روح کو باقی رکھا گیا ہے۔ درس نظامیہ ملا نظام الدینؒ کی طرف منسوب ہے جو لکھنؤ سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر قصبہ سہالی کے رہنے والے تھے، اور جنھوں نے بعد میں زمانہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر فرنگی محل میں مستقل سکونت اختیار کی۔ درس نظامیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور ہے، بقول علامہ شبلیؒ "کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم، عالم نہیں مانا جاسکتا جب تک ثابت نہ ہوجائے کہ اس نے اسی طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے" اس لئے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے بہت زیادہ علم اور تعلیمی مہارت کی ضرورت ہے۔ راقم کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے، اس کے علاوہ بہت بڑی ذمہ داری کا کام ہے، معلوم نہیں کہاں قلم پھسل پڑے اور معلوم نہیں کس جگہ دامن الجھ جائے، اس لئے محفوظ راہ یہی ہے کہ اس کام کو ضرور کیا جائے۔ البتہ علامہ شبلیؒ علوم اسلامیہ کے بہت بڑے واقف کار تھے، خدا نے جہاں انھیں اور بہت سی صلاحیتیں عطا کی تھیں وہاں تعلیمی مہارت سے بھی بہرہ مند کیا تھا، اس لئے اس کے متعلق ان کی رائے بہت زیادہ وقیع اور قابل قدر ہوگی۔

مرحوم نے اپنے رسالہ الندوہ میں تعلیمی اصلاح کے متعلق کئی مضامین لکھے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مضمون درس نظامیہ کے متعلق بھی تھا۔ اس سے ہم ذیل میں اقتباس پیش کرتے ہیں۔ پہلے درس نظامیہ کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہے کیا؟

"درس نظامیہ میں اصول ذیل ملحوظ رکھے گئے:

۱۔ اختصار یعنی ہر فن کی ایک دو مختصر کتابیں لے لی گئیں۔

۲۔ اختصار کے اصول پر اکثر کتابیں، ناتمام درس میں رکھی گئیں یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری

خیال کیا گیا مثلاً میر زاہد، ملا جلال، صدرا شمس بازغہ، مسلم، تلویح، ان سب کتابوں کے کچھ کچھ حصے درس میں داخل ہیں۔

۳۔ ہر فن میں وہی کتاب رکھی گئی ہے جو اس فن کی سب سے مشکل کتاب ہے، اس سے مقصد یہ تھا کہ غور کی قوت پیدا ہو جائے کہ پھر جس کتاب کو چاہے دیکھ کر سمجھ سکے۔

۴۔ منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی۔ ملا محب اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دئیے اور اس کا عام انداز بدل دیا، یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس میں داخل کی، پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور ان میں فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوتی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابیں پڑھکر بھی منطق نہیں آتی کیونکہ جس کو منطق سمجھتے ہیں وہ منطق نہیں بلکہ فلسفہ ہے ...... اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا ملا محب اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے۔"

اب آئیے اس پر علامہ شبلی کی تنقید ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں، جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے، یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جائیں۔ مثلاً شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ العلم اما تصور فقط وھو الخ قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بنا پر چھڑ دی گئی کہ "ھو" کی ضمیر "تصور" کی طرف پھرتی ہے یا تصور فقط کی طرف۔ اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے لیکن اگر مصنف، ضمیر کے بجائے خود مرجع کا ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائگاں جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے مصنف کے ایک خاص لفظ اور اس کے منشا پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں، ان کے

قریب بلکہ ان سے زیادہ فضول لفظی مسائل ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بتادینا بھی ضروری ہے کہ قدما کے زمانہ میں شرح اور حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بوعلی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا، لیکن اس وقت تک شرح میں بھی مصنف کی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے، بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح و تشریح کرتے تھے۔ اس کے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں غرض نہیں رہی بلکہ تمام تر توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے؟ کس لفظ سے کیا خاص فائدہ ہے؟ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے؟ مصنف کی عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے غلط ہے، فلاں جگہ مصنف نے دفع دخل مقدر کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ جس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوا وہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں ایک مضمون لکھا ہے .... اس مضمون کا حاصل یہی ہے چنانچہ وہ مثالاً فن فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھکر لکھتے ہیں" یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے، اور عمر ایک ہی کے محفوظ رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے، اس لئے اگر مدرسین صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا۔"

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی وہی حالت تھی جو اب ہے یعنی باوجود اس طریقے کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ یہ طریقہ لوگوں کے لئے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہوگیا تھا، چنانچہ علامہ موصوف عبارت مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں" لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے جو دفع نہیں ہوسکتا کیونکہ معمولِ عام ہو جانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہوگیا ہے۔"

۲- سب سے بڑی خرابی نصاب موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہوتا ہے،

یہاں تک کہ اسکو فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے۔ ملا حسن، حمداللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعد الطبیعہ کے ہیں مثلاً علم باری جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ ملا جلال فن منطق میں بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن جس قدر درس میں ہے اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے، جو صرف اس عبارت سے متعلق ہے، جو مصنف نے حمد و نعت میں لکھی ہے۔ ان کتابوں کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی اس لئے الٰہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور سخت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔

۴۔ بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے مثلاً نحو، صرف، منطق، مقصود بالامر ضمنی ہیں لیکن کتب درسیہ زیادہ تر انہی فنون کے متعلق ہیں، منطق کا مقصود یہ ہے کہ فلسفہ میں کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابیں فلسفہ کے اعتبار سے اضعافاً مضاعفہ ہیں، صغریٰ کبریٰ، میزان، منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، حمداللہ، قاضی مبارک یہ انبار کا انبار منطق میں ہے اور درس میں داخل ہے لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابیں درس میں داخل ہیں، جن میں سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے، باقی سب جستہ جستہ مقامات۔ اس طرح نحو و صرف میں برسوں اوقات صرف کی جاتی ہے اور حواس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس میں بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں طلبہ میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا[۹۱]۔"

اس وقت کے نصاب تعلیم کی یہ خرابیاں تھیں، جنھیں مولانا شبلیؒ جیسے نقاد کے الفاظ میں آپ نے سنا۔ اب غور فرمائیے کہ ندوۃ العلماء کو کتنا کٹھن کام انجام دینا تھا۔ بالآخر دو سال کے تجربہ نے تبلا دیا کہ

---

۹۱ مقالات شبلی حصہ سوم ص ۱۲۹

ندوہ کو اپنے مقاصد میں اس وقت کامیابی ہو سکتی ہے کہ اس کے ماتحت ایک دارالعلوم قائم کیا جائے اور مجوزہ نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اس طرح اس کے فارغ التحصیل طلبہ سے یہ خدمت دی جا سکے گی۔
چنانچہ ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں دارالعلوم قائم کیا گیا۔ علما نے پذیرائی کی اور اپنی خدمات سے نوازا مگر ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو اس کے مقاصد سے قطعی ناواقف تھے۔ محض خوان یغما سمجھ کر اکٹھا ہو گئے تھے۔
مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کے حقیقت نگار قلم نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے،

"ندوہ (یعنی دارالعلوم) کی بنیاد کچھ عجیب طرح سے پڑی، ایک عمارت بن گئی مگر اس طرح کہ معماروں کی نیت اور ارادے کو اس میں بہت کم دخل تھا اور بہت سے تو سمجھتے ہی نہ تھے کہ یہ جو کچھ بن رہا ہے اس سے کیا کام لیا جائے گا"

ندوہ کا اولین اور مقدم ترین مقصد نصاب کی اصلاح تھا جب اس کے ماتحت دارالعلوم قائم ہوا تو خود اس کا نصاب درست نہیں کیا گیا، صرف سالانہ جلسے ہو جایا کرتے تھے اور بس۔
مولانا شبلیؒ اصلاح نصاب کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھے، جس وقت دارالعلوم کے مسئلہ قیام پر غور ہو رہا تھا تو اس وقت وہ علی گڑھ میں تھے۔ وہاں سے جلسہ میں شریک ہوئے اور دارالعلوم کے قیام پر زور دیا۔ قائم ہونے کے بعد، جب اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تو مولانا محمد علی مرحوم کو ایک اسکیم بنا کر دی جو ابتدا سے ندوہ کے ناظم تھے۔ مگر اس کے بعد ہی خزاں کا دور شروع ہو گیا اور جو لوگ چمن میں محض تفریح کے لئے آئے تھے چلے گئے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر گورنمنٹ ندوہ کو مشتبہ نگاہ سے دیکھنے لگی اور اس کی سختی سے نگرانی شروع کر دی، گورنمنٹ کی نگاہ پھرتی تھی کہ لوگ ایک ایک کر کے اس سے علیحدہ ہونے لگے۔
اس زمانہ میں علامہ شبلیؒ حیدرآباد میں تھے، وہ عرصہ سے مستقل طور پر ندوہ کو اپنا وقت دینا چاہتے تھے، مگر حالات اجازت نہ دیتے تھے، مگر جب ندوہ کی حالت اس حد تک پہنچ گئی تو ان سے نہ رہا گیا اور لکھنؤ چلے آئے۔ تاکہ ندوہ کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔
صفر ۱۳۲۳ھ کے جلسہ انتظامیہ میں مولانا شبلی کو معتمد تعلیم دارالعلوم بنایا گیا، مولانا پہلے جس وقت

اپنے عہدہ کا چارج لیا تو اسوقت ندوہ کی حالت نہایت زبوں تھی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔" دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریض جاں بلب کے بستر مرگ کو دیکھو یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر پرانی دہلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو، جن کی بہت سی دیواریں گر چکی ہیں اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب گرنے والا ہے۔ افلاس و فقر، بے نوائی و شکستہ حالی، کس مپرسی و محتاجی، خرابہ کار، اور بربادی محنت کا ایک ویرانہ تھا، جس کے اندر تباہی و ہلاکت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے، ایک ظاہر صورت ضرور قائم تھی، مدرسہ تھا، مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو روپیہ تھا، جس سے تمام کام زندہ رہتے ہیں اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی، جو بہت سے مادی نقصانوں کی بھی تلافی کر دیا کرتی ہے۔"

علامہ شبلیؒ نے چارج لینے کے بعد نہ صرف وہاں کی مالی حالت کو درست کیا بلکہ اس کے نصاب تعلیم کو درست کیا جو ندوہ کا اولین مقصد تھا۔ لیکن اس راہ میں بہت سی مشکلات تھیں، ان مشکلات کے متعلق علامہ شبلی نے الندوہ میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

" اصلاح نصاب کا خیال صرف چند علما کے دل میں پیدا ہوا تھا، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چونکہ فیصلہ عموماً کثرت رائے پر ہوتا ہے اس لئے انھیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں، اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے وہ جدید نصاب (جس میں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں، ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لئے ان کا پڑھا لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے لیکن جدید نصاب میں ان کے بجائے دلائل الاعجاز عبدالقادر جرجانی رکھی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ فن بلاغت کی جان ہے اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چیں ہیں لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا، نہ اس پر شرحیں اور حاشیے موجود ہیں، اس لئے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہیں۔ اور چونکہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے اس لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی استعداد

پیدا نہیں ہوتی بہرحال سال حال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجرا کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفا دیدیا اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کئے جا رہے ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں۔
بے شبہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں گی لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے تو اسکو سرے سے اصلاحِ نصاب کا نام لینا نہ چاہئے۔ یہ سخت بددیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔"

دارالعلوم کے جدید نصاب میں حسب ذیل چیزیں پیش نظر تھیں۔

۱۔ ایک ایسا نصاب تعلیم، جس میں جدید ضرورتوں کے مطابق، صحیح علوم اسلامیہ پر مشتمل ہو، غیر ضروری کتابوں اور قدیم طریق حواشی و شروح سے پاک ہو اور علوم شرعیہ میں اچھی استعداد پیدا کرے۔
۲۔ بعض جدید علوم کو شامل کیا جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم دی جائے تاکہ انگریزی داں علما پیدا ہو سکیں۔

صرف نصاب ہی کی اصلاح پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تعلیم میں بعض امور پر خاص طور پر زور دیا گیا مثلاً ادب پر۔ قدیم نصاب میں زبان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے جو قرآن و حدیث کے سمجھنے کی کنجی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ادب کی مشہور کتابوں کو نصاب میں جگہ دی گئی بلکہ تحریر و تقریر کے ذریعہ عربی میں بولنے اور لکھنے کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا علما پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ان کی عمریں پڑھتے پڑھتے ختم ہو جاتی ہیں مگر نہ تو عربی کے دو جملے بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ ندوہ نے اس الزام کو دور کرنے کی کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ انھی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ ندوہ کو ادب میں دوسرے تمام عربی مدارس میں امتیاز حاصل ہے۔ عرصہ ہوا مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی ندوی کی ادارت میں کلکتہ سے غالباً الجامعہ کے نام سے عربی میں ایک اخبار نکلتا تھا اس کے مضمون نگاروں میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم بھی تھے غالباً ندویوں کی عربی ادب کا یہ پہلا مظہر تھا ۱۹۳۲ء میں ندوہ سے ایک عربی رسالہ الضیاء جاری ہوا تھا، مگر

عدم اشاعت کی وجہ سے بند ہوگیا، اس کے مدیر، مضمون نگار سب ندوی اور ندوہ کے طالب علم تھے، اس نے نہ صرف ہندوستان کے علمائے ادب سے خراج تحسین حاصل کیا بلکہ مصر اور دوسرے عربی ممالک سے بھی۔ علمائے ندوہ کے عربی ذوق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ جہاں اُردو میں بہت سے قلمی رسالے نکالتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، وہاں عربی میں بھی نکالتے ہیں اور تقریریں بھی کرتے ہیں۔ چند سال ہوتے ہیں فلسطین سے ایک وفد آیا تھا جس میں مفتی اعظم اور علویہ پاشا بھی شامل تھے، وفد کے یہ ارکان ندوہ بھی تشریف لے گئے تھے، اس وقت راقم وہاں موجود تھا، انھوں نے بچوں کی جب تقریریں سنیں اور ان سے گفتگو کی تو بہت متعجب ہوئے اور کہا کہ ہمارے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ ہندوستان میں اس قسم کی کوئی درسگاہ ہوگی جس کے اتنے نوعمر طلبہ اس قدر فصیح اور عمدہ عربی بولتے ہوں گے۔

ادب کے بعد سب سے زیادہ زور فن تفسیر پر دیا گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ عربی تعلیم کا تمام تر مقصود قرآن اور حدیث کا سمجھنا ہے مگر عربی مدارس پر نگاہ ڈالئے تو نصابوں کی جلدیں منطق، فلسفہ، علم کلام کی کتابوں سے بھری ملیں گی مگر اصل سرچشمۂ علم، کتاب اللہ کے متعلق جلالین جو قرآن سے بھی مختصر ہے اور بخاری شریف کے چند پارے نظر آئیں گے اور بس۔

ندوہ میں درجۂ تکمیل (ایم۔ اے) بھی قائم کیا گیا ہے تاکہ علما فراغت کے بعد اپنے ذوق اور مناسبت کے مطابق تفسیر، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ جس فن میں چاہیں، مہارت حاصل کرسکیں۔ مگر اس میں ایک بہت بڑا نقص ہے جو معلوم نہیں ابتدا سے ہے یا بعد کی پیداوار ہے، وہ یہ کہ اس درجہ میں صرف مخصوص اور محدود لڑکے لئے جاتے ہیں، ہر شخص داخل نہیں ہوسکتا، حالانکہ اسے بالکل یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے اور آنرز کی طرح ہونا چاہیئے۔

ندوہ کی یہ تمام خصوصیات اسوقت تک باقی رہیں، جب تک علامہ شبلیؒ وہاں موجود تھے، مگر ان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد اس کی بہت سی خصوصیات باقی نہ رہ سکیں، نصاب تعلیم میں بہت سی ایسی کتابیں داخل کردی گئیں جنھیں بیکار سمجھکر اس وقت داخل نہیں کیا گیا تھا، مگر اس کے باوجود علامہ شبلیؒ ندوہ کی در و دیوار کی ایک ایک اینٹ میں وہ روح پھونک دی تھی کہ آج بھی باوجود تنزل و انحطاط کے اس کے طلبہ میں ندوہ کی

خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں کچھ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر اعظم گڈھ) کے متعلق بھی عرض کر دیا جائے۔ کیونکہ مدارس اسلامیہ کی اصلاح کے سلسلہ میں یہ بھی ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اواخر ۱۹۱۳ء میں جب علامہ شبلیؒ ندوہ سے علیحدہ ہوئے تو اپنے وطن اعظم گڈھ چلے آئے اور اپنی پرانی تجویز یعنی دارالمصنفین کی طرف توجہ کی۔ گو وہ علمی کاموں میں بہت مصروف تھے، مگر اس کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کی بھی انہیں فکر تھی، چنانچہ مولانا فراہی کو ایک نامہ میں لکھتے ہیں:۔

"کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو "گردکل" کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔"

(مکاتیب شبلی، حصہ دوم صفحہ ۴۳)

مولانا شبلی نے ندوہ میں خدام الدین کے نام سے ایک تحریک شروع کی تھی، اس تحریک کو یہاں بھی جاری کرنا چاہتے تھے، چنانچہ علامہ فراہی کو لکھتے ہیں:۔

"ان میں سے ایک کو مرکز بنا کر اسی کو دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے یہیں خدام الدین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گردکل ہو، تم اپنی رائے لکھو .... پرنسپلی اور ہیڈشپ قرار تنخواہ چند روزہ ہیں اور یہ کام ابدی ہے۔"

(مکاتیب شبلی حصہ دوم صفحہ ۷۴)

اس کے تقریباً ایک سال کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا، اس لئے سوائے مدرسہ کے چند جلسوں کی شرکت کے کچھ زیادہ توجہ نہ کر سکے۔

مدرسۃ الاصلاح کی اصلاح و ترقی میں سب سے زیادہ دخل مولانا حمید الدین فراہیؒ کو ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا فراہی دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کو چھوڑ کر مدرسۃ الاصلاح میں آئے اور آخر دم تک اس کی خدمت کرتے رہے۔ اس درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت کتاب الٰہی کی تعلیم ہے۔

"مدرسہ کی خصوصیات جو اس کے دستور العمل سے ماخوذ ہیں، حسب ذیل ہیں:۔

الف ۔ قرآن و حدیث وفقہ وادب کی طرف شدت اعتنا۔

ب ۔ اعلیٰ علم وقابلیت کو مطمح نظر رکھنا نہ کسی محدود نصاب کو۔ الا قرآن مجید و متون حدیث۔

ج ۔ درستی اخلاق یعنی پابندی شرائع وروحانیت اسلام

د ۔ آسانی نصاب باوجود اعلیٰ قابلیت

ہ ۔ کفایت مصارف باوجود آسائش طلبہ

شرح :۔ خصوصیات الف، ب بنیادی ہیں ج ان کا عملی ثمرہ ہے اور د، ہ ان کے ذرائع ہیں، ان کی اہمیت میں باہمی فرق مراتب، ان کی ترتیب سے سمجھنا چاہئے۔"

ذیل کی چیزیں مدرسہ کے لئے اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ غریبانہ اور مذہبی زندگی بسر کریں، اساتذہ تنخواہ کے متوقع نہ ہوں، کفاف پر قناعت کریں۔

۲۔ اس مدرسہ کو غربائے مسلمین کی اعانت سے چلایا جائے، سرکاری اثر سے آزاد رکھا جائے۔

۳۔ قرآن کی محققانہ تعلیم اس مدرسہ کا نصب العین ہو، اس کے بعد حدیث و فقہ پہ زور دیا جائے، منطق و فلسفہ اور کلام کی غیر ضروری کتابیں نکال دی جائیں ان کی جگہ پر ادب عربی کی تعلیم دی جائے، حدیث شریف کی تعلیم جماعتی عصبیت سے آزاد ہو، فقہ میں فقہ اسلامی کی تعلیم دی جائے، تاکہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو، تکفیر و تفسیق کا ولولہ نہ ابھرے، صرف نحو کی تعلیم عملی ہو، فنون کی تعلیم میں، امہات فن پیش نظر رہیں اور لکچرز کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بقدر ضرورت انگریزی کی تعلیم دی جائے، حصول معاش کے لئے صنعت کی تعلیم دی جائے۔ مدت تعلیم کم سے کم ہو۔ اور نرخ تعلیم انتہائی حد تک ارزاں۔

۴۔ مدرسہ اہل سنت والجماعت کے مختلف مذاہب (اسکولز) کا سنگم ہو، یہاں حنفی اور اہل حدیث دونوں ملیں، ندوی، دیوبندی، اصلاحی سب تعلیم دیں۔ جزئیات کے اختلاف کے باوجود سلف کے طریق پر آپس میں شیر و شکر رہیں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو مٹا دیں (الاصلاح ۱۰ اگست ۱۹۳۶ء)

جامعہ عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کی تحریک، ہماری تعلیمی تحریکوں کی تیسری کڑی ہے اس کے قیام و تاسیس میں اشخاص کے علاوہ، سب سے بڑا حصہ لڑکوں کی تعلیمی ترقی کا ہے، اس لئے بہتر ہوگا کہ حیدرآباد کے تعلیمی ارتقا پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

حیدرآباد میں تعلیم و تنظیم کی ابتدا مدرسہ دارالعلوم کے قیام سے ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ اس سے پندرہ بیس برس پہلے، ریاست کو تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوگیا تھا، مگر یہ خیال عملاً صرف چند فنی مدارس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا اور تہذیبی تعلیم کا اگر کچھ انتظام تھا تو اس کے نمونہ صرف مخصوص طبقہ تک محدود تھے، عام تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۸ مارچ ۱۸۵۶ء کو دارالعلوم کا باقاعدہ افتتاح ہوا، ۱۸۵۹ء تک اس کی حیثیت محض ایک معمولی مدرسہ کی رہی، اس کے بعد آہستہ آہستہ ترقی کرکے کالج کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ دارالعلوم کا کوئی اپنا نصاب نہیں تھا، بلکہ یہاں کے طلبہ، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات مثلاً منشی کامل، منشی فاضل، مولوی عالم، مولوی فاضل وغیرہ کے لئے تیار کئے جاتے تھے اور وہاں کے امتحانات میں بیٹھتے تھے۔ تاآنکہ، غالباً ۱۹۰۶ء میں، انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کی وجہ سے یہ الحاق ٹوٹ گیا تعلق کے منقطع ہوجانے کی وجہ سے چھ سات سو لڑکے بالکل بیکار ہوگئے، انگریزی اسکول قائم تھے، مگر یہ انگریزی سے نابلد تھے، یا معمولی شد بد رکھتے تھے، اس لئے ان میں داخل نہیں ہوسکتے تھے، اس اچانک آفت سے، ریاست اور مفکرین کو دارالعلوم کے لئے ایک نصاب تیار کرنے کی فکر ہوئی، جو زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہو۔ چنانچہ مولانا شبلیؒ اور مسٹر ے ہیو کو جو عرصہ سے سررشتہ تعلیمات میں ملازم تھے اور تعلیمی تجربہ رکھتے تھے، یہ خدمت سپرد کی گئی۔

اس دارالعلوم کی ترقی و اصلاح میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ کو بڑا دخل رہا ہے، نصاب میں بہت سی اصلاحیں کیں، علوم جدیدہ کو درس میں داخل کرکے، زمانہ کے مطابق بنایا۔ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز بھی کی ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھائے جائیں۔ سر راس مسعود مرحوم اور سر نواز جنگ حیدری نے یہ تو منظور کیا کہ علوم اردو میں پڑھائے جائیں مگر دینیات کی تعلیم کو عربی ہی میں باقی رکھا۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب کے لئے تیاری کتب اور وضع اصطلاحات میں بھی مولانا شریک تھے۔ جامعہ کے تخیل، نصب العین اور اس کی تشکیل میں بھی مولانا کے مشوروں اور رایوں کو

بہت دخل رہا ہے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جو اس وقت صدر الصدور تھے اور جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے چانسلر مقرر ہوئے تھے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ۔" جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے ۔"

دار العلوم میں انگریزی تھی، مگر بہت کم ۔ انگریزی کی تعلیم کے لئے، مشنری کے چند مدارس تھے، مگر عام طور پر مسلمان بلکہ ہندو بھی، اپنے لڑکوں کو ان میں تعلیم دلانے سے احتراز کرتے تھے، اس لئے اگر کہا جائے کہ اس وقت پوری ریاست میں انگریزی کی تعلیم نہ تھی، تو بیجا نہ ہوگا ، حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کا انتظام ۱۸۷۰ء میں ہوا جبکہ حیدرآباد کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا ۔ دار العلوم اور حیدرآباد کالج نے، اپنے اپنے طور پر ریاست کی تعلیم کو بہت ترقی دی اور زمانہ کی طلب کو پوری کرتے رہے ۔ مگر زمانہ ان سے تیز تھا، اس نے چند ہی سال میں، انھیں ناکافی ثابت کر دیا، اب زمانہ کی طلب کو پورا کرنے کے لئے ایک یونیورسٹی کی ضرورت تھی جوں جوں زمانہ ترقی کی طرف بڑھتا گیا، ضرورت کا احساس، شدید ہوتا گیا اور بالآخر ترقی کرکے، دلوں سے زبانوں پر آیا اور زبانوں سے عام جلسوں میں، بعض اشخاص نے یونیورسٹی کے قیام کے لئے تجویزیں بھی پیش کیں مگر اسکا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ البتہ انجمن طلبائے قدیم دار العلوم اور انجمن ترقی تعلیم حیدرآباد یا حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں نے، اس تخیل کو عمل سے بہت زیادہ قریب کر دیا ۔ انھیں دونوں انجمنوں کی بار بار یاددہانی کی وجہ سے، ذمہ دار حضرات نے اس کی طرف توجہ مبذول کی ۔ نواب سر حیدر جنگ بہادر اسوقت معتمد تعلیمات تھے، انھوں نے ایک عرضداشت مرتب کرکے، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی ۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا حسب ذیل جواب دیا ۔

> " مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام کے نقائص دور ہو کر جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی ہو سکے ۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بحیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے۔ لہٰذا میں خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکورۂ اصول محولہ عرضداشت کے مطابق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد" ہوگا۔

قیام یونیورسٹی کی منظوری اور ابتدائی امور کی انجام دہی کے بعد، اگست ۱۹۱۹ء میں اس کا افتتاح ہوا، چونکہ مجوزہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اُردو قرار پایا تھا اور ظاہر ہے اُردو میں نصاب کے لئے کتابیں تھیں نہیں، اس لئے مغربی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنے کے لئے دارالتصنیف والترجمہ قائم کیا گیا۔ اور وضع اصطلاحات کے لئے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ اس طرح تقریباً بارہ سال صرف ہوگئے اور ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی اس قابل ہوئی کہ بی۔ اے کی تعلیم کا انتظام کر سکے۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد دارالعلوم کو اس میں ضم کر دیا گیا اور اسے شعبۂ دینیات کے کالج کی حیثیت دیدی گئی۔ یونیورسٹی کے ماتحت ایک میڈیکل کالج، ایک انجنیرنگ کالج، ایک مدرسۂ تعلیم المعلمین جس میں بی۔ ٹی کی تعلیم ہوتی ہے اور ایک سائنس کا معمل (لیبرٹری) ہے۔

یونیورسٹی کا نصاب تعلیم دستیاب نہ ہو سکا، اس لئے اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا مشکل ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب "حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی" میں اس کے متعلق مختصراً لکھا ہے جو بالکل ناکافی ہے، مگر اسی پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"جامعہ عثمانیہ کے نصاب تعلیم کی بڑی خصوصیات یہ ہیں کہ میٹرکیولیشن میں مضامین دو گروپوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، تاکہ طلبہ جو مضامین کالج میں لینا چاہیں، ان میں ان کی ابتدائی تعلیم اچھی ہو۔ انٹرمیڈیٹ میں انتخاب مضامین میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی گئی ہے اور مضامین کو اس طرح سے مرتب کیا گیا ہے کہ ایک طالب علم اپنے لئے ایک ایسا مجموعہ اختیار کر سکتا ہے، جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ ہے کہ بی۔ اے کی جماعتوں میں

ایک طالب علم کسی خاص مضمون اور اس کے متعلقات کی تعلیم مکمل طریقے پر حاصل کر سکتا ہے،
انگریزی زبان اور دینیات یا اخلاقیات کے علاوہ جو لازمی مضامین ہیں، طالب علم کوئی دوسرا
مضمون ایسا لے سکتا ہے، جس میں خصوصیت کے ساتھ وہ تمام و کمال عبور حاصل کرے
اور پھر اسی مضمون پر تحقیق و تلاش کے کام میں مصروف ہو جائے .... دینیات یا
اخلاقیات کالج کی تمام جماعتوں کے لئے لازمی ہے .... انگریزی زبان کی تعلیم لازمی
قرار دی گئی ہے اس کا معیار وہی رکھا گیا ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کا ہے، اس کی وجہ
سے جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ انگریزی بولنے والی دنیا کے خیالات سے آشنا رہ سکتے ہیں"۔
انکا دائرۂ عمل جامعہ کی مطبوعہ یا مترجمہ کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے مضامین
میں انگریزی کتابوں سے بھی ہر وقت استفادہ کر سکتے ہیں"۔ یہی امتیازی خصوصیات ہیں،
جن کی بدولت جامعۂ عثمانیہ نہ صرف حیدرآباد، بلکہ ہندوستان بھر میں مقبول ہوئی، اس کی
پیداوار مشرق اور مغرب کا بہترین آمیزہ ہے۔" (صفحہ ۸۸)

استقامت اور صلح پسندی

(از سید طفیل احمد صاحب منگلوری۔ بی۔ اے (علیگ))

مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں جو درسگاہ ۱۹۲۰ء میں کھولی گئی تھی اول تو اس کا رویہ کچھ مخالفانہ رہا پھر وہ دہلی میں منتقل ہو گئی۔ چونکہ نصاب تعلیم اس کا اپنا تجویز کردہ تھا۔ اور اسے سرکاری امداد حاصل نہ تھی۔ مدتوں اُسے سخت مالی مشکلات کا سامنا رہا۔ بالآخر اُس کے موجودہ پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے استقلال اور حکیم اجمل خاں صاحب اور خواجہ عبدالمجید صاحب کی امداد اور سرپرستی سے اس میں استقلال پیدا ہو گیا۔ تعلیم و تربیت کے متعلق اُس میں جدید تجربے کئے گئے۔ ان میں کامیابی ہوئی اور کارکنان کی صداقت۔ اور استقامت کی وجہ سے اب اس نے قوم کے دل میں جگہ پیدا کر لی ہے اور آثار ایسے ہیں کہ مستقبل قریب میں وہ اپنے پروگرام کے عمل کرنے میں کامیاب ہو گی۔ پچھلے چالیس سال کے زمانہ میں مسلمانوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ باہمی نقیض کے لئے مشہور تھے۔ مگر اب حالات بدلنے کی ایک بدیہی علامت یہ ہے کہ جو درسگاہ مسلم یونیورسٹی کی مخالفت میں قائم ہوئی تھی اب اس کے پرنسپل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انتظامیہ جماعت کے ممبر ہیں اور دونوں درسگاہوں کے کارکن ایک دوسرے کے معین و مددگار اور باہم شیر و شکر ہیں۔

بااشبہ ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ کالج کے دو ٹکڑے ہو جانے سے اُس زمانہ میں مسلمانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی مگر اب جبکہ جامعہ ملیہ علی گڈھ کالج کے جسم سے علیحدہ ہو کر مثل چاند کے روشن و تاباں ہے تو وہ ہر طرح مادر درسگاہ کے لئے باعث فخر و مباہات ہے۔

(اقتباس از "مسلمانوں کا روشن مستقبل")

دارالعلوم دیوبند

(جناب طفیل احمد صاحب متعلم جامعہ)

دارالعلوم دیوبند کے متعلق راقم الحروف کی رائے ہے کہ حالات موجودہ میں اگر دارالعلوم جیسا ادارہ ہندوستان میں موجودہ نہوتا تو ہندوستان سے اسلام کبھی کا رخصت ہو چکا ہوتا۔

عہد مغلیہ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت | یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اشاعت اسلام کی خدمات شاہی شئون کے ذریعہ انجام نہیں دی گئیں۔ بلکہ اس مقدس خدمت کا سہرا حضرات اولیاء اللہ۔ علمائے باخدا اور صوفیائے کرام کے سر ہے۔ جنھوں نے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ، فوجی اور شاہی طاقتوں سے مستغنی ہو کر اخلاق فاضلہ، اعمال صادقہ اور علم صحیح کی روشنی میں اس فریضہ کو انجام دیا۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عہد عالمگیرؒ تک اشاعت علم کا کافی انتظام حکومت کی جانب سے ہوتا رہا۔ جس کا اندازہ اسلامی مورخ علامہ مسطرزی کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ "شاہ محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دلی شہر میں ایک ہزار مدارس تھے۔ اور بقول کپتان الگزنڈر ہملٹن خاص عالمگیرؒ کے بدنام عہد میں" پایۂ تخت سے بہت دور یعنی شہر سندھ میں چار سو مدارس مختلف علوم و فنون کے تھے" اور غالباً اسی زمانہ کو مکس مولیہ برطانوی حکومت کے عہد ماقبل سے تعبیر کرتا ہوا کہتا ہے" برطانوی حکومت سے قبل صرف صوبہ بنگال میں اسی ہزار مدارس تھے، یعنی ہر چالیس نفر کے لئے ایک مدرسہ۔ مسٹر آرنلڈ کی رپورٹ ۱۸۸۰ء کے بموجب "پنجاب میں تعلیمی میدان صرف مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، وہ ہر دلعزیز تھے۔ ہندو لڑکوں کو ان ہی پر اعتماد تھا مسلمانوں کے مدارس میں ہی وہ لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے" اسی قسم کی بہت سی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان اسلام کے زمانہ میں اشاعت اسلام کا سلسلہ اس وسیع پیمانہ پر تھا کہ اگر انگریزی رپورٹیں تصدیق نہ کرتیں تو اس عظیم الشان سلسلہ کی روایات کو مبالغہ آمیز افسانہ سمجھا جاتا۔ ان مدارس میں اگرچہ علوم شریعت اور علوم عربیہ کی تعلیم نہ ہوتی تھی لیکن بلاشبہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد

میمنت عہد تک حکومت کی جانب سے ایک خاص سرپرستی علمائے اسلام کی ہوتی رہی۔ علیٰ ہذا قوانین شریعت کی ایک خاص قدر ومنزلت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے زمانہ میں علما کی ایک کمیٹی بنا کر عنوالبطو کے طور پر اسلام کے فقہی احکام کی تدوین کرائی جس پر بقول علامہ شبلیؒ دو لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اور اس دستوری فتاوی کا نام فتاوی عالمگیری رکھا گیا۔ جو تقریباً پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اور جس کو آج تک اسلامی دنیا میں فتاوی کا ایک مستند مجموعہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانان ہند کی بدبختی سے عالمگیرؒ کی حکومت کے بعد وہ زمانہ آنیوالا تھا جو بموجب آیہ کریمہ واذا اردنا ان نهلك قرية الخ قانون قدرت ہے کہ تباہ ہونیوالی قوم کی تباہی کا آغاز اس کے امراء اور ارباب حکومت واصحاب دولت کے فسق وفجور سے ہوتا ہے۔ (جن کا اقتدار کچھ عرصہ کے بعد تمام قوم کے قصر معنی کو منہدم اور مسمار کر دیتا ہے)

عہد مغلیہ کا زوال اور تحفظ علم کی غیبی تدبیر
علمائے ہند کے مورث اول

عہد عالمگیرؒ کے بعد ایک طرف قانون قدرت امراء کے فسق وفجور کی پاداش پر تلا ہوا تھا۔ بڑے بڑے قدیم شاہی خاندان ”تلک الایام نداولها بین الناس“ کا مظہر بن کر اپنے عالیشان محلات اور ہزار ہاقسم کی نعمتوں کی بجائے تیغ وتفنگ کے ہدف بن کر مکافات عمل کا نظارہ دنیا کو دکھا رہے تھے، اور تاریخ کے سبق آموز اوراق کو آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے پُر کر رہے تھے، تو دوسری طرف قضا وقدر کے کارکن دین متین کی حفاظت کے لئے سرزمین ہند کے جگر میں ایک مقدس سلسلے کی ایسی بنیاد ڈال رہے تھے کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ تک گڑی ہوئی تھیں، اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی تھیں۔

قدرت کا کس قدر عجیب وغریب کرشمہ ہے کہ جس طرح عالمگیری عہد حکومت کے دامن میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا پھندا لٹکتا ہوا نظر آتا ہے اسی طرح اس دامن کا آخری کنارہ اس مقدس مجدد ملت وارث الانبیا علیہم السلام کو بھی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، جو آئندہ تمام لازوال شاخوں کے لئے اصل اصول ہے۔

یہی مجدد ملت ہے جو علمائے ہند کے سلسلۂ حدیث وتفسیر کا مدار ہے۔

یہ وہ مقدس مجدد ہے کہ جس کی ام محترم نے پیدائش سے پیشتر بذریعہ خواب قطب الدین کے نام سے پہچانا تھا۔ لیکن پیدائش کے بعد دنیا نے اس کو ولی اللہ کے اسم باسمی سے پہچانا یعنی عالم بالا میں اس کو

دائرہ دین کا قطب اور مرکز قرار دیا گیا تھا جس کی تصدیق اہل دنیا سے دلی اللہ کہکر کرائی گئی۔

بہر حال عالمگیری عہد ملکوت کے اختتام کے بعد دولت مغلیہ کے تو اختتام اختیار کیا۔ مگر حضرت شاہ صاحب رح کے ذریعہ سے جو دولت ملت اسلامیہ ہند کو عنایت فرمائی گئی وہ آج تک بحمداللہ روبترقی ہے۔ یہی وہ دولت ہے جو کچھ بعد دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

لہذا ضروری ہے کہ اس سلسلہ طیبہ کے طبقات شمار کرائے جائیں تاکہ باسانی مقصود کی تشریح ہو سکے، اور آشکارا ہو جائے کہ جس چیز کو آج دارالعلوم دیوبند کہا جاتا ہے درحقیقت یہ وہی درخت ہے جس کا تخم قدرت نے بذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (محدث دہلوی) دہلی کی سرزمین میں لگایا تھا۔

خاندان ولی اللّہی کے طبقات | یہ شرف بھی دنیا کے عجائبات میں سے ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ کو مرحمت فرمایا گیا۔ یعنی آپ کی اولاد میں جو بھی ہوا وہ ولی اللہ اور قطب وقت، علوم دین کا بہترین حامل۔ دنیا کے لئے نمونہ زہد و تقویٰ۔ معیار رشد و ہدی۔

یہاں یہ سلسلہ کو قلمبند کرنا مضمون کو طول کرنے کے علاوہ خارج از بحث بھی ہوتا ہے لیکن چونکہ دارالعلوم دیوبند کی کڑی کا سلسلہ باندھنا ضروری ہے اس واسطے اس سلسلہ کو بطور طبقات تقسیم کر کے ممتاز حضرات کے اسمائے گرامی پیش کر دینے کافی ہیں۔

(۱) طبقہ اولیٰ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پیدائش ۱۱۱۴ھ یعنی چار سال قبل وفات عالمگیر (۱۱۱۸ھ) وفات ۱۱۷۶ھ بزمانہ گوہر علی عرف شاہ عالم

(۲) طبقہ ثانیہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادگان تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رح حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رح حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رح حضرت شاہ مولانا عبدالغنی صاحب رح (والد ماجد حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رح۔)

ان سب بھائیوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رح سب سے بڑے تھے اور عجیب اتفاق ہے اور آپ کی وفات سب سے بعد ۱۲۳۹ھ میں ہوئی۔

(۳) طبقہ ثالثہ۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رح۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رح۔

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالحیٰ صاحبؒ ۔حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بعد سلسلۂ درس میں حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کو جانشین مانا گیا۔ آپ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے ہیں اور تمام تلامذہ میں ارشد ترین تلمیذ ہیں ۔ قریباً ۱۲۶۰ھ میں آپ نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی۔

(۲) حضرت شاہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو اپنے اس بھتیجے سے بہت زیادہ انس تھا۔

(۳) حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے بھائی ہیں اور آپ نے بھی سنہ ۱۲۶۰ھ میں بڑے بھائی کے ساتھ ہجرت فرمائی۔

(۴) حضرت مولانا شاہ عبدالحیٰ صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے داماد تھے ۔ اور حضرت مولانا سید احمد صاحبؒ کی معیت میں ایک عرصہ تک کوہستان اور اس کے اطراف میں رہے ۔ اور پھر مرض بواسیر کی شدت سے سفر ناگزیر اختیار کیا۔ (حیات ولی ص ۳۳۶)

(۵) حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ ایام جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں آپ نے بروایت تذکرۃ الرشید مدینہ طیبہ ہجرت فرمائی۔ حرم پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجاور ہو کر ۲ محرم ۱۲۹۵ھ کو بعمر ۷۰ سال وفات پائی۔ اس خاندان کے آپ نواسے ہیں۔

دہلی سے دیوبند کو علمی مرکزیت کا انتقال | یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ جس طرح محکمۂ قضا وقدر کی طرف سے یہ طے کیا جاچکا تھا کہ دہلی شہر اسلامی حکومت کا مرکز نہ رہے اسی طرح گویا اس کی علمی مرکزیت کا انتقال کا بھی فیصلہ ہو چکا تھا ۔ چنانچہ حضرت سیدنا و مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ اور حضرت شاہ محمد یعقوب صاحبؒ نے سلطنت مغلیہ کے زوال یعنی ۱۸۵۷ء سے تقریباً دس سال بیشتر اور خاندان ولی اللہ کے آخری چشم و چراغ یعنی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے اسی جہاد حریت کے سلسلہ میں دہلی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد

کہ حرم پاک کی ہجرت فرمائی اور اس طرح اس خاندان کے فیوض سے ہندوستان محروم ہوگیا۔

لیکن قدرت نے جن مقدس نفوس کو خاندان ولی اللہی کی جانشینی کے لئے ازل سے منتخب فرمایا تھا وہ حضرات مندرجہ ذیل تھے:۔

حجۃ الاسلام سیدنا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح منبع العلوم سیدنا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ان حضرات نے دیگر فنون حضرت مولانا مملوک العلی صاحب حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحب نانوتوی سے حاصل کئے اور اس کے بعد حدیث شریف سیدنا مولانا حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے حاصل کیا۔

حضرت مولانا مملوک العلی صاحب حضرت مولانا رشید الدین خانصاحب کے شاگرد رشید تھے۔ اور حضرت مولانا رشید الدین خانصاحب حضرت سیدنا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد رشید اور شہرہ آفاق شاگرد تھے۔ جو ہر فن میں یکتائے روزگار تھے خصوصاً ردِّ شیعہ سے بہت زیادہ شغف تھا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ محدث اول دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے فرزند سعید تھے اس طرح حضرت مولانا مفتی صدرالدین صاحبؒ بھی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رح کے مشہور و معروف شاگرد تھے۔

بہر حال علوم حدیث و نیز دیگر علوم میں ایک یا دو واسطے سے یہ تینوں حضرات بانیان دارالعلوم حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان تینوں حضرات میں سے دیوبند کا اصل باشندہ کوئی بھی نہ تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا وطن مالوف قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور تھا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہ کے باشندے تھے۔

اس زمانہ میں دیوبند میں کوئی مدرسہ بھی نہ تھا۔ کوئی عالم مرجع خلائق بھی نہ تھا۔ اور دہلی کی طرح کبھی علوم اسلامیہ کا چھوٹا یا بڑا مرکز ہی رہا تھا۔ بہر حال مقام حیرت ہے کہ دہلی کے ولی اللہی چشمہ کے لئے دیوبند ہی کی زمین کو کیوں منتخب کیا گیا۔

قیام دارالعلوم دیوبند (۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق (تقریباً) ۱۸۶۶ء)

۱۸۵۷ء اپنے بدترین نتائج چھوڑ کر رخصت ہوا سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ سحری ہمیشہ کیلئے گل ہوگیا ایک تاریکی ہے ایک ابر ظلمت ہے۔ ہاں کہیں کہیں کوئی تارا نظر آتا ہے۔ لیکن خطرہ ہے کہ بادل کی حرکت اس کو بھی چھپا دیگی۔ ہندوستانی چاہتے ہیں کہ انگریزی کی اشاعت بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں مسلمانان کلکتہ نے آٹھ ہزار دستخطوں کے ساتھ اس مضمون کی شکایتی درخواست پیش کی تھی کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے حکومت کا منشا عیسائی بنانا ہے۔ (جو حضرات روشن خیال مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا الزام آج حضرات علمائے کرام پر لگاتے ہیں ان کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے) اور پھر ۱۸۵۲ء میں مدراس کے ہندوؤں نے پارلیمنٹ میں درخواست دی کہ سرکاری یا امدادی سکولوں میں انجیل کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ مگر اس کے باوجود مسٹر منگلس کی مندرجہ ذیل تقریر ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ میں ہوئی خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھلایا ہے کہ سلطنت ہندوستان انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمامتر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کی عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہ کرنا چاہیئے۔ (حکومت خود اختیاری صـ۹۷)

بہرحال ہندوستان کی یہ کیفیت رہی۔ کہ اس کے طول و عرض میں اصلاحی پرچم کی بجائے صلیبی پرچم لہرایا۔ اور ہندوستان کے ہندو اور مسلمان حریت و اخلاص وطن کی جدوجہد میں ناکام رہے اور سبز رنگ کا قومی نشان صلیبی نشان کے سامنے سرنگوں ہوگیا۔

وفور الم اور شدت عتاب نے مسلمانوں کو پست ہمت کر دیا کہ عمل تو درکنار سیاست کے نام سے لرزنے لگے۔ خفیہ پولیس کی برکت سے اوقات سحر میں برطانیہ کو بددعا دینا بھی بغاوت کے مرادف سمجھا جانے لگا۔ نظام تعلیم کی تباہی نے ایک جہالت کی چادر تمام ہندوستان پر تان دی۔ مزید برآں شاہ عالم کے معاہدہ کے برخلاف حکومت نے فارسی کی بجائے انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دے کر مصائب کے زوال اور فنا کا پیغام سنا دیا جو جا بجا فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے انگریزی سکولوں یا مڈل

سکولوں کا نصاب تعلیم وہ رکھا گیا جو مسلمان بچوں کی رائے میں ایسی تبدیلی پیدا کر دے کہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں یعنی اسلام کا دشمن عیسائیوں کی تبلیغ اور ہندو مقاصد پر مشتمل - حیرانی تھی ان تیز و تند باد سموم کے جھونکوں میں اسلام کے نخل نو کی بقا کس طرح ہوگی۔

ہمدردان ہند کی پیشانیاں سربسجود ہوئیں۔ تنہائی تضرع اور انکسار سے دعا مانگی جانے لگی۔

لطف الٰہی کی ایک کرن ارض ہند پر چمکی اور خاندان ولی اللہی کے جانشینوں کی توجہ ارض دیوبند (سہارنپور اور پھر مرادآباد) کی طرف متوجہ ہوئی۔

دیوبند میں دارالعلوم دیوبند - سہارنپور میں مظاہرالعلوم - اور مرادآباد میں مدرسہ شاہی قائم کیا گیا لیکن یہ عجیب کرشمہ قدرت ہے کہ ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند نے مرکزیت کی شان حاصل کر لی۔

قیام دارالعلوم دیوبند کے وقت ایک بزرگ جناب ملا محمود صاحب کو مدرس کی حیثیت سے اور جناب محترم مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحبؒ کو شاگرد کی حیثیت سے (استاد و شاگرد دونوں محمود) مقام چھتہ والی مسجد جو دارالعلوم کی جنوبی جانب ہے ایک انار کے درخت کے نیچے (جو ابتک اپنی پہلی سی ہیئت میں موجود ہے) مدرسہ کے قیام کو منتخب کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اصول و مقاصد | حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے قلم مبارک کے تحریر کردہ اصول رسالہ القاسم (دیوبند) کے دارالعلوم نمبر (محرم سنہ ۱۳۷۴ھ) میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں سے چند پیش نظر ہیں:-

الف - حریت و آزادی ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر کلمۃ الحق کا اعلان اور دین متین کی اشاعت ہو- کوئی سنہری طمع، مربیانہ یا سرمایہ دارانہ دباؤ اس میں حائل نہ ہو سکے - اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہ ہو یہ مدرسہ انشاءاللہ تعالیٰ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا - اور اگر کوئی آمدنی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی حاکم محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا - اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی - کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائیگا الغرض آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سر و سامانی ملحوظ رہے - سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

ب۔ کارکنان خدام اور مستفیضین کی جماعت جملہ اثرات سے محفوظ اور مامون ہوکر ولی اللہی مسلک پر شدت سے عمل پیرا رہے۔ جس کے متعلق تمام عالم اسلامی کا اتفاق ہے۔ کہ وہ سنت قدیمہ اور مسلک اسلاف کے عین مطابق تھا۔ افراط تفریط کے اتار چڑھاؤ میں جادۂ مستقیم تھا اور معیار صحیح تھا۔

یہ بات ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور مثل علماء روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

ج۔ خودرائی۔ انفرادی رائے اور استبداد (جو شرعی اور نیز تاریخی حیثیت سے بربادی مسلم کا واحد ذمہ دار رہا ہے) کے برخلاف باہمی مشاورت کے ساتھ اجتماعی حیثیت سے کام کرنے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

چند ضمنی چیزیں

(۱) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی۔ کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بقا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے ہر وقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ ہو۔ سخن پروری نہو۔

(۲) اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہوں۔

(۳) سامعین اس کو بہ نیت نیک سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہو بدل وجان قبول کریں گے۔

(۴) اور نیز اس وجہ سے اپنی رائے کی پچ نہو۔ بلکہ مفاد مدرسہ پیش نظر ہو ضرورت ہے کہ مہتمم مشورہ طلب امور میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ مشورہ میں خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی اور جو علم وعقل رکھتا ہو۔ اس نوع کے مدرسوں اور کا خیر اندیش ہو۔

(۵) اور نیز اسی وجہ سے مُصر درہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدرِ ضرورت اہلِ شورہ کی مقدارِ معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو۔ تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ | چونکہ دارالعلوم دیوبند کا مدار توکل، اعتماد علی اللہ، باہمی تعاون اور مشاورت پر تھا۔ اسواسطے ابتداہی سے اس کے لئے ایک مجلس شوریٰ مرتب کی گئی جس کے ارکین حسب ذیل تھے:۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ۔ حضرت حاجی حافظ سید عابد حسین صاحب دیوبندی۔ مولانا مہتاب علی صاحب دیوبندی (حضرت شیخ الہندؒ کے عمِ اکبر) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب (حضرت شیخ الہند کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمن صاحب۔ (والد ماجد مولانا حبیب الرحمن صاحب و مولانا عزیز الرحمن صاحب و مولانا شبیر احمد صاحب) منشی فضل حق صاحب دیوبندی شیخ نہال احمد صاحب رئیس دیوبند۔

سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی عابد حسینؒ تھے جن کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ آپ ہی محرک اول اور سب سے پہلے چندہ دینے والے تھے۔

لیکن یکم شعبان ۱۲۸۳ھ کو حضرت حاجی صاحب عازم حج بیت اللہ ہوئے۔ تو فرائض اہتمام جناب مولانا رفیع الدین صاحبؒ دیوبندی کے سپرد ہوئے۔ آپ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے خلیفہ ارشد تھے اور خود بھی ولی کامل اور شیخ وقت تھے۔

دارالعلوم کا دوسرا طبقہ از ۱۲۹۷ھ تا ۱۳۲۳ھ | ۱۲۹۷ھ میں حجۃ الاسلام سیدنا و مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وفات ہوئی۔ آپ کی وفات پر امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے فرمایا تھا۔ سالار قافلہ چل بسا۔ جو کبھی خود بھی شہید ہوتا اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے کر شہید کراتا۔

حجۃ الاسلام اگرچہ دارالعلوم دیوبند کی روح رواں اور بانی مدرسہ تھے لیکن صدارت یا اہتمام کبھی آپ نے منظور نہیں فرمایا۔ وفات کے وقت اور وفات کے بعد بھی صدارت پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور اہتمام پر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس اللہ سرہما العزیز قائم رہے۔

حضرت امام ربانی جناب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی بدرجہ سرپرست اور مربی مدرسہ رہے۔ ارباب حل وعقد موجود ہی تھے۔ لیکن اہم امور میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کی رائے بھی لی جاتی تھی۔ مگر باوجود اس عظمت وتقدس کے حضرت محترم کے ارشاد عالی پر اراکین شوریٰ رائے زنی بھی کرتے تھے۔

حضرت موصوف کی سرپرستی یوم وفات (یعنی روز جمعہ بتاریخ ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء) تک برابر جاری رہی، آپ اسی اثنا میں بسا اوقات دیوبند تشریف لاکر بچشم خود حالات کا معائنہ بھی فرماتے۔ وفات سے چند سال پیشتر تک آپ کا سلسلہ درس گنگوہ شریف میں جاری رہا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد طلبہ حاضر خدمت ہوتے تھے اور اکتساب فیوض کرتے تھے۔

سیاسی ماحول ۱۸۵۷ء نے جس طرح ہندوستانی کو ہر ایک اقتدار سے محروم کردیا تھا اسی طرح اسکو قوت مدافعت سے بھی محروم کردیا اسلحہ ضبط کرکے شجاعان ہند کو عورتوں کی صف میں کھڑا کردیا۔ حتیٰ کہ بندوق کی شکلیں بھیانک معلوم ہونے لگی اس کی آواز سے دل کانپنے لگا۔ بلاشبہ احساسات حریت پامال کردیئے گئے۔ مگر تاہم یہ ایک فطری جذبہ ہے اس کا اثر یقیناً باقی رہ گیا۔ اگرچہ اس کے اظہار سے بالخصوص مسلمان بہت زیادہ خائف تھے۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ۱۸۵۷ء کی عبرتناک داروگیر نے ان کو اس درجہ تباہ کردیا تھا کہ اپنی اولاد کو بھی وفاداری کی وصیت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ مسٹر رسل کا بیان ہے:

"مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا۔ اور قتل کرنے سے قبل خنزیر کی چربی ان کے بدن پر مل گئی۔ اور پھر انہیں جلادیا گیا۔" (تمغہ کا دوسرا رخ مصنفہ ایڈورڈ ٹامسن ص۴۲)

۱۸۵۸ء میں جبکہ ہندوستان براہ راست برطانیہ سے وابستہ ہوا تو اگرچہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے تمام مذاہب کی آزادی کا اعلان کردیا تھا۔ مگر سیاسی امور کے متعلق جو خوف جاگزیں ہوچکا تھا۔ وہ بدستور ترقی پذیر رہا بہر حال فطری جذبہ کبھی محو نہیں ہوسکتا اگرچہ مغلوب ہوسکتا ہے۔

لیکن اب اسلحہ کی جھنکار کے ساتھ اس جذبہ فطری کے اظہار کا موقعہ نہ تھا۔ لامحالہ آئینی طریقوں کو

اختیار کیا گیا اور اس مقصد کے پیش نظر آئینی طریقوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ اور باشندہ حقوق کا تحفظ کیا جائے ۱۸۸۵ء میں اہل ہند کی باشتراک جملہ اقوام ہند ایک انجمن قائم کی گئی جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔

اسی خوفزدگی کی بنا پر جس میں مسلمان تقریباً تیس سال سے مبتلا تھے اور اب ان کا ایک حد تک وراثتی حصہ ہوگیا تھا مسلمان اس میں شریک ہونے سے مجتنب ہوئے۔ اور اس خوئے بد کو چھپانے کے لئے مختلف قسم کے حیلے کرنے شروع کئے۔ مثلاً ایک حیلہ یہ تراشا گیا کہ آیا ایک غیر مسلم قوم سے مل کر کسی انجمن کے ماتحت کام کرنا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے زمانہ میں مندرجہ ذیل فتویٰ دریافت کیا گیا۔

ایک جماعت قومی مسمّی بہ انڈین نیشنل کانگریس جو ہندو مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی واسطے رفع تکالیف اور جلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے۔ اور اس کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انھیں امور میں ہو جو کل جماعتہائے ہند پر مشتمل ہوں۔ اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کے لئے مضر ہو یا خلاف سرکار ہو۔ تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔ (نصرت الابرار ص ۱۳ بلفظہ)

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان مل کر معاملہ کریں بشرط عدم نقصان دین جائز ہے۔ نصرت الابرار ص ۱۵

جس طرح ارباب سیاست انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی اور ان کے مقابلہ پر سرکار پرست مسلم ایسوسی ایشن قائم کر رہے تھے۔ حضرات علمائے کرام بھی تنظیم ملت، حریت و ترقی کے صحیح اور مستحکم اصول کے قائم کرنے میں نہایت خاموشی کے ساتھ سرگرم جدوجہد تھے۔

بلا شبہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جو جماعت خوگر شہادت رہی ہو جس کی انتہائی تمنا صدیوں سے موت احمر ہو وہ خود کو بے دست و پا دیکھ کر جس قدر حیران اور مایوس ہو کم ہے۔ لیکن ساٹھ برس بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد علمائے کرام ایک لمحہ کے لئے بھی مصروف تن آسانی یا مبتلائے غفلت نہیں ہوئے خود دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک عمیق ترین کامیاب سیاست تھی۔

جس زمانہ میں سرسید احمد صاحب مرحوم گورنمنٹ برطانیہ کو مسلمانوں کا قبلہ مقصود بتاتے ہوئے

مسجود ہونے کی فرمائش کر رہے ہوں۔ اور اس جدید قبلہ کی طرف ادائے نماز کی تلقین کے لئے علی گڈھ کالج قائم کر رہے تھا تو دارالعلوم دیوبند کے متعلق حضرت ربانی کا یہ اصول کہ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ ایک عظیم الشان روشن مستقبل اور ایک ایسے گہرے تدبر کا پتہ دے رہا تھا کہ غیر کے دماغ اس کے وہم وگمان سے بھی خالی تھے۔

آج سے زائد اس زمانہ میں (بزعم خود) روشن خیال طبقہ نے علماء کرام کے طرز کو امت اسلامیہ کے لئے تباہ کن ظاہر کیا اس پر بہت کچھ مذاق اڑایا گیا۔ اس کے برخلاف غلط پروپیگنڈا کیا کہ علمائے کرام انگریزی زبان سیکھنے سے منع کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ساٹھ سال بعد دنیا نے خود دیکھ لیا کہ کون طبقہ دوررس تھا۔ زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے آنیوالی حقیقت سے کون زیادہ آشنا تھا۔ مدعیان پالٹکس کا شور ہے کہ انگریز کو اب پہچانا لیکن ان بوریہ نشینوں کی ذکاوت پر جس قدر تشکر و امتنان کے نذرانے نثار کئے جائیں کم ہے۔ کہ انھوں نے اول ملاقات ہی میں سر سے پاؤں تک انگریز کو پہچان کر حفاظتی تدبیریں شروع کر دیں۔ جن کی بدولت آج ہم بحمد اللہ محسوس کر رہے ہیں کہ ابھی مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔

طبقہ ثالثہ از ۱۳۲۳ھ تا ۱۳۲۶ھ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند | امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی وفات ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو ہوئی۔

جملہ متوسلین دیوبند کا اتفاق ہے کہ ان دونوں (حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی) کے سب سے زیادہ محبوب اور روحانی فرزند اور ارشد ترین تلمیذ و عقیدتمند وہ مقدس بزرگ تھے جن کا اسم بامسمیٰ محمود الحسن تھا۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔

آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی رکن اول مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند تھے۔ ابتداہی سے آپ کو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ یعنی کامل آفتاب کی خدمت میں ایسا صاف و شفاف اور باکمال آئینہ پیش کیا جو نور کے ساتھ حرارت اور جملہ خصوصیات بھی اپنے اندر جذب کرے۔ چنانچہ اس آئینہ نے اولاً مولانا محمد قاسم صاحب کے پرتو فیض سے مکمل طور پر اپنے سینہ کو معمور کر لیا اور پھر ارباب رشیدی کا بہترین ہیرو بن کر جملہ خصوصیات سے دامن بھر گیا۔ اور اس طرح

قاسمی اور رشیدی آفتابوں کا پرتو نور بن کر عالم میں چمکا۔

مولانا مرحوم کے مجمل اور مختصر حالات | جن حضرات نے مولانا مرحوم کو دیکھا ہے اور ان کی اخلاقی لائف پر نظر ڈالی ہے حقیقت حال یہ ہے کہ وہی حضرات آپ کے کمالات سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ البتہ کچھ کیفیت جو بطور نمونہ از خروارے ہوگی پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ حالات جو شیخ محترم حضرت مولانا امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ کی تحریر سے حاصل کر سکا۔

مولانا مرحوم کو قدرت کی فیاضیوں نے ایک ایسا دل دیا تھا جس کی وسعت سات سمندروں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا۔ وہ سب کچھ حضرت مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی قدس اللہ اسرارہما ہی کا فیض تھا۔ مگر حسن قابلیت اور مبدأ فیاض کے کرم نے نہایت ہی عجیب و عدیم النظیر شگوفہ بنا دیا تھا۔

آپ ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم کے شیخ الحدیث بنائے گئے۔ علاوہ درس کے ساتھ سلسلہ تصانیف بھی بہت قوت کے ساتھ رہا جس کی آخری اور بہترین کڑی قرآن پاک کا وہ الہامی ترجمہ ہے جس کو باتفاق علمائے دیوبند بے نظیر تسلیم کیا جاتا ہے جس کو مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ بجنور نے طبع کرایا ہے۔

مولانا کا ماحول | بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کو حد سے زیادہ بےچین کر دیا تھا چنانچہ اس وقت حسب طریقہ استاد اکبر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا مرحوم نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔ فتوے چھپوائے۔ مدرسہ کو بند کرایا۔ طلبہ کے وفود بھجوائے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سیاست کی طرف آنکھ اٹھانا ۱۹۰۵ء کا سماں باندھتی تھی۔ آزادی کا خواب بھی اگر کسی کو دکھائی دیتا تھا۔ تو اس کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ خود مختار حکومت کی خواہش زبان پر لانا برق جہانسوز سے زیادہ تباہ کن شمار ہوتا تھا۔ برطانی ہتھوڑے نے عالم کے دل و دماغ پر اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس قدر موجودہ حکومت کا خوف تھا خدائے قہار کے خوف کا تو دسواں بلکہ سوواں حصہ بھی اثر نہ تھا۔ جیسا کہ اب بھی بہت سی ہستیاں اسی خیال میں ہیں۔ اس ماحول کو دیکھتے ہوئے ایک شخص کو بھی ہم خیال بنا لینا

بڑی کامیابی تھی۔

آپ کا رب سے پہلا اور سب سے اہم کام یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی منتشر جماعتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ ان میں امتیاز، اخلاص اور فدائیت کے جذبات پیدا کئے جائیں اور اجتماعی کارناموں کی پرانی تاریخ ان کو یاد دلائی جائے۔

انجمن موتمر الانصار | مذکورہ بالا اصول خدمت کے پیش نظر عموماً اور مختلف مدارس عربیہ کو ایک سلسلہ میں منسلک کرلنے کے لئے خصوصاً ایک انجمن مسمّٰی بہ موتمر الانصار قائم کی گئی۔ چنانچہ اس جمعیتہ کے زرین مقاصد میں اہم مقصد یہ تھا کہ جدید مدارس اسلامیہ کو ایک سلسلہ میں منسلک کرلیا جائے۔ جس کا مرکز دارالعلوم دیوبند کو قرار دیا گیا شعبۂ نظام تعلیم کے سلسلہ میں علی گڈھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا کہ انگریزی خواندہ طلبہ جو تبلیغ اسلام کا شوق رکھیں وہ دارالعلوم دیوبند میں جاکر علوم اسلامیہ حاصل کریں دارالعلوم دیوبند اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڈھ کالج ان طلبہ کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دیگا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر علی گڈھ کالج جائیں گے۔

جمعیتہ الانصار ۱۳۲۸ھ میں دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کا مشہور و معروف جلسہ دستار بندی منعقدہ ۱۳۲۸ھ جو تقریباً تیس ہزار کے مجمع پر مشتمل تھا۔ اور جس کو عجیب و غریب خصوصیات کے باعث علمائے ربانین کی کرامات کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس جمعیتہ الانصار کی نشاۃ ثانیہ کی عمومی شکل تھی۔ جمعیتہ الانصار کے روح رواں اور بانی مبانی حضرت شیخ الہندؒ تھے۔

اس تحریک کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ جمعیتہ الانصار اولڈ بوائے ایسوسی ایشن کی نقل ہے لیکن یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جمعیتہ الانصار کی بنیاد دراصل مولانا شیخ الہندؒ کے طالب علمی کے زمانہ ہی میں پڑچکی تھی لیکن چونکہ یہ تحریک اس وقت ضروریات زمانہ سے متعلق نہ تھی اس واسطے رک گئی۔ اور اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت کہ ضرورت ہر چیز کو خود بخود پیدا کرلیتی ہے ۱۳۲۷ھ میں اس انجمن کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ یہ انجمن ہرگز کسی دوسری انجمن کی نقل نہیں تھی۔ اور نہ کسی قسم کے ذاتی مقاصد سے بحیثیت دنیاوی اس کا تعلق تھا۔ بلکہ اس کے مقاصد وہ مقاصد تھے جن کی اس وقت بہت زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا

جسمیں کہ مسلمانوں کے سیاسی احساسات مفقود ہو چکے تھے۔ بعد میں جو اہل ہنود اور مسلمان سیاسی لیڈر جو تحریک خلافت اور تحریک کانگریس کے زمانہ میں ہندوستان کے زعیم و قائد قرار دیئے گئے اس وقت سیاسی پلیٹ فارموں سے بہت دور تھے۔ بہت سے بلکہ عموماً سب ہی وہ تھے جو مختلف اغراض پر ٹکٹکی لگائے ہوئے کوئے برطانیہ کا طواف کر رہے تھے۔ یقیناً اس وقت جمعیتہ الانصار کا وجود مسلمانوں میں سیاسی احساس کے لئے بانگ درا تھا۔ جس نے اس وقت حیرت انگیز سرعت کے ساتھ مسلمانوں میں احساس اور ان کے پژمردہ جذبات میں اشتعال پیدا کر دیا۔

شوال ۱۳۲۹ھ میں موتمر الانصار کا پہلا اجلاس مرادآباد میں منعقد ہوا۔ لیکن یہ پہلا اجلاس اپنی حیرت انگیز مقبولیت اور شاندار عظمت سے بتا رہا تھا کہ تنظیم ملت کے لئے یہ شاندار قدم انڈین نیشنل کانگریس سے بھی زیادہ باوقعت ہو کر قوم مسلم کی تمام نکبت کو دور کر دیگا۔ اور ملکی فلاح کے لئے بہترین شاہکار ہوگا۔ بظاہر اس کے مقاصد سیاسیات سے بالکل غیر متعلق تھے اسی کے اغراض و مقاصد کی تشریح کے ساتھ یہ جملہ بھی تھا، ملکی معاملات سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے:

مگر یہ حقیقت نہایت حیرت انگیز ہے کہ اس کے قیام کے صرف دو سال بعد ہی اس کے سرگرم کارکن حضرات کو ہندوستان سے جلاوطن کر دیا گیا۔

اس کے ناظم اعلیٰ مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ براہ کابل کسی دوسرے ملک میں چلے گئے۔ جو آجکل حجاز مقدس میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد میاں صاحب معتمد خاص نے افغانستان کی جانب ہجرت کی۔ مولانا احمداللہ صاحب پانی پتی وغیرہ ہندوستان میں گرفتار کر لئے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ۔ مولانا عزیر گل صاحب۔ مولانا حکیم نصرت حسین صاحب حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں سے یہ سب حضرات نیز جناب استاد محترم مولانا سید حسین احمد صاحب۔ مولانا وحید احمد صاحب۔ پانچوں حضرات کو باعانت شریف مکہ گرفتار کرا کر مصر لیجایا گیا اور وہاں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کے ضمن میں جو سوالات حضرت شیخ الہندؒ سے کئے گئے ان کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ نیز مولانا شیخ الہندؒ کے جوابات بھی درج ہیں۔ جو درحقیقت حضرت شیخ الہندؒ کی ذکاوت طبع کا مرقع ہیں۔

ج ۔ آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا ؟ مولانا ۔ اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر

ج ۔ آپ نے اس پر کیوں نہ دستخط کئے ؟ م ۔ مخالف شریعت تھا۔

ج ۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندوستان میں پیش کیا گیا تھا۔ م ۔ ہاں

ج ۔ پھر آپ نے کیا کیا ؟ م :۔ رد کر دیا

ج ۔ کیوں ؟ م :۔ مخالف شریعت تھا

ج ۔ آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں ؟ م :۔ ہاں

ج ۔ کہاں سے جانتے ہیں ؟ م :۔ انھوں نے مجھ سے عرصہ دراز تک پڑھا ہے

ج ۔ وہ اب کہاں ہیں ؟

م ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ میں عرصہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوتا ہے کہ حجاز وغیرہ میں ہوں۔

ج ۔ ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے ؟ م :۔ مجھ کو کچھ علم نہیں نہ میں نے دیکھا

ج ۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں شریک ہیں۔ اور آپ فوجی کمانڈر ہیں۔

م ۔ وہ اگر لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا ۔ بھلا میں اور فوجی کمانداری میری جیسی حالت ملاحظہ فرمائیے۔ اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے ۔ میں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گذرانی ۔ مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت۔

ج ۔ اس نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی ؟ م :۔ محض مدرسہ کے مفاد کے لئے۔

ج ۔ غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے ؟ م :۔ غالب نامہ کیا ؟

ج ۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا ہے اور آپ نے غالب پادشاہ سے اس کو حاصل کیا ہے۔

م ۔ مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں ۔ وہ میرا رفیق سفر تھا مدینہ منورہ سے مجھ سے جدا ہوا ہے۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مکہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھیرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے ؟ جس کو آپ میری طرف منسوب کرتے ہیں ؟

ج - محمد میاں کے پاس ہے۔ م - مولوی محمد میاں کہاں ہیں

ج - وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلا گیا۔ م - پھر آپ کو خط کا پتہ کیونکر چلا؟

ج - لوگوں نے دیکھا۔

م - آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشاہ گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی - میرا وہاں تک کہاں گذر ہو سکتا ہے پھر میں ناواقف شخص نہ زبان ترکی جانوں نہ پہلے سے ترکی حکام سے ربط ضبط۔ حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہنچا - اپنے امور دینیہ میں مشغول ہو گیا۔ غالب پاشا حجاز کا اگرچہ گورنر تھا مگر طائف میں رہتا تھا۔ میری وہاں تک رسائی نہ حج کے پہلے ہو سکتی تھی نہ بعد از حج - یہ بالکل غیر معقول بات ہے۔ کسی نے یوں ہی اڑائی ہے۔

ج - ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی، اور ایران، افغانستان میں اتحاد پیدا کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت کرانا چاہتے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں۔

م - میں تعجب کرتا ہوں آپ کو بھی حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گذر چکے ہیں کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرا جیسا شخص زائل کر سکتا ہے - اور پھر اگر زائل بھی ہو جائے تو کیا ان میں ایسی قوت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کے حدود پر فوجیں پہنچا دیں۔ اور اگر پہنچا بھی دیں تو آیا ان میں آپ سے طاقت جنگ ہوگی۔

ج - فرماتے تو آپ سچ ہیں مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہے۔

م - اس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسیں کی باتیں کس قدر پایہ اعتبار رکھ سکتی ہیں (سفرنامہ شیخ الہندؒ مصنفہ مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ)۔

غرضکہ اسی قسم کے بہت سے سوالات وہ کرتا رہا۔ حدود افغانستان دنیز کابل وغیرہ کی نسبت بھی اس نے سوالات کئے۔ مولانا محترم بھی مختصر مختصر جملوں میں مگر نہایت بے رخی کے ساتھ جواب دیتے رہے۔

وہ سب کو انگریزی میں لکھتا رہا۔ اور پھر مولانا کو جیل میں واپس کر دیا۔

جمعیتہ علمائے ہند دہلی | جمعیتہ علمائے ہند دہلی چونکہ مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کی وہ کڑی ہے جو کسی میدان میں کسی وقت پیچھے نہیں رہی اور جس کا قیام مولانا شیخ الہند رح کے زمانہ میں عمل میں آیا اسواسطے یہاں پر اس کو چھوڑنا حقیقتاً دارالعلوم دیوبند کے اہم ترین کارنامہ پر پانی پھیرنا ہے۔

علمائے کرام کا فرض تھا کہ حضرت شیخ الہند رح کی گرفتاری کے بعد حضرت شیخ رح کے مسلک پر زاید از زاید قربانیاں پیش کرتے۔ مگر ایسا نہوا بالاخر اسلامی دنیا کے لئے منحوس دور آیا خلافت اسلامیہ کا زوال۔ ترکان احرار کے ملک کے حصے بخرے دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس نے گورنمنٹ برطانیہ سے ان وعدوں کا ایفا چاہا جو جنگ کے زمانہ میں ہندوستان سے کئے گئے۔ یعنی آزاد حکومت خود اختیاری۔ باہم رول مقامات مقدسہ کی توہین نے مسلم خوابیدہ کو چونکا دیا۔ وہ دیوانہ وار میدان کی طرف دوڑا۔ لیکن اس لئے جھجک کر رہ گیا کہ جماعت علما وہاں موجود نہ تھی جو اس کی راہنمائی کرتی۔

جمعیتہ علما حضرت مولانا عبدالباری صاحب رح (فرنگی محل لکھنؤ) کے اس احسان کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ کہ اس زمانہ کے علما ہند میں بیدار ہو کر دوڑنے والے آپ ہی تھے۔ آپ نے اپنی پوری کوشش احیائے ملت میں صرف کر دی۔

اس سلسلہ کے متعلق تحقیق کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنی جیب خاص سے محض ریل کے کرایہ وغیرہ میں جو حضرت مولانا موصوف نے خرچ کیا اس کی مقدار ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ ۱۲۰۰۰۰

لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ تردد تھا یا سستی کہ علمائے کرام نے عملی اثر قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ سیدنا مولانا شیخ الہند رح کو مالٹا سے رہا کر دیا گیا۔ ساحل ہند پر حضرت شیخ رح کے قافلہ کا ورود ہوا کہ ایک روح مشرق سے مغرب تک دوڑ گئی۔ اور قریب قریب جملہ علمائے ہند بلا تفریق عقائد و خیالات میدان عمل میں ظہور فرما ہو گئے اور نہ معلوم کس غیبی قوت نے حضرت مولانا محمود الحسن رح کو متفقہ شیخ الہند بنا کر تمام علمائے ہند کا قائد اعظم بنا دیا۔ اور ایک بے نظیر اتحاد کا روح پرور نظارہ ہندوستان کے طول و عرض میں جلوہ فرما ہوا۔ جس کی نظیر سے تاریخ ہند خالی ہے۔

اس وقت دیگر اقوام ہند کے سامنے صرف ایک مسئلہ پیش تھا یعنی آزادیِ وطن لیکن مسلمانوں کے سامنے دو مسئلے پیش تھے آزادیِ وطن اور آزادیِ خلافت۔

گذشتہ واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ جس طرح مسلمانوں کے فرائض دو چند تھے اسی طرح ان کی جدوجہد بھی جملہ اقوام ہند سے زیادہ تھی۔

آزادیِ خلافت کے لئے انھوں نے مجلس خلافت قائم کیں اور آزادیِ وطن کیواسطے کانگریس میں شرکت کرکے اس کو چار چاند لگا دئے۔

لیکن اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام مسلمانوں میں جس نے جدوجہد کی روح پھونکی۔ وہ سیدنا شیخ الہندؒ کی مخلصانہ صدا تھی جس کی پشت پر حضرت شیخ کی پچاس سالہ خفیہ جدوجہد۔ ایثار و خلوص تھا۔ درحقیقت یہ طویل اور ممتد جذبۂ ایثار تمام ہندوستان میں نفخ روح کا باعث ہوا اور اسی نے اس وقت تمام علما کو بے چین کرکے ایک مرکز پر جمع کر دیا۔

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری شوال ۱۳۳۹ھ میں ہوئی ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں دہلی میں جمعیۃ العلما کا دوسرا اجلاس ہوا جس میں علمائے ہند نے بے نظیر جذبات کے ساتھ شرکت کرکے ترک موالات۔ جہاد حریت کو مسلمانوں پر لازم قرار دیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات حضرت محترم کو وجع المفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ اس پر مالٹا کی برفبار سردی۔ پیرانہ سالی قید و بند کے تمام مصائب مگر استقلال و ہمت جوانوں سے بھی زیادہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی علالت سلسلہ واپسی ہند سے پیشتر ہی شروع ہو گیا۔ یہاں مرض روز بروز ترقی کرتا رہا۔ اس کے باوجود تحریک میں بے پناہ شرکت سے کبھی جی نہیں چرایا۔ تپ دق کا آخری اسٹیج ہے۔ نقل و حرکت مشکل ہے مگر اسی حالت میں مشوروں میں شرکت۔ تحریک کی قیادت اور آئندہ کے لئے پروگرام کی تعیین اور پھر جمعیۃ علمائے ہند اور علی گڈھ یونیورسٹی کے طلبہ کے جلسوں کی صدارتی شرکت جاری ہے۔ اور اسی حالت میں جامعہ ملیہ کا (۱۳۳۹ھ) قیام فرمایا جا رہا ہے۔

افسوس میرے سامنے حضرت محترم مولانا شیخ الہندؒ کا خطبہ صدارت نہیں ہے۔ جو غالباً ضبط کر لیا گیا ہے۔

ورنہ آپ کے سامنے موصوف کی الوداعی تقریر یا آخری وصیت پیش کرکے ان حضرات سے جو عدام جمعیۃ کو ہندو پرست یا معاذ اللہ گاندھی پرست کہتے ہیں سوال کرتا کہ آج جمعیۃ العلما کے حسب ہدایت تحریک کانگریس میں شرکت کرنے والے حضرات اگر ہندو پرست یا گاندھی پرست ہیں تو شیخ الہندؒ کے متعلق آپ کا کیا فتویٰ ہے۔

بہر حال مسلمانان ہند کے قلوب میں جذبات حریت اور احساس آزادی وطن کی ایک لہر پھیلاتے ہوئے ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو حضرت موصوف نے عالم آخرت کی طرف داعی کو لبیک کہا۔ اور اپنی مقدس زندگی کے بے پناہ مخلصانہ مساعی اور پھر دور ابتلا اور امتحان کو آئندہ اسلامی نسلوں کے لئے بہترین درس عبرت چھوڑا۔

دار العلوم کا چوتھا طبقہ :۔ **مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ** | آپ نے مولانا شیخ الہندؒ کے زمانہ اسارت ہی میں دار العلوم میں صدر مدرس کے فرائض انجام دینے شروع کر دئے تھے آپ نے ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۳۷ھ تک نائب کے فرائض انجام دئے۔ اور ۳۸ھ میں مستقل صدر مدرس ہوگئے۔ یہ سلسلہ ۴۶ھ تک جاری رہا اس کے بعد آپ کو اختلافات کی بنا پر ۴۶ھ میں مدرسہ چھوڑنا پڑا اور مدرسہ ڈابھیل کی بنا ڈالی۔

مولانا سید حسین احمد صاحب | مولانا محمد انور شاہ صاحب کے مدرسہ چھوڑنے کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے اس مسند کو سنبھالا اور اس وقت تک آپ ہی اس عہدہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا سیاسی ماحول آپ کی پرائیویٹ زندگی کے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں اسولسطے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اب مدرسہ کی موجودہ حالت کی طرف متوجہ ہوں۔

سب سے پہلے ضروری ہے کہ مدرسہ کے ذمہ داران عہدہ کا تذکرہ ابتدا وقت سے آپ کے سامنے ذکر کروں اور اس کے بعد مدرسہ کی موجودہ حالت۔ اور دیگر شعبوں کا تذکرہ با تفصیل ذکر کروں۔

دار العلوم کے سب سے بڑے عہدے تین تسلیم کئے جا سکتے ہیں۔ سرپرست مہتمم۔ صدر مدرس چوتھا عہدہ نائب مہتمم کا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ عہدہ ابتدا میں نہیں تھا۔ بعد میں اس کی ابتدا ہوئی اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

سرپرست دار العلوم دیوبند

(۱) دار العلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانی دار العلوم مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہیں۔

(۲) آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ،

(۳) آپ کی وفات کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ جو ۱۲۹۷ھ میں مقرر ہوئے۔

(۴) آپ کی وفات کے بعد جو تھے سرپرست مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہندؒ ۱۳۲۳ھ میں سرپرست ہوئے۔

(۵) آپ کے بعد پانچویں سرپرست مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی ہوئے۔

(۶) آپ کے بعد موجودہ سرپرست جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی کو سمجھنا چاہئے جو اس وقت دارالعلوم میں یہ عہدہ صدر مہتمم بھی فائز ہیں اور مدرسہ ڈابھیل میں صدر مدرس بھی۔

مہتممین دارالعلوم دیوبند

(۱) سب سے پہلے ناظم و مہتمم جناب حاجی مولانا محمد عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ ہیں از ۱۲۸۳ھ تا ۱۲۸۴ھ

(۲) دوسرے مہتمم جناب مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ ہیں۔ از ۱۲۸۴ھ تا ۱۳۰۶ھ

(۳) تیسرے مہتمم جناب مولانا حاجی محمد فضل صاحبؒ دیوبندی تھے۔ از ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۱ھ صرف ایک سال۔

(۴) چوتھے مہتمم جناب مولانا مولوی محمد منیر صاحب نانوتویؒ از ۱۳۱۱ھ تا ۱۳۱۲ھ۔ " "

(۵) پانچویں مہتمم جناب مولانا مولوی حافظ محمد احمد صاحب۔ ابن مولانا محمد قاسم صاحب از ۱۳۱۲ھ تا ۱۳۴۷ھ

(۶) چھٹے مہتمم جناب مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب از ۱۳۴۷ھ تا ۱۳۴۸ھ (صرف ۱½ سال)

(۷) ساتویں مہتمم جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب از ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۵ھ

(۸) آٹھویں مہتمم جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی (صدر مدرس مدرسہ ڈابھیل) موجودہ مہتمم

نوٹ:۔ جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب قدس سرہ کا عہد اہتمام تمام دوروں سے زیادہ ممتاز اور پُر شوکت وہیبت گذرا ہے یہ دور مسلسل ۳۵ برس رہا۔ اور اس مدت میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔ حضرت ممدوح کی آبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دارالعلوم کے حلقۂ اثر کو وسیع تر بنایا۔ مالی امداد میں کثیر تعداد میں بڑھیں بڑی بڑی عمارتیں مثل دارالطلبہ قدیم۔ دارالطلبہ جدید (جو ابھی زیر تعمیر ہے) دارالحدیث، مسجد مدرسہ کتب خانہ، دارالمشورہ اور مختلف وسیع احاطے وغیرہ ارض دارالعلوم پر نمایاں ہوئے کارکنوں میں اضافہ ہوا۔ اور حاصل یہ کہ اس درسگاہ نے مدرسہ سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ (یونیورسٹی) کی حیثیت اختیار کر لی۔

نائب مہتممین | نیابت کا سلسلہ مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے چنانچہ آپ کے بعد

(۱) سب سے پہلے نائب مولانا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ہوئے۔ از ۱۳۲۵ھ تا ۱۳۴۷ھ

(۲) دوسرے نائب مہتمم جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحبؒ از ۱۳۴۲ھ تا ۱۳۴۸ھ (اس کے بعد مہتمم ہوگئے)

(۳) تیسرے نائب جناب مولانا مبارک علی صاحب نگینوی

(۴) چوتھے نائب مہتمم جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب } موجودہ نائب مہتممین حضرات

نوٹ:۔ چونکہ اس وقت صدر مہتمم جناب مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی ہیں اور وہ ڈابھیل میں مدرسی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں اسواسطے اس وقت دو نائبوں کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ مولانا مولوی محمد طیب صاحب آپ کی غیبوبت میں صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور آپ کی موجودگی میں نیابت کے۔ بہرحال موجودہ زمانہ میں نائب مہتممین حضرات دو صاحبان ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرسین حضرات

(۱) دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس جناب مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تھے۔ از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۰۲ھ

(۲) دوسرے صدر مدرس جناب مولانا سید احمد صاحب بریلوی تھے از ۱۳۰۳ھ تا ۱۳۰۷ھ

(۳) تیسرے صدر مدرس جناب مولانا مولوی محمود الحسن صاحب شیخ الہندؒ تھے۔ از ۱۳۰۸ھ تا ۱۳۳۳ھ

(۴) چوتھے صدر مدرس جناب مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری تھے از ۱۳۳۳ھ تا ۱۳۴۴ھ

(۵) پانچویں صدر مدرس جناب مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی ہیں۔ موجودہ صدر مدرس ۱۳۴۵ھ

نوٹ جناب مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری ۱۳۳۲ھ میں نائب صدر مدرس کی حیثیت سے کام انجام دیتے تھے چونکہ مولانا شیخ الہندؒ اسیر مالٹا تھے۔ لیکن ۱۳۳۳ھ میں مستقل صدر مدرس ہوگئے۔

دارالعلوم کے مفتی | افتا کا عہدہ بھی دارالعلوم میں اپنے کارکنوں کے لحاظ سے شروع ہی سے ممتاز رہا ہے جس کے ذریعہ عامۃ المسلمین کی عظیم الشان خدمت انجام پاتی رہی ہے۔

(۱) سب سے پہلے مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب تھے دیوبندی

(۲) آپ کے بعد حضرت مولانا مولوی ریاض الدین صاحب، بجنوری

(۳) آپ کے بعد جناب مولانا مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی

(۴) آپ کے بعد جناب مولانا سہول صاحب (بہت تھوڑے عرصہ کے لئے)

(۵) پانچویں اور موجودہ مفتی جناب مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب سہارنپوری۔

نوٹ:۔ دارالافتا میں استفتوں کا سالانہ اوسط آٹھ دس ہزار ہے۔

دارالعلوم کا حصّہ تصانیف میں | علمائے دیوبند کا حصہ تصانیف میں کسی صورت میں کسی اور ادارہ سے کم نہیں بلکہ حقیقتاً کوئی اور دوسرا ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

حضرت بانی دارالعلوم دیوبند کی کتنی ہی متکلمانہ تصنیفیں منظر عام پر آچکی ہیں حضرت مولانا شیخ الہند رح کی محدثانہ تصانیف۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کی مورخانہ و ادیبانہ تصانیف حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کی نصابانہ نیز مورخانہ تصانیف۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب بجنوری کی مناظرانہ تصانیف اس کی شاہد عدل ہیں۔

بعد کے دور میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فلسفیانہ تصانیف حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب کی محشیانہ فقہی و ادبی تصانیف۔

نئی پود کو اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو دارالعلوم کے چند جدید فضلا نے مجلس قاسم المعارف کے نام سے ایک مجلس قائم رکھی ہے جس نے تعلیمی ہند کو سب سے پہلے پبلک کے سامنے پیش کیا۔ جس کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صوبہ یوپی کے محکمہ تعلیم نے اس کو منظور کر لیا ہے، نیز وہاں سے ایک اخبار استقلال کے نام سے بھی شائع ہوتا ہے۔

قرول باغ نئی دہلی میں ایک مجلس ندوۃ المصنفین کے نام سے قائم ہوئی ہے جس کا اصل کام تصنیف و تالیف ہے۔ اور یہ کام جاری ہوگیا ہے اس سال غالباً چار کتابیں پبلک کے سامنے پیش کرنے والے ہیں۔ رسالہ برہان ماہانہ تو جاری ہو چکا ہے۔

اسی طرح دارالعلوم کے اور دوسرے اہل درس حضرات کی متعدد تصانیف جو انھوں نے تدریسی خدمات کے ساتھ تصنیفی حیثیت کے ساتھ انجام دیں ملک کے دینی حلقوں میں آجتک قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہے۔

دارالعلوم کے امتحانات | چونکہ دارالعلوم کی علمی حالت کا بیان ہو رہا ہے اس واسطے بیجا نہو گا اگر اس کے طریقہ ہائے امتحان پر بھی روشنی ڈالدی جائے۔

طلبائے کرام کی تعداد کا اندازہ تو آپ نے راقم الحروف کی اس مرقوم عبارت سے لگا لیا ہوگا جبکہ آپ کو بتایا گیا ہے کہ صرف دورہ حدیث کی جماعت دو سو سے زاید پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کثرت تعداد پر نظر ڈالتے ہوئے، یہ حقیقت مزید تعجب کا باعث ہوگی کہ امتحانات کے متعلق دارالعلوم دیوبند میں وہ شدت ہے جو کسی اور مدرسہ میں عموماً نہیں۔

امتحانات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک امتحان داخلہ یہ ان طلبہ کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے مدرسے سے آکر امسال دارالعلوم میں داخل ہونا چاہیں۔ اس میں عموماً شوال کا پورا مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ شدت استعمال کی جاتی ہے جو دیگر مدرسوں میں نہیں۔ اسی وجہ سے بسا اوقات نصف سے زاید طلبہ وہ ہوتے ہیں جو امتحان داخلہ میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے مدرسوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ دوسرے امتحانات زیر تعلیم طلبہ کے ہوتے ہیں یہ سال میں تین ہوتے ہیں۔ سہ ماہی۔ ماہ صفر المظفر میں۔ ششماہی ماہ جمادی الاول میں۔ تیسرا سالانہ ہوتا ہے عموماً ۵ ۲ رجب سے شروع ہو کر ۱۲ شعبان تک رہتا ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ جس قدر سختی سالانہ امتحان میں خاص طور سے کی جاتی ہے وہ اصولی طور پر دوسرے کالجوں میں بھی نہیں ہوتی داخلہ امتحان کے خاص خاص ضوابط ہوتے ہیں نگرانی پوری شدت سے کی جاتی ہے اور اصولی سختی یہ ہے کہ ۸۰ فیصدی نمبر ہر کتاب میں حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف ۳۳ فیصدی حاصل کرنے پڑتے ہیں اس کے علاوہ دو سختیاں اور ہیں۔

(۱) کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عموماً کتابوں کے گروپ مقرر کر دئے جاتے ہیں۔ مثلاً دو کتابیں ساتھ ساتھ ایک گروپ میں شامل کی گئیں اب ان دونوں کتابوں میں مجموعی طور سے ۳۳ نمبر حاصل کرنے چاہئیں۔ خواہ ہر ایک میں ۱۷، ۱۷ یا ایک میں مثلاً ۲۰ دوسری میں ۱۳۔ لیکن دارالعلوم میں کوئی گروپ نہیں ہوتا۔ اس کے ہر کتاب کے نمبر علیحدہ ہوتے ہیں۔ نمبروں کے چار درجے ہیں۔ ۵۰ سے زائد اعلیٰ۔ ۴۰ سے ۴۹ تک اوّل۔

۴۰ سے ۴۹ تک دوم ۔ ۵۰ سے ۴۹ تک سوم ۔ اگر کسی ایک کتاب میں ۳۰ نمبر حاصل کئے تو اس کو کمپارٹمنٹ میں سمجھا جاتا ہے اس کو اگلی کتاب پڑھنے کی اجازت مل سکتی ہے لیکن اس میں سالانہ امتحان دینا ہوگا۔

(۲) عموماً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے امتحانات میں ایک ایک کتاب کے متعلق سات سات آٹھ آٹھ سوالات ہوتے ہیں ۔ ہر سوال کے نمبر متعین ہوتے ہیں ۔ طالب علم کا حق ہوتا ہے کہ جونسے سوالات چاہے انتخاب کرکے حل کرسکتا ہے البتہ اس کا فرض ہوتا ہے کہ ۳۳ فی کتاب یا گروپ میں ۳۳ نمبر حاصل کرے ۔ خواہ وہ ایک سے ہوں یا دونوں سے لیکن دارالعلوم کے امتحانات میں ایک پرچہ میں (وہ بھی صرف ایک ہی کتاب کا) ۴ سوالات ہوتے ہیں ۔ اگر ان میں سے ایک چھوڑ دیا تو عموماً فیل ہی ہو جاتا ہے۔

شدت کے ساتھ ان تمام قیود کی پابندی کا لحاظ فرماتے ہوئے آپ کو طلبہ کی اس غیر معمولی کثرت پر تعجب ضرور ہوگا۔

دارالعلوم کی تعطیلات امتحان کا ایک لازمی جزو سمجھنا چاہئے کہ اس کے بعد عموماً تعطیلات ہوتی ہیں اسواسطے امتحانات کی تفصیل کے بعد ضروری ہے کہ یہاں کی تعطیلات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

یہاں ہر جمعہ کے علاوہ سال بھر میں ۴ چھٹیاں ہوتی ہیں ۔ رمضان شریف میں سالانہ امتحان کے بعد ۔ اس میں عید الفطر امتحان سالانہ کی چھٹیاں بھی آجاتی ہیں ۔ جو عموماً ۵ ار شعبان سے شروع ہوکر ۷ ار شوال کو ختم ہوتی ہیں۔

دوسرے عید الضحیٰ کی تعطیل جو عموماً ۹ ر ذی الحجہ سے ۱۵ ر تک ہوتی ہے۔

تیسری اور چوتھی تعطیل امتحان سہ ماہی اور ششماہی کی ۴ یوم کی جس کی صورت مجلس شوریٰ یہ پیش کرتی ہے کہ امتحان کو ہفتہ کے پہلے دن ہفتہ سے شروع کرکے ۴ دن امتحان کے اور ہفتہ کے آخری چار دن تعطیل کے ہوتے ہیں۔

دارالعلوم کی موجودہ حالت اور مختلف شعبے آج بحمداللہ اس کا احاطہ بہت وسیع ہے ۔ کئی لاکھ کی سربفلک عمارتیں کھڑی ہیں ۲۳ بڑی بڑی درسگاہیں ہیں ۔ ۸ چھوٹے بڑے دارالطلبہ ہیں مجموعی حیثیت سے تقریباً ۱۰۴ حجرے ہیں ۔ جن کے نمبروار حلقے اور ساکن رجسٹروں میں درج ہیں بہت کافی تعداد میں طلبہ ہیں ۔ جن میں سے

اکثر کے مصارف طعام، پارچہ جات، سرمائی گدا و بوتہ، فرش زرکشی، دھلائی پارچہ، معالجہ اور ان کی رہائش و جائے قیام و دیگر ضروریات کا بار بذمہ دارالعلوم ہے۔ اور ۲۷ قابل و بے نظیر مدرس ہیں جو ۱۲ علوم و فنون کی ۹۰ کتابوں کا تلامذہ کو درس دے رہے ہیں۔

تبلیغ | تبلیغ بھی درحقیقت تعلیم ہی کا ایک شعبہ ہے فرق یہ ہے کہ تعلیم میں خطاب خاص ہے اور تبلیغ میں خطاب عام۔ یا تعلیم میں سبق دیا جاتا ہے۔ اور تبلیغ کے ذریعہ اس سبق کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ بہر حال نوعیت کے لحاظ سے یہ بھی تعلیم ہی ہے تعلیم کے سلسلہ میں لوگ باہر سے آکر داخل مدرسہ ہوتے ہیں اور تبلیغی سلسلہ میں داخلی لوگ باہر جا کر مسلمانوں کو وعظ و پند کرتے ہیں جو ملک کے مختلف اجتماعات اور جلسوں میں منجانب دارالعلوم شرکت کرتے ہیں۔ اور دارالعلوم کی تعلیمات اور اس کے معتدل مسلک کو لوگوں میں رائج کرتے ہیں۔ ان کی کارگذاری کی پندرہ روزہ ڈائریاں دفتر اہتمام میں موصول ہوتی ہیں جن سے تبلیغ کے سلسلہ میں مبلغین کی مساعی مستقل فائل میں محفوظ رہتی ہیں۔ مقامات سفر، ایام سفر، عام پروگرام کی سب تفصیلات ڈائریوں میں مفصل مذکور ہوتی ہیں سال گذشتہ کی بھی شعبہ کی کارگذاری کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے پانچ مبلغین حضرات نے ایام گردگی میں اطراف ملک میں ۴۰۴ تقریریں مختلف علمی و عملی موضوعوں پر کیں۔ اور اصلاح عامہ کا حق ادا کیا۔

افتا | اس کا خاکہ گو آپ کے ذہن نشین ہو چکا ہے لیکن یہاں پر چند باتیں اور قابل تذکرہ ہیں۔

یہ شعبہ تعلیم کا ایک ایسا جزو ہے جس سے عامۃ المسلمین کی خدمت انجام دی جاتی ہے۔ سوالات پہنچنے پر شرعی جوابات ارسال کئے جاتے ہیں۔ پچھلے سال کے اعداد و شمار کے لحاظ سے جو عدد درج رجسٹر ہے وہ یہ ہے کہ ۱۸۸۱۴ فتاوی دارالعلوم سے باہر بھیجے گئے۔

دائرہ افتا میں ایک مفتی نائب مفتی دو معین مفتی اور ایک فتاوی نویس کام کر رہے ہیں۔

طب | یہ بھی ایک علمی شعبہ ہے جس میں خواہشمند طلبہ کو فن طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس شعبہ میں ایک ماہر طبیب جناب حکیم محمد عمر صاحب کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ طبیب صاحب دارالعلوم طب کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اور احاطہ مدرسہ میں مطب بھی کرتے ہیں۔ مریض طلبہ انھیں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

معالجات طلبہ کا ایک مستقل مصرف ہے جس میں ماہانہ ایک معتد بہ رقم خرچ کی جاتی ہے نسخہ جات میں رعایت رکھی جاتی ہے کہ حتی الامکان کم قیمت اور کثیر المنفعت ہوں۔ سال گذشتہ ۲۶۹۶ مریضوں کا علاج کیا گیا۔ جن کی سالانہ حاضری کا شمار ۹۶۰۳ ہوتا ہے۔ گویا ہر ماہ میں ۲۲۴ مریضوں کا اوسط اور ماہانہ نسخوں کا اوسط ۸۰۶ ہوتا ہے۔ ان نسخہ جات کی قیمت جو خزانہ سے ادا کی گئی اس کا ماہوار اوسط عہ۱۵ ہوتا ہے۔ اگر ان ماہانہ مصارف کو مریضوں اور نسخہ جات کی مذکورہ تعداد پر تقسیم کیا جائے تو ایک مریض کا اوسط خرچ صرف دس پیسے اور ایک نسخہ کی اوسط قیمت ۸ پائی سے بھی کم آتی ہے۔ اس سے شہر کی کفایت اور طبیب صاحب دارالعلوم کی حُسن قابلیت اور حُسنِ کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن مریض، طلبہ یا ملازمین مدرسہ کو طبیب صاحب ان کے قیامگاہوں پر جاکر دیکھتے ہیں ان کا ماہانہ اوسط چالیس مریض ہوتا ہے۔

کتبخانہ | کتبخانہ دارالعلوم کا ایک جوہری جزو اور سامان علم ہے اس لئے مالی خزانہ سے زیادہ اس علمی خزانہ کی اہمیت ہے۔ دارالعلوم کا کتبخانہ بحیثیت عدد و نوعیتِ کتب بحمداللہ امتیازی شان رکھتا ہے جس کی شاندار عمارت چار بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ہے، بڑے ہال میں گیلری کے ذریعہ اوپر سے کتابیں اٹھائی جاتی ہیں۔ چالیس ہزار وقفی جلدیں ہر وقت زیر درس و مطالعہ رہتی ہیں اور غیر وقفی ملاکر ایک لاکھ جلدیں ہو جاتی ہیں قلمی کتب کا ذخیرہ جداگانہ الماریوں میں استفادہ کے لئے محفوظ ہے۔ اندراج کتب اور جمع و تقسیم کے باقاعدہ رجسٹر ہیں جن کے ذریعہ ہر وقت تمام کتابوں، تمام فنون اور کتب فنون کے مجموعی اعداد و شمار بآسانی معلوم کئے جا سکتے ہیں، کتب خانہ کے ذمہ دار ناظم جناب مولانا مولوی سلطان الحق صاحب ہیں جو مستقلاً ایک مختصر سے تین چار آدمیوں کے عملہ کے ساتھ اس کام کو بخیر و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ کتبخانہ کا انتظام بہترین نظم و نسق کے ساتھ انجام دیں خدا کرے کہ وہ کامیاب ہوں۔ (آمین)

مطبخ | اسی طرح شعبہ مطبخ جس سے طلبائے مستحقین کو کھانا دیا جاتا ہے اپنے معمولات میں سرگرم ہے۔ سال گذشتہ مطبخ سے کھانا پانے والوں کی تعداد (۴۵۰) سے اوپر رہی (نقد وظیفہ پانے والے طلبہ کا شمار ان کے علاوہ ہے) اس کا ماہانہ اوسط گذشتہ سال الٹ ۱۲ روپیہ رہا ہے۔ اس شعبہ میں تقریباً ۱۴، ۱۵ ملازمین کا عملہ کام کر رہا ہے۔ کھانا ہمیشہ ٹھیک وقت پر تیار رہتا ہے۔ گاہ گاہ جناب مہتمم صاحب اور گاہے

گاہے جناب صدر مدرس صاحب کھانے کا معائنہ فرماتے رہتے ہیں۔ خریداجناس کا کام ہمیشہ مختلف نرخ معلوم کرنے کے بعد کفایت کے ساتھ ناظم مطبخ خود کرتے رہتے ہیں۔ جنس حتی المقدور عمدہ خریدی جاتی ہے۔ گوشت گاؤ قصاب مطبخ میں آکر بناتا ہے۔ گاہ گاہ دارالعلوم کے بعض ذمہ دار اشخاص بھی گوشت کی نگرانی کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔

تعمیرات | یہ شعبہ اپنے کاروبار کے لحاظ سے کافی وسعت رکھتا ہے۔ تعمیرات کا دفتر بھی مستقل ہے۔ اور اس کے گودام جس میں مختلف تعمیری سامان رہتا ہے بالکل جداگانہ ہیں مختلف رجسٹروں کے ذریعہ تعمیرات کی کارگذاریاں دفتر میں مدون رہتی ہیں، اس شعبہ میں تقریباً چار کارکن مصروف کار رہتے ہیں ایک ان میں سے ناظم ہیں جو روڑکی انجنیرنگ کالج کے پاس شدہ ہیں، اور اپنی دیانت و امانت داری کے لحاظ سے جماعت میں معروف ہیں تمام تعمیری کام مثلاً پیمائش سامان تعمیر مصالحہ جات وغیرہ خود ہی انجام دیتے ہیں۔

اس شعبہ نے چار سال کے اندر بہت کافی ترقی کی ہے (کیونکہ راقم الحروف ۱۳۵۵ھ کا سند یافتہ ہے جس کو چار سال گذر گئے) جدید فارسی خانہ بنایا ہے۔ محافظ خانہ کی دومنزلہ عمارت بنائی۔ دارالطلبہ جدید کے سلسلہ میں پانچ وسیع کمرے تیار کئے۔ کمرہ ۱۳ کی بنیادیں بھریں۔ گیارہ کمروں کی جو پہلے سے تیار تھے پختہ منڈیریں، فرش زمین اور فرش سنگ پختہ اور پلاستر کرائے۔ نیز ان کمروں میں بانیان کمرہ کے ناموں کے کتبے لگوائے۔

دارالحدیث کے اوپر منڈیر لگوائی جس میں کئی ہزار روپیہ صرف ہوا۔ دارالحدیث کا شمالی برآمدہ تیار کیا دارالحدیث کے شمالی اور جنوبی برج تیار کئے۔ دارالحدیث اور گیلری کی جوڑیوں پر سبز رنگ کرایا۔ مسجد دارالعلوم کی بالائی منزل کے سامنے سائبان بنوایا۔ احاطوں کا پانی باہر جانے کے لئے ایک طویل و عریض پختہ نالی تیار کرائی۔ زینہ دارالاہتمام جو مسجد کی جانب سے آتا ہے اور زینہ متصل فارسی خانہ پتھر کا بنایا۔ دارالحدیث کمرہ ۹ سے ۱۲ تک جو اندرون تالاب واقع ہیں بھرائی کرائی۔ بہرحال یہ شعبہ ضرورت کے لحاظ سے خاصی ترقی کر رہا ہے۔

ورزش | راقم الحروف کے دارالعلوم چھوڑنے کے بعد دارالعلوم میں شعبہ ورزش بھی کھولدیا گیا ہے جس میں طلبہ کو کود پھاند، لکڑی چلانا۔ اور مخصوص ورزشیں کرائی جاتی ہیں۔ یہ شعبہ ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ سردست اس میں ایک استاد ورزش محنت و مستعدی سے کام کر رہے ہیں مختلف عمر کے طلبہ اُن سے فنونی ورزش و سپہ گری سیکھتے ہیں۔ مختلف قسم کے سامان ورزش موگریاں، ہتھ اے ڈنڈا، چرمی دستانے لاٹھی وغیرہ شعبہ کے اسٹاک میں موجود ہیں جو طلبہ میں مستعمل ہیں۔ یہ شعبہ حصول تندرستی کے ساتھ مسلمانوں کو ان کا اصلی مگر بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور ان میں جرأت و حوصلہ پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا مختلف شعبوں کے متعلق مختصر سی تحریر سے آپ نے بخوبی دارالعلوم کے حالات کا اندازہ لگایا ہوگا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ختم کردوں ورنہ ابھی صرف اجمالی بیان کے لئے بھی بہت سے شعبے باقی ہیں۔ مثلاً شعبۂ احتساب، حفظ، رذ، فصل خصومات، شعبۂ صفائی، شعبۂ اوقاف، مجلس منتظمہ وغیرہ وغیرہ۔

دارالعلوم کا نظم و نسق | البتہ آخر میں ضروری ہے کہ زائرین کرام (دارالعلوم) کے خیالات سے بھی مستفید ہوں۔ کہ وہ کس قسم کا اثر دارالعلوم کے نظم و نسق سے لے کر جاتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کا نظم و نسق بھی آپ کے سامنے ہوگا۔

نظم دارالعلوم کی تقویت نہ کسی حکومت کی اعانت سے ہے نہ پولیس اور فوج سے بلکہ محض باہمی محبت و عقیدت اور رواداری سے قائم ہے اس پختگی نظام اور استواری نظم کو دیکھ کر (جو محض اخلاقی ہے) ایک موقعہ پر صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب مرحوم وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی نے دارالعلوم کے احاطہ میں فرمایا تھا کہ "کاش یہ ڈسپلن (نظم) علی گڈھ کو بھی نصیب ہو"

۱۳۴۷ھ میں وفد حیدرآباد کے صدرنشین نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شروانی نے دارالحدیث دارالعلوم کے بڑے ہال میں تقریر فرماتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے اس مجموعی نظام میں ایک نور محسوس ہوتا ہے۔

اور علامہ رشید رضا مدیر رسالہ المنار مصر نے دارالعلوم کی اس ساکن فضا کو دیکھکر اپنی عربی تقریر میں فرمایا تھا:-

ولم اربھا اجعت من الطفن ضربناً۔ اگر میں دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین جاتا۔

دارالعلوم کے سرسٹھ سالہ تعلیمی مصارف اور اس کی کفایت شعاری | کالج اور یونیورسٹیاں کے بدنام ہونے کے ذرائع جہاں اور کچھ ہیں ایک یہ بھی ہے کہ کالجوں میں طالبعلم پہنچکر سوائے اس کے کہ اپنے عزیز والدین کی کمائی کو فضول اور لغو باتوں میں ختم کرنا سیکھتا ہے نیز اسی چیز کے پیش نظر موجودہ لیڈران قوم اور محکمہائے تعلیم کے ماہروں نے اس طرف قدم بھی بڑھانا شروع کر دیا ہے لیکن یہ لاٹھی جاری ہوئی ہے اس وقت تک جبکہ سانپ گذر چکا ہے مگر دارالعلوم دیوبند کو دیکھئے کہ اس نے اپنے اس معاملہ میں بھی ایسا رویہ اختیار کیا ہے جس کو شروع سے برابر نبھائے چلا جا رہا ہے۔

اس وقت میرے سامنے ایک رپورٹ ہے مرتبہ جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب نائب مہتمم حال دارالعلوم دیوبند جس میں انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی سرسٹھ سالہ زندگی پر ایک مجمل نظر ڈالی ہے اس میں انھوں نے مذکورہ بالاعنوان کے ماتحت دارالعلوم نے کم از کم اخراجات سے کتنا فائدہ عظیم اٹھایا ہے چنانچہ میں اس کو یہاں بالفاظ مع مذکورہ بالاعنوان کے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ مذکورہ بالاعنوان کے ماتحت رقمطراز ہیں

" پھر اس مرکزی کاروبار کی اس ہمہ گیری ووسعت اور پھیلاؤ کے باوجود کارکنوں کی دیانت و اخلاص کا یہ کس قدر حیرت انگیز کارنامہ ہے کہ دارالعلوم نے اس سرسٹھ سالہ زندگی میں صرف طلبہ تقریباً پانچ لاکھ پانچ ہزار تین سو تیس روپیہ صرف کر کے تین ہزار عالم تیار کئے۔ اگر اس رقم کو صرف ان تکمیل یافتہ علماء ہی پر صرف کیا جائے اور ان آٹھ ہزار طلبہ کے عدد کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا جائے جن پر گو صرف کیا گیا مگر وہ سند تکمیل نہ پا سکے تو فی عالم تقریباً ۱۶۹ روپیہ بیٹھتا ہے جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ دارالعلوم نے صرف ایک سو انہتر روپیہ کی حقیر رقم میں ایک ایک عالم ایسا مکمل تیار کر دیا جو قوم کی تمام دینی ضروریات تدریس، تبلیغ، وعظ، مناظرہ، تصنیف اور افتاء وغیرہ کا کفیل ہو۔ اور ہر ایک دینی خدمت بآسانی کر سکے۔ درآں حال کہ ان تین ہزار میں کتنی ہی ہستیاں ہم ایسی بھی شمار کرا چکے ہیں کہ اگر یہ لاکھوں کی کل صرف شدہ رقم ان میں سے صرف ایک ہی پر نچھاور کر دیجاتی تو برمحل ہی نہیں بلکہ ع " نرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز " کا مصداق ہوتا۔ بہرحال اس کا فیض باران رحمت

کی طرح عام رہا اور یہاں سے بھی اس کے پیاسے پہنچے اس نے ظرف و ہمت کے موافق انھیں سیراب کیا۔ اور اس لئے ہندوستان کا کوئی شہر کوئی قصبہ اور کوئی کونہ ایسا نہ ملے گا جہاں دارالعلوم کے سرچشمہ کی کوئی نہر اور کوئی ندی مسلمانوں کو سیراب نہ کر رہی ہو۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

موجودہ حضرات مدرسین کا ایثار — علم ہوگا اگر اس وقت حضرات مدرسین کے زہد اور ایثار کا دارالعلوم پر تذکرہ نہ کیا جائے۔ آپ نے مختصراً ہر زمانہ کے مدرسوں کا حال دیکھا بعینہٖ یہی حال دارالعلوم کے موجودہ مدرسین حضرات کا ہے۔ ان حضرات کی کیفیت اس طرح بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے جبکہ ہم دوسرے کالجوں کے مدرسین کا حال سامنے رکھیں چنانچہ کالجوں یا یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو عموماً پورے ہفتے صرف ۲۴ گھنٹے پڑھاتے ہیں ان کی تنخواہ دو سو ڈھائی سو روپیہ ماہوار ہوتی ہے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کا باکمال پروفیسر جو یومیہ کم از کم چھ گھنٹے درس دیتا ہے اس کی اوسط تنخواہ صرف ساٹھ روپیہ ماہانہ ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی عربی مدرسہ ہے جو گورنمنٹ کے زیر کفالت ہے اس کے پرنسپل کو پورے مہینہ میں صرف ۴۴ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے اور ایک ہزار یا گیارہ سو روپیہ کی تنخواہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ لیکن دارالعلوم کے پرنسپل کو صرف ایک سو پچیس روپے ماہوار ملتے ہیں جو اوسطاً ۵ گھنٹے یومیہ مدرسہ میں کام کرتا ہے۔

ایک نظم اور خاتمہ — غالباً سنہ ۱۳۵۰ھ میں مولانا ظفر علی خاں صاحب کا ورود مسعود دارالعلوم دیوبند میں ہوا آپ پر وہاں کے حالات کا بہت کچھ اثر ہوا فی البدیہہ آپ نے اپنے خیالات کو منظوم فرمایا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل ہے:۔

شاد باش و شاد زی اے سرزمین ہند — ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند — حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دو چند
اسم تیرا با مسمیٰ، ضرب تیری بے پناہ — دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند
تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے نثار — قرن اول کی خبر لائی تیری الٹی زقند

تو مسلم بردار حق ہے، حق نگہباں ہے ترا — خیل باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو — کر لیا ان عالمان دین قیم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموس محمدؐ پر فدا — حق کے رستہ میں کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ ! — جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اسمعیل، قاسمؒ ہوں کہ انور شاہؒ کہ محمود الحسن — سب کے دل تھے درد مند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمی ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے

جن سے ہے پرچم روایات سلف کا سربلند

سلسلہ منتخباتِ نظم اُردو

۱- معارف ملت ۲- جذبات فطرت ۳- مناظر قدرت

مرتبہ

پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے ال ال بی (علیگ)

وہ حضرات جنھوں نے اردو شاعری کی ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی پرانی داستان سمجھ رکھی ہے اس سلسلہ انتخاب کو ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ انگریزی کی جن نیچرل نظموں پر وہ سر دُھنتے ہیں اُن کی ہم پلہ نظمیں خود اُن کی زبان میں موجود ہیں شعر و سخن کے چمن کھلے ہوئے ہیں جن کے رنگ و بو سے دل و دماغ بلکہ روح کو تفریح ہوتی ہے۔

معارف ملت (چار حصے)

جلد اول - حمد، نعت، مناجات اور معرفت کی نظمیں قیمت عہ

جلد دوم - مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل کی تصویریں - قیمت عہ

جلد سوم - ہندوستان کی متحدہ قومیت کے متعلق شعرا کا دلپذیر کلام قیمت عہ

جلد چہارم - اخلاق و حکمت کے انمول موتی - قیمت عہ

جذبات فطرت (چار حصے)

جلد اول - میر و سودا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد دوم - غالب، ذوق، ظفر اور حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد سوم - تقریباً تیس قدیم، مستند اور باکمال شعرا کے کلام کا انتخاب قیمت عہ

جلد چہارم - تقریباً ساٹھ جدید شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب قیمت عہ

مناظر قدرت (چار حصے)

جلد اول - متعلق اوقات یعنی صبح شام، دن رات، برسات اور بہار کے دلکش مناظر - قیمت عہ

جلد دوم - متعلق مقامات یعنی آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل اور عمارات کی صناعی تصویریں قیمت عہ

جلد سوم - متعلق نباتات و حیوانات یعنی پھول پھل کیڑے پتنگے اور چرندوں پرندوں کا مطالعہ و مشاہدہ - قیمت عہ

جلد چہارم - متعلق عمرانیات یعنی ہندوستان کا تمدن، رسم و رواج، عید، تیوہار اور میلے ٹھیلوں کے دلچسپ حالات - قیمت عہ

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہو گئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون کریں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور